ناول

بلونت سنگھ

چکِ پیراں کا جسّا

رومان اور حقیقت کا سنگم

चक पीराँ का जस्सा

چک پیراں کا جسّا

ناول

بلونت سنگھ

پیش لفظ:
محمد حامد سراج

بک کارنر
جہلم، پاکستان

چک پیراں کا جسا

चक पीराँ का जस्सा

عام خیال یہ ہے کہ بلونت سنگھ کا نام ذہن میں آتے ہی پنجاب کے دیہات اور گاؤں کا ماحول نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلونت سنگھ کسی مخصوص فضا کا انسان نہیں، بلکہ کہانی کا بندہ ہے۔ اس کی کہانیاں ایسے کوزے ہیں جو بڑی چابکدستی کے ساتھ تیار کر کے بڑے پریم سے سجاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی جگہ مٹی زیادہ چکنی اور رنگدار ہوتی ہے اور کسی علاقے کی مٹی بھربھری ہونے کی وجہ سے آبخورہ کھردرا اور بے رنگ رہ جاتا ہے۔ لیکن بلونت سنگھ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ مال اچھا نہ ہونے کے باوصف وہ خوبصورت اور توجہ طلب چیزیں بناتا اور اپنے سامنے طلب گاروں کے ڈیرے رکھتا ہے۔

(اشفاق احمد)

Chak Piran Ka Jassa
by Balwant Singh
Jhelum: Book Corner. 2019
424p.
1. Novel - Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-217-8

ناشر گگن شاہد • امر شاہد

اشاعت: ۲۰۱۹ء

ناول نگار: بلونت سنگھ

پیش لفظ: محمد حامد سراج

حروف خوانی: اے ڈی چشتی (پاکپتن)

سرورق: ابو اِمامہ

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

بُک کارنر

شورُوم: اقبال لائبریری روڈ، بک سٹریٹ، جہلم (پاکستان)
Ph: +92 (544) 614977, 621953 Email: info@bookcorner.com.pk
WhatsApp # 0314-4440882 Facebook: book corner showroom

WWW.BOOKCORNER.COM.PK

......جَسّو کا جوڑا بگّی کی مٹھی میں تھا، اور وہ ہوا میں لٹک رہا تھا...... بگا سنگھ کسی چالاک مداری کی طرح اپنا بڑا سا منہ کھولے کھڑا تھا۔ وہ خود بھی خوش ہو رہا تھا اور دوسروں کو بھی خوش کر رہا تھا۔ قہقہوں کا شور کم ہوا تو اس نے بھاری آواز میں کہا:

''بِلّا چاہے کتّے کا ہو، یا آدمی کا، اس کی قوتِ برداشت کی جانچ کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے......''

بگا سنگھ نے ہوا میں ہی اپنی مٹھی کھول دی اور جَسّو یوں نیچے کو آیا، جیسے ناریل کے پیڑ سے ناریل نیچے گرتا ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نیچے گرتے ہی جَسّو پل بھر میں اُٹھ کر کھونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا......

......غیر متوقع طور پر واہ گورو اکال پُرکھ نے اس کی سُن لی، کیونکہ اسی بیچ اسے دروازے میں سے ٹُو تیا رنگ کے تہمد کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اُسے گھٹنے تک کا لمبا کُرتا نظر آیا۔ دروازے سے بھی اونچا ہونے کی وجہ سے جَسّا سنگھ سر جھکا کر باہر نکلا۔ والان میں قدم رکھتے ہی وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی اُونچی، مضبوط اور تنی ہوئی گردن پر صورت سنگھ کو ایسا چہرہ دکھائی دیا، جو سندر نہ ہونے پر بھی لاکھوں میں ایک تھا......

فہرست

پیش لفظ

مطالعہ ایسی قیمتی متاع ہے جو آپ کی زندگی کو بامعنی بنا دیتا ہے، آپ کے باطن میں تیسری آنکھ کھول دیتا ہے جس سے آپ زندگی کے وہ مناظر دیکھ سکتے ہیں جنہیں ایک عام انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ہم دو جمع دو کی زندگی جینے والوں کو زندہ انسان نہیں کہہ سکتے۔ وہ چلتے پھرتے لاشے ہیں جو وقت کے ساتھ زمین سے غائب ہو جاتے ہیں۔
یہ بہت برس پرانی بات ہے اگر میں بھول نہیں رہا تو 1977 کی، کالج کی زندگی تھی اور بے فکری کا زمانہ تھا، اُن دنوں اُردو ادب کے افق پر نقوش، فنون، اوراق اور سویرا چھائے ہوئے تھے، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے ساتھ حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر کے افسانوں اور ناول کی دھوم تھی۔ ناول میں عبداللہ حسین کے قد کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ میں ان کی کتابوں کی تلاش میں رہتا اور نقوش، فنون اور اوراق کے ساتھ ماہِ نو کا خریدار اور قاری تھا۔ اتوار کے دن راولپنڈی صدر بازار کے فٹ پاتھ پر کتابوں کا میلا سج جاتا اور رؤف امیر اور میں پُرانے جرائد اور کتابیں کھوجتے شام کو لوٹتے۔ سیروز سینما کے ساتھ ہی ایک گھنے درخت کے ساتھ ''ارم کیفے'' تھا۔ رؤف امیر اور میں تلے ہوئے قیمہ کے ساتھ گرم گرم روٹیاں اڑاتے اور کالج لوٹ آتے۔
ایک دن کالج گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر ہم بیٹھے تھے، سورج ڈوب چلا تھا، باتیں چل رہی تھیں اور ہم سموسے کھا رہے تھے، میں نے رؤف امیر سے کہا:

''یار ایک بات کہوں.....؟''

''کہو.....''

''ایک دن ہم مر جائیں گے۔''

''یہ کون سی انہونی ہے، سب جان دار مر جاتے ہیں۔''

''یار بات تو مکمل کر لینے دیا کر۔ میری سوچ ہے کہ ادب میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور

عصمت چغتائی کے ساتھ حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر کے افسانوں اور ناول کی دھوم ہے۔ ایک بہت اہم نام اوٹ میں ہوگیا ہے جو کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان سے اچھا..... چلو اچھا نہ سہی برابر کا قدر رکھتا ہے..... اور وہ ہے ''بلونت سنگھ''۔ اس کا ناول ''رات، چور اور چاند'' ایک کلاس کا ناول ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ''اِک چادر میلی سی'' کا ذکر خوب کیا جاتا ہے اور اداکارہ سنگیتا نے اس پر ''مٹھی بھر چاول'' بنائی ہے۔ نقوش میں مَیں بلونت سنگھ کا افسانہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔''

''اچھا..... بات مکمل کرو۔''

''ایک دن آئے گا ہم زمین پر نہیں ہوں گے، اُس وقت فیصلہ قاری کرے گا، نقاد کرے گا کہ بلونت سنگھ کس پائے کا ناول نگار اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانے جمع کر کے شائع کریں گے۔ کلیات کلیات..... آئی عقل میں بات..... اسے مکمل شائع کیا جائے گا، اس پر سیمینار اور تھیسز ہوں گے۔ ہم نہیں ہوں گے رؤف امیر لیکن بلونت سنگھ ہوگا..... ''چک پیراں کا جسا'' ہوگا، وہ زندہ رہے گا۔''

''یار حامد راحت (اس زمانہ میں میرا تخلص راحت تھا) میرا تو یقین نہیں، تم اپنی پیشین گوئی کسی بینک کے لاکر میں رکھوا جاؤ۔''

آہ..... آج ڈاکٹر رؤف امیر نہیں ہے۔ اللہ کریم اسے جنت نصیب کرے، وقت نے گواہی دے دے دی کہ بلونت سنگھ قاری کے دل میں دھڑک رہا ہے۔ پاکستان کے ایک ادارہ نے اس کے افسانوں کا کلیات دو جلدوں میں طبع کیے ہیں، میری خواہش تھی کہ بلونت سنگھ کے افسانے ایک ساتھ کہیں مل جائیں اور بس میں انہیں پڑھتا چلا جاؤں۔

''رات، چور اور چاند'' تو کالج کی زندگی میں پڑھ لیا لیکن ''چک پیراں کا جسا'' دستیاب نہ ہو پایا۔ کوئی تیس برس ادھر کی بات ہے، لاہور مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ایک کہر آلود صبح میں ان کے ساتھ چائے پیتے ہوئے جب ان کی لائبریری کو عمیق جانچا تو ''چک پیراں دا جسا'' پر نظر ٹھہر گئی۔ مجھے احمد داؤد کے ناول ''رہائی'' کی تلاش تھی جو ایک فوجی آمر ضیاء الحق کے دور میں صحافتی پابندیوں کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ اس کا پہلا ایڈیشن بھی بک سٹالوں سے اٹھالیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے یہاں سے مل گیا۔ میں تارڑ صاحب سے دونوں ناول لے آیا۔

''چک پیراں کا جسا'' پنجاب دھرتی کی مٹی سے ابھرتا ہوا گھبرو ناول ہے۔ دیہات کے ماحول کی عکاسی رام لعل، غلام الثقلین نقوی اور ابوالفضل صدیقی کے ہاں بھرپور ملتی ہے اور متاخرین میں طاہرہ اقبال کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بلونت سنگھ کا اندازِ نگارش اپنا ہے اور منفرد ہے۔ وہ پنجاب کی مٹی میں وہاں کے کلچر کو گوندھ کر چاک پر چڑھاتے ہیں۔ سکھ جاتی تہذیب، رسم ورواج، بول چال محاورہ، گالی، میلے ٹھیلوں کے ساتھ وہ سکھوں کے رہن سہن اندازِ زندگی روزمرہ کی بول چال کو خاص سکھ انداز میں پینٹ کرتے ہیں۔ بلونت سنگھ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ سکھوں کی معاشرتی زندگی، گھریلو جھگڑے اور محبتیں اپنے قلم سے امر کر دیتے ہیں۔

آپ ناول کا مطالعہ کیجئے، اس کے کردار سینہ ٹھوک کر آپ سے زندہ انسان کی طرح اپنی زبان میں بات کریں گے۔ جملوں اور مکالموں میں بناوٹ کی بجائے اصل زبان اور لہجے کی کاٹ سے جو زبان رائج تھی بلونت سنگھ کے کردار اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس ناول کے دو بنیادی کردار جسا سنگھ اور بگا سنگھ ہیں۔ ذیلی کردار کئی ہیں جو اپنے اپنے حصے کا کردار نبھار ہے ہیں۔ محبت، عروج کی نفرتیں، منتقم مزاج، سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

متھرا دیوی اور گوردیپ ہیں۔ گوردیپ قیامت خیز حسن کا ایسا استعارہ ہے جس کا ہر زاویہ بولتا ہے اور اپنے روایتی لباس سُرخ اوڑھنی، پیلا کُرتا اور بینگنی رنگ کی شلوار میں ایک ایسی الہڑ دوشیزہ ہے جس کے حُسن کو آنکھ بھر کے دیکھنا ممکن نہیں۔ جسا سنگھ کا لباس کھدر کا کُرتا، کُرتے کے نیچے میلا کمر بند، سخت سردی کے باوجود اس کے تن پر ایک پھٹا ہوا کھیس، اس کی غربت اور یتیمی کی علامت ہیں۔ وہ جسا سنگھ کو ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ رام پیاری کون ہے؟ ایک عورت ہے لیکن کس قماش کی عورت ہے، کتنے کرداروں سے جُڑی ہے اور معاشرتی زندگی کے کن کرداروں میں سے ہے؟ ناول کا مطالعہ کرتے جایئے اور کرداروں کے ساتھ منظروں کا لطف لیجئے۔ یہ اس زمانے کا ناول ہے جب ابھی کہانی کو موت نہیں آئی تھی۔ کہانی اپنی توانائی سے قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی۔ یہی خوبی اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ناول میں بگا سنگھ کی شادی کا قصہ بہت طولانی ہے اور اس میں سیکڑوں اتار چڑھاؤ ہیں۔

''چک پیراں کا جسا'' اُردو ادب کے کلاسک میں شمار ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے ادب میں بھی دھڑے بندیاں کمال کی ہیں۔ سب کی اپنی اپنی بانسری ہے، اپنی لَے اور اپنے سُر ہیں۔ ہمارا نقاد مبصر اور تنقید نگار زیادہ تر تدریسی ضرورت کے تحت لکھتا ہے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ گروپ بندیوں کی وجہ سے وہ انہی مہربانوں کو پرموٹ کرتا ہے جو اس کے منظورِ نظر ہوں۔ بہت عمدہ اُردو کلاسیکی ناول نظر انداز ہو گئے۔ نشاط فاطمہ کا ناول ''آنسو جو بہہ نہ سکے'' اور کئی ناول اس طرح نظر انداز ہوئے لیکن وقت کی کسوٹی نے انہیں اچھال کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ''چک پیراں کا جسا'' بھی گرد آلود ہو رہا تھا۔ بگا سنگھ تلخ مزاج اور کرخت کردار ہے۔ ایک جگہ بڑا خوبصورت مکالمہ ہے، بگا سنگھ کی فطری اکڑ اور ہٹ دھرمی وہاں موجود دوسرے دیہاتیوں کی کیفیات بگا سنگھ کی حرکات وسکنات، یہ سب بلونت سنگھ نے سادہ انداز میں پیش کیا ہے جو ناول کی شروعات سے ہی دلچسپی کے عنصر کو نمایاں کر دیتا ہے۔ بوڑھا جب اسے خبر کرتا ہے کہ وہ اس یتیم لڑکے کو سردار پور گاؤں سے اس کے حوالے کرنے آیا ہے تو بگا سنگھ اپنی ہٹ دھرمی کے ہاتھوں انکار کر دیتا ہے۔ محفل میں بات طول کھینچتی ہے تو سب بگا سنگھ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس بلا کو سر سے ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ بے چارے بھکاری ہوں گے کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔

بگا سنگھ نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف کرخت نظروں سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا:

''کم از کم میں نے پنجاب میں کسی سکھ کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا...... سکھ بھکاری نہیں ہوتا، ہاں اگر کبھی پنجاب ختم ہو گیا تو پھر سکھ بھی بھکاری بن جائیں گے۔''

طویل ناول ''چک پیراں کا جسا'' اپنے اندر اتنی روانی اور کہانی کے بہاؤ سے لبریز ہے کہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری اس وقت اس سے الگ نہیں ہوتا جب تک وہ اسے مکمل پڑھ نہ لے۔ ہر اشاعتی ادارے کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ بک کارنر جہلم نے ایک طرف ادب میں قدیم آپ بیتیوں کو نہ صرف کھوج نکالا بلکہ انہیں کمال زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ امر شاہد اور گگن شاہد کا اُردو زبان و ادب پر یہ احسان ہے۔

جیب سے رقم نکالنا ایک مشکل امر ہے..... اور محنت کی کمائی سے ہوتا بھی یہی ہے لیکن آپ یہ شاہکار خرید لیجئے، میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں آپ کی رقم اور مطالعہ دونوں رائیگاں نہیں جائیں گے۔

میرا کریم ربّ آپ کا حامی و ناصر ہو!

محمد حامد سراج

خانقاہ سراجیہ: ڈاک خانہ چشمہ بیراج،
ضلع میانوالی، پوسٹ کوڈ:42030
موبائل:03336833852
ای میل:hamidtaloker@gmail.com

دیباچہ

صُورت یُوسف دی ویکھ طیمُوس بیٹی، سنے مال تے تلک قربان ہوئی
نین مَست کلیجڑے وچ دھانے جیویں تڑکھڑی نوک سِناں ہوئی

(وارث شاہ)

''......طیمُوس بادشاہ کی بیٹی یوسف (علیہ السلام) جیسی شکل والے نوجوان کو دیکھ کر اپنے جاہ وچشم اور مال ودولت کے ساتھ اس پر نچھاور ہوگئی، اسے لگا، جیسے نوجوان کے مَست نین اس کے کلیجے میں برچھی کی تیز نوک کی طرح دھنس گئے......''

کچھ دیر بعد آکاش سے ستاروں کا کارواں کوچ کرنے ہی والا تھا۔ فضا میں سردی بڑھ گئی تھی۔

ہری پورہ نامی گاؤں سے آدھا میل دُور سکھوں کے گوردوارے میں سنگت اکٹھی ہو رہی تھی۔ یہ سنگت صِرف ہری پُورہ کی ہی نہیں تھی، بلکہ قُرب و جوار کے دیہاتوں کے لوگ بھی اس میں جمع ہو رہے تھے۔ وجہ یہ کہ آج سنکرانت تھی۔

جس وقت بچن سنگھ اپنے پریوار کے ساتھ وہاں پہنچا، تو شبد کیرتن شروع ہو چُکا تھا۔ اس کی بیوی متھرا دیوی کو کیرتن سے دِلی لگاؤ تھا۔ اُدھر لنگر میں عورتوں کی ضرورت تھی۔ متھرا دیوی نے اپنی نوجوان بیٹی گوردیپ کور کو لنگر کی طرف چلتا کیا اور خود کچھ دیر کیرتن سُننے کے لیے بیٹھ گئی۔

گوردیپ کور لنگر والے وسیع احاطے کے ایک اندھیرے کونے میں خاموش کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی سُرخ اوڑھنی کا ایک کونہ دانتوں تلے دبائے لنگر میں مصروف عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتی رہی۔ سبزیاں کاٹی جا رہی تھیں، پیاز چھیلے جا رہے تھے، چوڑی چوڑی پراتوں میں آٹا گوندھا جا رہا تھا، مصالحے بڑے بڑے گُونڈوں میں گھوٹے جا رہے تھے۔ کچھ لمبے چوڑے چارکونوں والے توے، جنہیں "لوہ" کہا جاتا تھا، دیوار کے ساتھ ٹِکے ہوئے تھے۔ بھاری بھرکم دیگوں میں ارد، چنے کی دال پک رہی تھی، بھٹیوں میں لپکتے شعلوں کا عکس اس حسینہ کی موٹی موٹی کالی آنکھوں میں جھلک دکھا رہا تھا۔

گوردیپ کور تو اس کا پورا نام تھا۔ عام طور پر اسے دیپو یا دیپی کہہ کر بُلایا جاتا تھا۔ چہرے کا رنگ تھا تو صندلی، مگر ایسا، جیسے چندرما کی اُجلی چاندنی میں گُھلا ہوا ہو، یا جیسے چہرے کی صندلی تہہ کے نیچے دودھ کی ملائی جھلملا رہی ہو۔ گیلے کوئلے کی طرح کالی زُلفیں چہرے کے آس پاس یوں ساکن پڑی تھیں، جیسے صندل کے جنگل میں اس کی خوشبو سے کالے ناگ مَست پڑے ہوں۔ اَدھ کُھلے ہونٹ سنگترے کی پھانکوں کی طرح رَس سے بھرے تھے، جن میں سے سفید دانت دیپوں کی طرح چمک رہے تھے۔ محراب نُما دونوں بھویں کبھی کبھی اُڑتے ہوئے پرندے کے لمبی پَروں کی طرح کانپنے لگتیں۔ پورے چہرے پر جیسے صُبح ہونے کو ہو۔

اس نے دیہاتی رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سرخ اوڑھنی، پیلا کُرتا اور بینگنی رنگ کی شلوار۔ پاؤں سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح شلوار کے پائنچوں میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر گیس کی تیز روشنی میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی سہیلیوں کا بھی خوف تھا، جو پہچان لینے کے بعد اُسے چھوڑنے والی نہیں تھیں...... وہ ہچکچائی سی کھڑی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد متھرا دیوی لنگر کے احاطے میں آئی، تو اسے اپنی بیٹی دکھائی نہیں دی۔ اسے نہ تو حیرت ہوئی، نہ فکر۔ وہ جانتی تھی، کہ دیپو اور اس کی کام چور سہیلیاں جان بُوجھ کر کہیں الگ سے محفل جمائے ہوں گی۔ لیکن دیپو کو اس کی کسی سہیلی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماں کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے وہ کھسک کر گوردوارے کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی اور رُوں رُوں کرتے ہوئے رَہٹ کے قریب پہنچ کر پل بھر کو رُکی۔ رَہٹ چل رہا تھا اور خوش قسمتی سے اس کی گادھی پر بیٹھا بوڑھا اُونگھ رہا تھا۔ دیپو نے دُور تک پھیلے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں جھاڑیاں تھیں، بیر اور بَبُول کے پیڑ تھے، قبرستان کی جھاڑیوں میں قبریں سہمی ہوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔ کھیتوں میں بہت بہت بڑے کچھوؤں کی طرح ''دھڑیں'' دکھائی دے رہی تھیں۔ بُھوسے کے اُونچے اُونچے انباروں کو اُوپر سے گارے سے لیپ کر دھڑیں بنائی جاتی تھیں۔ فضا میں نشہ سا تھا، جیسے دکھائی نہ دینے والی شراب اس میں لہریں لے رہی تھی۔

دیپو نے سکون کی گہری سانس لی، تو پل بھر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پیلا کُرتا پھٹ جائے گا اور اس میں جکڑے ہوئے دو چکور پَر پھڑ پھڑاتے ہوئے آکاش کی طرف اُڑ جائیں گے۔ یکا یک ہی وہ کھیتوں میں دوڑ پڑی، جیسے آکاش کا کوئی تارہ ٹوٹ کر اُڑا جا رہا ہو۔ اس کے پاؤں تلے کھیتوں کی بُھر بُھری مٹی ٹوٹنے لگی، تو اسے اپنے تلوؤں میں عجیب سی گدگدی کا احساس ہوا۔ کچھ گیدڑ آدھے چندر ما کی چاندنی سے اُجلی جنگلی حسینہ کو ایسی بے پرواہی سے دوڑتے دیکھ کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے سٹک گئے تھے۔

یکا یک اسے اس بات کا احساس ہوا کہ گوردوارہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس خیال سے اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔

اس کی نظر قبرستان کی طرف چلی گئی۔ قبرستان وہاں سے بُہت دُور تھا۔ انجان آدمی بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ قبرستان ہے کدھر۔ دھرتی سے بہت کم اونچی کچی قبروں کے آس پاس کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ انہیں جھڑ بیریاں کہتے تھے۔ گرمیوں کی دوپہر کو وہ پسینے سے نہائی ہوئی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس قبرستان میں بیر کھانے آیا کرتی تھی لیکن یہ بہت پہلے کی بات تھی، جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

اس زمانے کی اسے یہ بات بھی یاد تھی، کہ اس کے گاؤں میں ایک آدمی آیا کرتا تھا، جسے سب سَیّد کہتے تھے۔ وہ بالکل کالا کُرتا اور کالا ہی تہمد پہنے ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر اتنی چکنائی ہوئی تھی، جیسے وہ ابھی ابھی سرسوں کے تیل کی مالش کر کے آرہا ہو۔ سبھی دیہاتی مسلمانوں کی طرح اس کے سر پر بھی لمبے لمبے پٹے تھے۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بلکہ تیل سے بہت چکنے ہوتے تھے۔ وہ کنگھا کر کے بالکل ہموار بنا دیے جاتے تھے۔ تین چوتھائی چاند کی شکل والا کنگھا اس کے بائیں کان کے اُوپر پٹوں میں پھنسا رہتا تھا۔ عام مسلمانوں کے

پکوں اور اس کے پکوں میں ایک فرق بھی تھا۔ وہ یہ کہ دائیں اور بائیں سے دو موٹی زلفیں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اس کے سینے پر لہراتی رہتی تھیں۔ اس کی آنکھیں بڑے بڑے انگاروں کی طرح دہکتی رہتی تھیں۔ قینچی سے کٹی اس کی ڈاڑھی، اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی ہوتی تھی۔

جب سَیّد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کے نزدیک پہنچتا، تو کتے بھونک بھونک کر اس کا سواگت کرتے۔ اس کے ہاتھ میں بڑے ہی گہرے بھورے رنگ کی لمبی سی لاٹھی ہوتی تھی۔ اگر کوئی کتا بھونکتے بھونکتے، اس کے زیادہ قریب آنے کی جرأت کرتا، تو وہ آسانی سے ہی تڑاک سے اپنی پتلی سی لاٹھی مار دیتا اور کتا بھونکنا بھول کر دُم دبا لیتا اور ٹاؤں ٹاؤں کرتا ہوا پرے بھاگ جاتا۔ سَیّد کے کانوں میں سینگ کے بنے ہوئے بالے ہوتے تھے اور اس کی گردن میں اَن گنت مالائیں جھولتی رہتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی چلتے چلتے یک دم بھاری آواز میں چلاّ اُٹھتا...... ''یاعلی (رضی اللہ عنہ)!''

یوں لگتا ہے، جیسے یہ شبد اس کے پیٹ کی گہرائیوں سے نکل کر باہر آتے تھے اس کی آواز میں بھاری پن کے ساتھ ساتھ ایک کڑک سی ہوتی تھی۔ وہ کیوں آتا تھا، کہاں کو جاتا تھا؟...... اس بات کا دیپو کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اب اس سنسان جگہ پر کھڑے کھڑے اسے سَیّد کا خیال آ گیا، کیونکہ اس کے بچپن میں سَیّد قبرستان کی طرف سے ہی آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اسے لگتا تھا کہ سَیّد قبرستان میں ہی رہتا تھا اور وہیں ہی سے اُٹھ کر اس کے گاؤں کی طرف آتا تھا۔ اَب بھی اسے ڈر سا لگا کہ کہیں سَیّد دھوئیں کے بَل کھاتے ہوئے ستون کی طرح قبرستان سے اُٹھ کر اس کی طرف نہ چلا آئے۔ حالانکہ سَیّد نے اسے کبھی گھورا نہیں تھا، کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ سَیّد چاہے، جیسا بھی رہا ہو، لیکن وہ اس سے سدا ڈرتی رہی۔ بچپن کا یہ خوف اَب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔

وہ اس سنسان جگہ پر آنے کی کبھی جرأت نہ کرتی مگر جس نے اسے بلایا تھا، وہ اسی کے بھروسے یہاں پر چلی آئی۔ اگر وہ وہاں موجود ہوتا، تو پھر اسے کس بات کا خوف تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے غلط پیغام ملا تھا؟ کیا پیغام ملنے پر بھی اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟...... لیکن وہ کیسے نہ آتی۔ اوّل تو وہ پیار کی خاطر آتی، اور اگر پیار کی خاطر نہیں تو خوف کے مارے تو ضرور ہی آتی۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی، اس سے ڈرتی بھی تھی لیکن اس خوف میں اسے کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس معاملے میں ڈرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ کیوں اچھا لگتا تھا؟...... اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس سنسان مقام پر دیپی اپنے آپ کو بالکل اکیلا پا کر عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اپنی دُھن میں وہ وہاں تک بھاگتی چلی آئی تھی۔ اگر وہ مِل جاتا تو وہ محسوس کرتی، کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی ہے۔ اسے حیرانگی ہونے لگی، کہ وہ وہاں تک اکیلی آ کیسے گئی۔ اس نے بڑے حوصلے سے کام لیا تھا، لیکن اَب وہ حوصلہ اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اسے وہم ہونے لگا، کہ ہر ایک جھاڑی کے پیچھے بھیڑیئے بیٹھے اپنی دہکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس کے دل میں یہ خوف بھی پیدا ہوا کہ کہیں وہی سَیّد قبرستان سے نکل کر اس کی طرف نہ چلا آئے......

ہوا میں ہلکی سی سردی کی چُبھن تھی۔ چاروں طرف میدانی علاقے میں کھیت ہی کھیت تھے۔ نہروں کی اُٹھی ہوئی پٹڑیاں لکیروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاں تہاں پیڑوں کے جُھنڈوں میں رَہٹ مٹیلے دھبّوں کی طرح لگ رہے تھے۔ پُورب کی سمت اُفق کی ریکھا پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کا پرکاش بھی ابھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سمجھ بیٹھی کہ ستاروں کا کارواں آسمان سے وِداع ہونے کو تھا، لیکن شائد اسے غلطی ہوئی تھی۔ ابھی دن چڑھنے میں کافی دیر تھی۔ وہ گوردوارے سے اتنی دُور نکل آئی تھی کہ وہاں سے کیرتن، ڈھولک اور ہارمونیم کی آوازیں بھی اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ یکا یک ہی اس نے محسوس کیا کہ اسے اتنی دُور سے اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب اسے اس بات میں شک ہونے لگا کہ وہ واپس گوردوارے تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔ وہ پچھتانے لگی کہ کیوں وہ بِنا کسی سے کچھ کہے سُنے اِدھر کو بھاگ آئی۔ اس کے من میں بڑی تیز خواہش اُٹھی کہ اسے جلد سے جلد واپس پہنچ جانا چاہیے۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف مایوسی بھری نگاہ ڈالی اور پھر چُنری کو سر اور جسم پر اچھی طرح لپیٹتی ہوئی سر جھکا کر وہ گوردوارے کی طرف چل دی۔

ابھی وہ چند ہی قدم چلی ہوگی کہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔ یہ خیال اسے بعد میں آیا۔ وہ اس طرح ٹھٹھک کر رُک کیوں گئی تھی...... وجہ یہ تھی کہ اسے وہاں پر کسی اور شخص کی موجودگی کا احساس بھی ہوگیا تھا۔

اس نے بے اختیار اپنے جھکے ہوئے سر کو اُوپر اُٹھایا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر سچ مُچ ہی ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ نہیں پہچانتی تھی کہ وہ کون ہے۔

اسے لگا، جیسے اینٹ پتھر اور بُول اور شیشم کی لکڑیوں کو آپس میں کوٹ پھینٹ کر کچے تالاب کے مٹیلے پانی اور پتلے کیچڑ میں گوندکر ایک لمبا چوڑا پُتلا بنا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس شخص کے کانوں میں بھی بالے جھول رہے تھے لیکن یہ بالے سینگ کے بنے ہوئے نہیں تھے، بلکہ سونے کے بنے ہوئے تھے۔ پَل بھر کو جو اس کے من میں یہ خوف پیدا ہوا تھا کہ شاید قبرستان والا سَیّد وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ غلط نکلا۔ یہ سَیّد نہیں تھا، بلکہ سِکھ تھا۔ ستاروں کی مدہم روشنی میں اس کے بالوں والے چوڑے سینے پر سونے کا بڑا سا کینٹھا دمک رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی پگڑی کا ایک شملہ مُرغ کی کلغی کی طرح ہوا میں اُٹھا ہوا تھا، اور دوسرا شملہ کندھے کو چھو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت کم گوشت تھا۔ ناک اور کانوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ بھویں اُبھری ہوئیں اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، لیکن دو چنگاریوں کی طرح دہکتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ اس کی ڈاڑھی کے بال ابھی اتنے کم تھے کہ لگتا تھا کہ جیسے مکڑی نے اس کے گہرے گیہوں رنگ کے چہرے پر ہلکا جالا سا بُن دیا ہے۔ اتنے دُھندلے پرکاش میں اس کی مُونچھوں کا ایک بال تک دکھائی نہیں دیتا تھا، صرف ناک کے نیچے بائیسکل کا کالا سا ہینڈل پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

دیپی کے مَن میں سوال اُٹھا کہ وہ سوائے اس شخص کے، جسے وہ چاہتی تھی، کوئی اور تو نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے دبی دبی نظروں سے سامنے کھڑے نوجوان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی شکل پریمی کی سی شکل نہیں لگتی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور کُھردرا سا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بند تھے اور وہ بالکل ساکن سا کھڑا تھا۔ اس کے بارے میں

دیپی کو صرف ایک ہی خاص بات کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ اجنبی کی دہکتی آنکھیں لگاتار اس کی طرف دیکھے جارہی تھیں۔ کتنے دُکھ کی بات تھی کہ وہ اسے پہچانتی بھی نہیں تھی۔ پہچانتی بھی کیسے۔ وہ اسے چھ برسوں کے بعد دیکھ رہی تھی۔ ان چھ برسوں میں وہ کتنا بدل گیا تھا۔ پہلے تو اس کا رنگ اچھا خاصا نکھرا ہوا تھا لیکن اب بالکل بالکل دُھواں سا نظر آتا تھا۔ چہرے کا کھردراپن جوں کا توں موجود تھا۔ دیپی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی، کہ ان چند برسوں میں وہ اتنا لمبا ہو جائے گا۔ چاہے وہ موٹا نہیں تھا لیکن اس کی ہڈیوں اور سینے کے ڈھانچے اور کندھوں کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ بالکل جہاز کی طرح لگتا تھا۔

دیپی نے سوچا کہ موجود نوجوان کو بھی اسے پہچاننے میں کٹھنائی ہورہی ہے۔ وہ کیسی مورکھ ہے؟ اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ آج سے چھ برس پہلے وہ صرف دَس برس کی تھی۔ ان چھ برسوں میں وہ خود بھی تو بہت بدل گئی تھی۔ چاہے اپنے آپ کو ایسا نہ لگے لیکن جو شخص اسے اتنے برسوں کے بعد دیکھ رہا تھا، اسے تو پہچاننے میں کٹھنائی ہوگی ہی۔ چودہ برس کی عمر میں ہی اس نے ایسا جوبن نکالا تھا کہ اگر اسے کوئی چار برس کے بعد بھی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔ اب تو وہ خیر سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے روم روم سے جوانی پھوٹ نکلی تھی............ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، وہاں سوائے اس کے پریمی کے اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ چھ برس پہلے وہ پریمی صرف چودہ برس کا لڑکا تھا۔ ان دونوں کی عمر پریم کرنے کی تو نہیں تھی، اس وقت۔ اس کے برعکس اس عمر میں بھی وہ اس سے ڈرتی زیادہ تھی، اور محبت کم کرتی تھی۔ عجیب لڑکا تھا وہ۔ ان دنوں میں بھی وہ کم مسکراتا اور بہت تھوڑی باتیں کرتا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں جب اسے گاؤں سے جانا پڑا، تو وداع ہونے سے پہلے اس نے ڈانٹ کر کہہ دیا تھا:

"دیپی! یاد رکھنا، میں تم ہی سے شادی کروں گا۔ اگر تم کسی اور کی پتنی بنی تو تمہارا اگلا کاٹ دُوں گا۔"

کتنی عجیب بات تھی...... اس چھوٹی سی عمر میں ہی ایک کٹھور چہرے والے لڑکے نے اس پر اپنا دعویٰ جما دیا تھا۔ شاید وہ لڑکا صرف عمر کا کچا تھا عقل کا کچا نہیں تھا۔ اتنے برسوں تک بھی دیپی اس کی دھمکی کو بھول نہیں سکی۔ وہ سدا اس سے ڈرتی رہی۔ اسے وِشواس تھا کہ چاہے اسے اس لڑکے سے پریم ہو نہ ہو لیکن شادی اسی سے ہی کرنی پڑے گی۔ اب تک لڑکے کی محبت نے کالے بادل کی طرح اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھا۔ اسے الجھن ہوتی تھی، پریشانی بھی ہوتی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ محبت کے اس گہرے کالے بادل کی حدود سے باہر نہیں آ سکتی...... عجیب بات یہ تھی کہ وہ اس دُھند سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

ستاروں کے پرکاش میں وہ ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑے تھے۔ آخر دیپی نے دھیمی آواز میں پوچھا: "تم جسُّو ہو؟"

اس کا نام جسا سنگھ تھا۔ اسے لوگ صرف جُسا بھی کہتے تھے۔ لیکن اسے یاد آیا کہ بچپن میں دیپی اسے جسُّو ہی کہا کرتی تھی۔ اس کے بند ہونٹ کھلے اور وہ اپنی بھاری، بےسُری اور سپاٹ آواز میں بولا: "میں جسُّو ہوں۔"

یہ سن کر دیپی کا دل ناچ اُٹھا۔ سب سے بڑا اطمینان اسے یہ تھا کہ اس وقت وہ کسی خطرے میں نہیں تھی۔ جسُّو دیکھنے میں جیسا بھی ہو لیکن اس سے خطرہ تو کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ تو اس کا اپنا تھا، جس نے خود پیغام بھجوا کر اسے

بلا یا تھا۔ کچھ دیر بیت گئی۔ وہ دونوں ہی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ بیچ بیچ میں دہی اس سے کوئی بات پوچھ لیتی۔ جسُو اس کی ہر بات کا چھوٹے سے چھوٹا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

دہی نے پوچھا: ''تم گاؤں سے کب لوٹے؟''

''کل......''

دہی نے جان بوجھ کر یہ سوال کیا تھا۔ اس کے آتے ہی گاؤں میں دُھوم مچ گئی تھی، اور لوگ کہہ رہے تھے کہ جسُّو کو اس کے چاچے نے بھیجا ہے۔ جب دہی کے کان میں یہ خبر پہنچی کہ جسُّو پھر گاؤں میں آ گیا ہے تو وہ جُوں کی تُوں بیٹھی رہ گئی، دیکھنے میں وہ خاموش اور ساکن تھی لیکن اس کے من میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے اور جسُّو کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ جسُّو کے بارے میں کچھ سوچنا بیکار تھا، کیونکہ وہ ضرور اُسے بھول چکا ہوگا...... لیکن جب دن ڈھلے اللہ دتی اس کا پیغام لے کر آئی، تو اسے پتا چلا کہ جسُّو اُسے بھولا نہیں تھا۔ یہ بات سوچ کر اس کے من میں کئی اور سوال، کئی نئی اُمنگیں اُبھر آئیں۔ پیغام میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ کب اور کہاں مل سکتے ہیں۔ پیغام پا کر اس کے دل میں یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ کہیں بات پھیل نہ جائے۔ اس نے اپنی سہیلی سے کہا: ''دیکھو یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔''

اس پر اللہ دتی نے اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: ''وہ میرا گلا کاٹ دے گا۔''

سکھی کی بات سُن کر دہی کو احساس ہو گیا کہ اگر وہ پیغام پا کر بھی کل سورج طلوع ہونے سے پہلے جسُّو سے ملنے نہ گئی تو اس کے گلے کی بھی خیر نہیں۔

کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے اس نے پھر پوچھا: ''تم گاؤں میں رہو گے نا؟...... واپس چاچے کے پاس تو نہیں جاؤ گے...... ابھی......''

''گاؤں میں کچھ آدمی ہیں، ان سے نپٹ کر ہی جاؤں گا۔''

ان دونوں میں محبت کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جسُّو نے اسے اُنگلی سے چھوا تک نہیں لیکن پھر بھی اس نے محسوس کیا، جیسے جسُّو نے اسے سر سے پاؤں تک محبت کے نشے میں نہلا دیا ہے۔

''اب مَیں جاؤں؟'' دہی نے اس سے پوچھا۔

''چلی جانا۔''

''کہیں کوئی آ نہ جائے۔''

''کوئی آ بھی گیا تو وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گا۔''

دہی نے چونک کر جسُّو کی طرف دیکھا۔ تو گویا یہ تھا اس کا پریمی...... اس نے مَن میں سوچا۔

پہلا غلاف

جیہڑا آس کر کے ڈگے آن دوارے، جیو او سدا کدے نہ توڑیے جی
وارث شاہ! یتیم دی غور کریے، ہتھ عاجزی دے نال جوڑیے جی
(وارث شاہ)

''......اگر کوئی آس کر کے دروازے پر آ گرے تو اس کا من کبھی نہیں توڑنا چاہیے، اے وارث شاہ، یتیم کی دیکھ بھال کرنی چاہیے اور اس کے سامنے عاجزی سے ہاتھ جوڑنے چاہئیں......''

۱

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور ہر طرف دُھند چھائی ہوئی تھی۔ کچی اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے مکانوں والے گاؤں کے باہر بھنگیوں کے کنوئیں کے قریب دھریک کے دو تین درخت بالکل ساکن کھڑے تھے۔ ان کی گھنی پتوں اور شاخاؤں میں سے جیسے دُھند بہت دھیرے دھیرے بہہ بہہ رہی کر باہر کو آ رہی تھی۔ درختوں کے اس جھنڈ سے کچھ دوری پر قبرستان کے قریب سے ہو کر آنے والے کچے چوڑے راستے پر کچھ سائے گاؤں کی طرف آتے دکھائی دیے۔ اگر اتنی گاڑھی دُھند نہ ہوتی، تو پرچھائیوں کی، واضح صورت دکھائی دے جاتی؛ ایک گھوڑا، گھوڑے کے اوپر چودہ برس کا لڑکا اور گھوڑے کے آگے آگے لگام تھامے چھوٹی سی ڈاڑھی والا ایک بوڑھا سکھ۔

گاؤں والے اپنے اپنے گھروں کے بھیتر، انگیٹھیوں میں سوکھے اُپلے دہکائے ہاتھ پاؤں سینک رہے تھے۔ اگر کوئی شخص باہر کھڑا ہوتا، تو اسے گاؤں کی طرف بڑھنے والی پرچھائیاں بُھوت پریت ہی معلوم ہوتیں۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے والے بُھونے والی بھٹی کے بھیتر گُھسے کتے بھی اپنی تھوتھنیاں ٹانگوں میں چھپائے چپ چاپ پڑے تھے۔ یہاں تک کہ ان پرچھائیوں کو آتے دیکھ کر اُن پر بھونکنے کی بھی ان کو خواہش نہیں ہوئی۔

گھوڑا چلتے چلتے درختوں کے نیچے پہنچ کر یوں رُک گیا، جیسے کھلونے کی چابی ختم ہونے پر وہ رک جاتا ہے۔ بہت مَریل، مٹمیلا، گندے بالوں والا گھنونا گھوڑا تھا۔ اس کی گردن کے بال بھبھوت ملے سادھوؤں کی بھٹاؤں کی طرح گیلے گیلے سے نیچے کو لٹک رہے تھے اور اس کے کچھ بال دونوں کانوں کے بیچ میں سے آگے کو لٹک کر آنکھوں میں گھسے جا رہے تھے۔

بوڑھے نے گھوڑے کے رُکتے ہی اپنی چُندھی اور تیز آنکھوں سے مُڑ کر لڑکے کی طرف دیکھا اور کھرکھراتی آواز میں کہا:

''لو جسّو، یہ ہے تمہارے چاچا کا گاؤں۔''

لڑکے کا نام جَسّا سنگھ تھا۔ اس کے سر کے بال اوپر کے جُوڑے میں کس کر بندھے تھے۔ جُوڑا ابھی اتنا

بھاری تھا جیسے بھوری بھینس ٹانگ اُٹھا کر اس کے سر پر گوبر کا ڈھیر لگا گئی تھی۔ جوڑا بالکل ننگا تھا، یہاں تک کہ اس پر جالی بھی نہیں بندھی تھی۔ جوڑے کے آس پاس کھوپڑی پر میلی پگڑی کے تین چار بل لپٹے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ جمبور کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے کی بات سُن کر اس کا چہرہ جُوں کا تُوں بنا رہا۔ وہ بنا کچھ کہے چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اُتر پڑا۔

وہ لڑکا نانا سا تھا۔ گھوڑے کی طرح مریل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ایک ایک ہڈی دیکھی جا سکتی تھی۔ ابھی اس نے بھدا سا کھدر کا پاجامہ اور گاڑھے کا کرتا پہن رکھا تھا۔ کُرتے کے نیچے سے سُتلی کا بٹا ہوا میلا کمر بند جھانک رہا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود اس نے اپنے جسم پر صرف ایک پھٹا ہوا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ وہ یتیم اور مفلس دکھائی دیتا تھا۔ اگر چہ اس کے کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں جھول رہی تھیں۔

بوڑھے نے تھکے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ مریل گھوڑا جُسّو کے چاچا کے طویلے تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں۔ راستے بھر وہ دونوں باری باری گھوڑے کی سواری کرتے رہے تھے۔ آخر میں بوڑھے نے لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پل بھر کو تو گھوڑا یوں کھڑا رہا، جیسے وہ کاٹھ کا بنا ہو، نیز جیسے وہ قلفی کی طرح جم کر رہ گیا ہو...... آخر اس کی ٹانگیں ہلیں۔ جُسّو نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو دھکیلا۔

اس طرح وہ تینوں جُسّو کے چچا بگا سنگھ کے طویلے کی طرف بڑھے۔

طویلے کے اندر اُلجھی اُلجھی ڈاڑھیوں والے کئی اشخاص تین ٹولیوں میں بٹے اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ ہر ایک ٹولی کے بیچ میں دہکتے ہوئے اُپلوں کی کچی انگیٹھی رکھی تھی۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیوں میں سے سر کے چوتھائی یا اس سے کچھ کم بال گدیوں پر لٹک رہے تھے۔ ہر ایک شخص خاصا ہٹا کٹا تھا۔ وہ سب سوچ بچار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اہم سنجیدہ مسئلہ پر دچار کر رہے ہیں۔

یہ طویلے کا کمرہ تھا۔ لگ بھگ بیس قدم چوڑا، اور پینتالیس قدم لمبا۔ کمرے کا ایک کونہ تو کئی قسم کی چیزوں سے اَٹا ہوا تھا۔ بیل گاڑیوں کے بھاری بھرکم پہیے، دیوار کے ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے ہَل اور پنجالیوں کا الگ انبار تھا۔ کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے پھاوڑے، کھرپے، کنگھے وغیرہ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک میز کی طرح کی بھاری تخت اس ٹوٹے پھوٹے سامان سے ذرا الگ رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک سرے پر چارہ کاٹنے کی دستی مشین لگی ہوئی تھی۔ پہلے یہ تخت طویلے کے باہر والے صحن میں پڑا رہتا تھا، مگر اَب سردی کی وجہ سے اندر رکھ دیا گیا تھا۔

کمرے میں بے حد مدھم روشنی تھی۔ سب ہی لوگوں کے چہرے موم کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اتنے میں ایک بھاری چہرے والے شخص نے بیٹھے بیٹھے ذرا اُوپر کی طرف دیکھا اور کہا:

"بگیا! وہ تینوں بھائی ہیں بڑے حرامجادے۔"

جس شخص کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے گئے تھے، وہ بھاری بھرکم تخت کے پاس چارہ کاٹنے کی مشین کے پہیے پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ اسے آدمی کی جگہ پر بھوت کہنا زیادہ مناسب تھا۔ جتنا وہ لمبا اونچا تھا، اتنا ہی وہ بھاری

تھا۔ اس کے جسم پر کافی ٹھوس ماس، چڑھا ہوا تھا لیکن اس کا چہرہ بہت بڑا ہوتے ہوئے بھی چربی اور گوشت سے عاری تھا۔ اونچی ناک، چوڑے نتھنے، کچھ اندر کو دبے ہوئے گال، گھنی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی بھویں، بھیتر کو گھسی ہوئی چھوٹی چھوٹی مگر تیکھی آنکھیں اور چھدری ڈاڑھی تھی اس کی۔

یہی شخص جسّو کا چاچا رنگا سنگھ تھا۔

اس آدمی کی بات سن کر بگا سنگھ کے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی، لیکن اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں دہک اٹھیں، جیسے سوکھی گھاس کے نیچے دو چنگاریاں چمک رہی ہوں۔ وہ اپنی کہنی کو اس پہیے پر ٹکائے جوں کا توں فطری آواز میں بولا:

''اوئے لدھا سنگھ، حرامزادے وہ بھی ہیں اور حرام زادہ میں بھی ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ حرام زادہ کون ہے...... میں یا وہ۔''

بگا سنگھ کی آواز میں کیا کیا تھا۔ عام آواز میں تیزی سے بہتے ہوئے چوڑے پہاڑی نالے کی گرج تھی۔

بگا سنگھ کی اس بات پر ایک آدمی انگیٹھی کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد چھوٹا اور بدن اکہرا تھا۔ لمبی ڈاڑھی میں کالے بال کم اور سفید زیادہ تھے۔ اس کے چہرے پر سوجھ بوجھ کی علامات دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے اس نے دونوں بازو پھیلا کر کھیس کو دو چار جھٹکے دیے، جس طرح بگلا اپنے سفید پر پھڑ پھڑاتا ہے اور پھر کھیس کو اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹتے ہوئے دو قدم بگا سنگھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

''بگا! میں تو صرف ایک ہی بات ہی کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھانا، وہ تمہارے سمبندھی ہیں اور ایسے شریک سمبندھیوں کی باہمی رقابت اور حسد تو سدا ہی سے چلے آتے ہیں۔ شریک جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے ہونٹوں پر میٹھی باتیں ہوتی ہیں، لیکن دل میں زہر بھرا ہوتا ہے......!''

بگے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

''کشن سنگھ! تم اچھی طرح جانتے ہو، کہ میں سدا تمہاری رائے مان لیتا ہوں لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے وہ سمبندھی اپنے دل میں زہر چھپائے ہیں، تم مجھے حوصلہ رکھنے کی رائے دیتے ہو؟''

''شریک کا مطلب کیا ہے؟...... یہی کہ چاچے تاؤ کی وہ اولاد جو ایک دوسرے کا پنپنا پسند نہیں کرتی۔ ان میں سے ہر ایک خود تو زندگی میں ہر طرح سے اوپر اٹھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتا ہے، بلکہ مٹی میں ملا دینا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسی سنگھرش کی ایسی حالت تو بنی ہی رہتی ہے۔ اس لیے آپے سے باہر ہونا مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے میں حوصلہ رکھنے کو کہتا ہوں۔ ہونٹوں سے شہد کی سی میٹھی باتیں ٹپکنی چاہئیں، لیکن ہاتھ میں نہ دکھائی دینے والا کھرپہ تیار رکھنا چاہیے تاکہ جب موقع ملے اپنے شریکوں کی جڑیں کاٹ کر پھینک دو......''

بگّا سنگھ کا دماغ چھوٹا نہیں تھا، اور نہ چھوٹے ڈھنگ سے سوچنے کی اس کی عادت تھی۔ کشن سنگھ کی سمجھائی ہوئی باتیں اس کی عقل میں بیٹھتی ہی نہیں تھیں۔ مگر وہ ایک بات جانتا تھا، وہ یہ کہ کشن سنگھ بہت دُور کی بات سوچ لیتا تھا اور اس کا دماغ بہت گہرائی تک جاتا تھا۔ کشن سنگھ کا کہا چاہے ہی اس کی سمجھ میں نہ آئے، لیکن وہ اس کی رائے کی مخالفت کبھی نہیں کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کشن سنگھ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے وہ کئی مصیبتوں سے بچا رہے گا اور آخر میں اسے ضرور ہی فائدہ ہوگا۔ اس وقت بھی کشن سنگھ کی بات کو سن کر وہ بھڑکا نہیں، بلکہ مطمئن ہو گیا۔

لدّھا سنگھ دوبارہ بولا:

''میں کشن سنگھ سے متفق ہوں......اور پھر بگّے کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اکیلا ہے، اور اس کے دشمن شریک تین بھائی ہیں۔ مانا بگّے کے کئی ساتھی ہیں لیکن بھئی کون کہہ سکتا ہے کہ بُرے دن آنے پر ان میں سے کتنے ساتھی ٹوٹ کر دشمنوں سے جا ملیں گے اور کتنے بگّے کا ساتھ دیں گے۔ یہاں پر ہم جتنے اس کے ساتھی بیٹھے ہیں، وہ سب اس کا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر زیادہ سے زیادہ اس کا ساتھ دینے کو بھی تیار ہیں لیکن ہم میں سے ہر ایک کی ایک حد ہے۔ چاہے بگّے کا بُرا نہ کریں مگر اس کا ساتھ بھی تو ایک حد تک ہی دے سکتے ہیں۔ اُدھر وہ تینوں بھائی ایک ہاتھ کی اُنگلیوں کی طرح آپس میں جُڑے ہوئے ہیں۔ کیوں کشن سنگھ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

کشن سنگھ نے اپنی تجربہ کار بوڑھی آنکھوں سے لدّھا سنگھ کی طرف پل بھر دیکھا اور کہا:

''تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ بگّے کو ہم پر وشواس نہیں کرنا چاہیے۔ بات صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کے تینوں شریک آپس میں سگے بھائی ہیں۔''

ان کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ طویلے کے دروازے پر گدھے نما گھوڑے کا سر دکھائی دیا۔ ایک بڈھے کا چہرہ اور بڈھے کے بعد ایک لڑکے کی شکل دکھائی دی۔

بگّا سنگھ کا دھیان سب سے پہلے اس طرف گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ یوں تو اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا لیکن اس کی آواز آنے والوں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ لگتا تھا کہ بگّا سنگھ انہیں سنانے کے لیے ہی اتنی اونچی آواز میں بولا:

''اوئے! یہ تین کھوتے کہاں سے آ گئے ہیں؟''

وہاں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی نے بگّا سنگھ کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بگّا سانڈ کی طرح اٹھلاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے دروازے کے تختے کے اوپر کہنی ٹیکتے ہوئے پوچھا: ''کون ہو تم؟''

بوڑھے نے دَب کر جواب دیا: ''ہم سردار پورے سے آئے ہیں۔''

بگّے نے زبان نکال کر اس کی نوک سے اپنی مونچھوں کو چھوا اور پھر پوچھا:

''تو کیا تم میرے پاس آئے ہو؟''

بوڑھے نے اپنی پیلی نم دار آنکھوں سے بگے کے چوڑے کندھوں کا جائزہ لیا، اور مریل آواز میں بولا:

''ہاں!!''

''کیوں؟............کیا راستے میں اور کوئی گاؤں نہیں پڑتا تھا؟ یا پھر ہمارے گاؤں سے آگے کوئی اور گاؤں نہیں ہے، جہاں تم پہنچ سکتے؟......کیا یہ سالا پنجاب میرے گھر تک آ کر ختم ہو جاتا ہے؟''

بگا سنگھ کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا:

''بے چارے بھکاری ہوں گے، کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑاؤ۔''

بگا سنگھ نے پلٹ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا:

''کم از کم میں تو پنجاب میں نے کسی سکھ کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا......سکھ بھکاری نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کبھی پنجاب ختم ہو گیا تو پھر سکھ بھی بھکاری بن جائیں گے۔''

بہر حال بوڑھے کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ سب لوگ اس کے پیچھے کھڑے لڑکے کو صاف طور پر دیکھ سکیں۔ تب وہ بولا: ''میں اس لڑکے کو یہاں لے کر آیا ہوں۔''

بگا سنگھ نے گھور کر پوچھا: ''کیوں......؟''

''یہ یتیم ہے۔'' بوڑھا بولا۔

''لیکن میرا گھر یتیم خانہ تو نہیں ہے...... جاؤ! اسے گوردوارے کے گرنتھی کے پاس لے جاؤ، وہاں یہ جھاڑو دیا کرے گا، برتن مانجھے گا اور گوردوارے کی سیوا کرتا رہے گا۔ دونوں وقت روٹی کے علاوہ کڑاہ پرشاد بھی کھانے کو ملے گا۔''

بوڑھا کچھ پلوں تک بگا سنگھ کو اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر پٹاک سے بولا:

''یہ آپ کا بھتیجا ہے۔ اس بیچارے کا اپنے چاچا یعنی آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔''

یہ سُن کر بگے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''دُنیا جانتی ہے کہ بگا سنگھ کھاتا پیتا آدمی ہے۔ لوگ کسی نہ کسی بہانے میرے ٹکڑے توڑنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ اب اس لونڈے کو ہی دیکھو۔ میرے رشتے داروں کو بھی کیا مذاق سوجھا ہے۔ اس مادر......کو میرے گھر کی طرف دھکیل دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا......''

بوڑھا بولا:

''یہ آپ کے سور گیے بھائی کی اکلوتی اولاد ہے۔ اَب ماں بھی نہیں رہی۔ سب نے یہی رائے دی کہ اسے آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔''

بگے نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: ''اچھا! تو اس کی ماں بھی مر گئی؟''

''ہاں! اس کے مرنے پر آپ کو کارڈ ڈالا گیا تھا......اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ لڑکا آپ کے پاس آ رہا ہے۔''

''کارڈ؟............ بگے کو یاد آیا کہ کچھ دن پہلے ڈاکیا ایک میلا کچیلا پوسٹ کارڈ دے گیا تھا۔ جب کسی کے مرنے کی اطلاع دینی ہوتی تھی، تو کارڈ کا کنارہ ذرا سا پھاڑ دیا جاتا تھا۔ یہ بات بگے کو بھی معلوم تھی۔ بڈھے کی بات پر وہ چونکا، اور اس نے اپنے طویلے کا کام کرنے والے ایک مسلمان نوجوان کو آواز دی: ''اور حیمیا!''

رحیم بھینسوں کے لیے سانی تیار کر رہا تھا کیونکہ آج زیادہ دھند اور بادلوں کی وجہ سے بھینس چراگاہ کو نہیں بھیجی گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ بھوسے اور تِلی کھلی سے سَنے ہوئے تھے۔ وہ لمبی لمبی ٹانگیں چلاتا ہوا وہاں پہنچا اور منہ کھول کر بگے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

بگے نے پوچھا: ''کئی دن ہو گئے ایک کارڈ آیا تھا، وہ میں نے تمہیں دے دیا تھا، کہاں ہے؟''

رحیم نے فوراً ہی اپنی تہمد کے بھیتر اُڑسی ہوئی گانٹھ کو کھولا اور اس میں سے تُڑا مُڑا کارڈ نکال کر بگے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بگے نے کارڈ پر سے بھوسے کے تنکے جھاڑتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ لیکن اس کا کچومر تو نکل ہی چکا تھا۔ اس نے کارڈ کو جھنڈی کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

''یہی ہے وہ کارڈ! کنارے سے پھٹا ہوا ہے۔ میں نے سمجھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی اکال چلانا کر گیا ہے (مر گیا ہے)...... چلو چھٹی ہوئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کارڈ میں کچھ اور بھی لکھا ہے۔''

یہ کہہ کر بگا کارڈ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کے لیے کالا آکھر بھینس برابر تھا۔ پھر جیسے یکا یک ہی اُکتا کر اس نے کارڈ کشن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''کشنیا! ذرا کارڈ تو پڑھ کر سنا۔''

کِشن سنگھ یوں خم ٹھونک کر سامنے آیا۔ جیسے وہ کارڈ پڑھنے نہیں بلکہ کشتی لڑنے جا رہا تھا۔ سچ مچ اسے کشتی ہی لڑنا پڑی۔ کئی بار اس نے کارڈ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جب اسے وشواس ہو گیا کہ کارڈ کے اوپر اور نیچے والا حصہ کون سا تھا تو اس نے رُک رُک کر پڑھنا شروع کیا۔

ایک اونکار ست نام،

یہاں واہ گورو اکال پُرکھ کی کرپا سے سب ٹھیک ٹھاک ہے اور آپ کی خیریت واہ گورو اکال پُرکھ سے ٹھیک ٹھاک مانگتے ہیں۔ باقی حال یہ ہے کہ آپ کے بھائی ڈگا سنگھ کی عورت کا اکال چلانا ہو گیا ہے۔ اس کا لڑکا جسا سنگھ یتیم ہو گیا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔

بقلم خود
مہا سنگھ
ساکن سردار پورہ
ضلع شیخوپورہ
پنجاب

کارڈ ختم ہو گیا۔ بگا سنگھ کچھ اُلجھن میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑھے سے پوچھا:
''یہ اتنے لمبے نام والا کون ہے؟ مہا سنگھ ساکن سردار پورہ......''
اب کشن سنگھ نے سمجھایا:
''مطلب یہ ہے کہ ساکن کے معنی ہیں رہنے والا، یعنی سردار پورہ گاؤں کا رہنے والا مہا سنگھ۔''
بگا سنگھ بگڑ کر بولا: ''میں پوچھتا ہوں کہ یہ ماں......کون ہے؟''
اب بڑھا بولا: ''مہا سنگھ رشتے میں آپ کا بھانجا ہے۔''
بگا سنگھ اپنے ماتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا:
''میں تو اس ٹیکا ٹمنی سے گھبرا گیا ہوں۔ اِدھر آ سور دے پتر (سور کے بچے) ذرا میں تمہیں نجیک سے دیکھ لوں۔''

اب وہ لڑکا کھونٹے کی طرح بالکل سیدھا آگے کی طرف بڑھا اور چاچے کے سامنے پہنچ کر جیسے کھونٹے کی طرح دھرتی میں گڑ گیا۔ اس کے جسم کا ہر انگ بالکل ساکن تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بٹن نما آنکھوں کو بھی نہیں جھپکا رہا تھا، لیکن اکی آنکھوں میں تیز چمک تھی، بالکل ایسی ہی جیسی باز یا کسی شکاری پرندے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی، غمی یا کسی قسم کے جذبے کی علامت نظر نہیں آتی تھی۔

بگا سنگ بڑے دھیان سے ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک ہی شیطان کی طرح بناوٹی قہقہہ لگا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: ''اس ماں دے بھوڑے کی شکل تو دیکھو۔''

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نہیں ہنسا، صرف ان کی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔

بگا سنگھ کی باچھیں پھیلی ہوئی تھیں اور میلے دانتوں کی قطاریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہتھوڑے جیسا ہاتھ جسّو کے سر کی طرف بڑھایا اور پھر اس کے جوڑے کو مٹھی میں سمیٹ کر کس لیا۔ سبھی کو اشتیاق ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے بگا سنگھ نے جسّو کو اسی طرح جوڑے سے پکڑ کر اوپر اُٹھا لیا۔

یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ جسّو کا جوڑا بگّے کی مٹھی میں تھا اور وہ ہوا میں لٹک رہا تھا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ جسّو کے چہرے پر اب بھی دُکھ یا درد کی ہلکی سی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ مرے ہوئے چوہے کی طرح نہیں، بلکہ پیڑ کے کٹے ہوئے تنے کی طرح نیچے کو لٹکا ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس بُری طرح اُٹھائے جانے سے اسے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کی قوت برداشت کی تعریف ضرور ہی کرنا پڑے گی۔

یہ منظر دیکھ کر سب ہی لوگ چھپر پھاڑ قہقہے لگا رہے تھے۔ بگا سنگھ کسی چالاک مداری کی طرح اپنا بڑا سا منہ کھولے کھڑا تھا۔ وہ خود بھی خوش ہو رہا تھا، نیز دوسروں کو بھی خوش کر رہا تھا۔ قہقہوں کا شور کم ہوا تو اس نے بھاری آواز میں کہا:

''پلّا چاہے کتے کا ہو یا آدمی کا اس کی قوتِ برداشت کی جانچ کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کتے کے

پلے کو ایک کان سے پکڑ کر ہوا میں اُٹھا دو۔ اگر پلا درد کے مارے ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ کتا پالنے کے لائق نہیں ہے۔ ایسا کتا گھر کی رکھوالی بھی نہیں کر سکتا۔ اگر پلا ایسی درد کو چپ چاپ برداشت کر جائے تو سمجھ لو کہ وہ بڑا ہو کر سارے گاؤں کے کتوں کو کھدیڑا کرے گا اور جس گھر میں ہوگا اس میں چور پاؤں نہیں رکھ سکیں گے۔''

اس وقت تک جسُو کا چہرہ سُرخ پڑ چکا تھا کیونکہ سارا خون اس کے سر اور چہرے پر جمع ہو گیا تھا۔ بگا سنگھ نے ہوا میں ہی اپنی مٹھی کھول دی اور جسُو یوں نیچے کو آیا، جیسے ناریل کے پیڑ سے ناریل نیچے گرتا ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نیچے گرتے ہی جسُو پل بھر میں اُٹھ کر کھونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا۔

ایک بار پھر بگا سنگھ کے ساتھ سب لوگوں نے قہقہے لگائے۔

بڑھے نے یہ منظر دیکھ کر سمجھ لیا کہ چاچا نے جسُو کو اپنے یہاں رکھنا سویکار کر لیا ہے۔ وہ مڑ کر اپنے گدھے نما گھوڑے یا گھوڑے نما گدھے کی طرف بڑھا۔ بگے کی اس پر نظر پڑی، تو اس نے پوچھا:

''تم کہاں کو چلے؟''

بوڑھے نے آہستہ آہستہ اپنا سر پیچھے کی طرف گھمایا اور اُداس نظروں سے بگے کی طرف دیکھ کر بولا:

''اب میں واپس جاؤں گا۔''

بگا مسکرا کر بولا:

''واپس جا کر کیا کرو گے؟ اب تم زیادہ دن جینے والے تھوڑے ہی ہو تم بھی یہاں رہ جاؤ، مر جاؤ گے تو مٹھی بھر مچھٹی (کپاس کے پودوں کی سوکھی چھڑیاں) میں تمہیں پھونک ڈالیں۔''

دُبلے پتلے بڑھے پر یہ پھبتی خوب بجی۔ سب نے دانت دکھا دیے۔ صرف بڑھے کو اس میں کوئی آنند نہیں آیا۔ وہ چپ چاپ گھوڑے کی طرف رینگنے لگا۔

بگے نے پھر کہا:

''بابا! یہ چھاہ ویلا (ناشتے کا وقت) ہے۔ کھا پی کر تھوڑا سستا لو تو پھر چلے جانا۔''

بڑھے کے ردعمل کا انتظار کیے بغیر بگے نے ایک لکڑی کی بلیوں والی ایک کھڑکی کی طرف منہ کر کے زور سے آواز لگائی:

''بھجنو! بھجنو!''

بھجن کور اس کی ادھیڑ عمر کی وِدھوا بہن تھی۔ خاوند کے دیہانت کے بعد پچھلے کئی برسوں سے وہ اسی کے پاس رہ رہی تھی۔ چھوٹا بھائی ہوتے ہوئے بھی بگا اسے بھجنو کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

بھائی کی آواز سن کر بھجنو بھاگتی ہوئی وہاں آئی۔ وہ اونچے قد کی بھاری بھرکم عورت تھی اور اس وقت دوڑتے ہوئے ہتھنی کی طرح لگ رہی تھی۔

طویلے کے کمرے میں پہنچ کر بھجنو دونوں بغلوں میں ہاتھ داب کر کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس

سے اُبھرے ہوئے گالوں پر لالی کھیل رہی تھی۔ اس کے سر کے الجھے ہوئے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ صورت سے اپنے بھائی کے برعکس وہ زیادہ عقل مند نظر آتی تھی۔ وہ اُجڈ بھی نہیں لگتی تھی۔ اس وقت اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی سینا (فوج) کی سیناپتی (سپہ سالار) ہو۔

بگے نے بہن کو دیکھا اور جسُو کی طرف اشارہ کر کے بولا:

''یہ ماں...... ہمارا بھتیجا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ ہمارے گھر ہی رہے گا۔ جب سے میرے پاس چار پیسے آئے ہیں، ہمارے بھتیجے اور بھانجے کھٹا کھٹ اناتھ (یتیم) ہونے لگے ہیں۔''

بگا سنگھ کی اس بات کی کوئی بنیاد تو تھی نہیں کیونکہ ابھی تک اس نے ایک بھی بھانجے یا بھتیجے کو اپنے گھر میں نہیں رکھا تھا۔

بھائی کی بات سن کر بھجنو نے جسُو کو ایک بازو سے گھیرے میں لے کر اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ جسُو پر اس لاڈ کا بھی کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ کدو کدو بھر کی چھاتیوں کے لمس سے اسے بڑی اُلجھن کا احساس ہوا اور وہ ذرا کھنچ کر پرے ہٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

بھجنو دروازے سے باہر نکلنے لگی تو بگا سنگھ نے کہا:

''بھجنو! اس بڈھے کو بھی ساتھ لیتی جاؤ، اگر چوکے تک پہنچتے پہنچتے اس کا دیہانت نہ ہو جائے تو اسے پیٹ بھر کر ناشتہ پانی کرا دینا۔''

اس کام سے فرصت پا کر بگا سنگھ نے بڑی فخر بھری نگاہ اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور پھر انگو چھے سے اپنی مونچھوں پر لٹکی ہوئی تھوک کی ننھی ننھی بوندوں کو صاف کرنے لگا۔

بھجنو جسُو کو لے کر آگے آگے چلی اور بڈھا گھوڑے کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر بھجنو کے پیچھے پیچھے جوتیاں چٹخاتا ہوا بڑھنے لگا۔

۲

طویلے میں سے نکل کر بھجنو جسُو کے کندھے پر ہاتھ رکھے پچھواڑے والے حصہ سے مکان کی طرف بڑھی۔ مکان کی سطح اتنی اونچی تھی، کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے مٹی کی سیڑھیاں بنادی گئی تھیں۔ نو دس قدم کی سیڑھی چڑھ کر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا، جس میں سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ بڈھے نے تو گھوڑے کی کوئی چنتا نہیں کی لیکن بھجنو کو دھیان آیا کہ وہ جانور بھی تو بھوکا ہوگا۔ جب بڈھا دھیرے دھیرے زینے پر چڑھ رہا تھا، تو بھجنو نے کہا:

''گھوڑے کو بھی تو چارہ ملنا چاہیے......''

بھجنو کی یہ بات سُن کر بوڑھا جہاں کا تہاں رُک گیا اور اپنا بے دانت کا منہ کھول کر اُلّو کی طرح اس کی

طرف دیکھنے لگا۔ اس کی صورت پر بھجنو کو ہنسی آتے آتے رہ گئی اور اس نے اپنے منہ پر دوپٹے کا کونا رکھ لیا۔ اس نے سوچا کہ اس بارے میں بیچارہ بوڑھا کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس نے فوراً گلا پھاڑ کر آواز دی:

''رحیمیا! اوئے رحیمیا!''

رحیم نہ جانے کہاں سے سرپٹ بھاگتا اور اپنا تہمد پھڑ پھڑاتا ہوا آیا، اور دور سے ہی بولا:

''ہاں! بے بے جی!''

''ان کا گھوڑا ہے، اسے کچھ چارہ ڈال دو۔''

رحیم جہاں کھڑا تھا، وہاں سے اسے گھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ بھجنو کی بات سُن کر اس نے گھوڑے کی طرف دیکھا، تو ناک چڑھا کر بولا:

''یہ گھوڑا ہے؟''

بھجنو ماتھے پر بل ڈال کر چلائی:

''تمہارے سامنے چاہے گھوڑا ہے، یا گدھا ہے، یا خچر ہے......بس اسے چارہ ڈال دو۔''

''بہت اچھا بے بے جی!''

رحیم لوٹ گیا۔ جسُو نے ایک نظر نئے مکان پر ڈالی۔ کافی وشال صحن تھا۔ مکان کی دیواریں گوبر مٹی اور بھوسے کے گارے سے لپی ہوئی تھیں اور خوب اُجلی دکھائی دیتی تھیں۔ داہنے ہاتھ کو تین سیڑھیاں چڑھ کر باہر والا پسار یعنی برآمدہ تھا، اور دروازوں میں سے بھیتر کا پسار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے خوب اونچے اور چوڑے دروازوں کے تختوں پر پیتل کی پھولدار ٹکلیاں لوہے کے کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ پسار کا صرف باہر والا حاشیہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔

صحن کے کونے میں بالشت بھر اونچے چبوترے پر بغیر چھت کا رسوئی گھر تھا، جہاں اس وقت دو چولہے جل رہے تھے۔ رسوئی کے ایک کونے میں دھرتی کو کھود کر انگیٹھی بنائی گئی تھی۔ زمین کے نیچے بنی اس انگیٹھی میں اُپلے جلائے جاتے تھے اور اس میں ہر وقت دودھ سے بھری مٹی کی چاٹی (ہانڈی) رکھی رہتی تھی۔ انگیٹھی کا منہ مٹی کے بنے بڑے سے گول ڈھکن سے ڈھکا رہتا تھا۔ اُپلوں کی دھیمی دھیمی آنچ سے دودھ پک پک کر گہرے بھورے رنگ کا ہو جاتا تھا اور اس کے اوپر ملائی کی موٹی سی تہہ جم جاتی تھی۔ چولہے کے قریب ٹوکری میں تازے تازے بنے ہوئے پراٹھے پڑے تھے۔ لگتا تھا کہ انہیں پکاتے پکاتے بھجنو کو بھائی کی آواز سنائی دی، تو وہ اُٹھ کر اُدھر چلی گئی۔

کھلے رسوئی گھر کے قریب پہنچ کر اس نے دونوں نئے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر ان کا مَن ہو تو وہ منہ ہاتھ دھو لیں لیکن وہ دیکھنے میں اتنے بھوکے اور بے قرار نظر آ رہے تھے کہ بھجنو نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے انہیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر انہوں نے منہ ہاتھ دھو بھی لیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ سب سوچ کر اس نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے دو گول موڑھے ان کی طرف لڑھکا کر کہا:

''یہیں بیٹھ کر ناشتہ کرلو۔''

اس کی اس بات پر مہمانوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھونا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں بڑے اطمینان سے مونڈوں پر بیٹھ گئے۔ بھجنو مکان کے بھیتر سے دو بڑے بڑے چمکتے تھال اور کٹوریاں اُٹھالائی۔ ہر تھال میں اس نے گھی سے تر دو دو پراٹھے رکھ دیے اور پراٹھے پر مکھن کا گولہ بھی چپکا دیا۔ کٹوریوں میں دہی اور دہی میں کوٹا ہوا گڑ ڈال دیا۔ کانسے کے بنے ہوئے چھنّے (کٹورے) لسّی سے بھر دیے۔

مہمان اتنی تیزی سے کھانے لگے، جیسے کھیت میں کھڑی فصل کی کٹائی کر رہے ہوں۔ انہیں اس طرح کھاتے دیکھ کر بھجنو کو ان پر بڑی دَیا (ترس) آئی۔ وہ بولی:

''پیٹ بھر کر کھانا...... سَرم نہ کرنا...... جس نے کی سَرم، اُس کے پھوٹے کرم۔''

یہ پرانی کہاوت سن کر مہمانوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے چار چار پراٹھے کھائے۔

جب پیٹ میں ایک پراٹھا پہنچا، تبھی بڈھے کی زبان بھی کچھ کچھ کھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا:

''سردارنی جی! کیا سردار جی کی کوئی عورت نہیں ہے؟''

''عورت کہاں سے آئے گی، لے دے کر میں ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں، عمر تینتیس (۳۳) سال اور شادی کا کچھ پتا نہیں۔''

''پر سردارنی جی! واہگورو کا دیا سب کچھ ہے، تو پھر عورتوں کی کیا کمی۔''

لگتا تھا، کہ بھجنو اس بارے میں جلی بھنی رہتی تھی، بولی:

''ہونے کو تو میرا بھائی ہے، لیکن شکل تو دیکھو...... چہرہ جیسے چاپڑ، اس بات کو بھی چھوڑو، کھاتے پیتے مرد کو عورت مل ہی جاتی ہے لیکن اسے اپنے ہی لچھوں سے فرصت نہیں۔ ہر وقت فوجداری، ہر وقت مقدمے بازی، بہتیرا سمجھایا کہ ساری عمر اسی رنگ ڈھنگ سے نہیں نبھنے کی مگر جیسی شکل اُلٹی، ویسے ہی کھوپڑا بھی اُلٹا۔''

بڈھے نے بھجنو کی تائید نہیں کی۔ وہ جس کا نمک کھا رہا تھا، اس کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آتے ہی جو نقشہ اس نے دیکھا تھا، اسے سامنے رکھتے ہوئے وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے لیے بڑا غنیمت تھا کہ واہگورو اسے یہاں سے عزت آبرو کے ساتھ وِداع ہونے کا اُوسر دے دے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بھجنو بھائی سے ڈرتی نہیں تھی بلکہ موقع پڑنے پر اسے کھری کھری سنا دیتی ہوگی۔ بھجنو کے سامنے بگا بھی بے بس ہو جاتا ہوگا کیونکہ گھر کی پوری ذمہ داری بھجنو نے ہی اپنے کندھوں پر لے رکھی تھی اور وہ سب کچھ بڑے اچھے ڈھنگ سے نبھائے جا رہی تھی۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی حقیقت یہ تھی کہ جب بگا سنگھ کا دماغ غصے کے مارے خراب ہو جاتا تو پھر بھجنو بھی اس کے سامنے ٹِک نہیں سکتی تھی۔ گاؤں میں بگا سنگھ کی جسمانی طاقت اور اس کی بھونڈر بازی کے سامنے کوئی بھی ٹک نہیں سکتا تھا۔ اس میں کمی صرف عقل کی تھی۔ اگر واہگورو اکال پُرکھ

نے اس کی کھوپڑی میں تھوڑی عقل بھی رکھ دی ہوتی تو پھر اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ اس کے دُور نزدیک کے سمبندھی اس سے بُری طرح خار کھائے ہوئے تھے۔

وہ محسوس کرتے تھے کہ آمنے سامنے کے مقابلے میں وہ بگا سنگھ کو نہیں پا سکتے تھے۔ وہ اسی داؤ پر تھے کہ یا تو بگا سنگھ کا دھوکے سے صفایا کر دیا جائے یا اسے کسی بڑی مصیبت یعنی مقدمے بازی وغیرہ میں پھنسا کر تباہ کر دیا جائے۔ بگا سنگھ کی اپنی عقل نہ سہی لیکن اسے بھی اچھی صلاح دینے والے موجود تھے۔ رشتے داروں سے دُشمنی نکالنے کے داؤ پیچ چلتے ہی رہتے تھے۔

ناشتے کے خاتمہ پر بڈھے نے محسوس کیا کہ اب بگا سنگھ کے بارے میں اور زیادہ پوچھ تاچھ کرنا بے کار تھا۔ اس نے بھجنو سے کہا:

''سردارنی جی! پراٹھے کھا کر مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔ ہم آدھی رات کو ہی اپنے گاؤں سے چل دیے تھے، کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ جسّو کو یہاں چھوڑ کر جلد سے جلد گھر کو لوٹ جاؤں گا۔ اب لگتا ہے کہ تھوڑی دیر اونگھ لوں تو واپس جاؤں۔''

''ٹھیک تو ہے......اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔''

بھجنو نے جواب دیا۔

بڈھا اُٹھ کر جسّو کے پاس پہنچا اور اپنا روکھا سوکھا ہاتھ اس کے سر پر پھیر کر، باہر والے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی سیڑھیوں پر سے سنبھل سنبھل کر اُترنے کے بعد وہ طویلے کے قریب پہنچا۔ تو بھیتر سے بگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی باتوں اور قہقہوں کا شور سنائی دیا۔ اس سے اس کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ نگڑ سے جھانک کر دیکھا تو مریل گھوڑا مزے سے چارہ کھا رہا تھا۔ بڈھے نے اپنے موٹے کھیس کو جسم پر اچھی طرح لپیٹا اور دیوار کی ٹیک لگا کر باہر ہی بیٹھ گیا۔ پل بھر بعد ہی وہ خرّاٹے لینے لگا۔

جسّو رسوئی کے چبوترے سے نیچے نہیں اُترا۔ وہ جہاں کا تہاں بیٹھا دھوپ نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے بھی نیند آ رہی تھی لیکن کڑک دار سردی کے کارن سو نہیں پا رہا تھا۔ اُونگھ میں آ کر وہ ایک طرف کو گرنے لگتا، تو یکدم چونک کر سیدھا ہو جاتا۔

بھجنو نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولی:

''بیٹا! آؤ تم بھیتر سو جاؤ۔ آدھی رات کے جاگے ہوئے ہو، نیند تو آئے گی ہی۔''

جسّو اُٹھا اور چپ چاپ مکان کے بھیتر چلا گیا۔

بھجنو باہر بیٹھی پراٹھے پکائے جا رہی تھی۔ بگا سنگھ نے کہلوایا تھا کہ سب کے لیے ناشتے کا سامان طویلے میں بھیج دیا جائے۔ کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے جو آدمی رکھے گئے تھے، انہیں کامے کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک کامے کا نام حویلی رام تھا۔ وہ ابھی سولہ سترہ برس کا چھوکرا ہی تھا۔ اس لیے وہ کھیتوں میں کام تھوڑا کرتا تھا اور گھر کا کام زیادہ کرتا تھا۔

جب پراٹھے تیار ہو گئے تو لسی کے گڑوے (لوٹے) مکھن، پراٹھے اور دہی یہ سب کچھ لے کر حویلی رام بگا سنگھ کے پاس پہنچا۔ بڑے شور و غل میں ان سب نے ناشتہ کیا۔

دُھوپ چڑھ آئی، تو بڈھا جاگ پڑا۔ بڈھوں کو نیند بھی کم آتی ہے۔ وہ اتنی ہی نیند سے تازہ دم ہو چکا تھا۔ انگڑائی لے کر بڈھا گھوڑے کے قریب پہنچا تو اس کی نظر رحیم پر پڑی۔ اس نے رحیم سے کہا:

''اچھا بھائی! اب میں تو چلتا ہوں۔''

مہری بھینسوں کا گوبر تسلے میں ڈال رہی تھی اور رحیم اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بڈھے کی آواز سنی تو، اس سے پوچھا:

''سردار جی سے ملنا ہے؟''

بڈھا بھیتر ہی بھیتر سہم گیا۔ دھیرے سے بولا:

''ان سے کوئی کام تو ہے نہیں، کھا پی کر ئیں تھوڑا سو بھی لیا ہوں۔ اب میں جلدی جلدی سے اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔''

رحیم نے کہا:

''بہت اچھا!''

بڈھے نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور بڑے دروازے کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس اونچے دروازے میں باہر کو جا رہا تھا تو رحیم نے مہری سے کہا:

''اس بڈھے اور گھوڑے کی جوڑی اچھی ہے۔''

مہری ابھی جوان تھی، نمکین تھی، ہنس مکھ تھی۔ رحیم اس سے عموماً چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتا تھا۔ مہری اس کی بات سن کر مسکرا دی اور کھنکھناتی آواز میں بولی:

''اب تو تمہاری جوڑی بھی بن جانی چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کوئی گھوڑی لا کر کھونٹے سے باندھ دو۔''

اس پر وہ دونوں ہی خوب ہنسے۔ رحیم بولا:

''اری سلطانہ! میں نے تو مَن میں پکا ارادہ کر لیا ہے کہ عورت لاؤں گا تو تیرے جیسی، ورنہ کنوارا ہی بیٹھا رہوں گا۔''

سلطانہ نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا:

''تم اتنا چلا چلا کر بول رہے ہو...... کہیں سردار جی تمہاری آواز سن کر باہر آئے تو تمہاری منگنی، شادی، بچوں سب ہی کی ایسی کی تیسی کر دیں گے۔''

رحیم نے مسکرا کر اپنے دونوں کانوں کو باری باری چھو لیا۔

کافی دن چڑھ آیا، تو بگا سنگھ طویلے کے باہر آیا۔ اس نے رحیم کو آواز دیتے ہوئے کہا:

''رحیمیا! کل صبح میں شیخوپورے جاؤں گا۔ ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہیں تو غائب نہ ہو جائے۔
منہ اندھیرے ہی میں چل دوں گا۔ ذرا میرے گھوڑے کا ٹھیک سے پر بندھ کر کے رکھنا، تم یہ بھی
جانتے ہو کہ مجھے اور کیا کیا درکار ہوگا۔''

رحیم سے اتنی بات کہہ کر بگا سنگھ طویلے کے پچھواڑے سے ہوتا اور زینہ چڑھ کر چھوٹے دروازے میں سے گھستا ہوا گھر کے صحن میں پہنچ گیا۔ ان دنوں پنجاب کے لگ بھگ سب ہی مکان ایک ہی ڈھنگ سے بنائے جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوتے تھے۔ ان کی ہموار چھتیں بھی ایک دوسرے سے لگی ہوتی تھیں۔ صرف بہت چھوٹی چھوٹی منڈھیروں سے ہر چھت کی حد کا پتہ چلتا تھا۔

اپنی دُھن میں بگا سنگھ لمبے پسار کے بائیں ہاتھ والے دروازے سے بھیتر گھسا۔ اندر والے پسار میں دائیں ہاتھ کو جا کر وہ پچھواڑے والے کمرے میں جا پہنچا۔ اس کوٹھڑی کے ایک کونے میں زمین کو کھود کر ایک گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ جیسے بھیتر سے گوبر وغیرہ سے اچھی طرح لیپ پوت دیا گیا تھا۔ یہ گڑھا گویا بگا سنگھ کا خزانہ تھا۔ اس میں اس نے کافی سونا اور چاندی رَکھ رَکھی تھی۔ گڑھے کا منہ موٹے توے سے ڈھکا ہوا تھا توے کے اوپر بھی لوہے کا اتنا بھاری صندوق رکھا تھا، جسے تین چار آدمی مل کر اپنی جگہ سے سرکا سکتے تھے۔ یہ بگا سنگھ کا ہی بتا تھا کہ وہ صندوق کو ایک طرف سے اُوپر اٹھا کر پاؤں سے اس کے نیچے پتھر کا اُلٹا کنڈا کھسکا دیتا، صندوق اس پر ٹکا رہتا اور وہ گڑھے پر سے توا ہٹا کر مال بیچ میں رکھتا یا نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ پھر صندوق کو اپنے طاقتور ہاتھوں میں تھام کر پاؤں سے پتھر کے کنڈے کو پرے ہٹا دیتا، اور صندوق کو دھیرے دھیرے کچے فرش پر ٹکا دیتا۔ کمرے کے دائیں بائیں دو خوب بڑے بڑے پلنگ پڑے تھے۔ وہ پلنگ سُتلی سے بنے ہوئے تھے وران کے بڑے بڑے پائے رنگ رنگیلے تھے۔

آج بھی بگا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے صندوق کا ایک سرا اوپر اُٹھایا اور پاؤں سے نزدیک پڑا پتھر کا کنڈا اس کے نیچے کھسکا دیا۔ توا ہٹا کر اس نے کچھ پوٹلیاں نکالیں، اور انہیں کھول کھول کر دیکھنے لگا۔

کام ہو چکا تو بگا سنگھ نے دوبارہ صندوق کو گڑھے پر ٹِکا دیا۔ وہ باہر نکلنے کو ہی تھا کہ اسے کی نظر پلنگ پر پڑی۔ اسے تعجب ہوا کہ وہاں کون سویا ہوا تھا۔ جھجو تو ایسے وقت پر سونے کی عادی نہیں تھی۔ اس نے دھیرے سے رضائی کو ہٹایا تو نیچے جسُو سویا دکھائی دیا۔

یہ منظر دیکھ کر بگا سنگھ کا پارہ اوپر کو چڑھ گیا اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے جسُو کا گریبان دبوچا، اور ایک ہی جھٹکے میں اسے پلنگ سے نیچے اُتار دیا۔ جسُو اب بھی سویا ہوا تھا۔ بگا سنگھ بادل کی طرح گرجا:

''اوئے سور کے پتر! یہاں پہنچتے ہی لاٹ صاحب بن گیا۔ ماں یاد یا! تجھے سونے کے لیے اور کوئی
جگہ نہیں ملی؟''

بگا اسے پچھلی کوٹھڑی سے گھسیٹ کر بھیتر والے پسار میں لے آیا اور اس کے گریبان کو پکڑے پکڑے زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

جسُو کی آنکھیں کھل گئیں، لیکن وہ اب بھی سپنوں کے سنسار میں ہی تھا۔ اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ بوکھلایا ہوا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

بگا سنگھ نے منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے کہا:

''حرامی کے پلّے! تیری نیند اس طرح نہیں کھلے گی۔''

بگا سنگھ نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

تھپڑ کھا کر جسُو یوں لڑکھڑاتا ہوا اُڑا، جیسے کپڑے کی گیند گاؤں کے کسی لڑکے کی کھونٹی کی چوٹ سے اُڑ نکلتی ہے۔ پسار کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر کھا کر جسُو اوندھے منہ باہر والے پسار میں گرا۔

بگا سنگھ لپک کر دروازے تک پہنچا...... مگر یک دم رُک گیا۔ بائیں ہاتھ کو جھنجو بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اور داہنے ہاتھ کو کوئی ایک عورت ایک بالشت بھر اونچی پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ جسُو اس عورت کے پیروں کے پاس ہی گرا۔ بگا سنگھ جھنجو کی تو ایسے اوسر پر پرواہ نہیں کرتا تھا، لیکن اس ناواقف عورت کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور اس کا ہوا میں اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

بگا سنگھ کو تھوڑا تعجب ہوا کہ یہ عورت کب سے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اپنے وچاروں میں ہی مگن بائیں ہاتھ کے دروازے سے بھیتر والے پسار میں گھسا تھا۔ ممکن ہے، اسی لیے اس عورت کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔

ان دنوں عورتیں اپنے دوپٹے سدا سر پر اوڑھے رکھا کرتی تھیں، اور عموماً چھوٹا سا گھونگھٹ بھی نکالے رہتی تھیں۔ اسی انداز سے وہ ناواقف عورت وہاں بیٹھی تھی۔ جسُو کو لڑکھڑا کر اپنے قریب گرتے دیکھ کر عورت نے پاؤں پیچھے ہٹا لیے اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر بے اختیار بگا سنگھ کی طرف اُٹھ گئی۔ بگا سنگھ کو گھونگھٹ کی اوٹ میں سے عورت کا آدھا گال، ستواں ناک، چکنی ٹھوڑی اور بھرپور ہونٹ دکھائی دیے، جو اس وقت اَدھ کھلے سے ہو گئے تھے۔ خاص طور پر عورت کی کالی آنکھوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ آنکھیں موٹی تھیں، مگر چہرہ ہلکا پھلکا ہونے کے کارن وہ بہت بڑی ہی لگ رہی تھیں۔ ان چمکتی نشیلی آنکھوں میں کچھ خوف، کچھ تعجب اور شاید کچھ نفرت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ چھوٹے سے لڑکے کو اتنی کٹھورتا سے پٹتے دیکھ کر ہی شاید عورت کی آنکھوں میں بگا سنگھ کے لیے ہلکی سی نفرت اُبھر آئی تھی۔

اُدھر بگا سنگھ بالکل چکت سا رہ گیا...... بلکہ بوکھلا گیا۔ پل بھر کو وہ اس بات کا بھی فیصلہ نہیں کر سکا، کہ وہ آگے بڑھ کر جسُو کو دو چار تھپڑ اور جڑ دے یا پھر کوٹھڑی میں گھس جائے۔ اس نے ان دونوں میں سے کچھ نہیں کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، جس دروازے سے آیا تھا، اسی دروازے سے باہر نکل گیا۔

کالی آنکھوں والی عورت نے ہاتھ بڑھا کر جسُو کو سہارا دینا چاہا لیکن وہ بڑی مستعدی سے اپنے آپ ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ عورت نے جھنجو سے پوچھا:

''وہ آپ کا چھوٹا بھائی تھا؟''

عورت کا اشارہ بگا سنگھ کی طرف تھا۔
بھجن کور ماتھے پر بل ڈال کر بولی:
''ہاں میرا ہی چھوٹا بھائی تھا۔''
عورت نے پھر کہا:
''آپ کے بھائی کا غصہ تو بہت تیز ہے۔''
بھجنو دبے ہوئے لہجے میں بولی:
''غصے کے سوا اس کے پاس کیا رکھا ہے؟ اس کو خاندانی زمین وراثت میں مل گئی ہے مکان یہاں بھی ہے اور چک پیراں میں بھی ہے۔''
''یہ چک پیراں کہاں ہے؟''
''ضلع لائل پور میں...... وہاں یہ کبھی کبھی چلا جاتا ہے۔ ساری زمین پٹے پر دے رکھی ہے۔ وہاں کی آمدنی بٹورنے ہی تو جاتا ہے۔''
''ابھی شادی وادی نہیں ہوئی؟''
اس سماج میں شادی کا چکر بھی بڑے زور سے چلتا تھا۔ شادی نہ ہونا بھاری نااہلیت سمجھی جاتی تھی۔
اس عورت کے سامنے بھجنو اپنے بھائی کی زیادہ نندا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی:
''میرے بھائی کو تو ہر کام کی دُھن سوار ہوا کرتی ہے۔ اب شادی کی سنک سوار ہو گئی تو پھر کوئی عورت ڈھونڈے گا اپنے لیے۔''
عورت نے جسّو کی طرف دیکھ کر پوچھا:
''یہ لڑکا کون ہے بے چارا؟''
''اس بے چارے کو اناتھ ہی سمجھو۔''
عورت نے ذرا خوف زدہ ہو کر پوچھا:
''تو کیا روز ہی اس کی اسی طرح مرمت ہوا کرتی ہے؟''
''آج ہی تو آیا ہے...... ویسے اس میں کچھ شک نہیں کہ تقریباً اس کی مرمت ہوا ہی کرے گی۔''
جسّو اس انداز سے کپڑے جھاڑ رہا تھا کہ وہ عورتیں نہ جانے کس کا ذکر کر رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی سی پگڑی کھل کر اس کی ٹانگوں میں پھنس گئی تھی۔ اس نے پگڑی کا گولہ بنا کر گھٹنوں میں داب لیا اور اپنے ڈھیلے جوڑے کو دوبارہ کس کر باندھنے لگا۔ وہ جیسے بالکل بھول چکا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے اس کی ٹھکائی ہو رہی تھی۔ وہ بھیتر سے پسار میں چلا گیا اور بغیر کچھ اوڑھے اپنے سر کے نیچے پگڑی کے گولے کا تکیہ بنا کر ٹھنڈے فرش پر لیٹا اور سو گیا۔
بگا سنگھ طویلے میں جا کر بھی اس عورت کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ عورت حسین تھی اور اس نے اسے متاثر بھی کیا تھا لیکن ابھی وہ دوسری ہی باتیں سوچ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ عورت ان کے گاؤں کی نہیں تھی،

ورنہ اتنے عرصے میں کبھی تو دکھائی دی ہوتی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی عورت کچھ مختلف نظر آتی تھی۔

بگا سنگھ کو شہر جانا تھا، اس کا سارا دن تیاری میں نکل گیا۔ وہ چاہتا تو اپنی بہن سے جانکاری اسی عورت کے بارے میں حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بڑی بہن سے کسی بھی عورت کے بارے میں بات کرنے میں اسے جھجک ہی رہی تھی۔ ممکن ہے اسے یہ خوف تھا کہ اس طرح اس کی مردانہ شان میں کچھ فرق آجائے گا۔

اس رات جب بگا سنگھ گھر میں کھانا کھانے آیا تو اس کی آنکھیں جسُو کو تلاش کرنے لگیں۔ سردی کے کارن وہ دن کا بھوجن باہر دھوپ میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور رات کا کھانا بھیتر یا باہر والے پسار میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اس وقت بگا بھیتر کے پسار میں تھا۔ اس نے بہن سے پوچھا:

''جسُو کہاں ہے؟''

بہن اُتر دینے بھی نہ پائی تھی کہ نہ جانے کس اندھیرے کونے میں سے نکل کر جسُو بگا سنگھ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا وہی انداز تھا...... جیسے دھرتی میں موٹا مضبوط کھونٹا گڑا ہو۔

بگا سنگھ نے نوالہ چباتے ہوئے جسُو کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چوڑے چوڑے نتھنوں میں سے پہلے تو غرّ ائی کی آواز نکلی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولا:

''یہ بھان چھودلونڈا بھی بڑا عجیب سا ہے...... بل بتورا کہیں کا۔''

جہاں تک جسُو کا سمبندھ تھا، اس کے چہرے پر نہ کوئی علامت اُبھرتی تھی، نہ کوئی رنگ آتا تھا اور نہ کوئی رنگ جاتا تھا۔

بگا سنگھ نے دھمکی بھری آواز میں کہا:

''جسُو! یہ نہ سمجھنا کہ یہاں تمہیں حرام کی روٹیاں توڑنے کو ملیں گی۔''

جسُو نے جلدی سے اُتر دیا:

''اچھا چاچا!''

بگا سنگھ کو جسُو کا اتنی حاضر دماغی سے بولنا بھی اچھا نہیں لگا۔ بگا سنگھ نے پھر کہا:

''چاہے تم میرے بھتیجے ہی کیوں نہ ہو لیکن تمہیں یہاں پر گدھے کی طرح کام کرنا ہوگا۔''

''ہاں چاچا!''

جسُو کی آواز میں شرافت اور خوف کا نام تک نہیں تھا۔ اس کے بولنے کے انداز میں عجیب سی ہٹ دھرمی اور اکھڑ پن تھا۔

''یہاں حویلی رام کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ بھجو! میں سوچتا ہوں کہ اب حویلی رام کا کام جسُو سنبھال لے۔ حویلی رام کھیتوں پر جایا کرے گا یا باہر کا کام کیا کرے گا۔''

بھجو نے کوئی اُتر نہیں دیا، تو بگا سنگھ نے لڑکے طرف دیکھ کر کہا:

''سمجھے؟''

''ہاں چاچا!''
اس رات بگا سنگھ جلدی ہی سو گیا تا کہ صبح سویرے اُٹھ کر شہر کو جا سکے۔
گھر میں سب سے پہلے جھنو جاگا کرتی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ تین بھوری بھینسوں کا دودھ جما کر ستاروں کی چھاؤں میں دہی بلویا کرتی تھی۔ جب اس نے بڑے مٹکے میں بھاری متھنی ڈال کر دہی بلونا شروع کیا تو اس کے شور سے بگا سنگھ جاگ پڑا۔ سب تیاریاں پچھلی شام کو ہی چکی تھیں۔ وہ نگر میں چاندی سونے کے لین دین کا کام بھی کرتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ ضرورت پڑنے پر اس کے پاس زیور رکھ کر قرضہ لے جایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے، جو قرضہ لوٹا کر زیور چھڑا نہیں پاتے تھے۔ اس طرح کا سونا چاندی وہ شہر میں بیچ آتا تھا۔

ان کے گاؤں سے شیخوپورہ ستائیس میل کی دوری پر تھا۔ زیادہ تر لوگ لاری میں بیٹھ کر آنے جانے لگے تھے۔ پہلے گاؤں سے ڈھائی تین میل چل کر پکی سڑک پر پہنچنا پڑتا تھا۔ سڑک کے کنارے کسی درخت کی چھایا میں بیٹھ کر لاری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لاری آنے پر بھی کبھی جگہ ملتی اور کبھی نہ ملتی۔ بگا سنگھ کو لاری کا سفر اور یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا شہر پہنچ جاتا۔ آج کل کی طرح شہروں میں بسوں اور کاروں کی بھرمار نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بازاروں میں بھی گھوم لیا کرتا تھا۔
جھنو نے دہی بلونے کے بعد جلدی سے کچھ بڑے بڑے پراٹھے تیار کیے۔ جتنی دیر میں بگا سنگھ نے دہی مکھن لسی اور پراٹھوں کا ناشتہ کیا، اتنی دیر میں رحیم نے گھوڑے پر کاٹھی کس کر اسے تیار کر دیا۔ بگا سنگھ کو ایسے سفر سدا بڑے سہانے لگتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دھیمی دھیمی رفتار سے چلا۔ گرمیوں کے زمانے میں جلدی کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ دُھوپ چڑھ آنے پر پسینے کے مارے گھوڑے اور گھوڑ سوار دونوں کی بُری حالت ہو جاتی تھی۔ سردیوں کے زمانے میں اس بات کی کوئی چنتا ہی نہیں۔
بگا سنگھ گاؤں سے نکلا تو زیادہ تر لوگ کھیتوں میں جا رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جو نہا دھو کر گوردوارے پہنچ چکے تھے۔ کسی زمانے میں ہر ایک گاؤں کی طرح ان کا گاؤں بھی حفاظت کے نظریہ سے چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ اب وہ چار دیواری لگ بھگ ٹوٹ چکی تھی، کہیں کہیں اس کے کچھ حصے دکھائی دیتے تھے۔ ان موٹی اونچی دیواروں کے اوپر لگے ہوئے کانچ کے نوکدار ٹکڑے ستاروں کے مَند پرکاش میں ہلکی ہلکی جھلک دکھا رہے تھے۔
جب بگا سنگھ گوردوارے کے نزدیک پہنچا، تو اس نے گھوڑے سے اُتر کر اسے قریبی درخت سے باندھ دیا۔ وہ گوردوارے میں گھسا، گورو گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹیکا اور اُلٹے پاؤں لوٹ آیا۔
ایک بار پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ علاقے بھر میں بگا سنگھ کا گھوڑا اہمہ گیر تھا اور وہ خود بے مثال گھوڑ سوار تھا۔ اس کے گھوڑ سواری کے انداز سے لوگ دُور سے پہچان لیتے کہ یہ بگا سنگھ جا رہا ہے۔ یعنی چوڑے اور کچے راستے۔ ایسے راستوں پر گھوڑا تیز سے تیز رفتار سے دوڑ سکتا تھا۔ دراصل یہ پہیے گھوڑے کے لیے پکی سڑک سے اچھے رہتے تھے۔ پکّی سڑک پر گھوڑے کی نعلوں کے رَپٹ جانے

کا ڈر رہتا تھا۔

راستے میں بگا سنگھ نے صرف ایک بار آٹھ دس منٹ تک دم لیا۔ اگر چہ اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے گھوڑے سے بہت پریم تھا، اور وہ بغیر کارن گھوڑے کو لگا تار دوڑانا نہیں چاہتا تھا۔ شہر میں جا کر وہ ایک طرح سے چھٹی منا لیتا تھا۔ آج کل کے شہروں اور اس زمانے کے شہروں میں بڑا فرق تھا۔ اس زمانے کے شہروں کو عام گاؤں سے بیس پچیس گنا بڑا گاؤں کہہ سکتے تھے۔ نہ سینما، نہ لاؤڈ سپیکر، نہ آئس کریم، نہ ریسٹورنٹ، نہ بسیں، نہ کاریں۔ شہر والوں کے کپڑے بھی گاؤں والوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے تھے۔

بگا سنگھ نے جلد ہی اپنا کام ختم کر لیا۔ اس نے ایک ڈھابے میں گوشت اور روٹی کھائے۔ اسے کھروڑوں (پائے) کا سالن بہت پسند تھا۔ بکرے کے ٹخنوں کو، کھروڑے کہا جاتا تھا۔ انہیں کو کاٹ چھانٹ کر شوربے دار سالن تیار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ چیز گھٹیا مانی جاتی تھی اور شوقین طبیعت کے لوگ یہ سالن نہیں کھاتے تھے، لیکن بگا سنگھ کھروڑوں پر جان دیتا تھا۔

سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد تیسرے پہر بگا سنگھ واپس لوٹ پڑا۔ اَب تک اس کے دماغ میں بار بار اس عورت کا خیال آ چکا تھا، جسے اس نے اپنے گھر پر دیکھا تھا۔ عورت کا انداز ہی ایسا تھا کہ یہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس سے آگے کے معاملہ ذرا کٹھن تھا۔ وہ ٔجھجو سے پوچھ تاچھ کرنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سوائے ٔجھجو کے کوئی اس عورت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ عورت کو بھلا دینا ہی بہتر ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کو پوچھ تاچھ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اسے دُور سے گاؤں کی رُوپ ریکھا دکھائی دینے لگی۔ خاص کر ٹوٹی پھوٹی چار دیواری پر لگے ہوئے کانچ کے ٹکڑے دھوپ میں خوب چمک رہے تھے۔ جب وہ نہر کے نزدیک پہنچا، تو اس نے سوچا کہ دوپہر کو تیز دھوپ میں دوڑنے کے کارن گھوڑے کو پھر سے پیاس لگ گئی ہوگی اس لیے اسے نہر پر پانی پلا دینا چاہیے۔

وہ گھوڑے پر سے اُترا اور اس کی لگام پکڑ کر نہر کی طرف بڑھا۔ اب اس نے دیکھا کہ پٹری سے نیچے نہر کے بالکل کنارے پر کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ دن میں کپڑے دھونے کے لیے آئی تھیں۔ انہوں نے گھاس پر پھیلے دُھلے کپڑوں کو سمیٹ لیا اور اپنی اپنی گٹھڑی تیار کر لی تھی۔ واپس لوٹنے سے پہلے وہ پاؤں دھو رہی تھیں۔

یہ کہنا کٹھن ہے کہ بگا سنگھ سچ مُچ گھوڑے کو پانی پلانے آیا تھا یا وہاں بیٹھی عورتوں کو دیکھ کر نہر کنارے جا پہنچا۔ اس بات کا فیصلہ وہ خود بھی نہ کر سکا۔

جب گھوڑا پانی پی رہا تھا، تو یکا یک ہی بگا سنگھ چونک پڑا۔ پرلے کنارے پر بیٹھی عورت اینٹ کے ٹکڑے سے اپنی ایڑیاں رگڑ رہی تھی جب بگا سنگھ کی نظر اس پر پڑی، تو اس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ عورت وہی تھی، جسے اُس نے پچھلے دن اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ عین اسی وقت عورت کی نظر بگا سنگھ پر پڑی، اور اس نے فوراً گھونگٹ کھینچ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اگر وہ عورت اس طرح چونک کر منہ پھیرنے کی بجائے عام ڈھنگ سے بیٹھی رہتی تو ممکن تھا کہ بگا سنگھ کے من میں اتنی ہلچل پیدا نہ ہوتی۔ عورت کی حرکت اور صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچان گئی تھی...... پہچان جانے کے اس وچار نے ہی بگے کے من میں ہلچل مچادی تھی۔

پانی سے پیٹ بھر لینے کے بعد گھوڑے نے منہ کھینچ لیا۔ بگا سنگھ کو اپنی دُھن میں کافی دیر تک اس بات کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر وہ چونکا گھوڑے کو لے کر پٹڑی سے دوسری طرف کو اُتر گیا اور اس پر سوار ہو کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

بگا سنگھ نے نہ تو گھوڑے کو ایڑی دی اور نہ لگام کھینچ کر گھوڑے کو کوئی خاص اشارہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا موج میں ٹاپیں بھرتا ہوا دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف بڑھتا گیا اور بگا سنگھ بالکل کھویا سا ڈھیلے ڈھالے انداز سے اس کی پیٹھ پر بیٹھا رہا۔ دیواروں، مکانوں، پیڑوں وغیرہ کی چھایا بہت لمبی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں کتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔

طویلے میں پہنچا، تو رحیم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ ان کے احاطے کی نیچی سی دیوار کے اس پار رحمت اللہ کی چکی چل رہی تھی۔ چکی کو چلانے کے لیے ایک سانڈنی جُتی ہوئی تھی، جو گردن اوپر اُٹھائے اور ہونٹ نیچے کو لٹکائے اپنے چوڑے چوڑے گدے دار پاؤں دھرتی پر مارتی ہوئی چکر کاٹ رہی تھی۔ چکی کے بھاری بھرکم پاٹ گرڑ گرڑ کا شور مچاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ جس بات نے بگے کا دھیان اُدھر کو کھینچا، وہ یہ تھی کہ جسّو ہاتھ میں کپاس کی چھڑی لیے سانڈنی کو ہانکتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بگا تلملا اُٹھا۔ اس نے زور سے آواز دی:

''جسّو! اوئے جسّو!''

جسّے نے مُڑ کر چاچا کو دیکھا تو چھڑی وہیں پھینک کر ادھر کو بھاگا۔ ایک ہی چھلانگ میں نیچی دیوار کو پھلانگ کر وہ اپنے احاطے میں آ گیا۔

بگے نے آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے پوچھا:

''تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ نہیں چاچا''

''کیا رحمت اللہ نے تمہیں اپنے یہاں نوکر رکھ لیا ہے؟''

''نہیں چاچا!''

''تو پھر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''یوں ہی چاچا۔''

''یوں ہی کے بچے...... ایک دن میں یوں ہی اتنے زور کی لات تیرے چوتڑ پر لگاؤں گا کہ تو اُڑ کر اسی گاؤں میں جا گرے گا جہاں سے آیا تھا۔''

یہ کہہ کر بگا اسے یوں اسے گھورنے لگا، جیسے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔ جسُو نے بھی محسوس کیا کہ چاچا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے اپنی اس حرکت کا کارن بھی بتانا پڑے گا۔ وہ بولا:

''میں تو بُوا کے پاس بیٹھا تھا۔ پھر اس کے پاس وہی عورت آ گئی...... میں رحمت اللہ کی چکی کی طرف پھاند گیا۔''

بگے نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا:

''وہی عورت؟ یہ وہی عورت کون ہے؟''

''وہی کل والی عورت۔''

ممکن ہے، جسُو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اسی عورت کے کارن وہ زیادہ مار کھانے سے بچ گیا تھا۔ ادھر بگا سنگھ سوچنے لگا کہ اس عورت کو تو وہ نہر پر چھوڑ کر آیا تھا، وہ اس سے پہلے گاؤں کیسے پہنچ گئی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ بہت ہی دھیمی رفتار سے لوٹا تھا۔ راستے میں دو ایک جگہ گھوڑا رُک بھی گیا۔ کھوئے کھوئے سے ڈھنگ سے اس نے دو ایک آدمیوں سے بات بھی کی تھی، اس لیے اسے دیر ہو گئی۔

جسُو پھر بولا:

''اس نے تسلے میں دُھلے ہوئے کپڑے رکھ رکھے تھے......''

بگا سنگھ نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا:

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آئندہ میں تمہیں آوارہ گردی کرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر فالتو وقت ہو تو گھر کا کوئی کام کیا کرو۔''

بگا سنگھ کچھ اضطراب سے گھر کی طرف بڑھا۔ زینے سے چڑھ کر صحن میں پہنچا، تو دیکھا کہ جھجو باہر کے پسار میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شاید وہ عورت جا چکی تھی۔ ایک بار تو بگا سنگھ بھیتر میں گھس گیا اور کچھ ہی پلوں کے بعد باہر آ کر بولا:

''جھجو! وہ عورت کون ہے؟''

''کون عورت؟''

''جو یہاں آئی تھی۔''

''یہاں تو سارا دن عورتیں آتی ہی رہتی ہیں، تم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟''

بات چیت کے دوران جھجو کی نگاہ جسُو پر پڑی، جو عجیب سی شکل بنائے چاچا کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ جھجو بھانپ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

بگا سنگھ نے ذرا جھجک کر کہا:

''میرا مطلب اس عورت سے ہے، جو کل بھی یہاں بیٹھی تھی، جب میں جسُو کو ڈانٹ رہا تھا، تو......''

''اوہ! تمہارا اس عورت سے مطلب ہے؟''

''ہاں......لوٹتے وقت میں نے اسے نہر کے کنارے پر بھی دیکھا تھا وہ وہاں دوسری عورتوں کے ساتھ کپڑے دھونے گئی ہوگی۔ جسّو نے بتایا کہ اب بھی تو کچھ دیر پہلے وہ تمہارے پاس بیٹھی تھی۔''

ٹھجو نے پھر ایک اُچٹتی ہوئی نظر جسّو پر ڈالی، اور بولی:

''اچھا! وہ عورت......میں سمجھ گئی۔''

''وہ ہمارے گاؤں کی تو نہیں ہے۔ مَیں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''نہیں وہ ہمارے گاؤں کی نہیں ہے، وہ ہندوستان° کی رہنے والی ہے۔ کچھ ہی دن پہلے یہاں آئی تھی......''

اب بگا سنگھ کو یکا یک محسوس ہوا کہ اس عورت میں اتنی زیادہ دلچسپی دکھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ بے پروائی سے بولا:

''ٹھیک ہے......میں سمجھا نہ جانے کون ہے۔''

بگا سنگھ صحن میں سے گزرتا ہوا طویلے کی طرف اُتر گیا۔ فی الحال اس نے عورت کے بارے میں اتنا کافی سمجھا......باقی باتیں کسی اور وقت بھی ہو سکتی تھیں۔

بگا سنگھ کے چلے جانے کے بعد ٹھجو نے معنی خیز نظروں سے جسّو کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''کیوں رے چھوکرے، تُو نے اپنے چاچا سے یہ کیوں کہا کہ ابھی ابھی وہ عورت یہاں بیٹھی تھی۔ اگر مَیں بتا دیتی کہ اس وقت وہ یہاں نہیں آئی تھی تو جانتے ہو تمہاری کیا دُرگت بنتی؟''

جسّو نے صرف اپنے کندھوں کو ہلا دیا اور بغیر کچھ کہے ہی وہ دھیرے دھیرے طویلے کی طرف چلا گیا۔

۳

لالہ بالمکند عمر بھر سرکاری نوکری کرتے رہے۔ پہلے کلرک رہے اور نوکری کے ختم ہوتے ہوتے ہیڈ کلرک بن گئے۔ جب تک شہر میں تھے، بڑے پائینچوں والی بہت کھلی کھلی پینٹ پہنا کرتے تھے، گاؤں میں آ کر ٹِک گئے، تو لنگی پہننے لگے۔ ان کی مونچھیں اور سر کے بال دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح لال دکھائی دیتے تھے، کیونکہ وہ اِنہیں مہندی سے رنگا کرتے تھے۔ مونچھیں بہت بڑی بڑی گھنی اور نیچے کو گری رہتی تھیں۔ سدا سے بدہضمی کا شکار رہے۔ آنکھوں میں پیلا پن نظر آتا تھا، جیسے وہ یرقان کے روگی ہوں۔ انہیں اپنے ہیڈ کلرک ہونے پر بڑا فخر تھا۔ لوگ انہیں سدا لالہ بالمکند ہیڈ کلرک کہا کرتے تھے۔ عموماً انہیں ہیڈ کلرک صاحب کہہ کر ہی مخاطب کیا جاتا تھا۔

° پنجاب کے باہر کے علاقے کو اس زمانے میں ہندوستان کہا جاتا تھا۔

نوکری ختم ہو جانے پر جب وہ گاؤں میں پہنچے تو انہیں اپنا وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ کہاں تو وہ صبح سے فائیلوں میں ناک گھسیڑتے اور شام کو ہی سر اوپر اُٹھاتے، اور کہاں اب ایک تنکا تک دوہرا کرنے کا کام بھی نہیں رہ گیا تھا۔ گھر والوں کو بھی پہلے پہل ان کے گھر آ جانے پر بڑی خوشی ہوئی۔ بزرگوں کی چھتر چھایا بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان کا چاؤ ختم ہو گیا، کیونکہ لالہ جی نے سب کا کھانا، پہننا، ہنسنا، بولنا حرام کر دیا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کی ٹیکا ٹپنی کرتے رہتے تھے گھر کے ہر ایک فرد کی ناک میں دم آ گیا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ لالہ جی کو دن بھر کوئی کام نہیں کرنا ہوتا تھا۔ صبح ہوتے ہی موسم کے مطابق گھر کے صحن یا پسار میں چار پائی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ حقہ تازہ کر کے اس کی نلی دانتوں میں دبا لیتے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ان کی نگاہ ہر بچے ہر بیٹی بیٹے اور ہر بہو پر پڑتی رہتی تھی۔ ٹوکنے سے وہ باز نہیں آتے تھے۔ سب کا دم پھولا رہتا تھا۔ مَن ہی مَن میں وہ لالہ جی کو کوستے اور سوچتے کہ اگر وہ نوکری سے ریٹائر نہ ہوتے، تو اچھا ہوتا، نوکری کے دوران وہ مہینے میں ایک آدھ بار گھر آتے، تو کسی کو نہ کھلتا۔

گھر والوں کی پراتھنا بھگوان نے سُن لی۔ گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھوں نے لالہ جی سے کہا کہ آپ کیوں سارا دن عورتوں کی طرح گھر میں گھسے رہتے ہیں، باہر نکل کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا کیجیے۔

پہلے پہل تو لالہ جی کتراتے رہے۔ آخر اَن پڑھ اَن، اور بے ڈھب دیہاتیوں سے ان کی کیا بات چیت ہو سکتی تھی؟ لیکن جب انہوں نے بیٹھک سازی شروع کر دی تو انہیں بڑا مزہ آنے لگا۔ گھر میں وہ صرف گنتی کے لوگوں کی ہی نکتہ چینی کر سکتے، لیکن گھر سے باہر تو میدان بہت ہی وسیع تھا۔ ان کی وہی حالت ہوئی جیسے کنوئیں کا مینڈک بہت بڑی ندی میں پہنچ گیا ہو۔ صرف یہی نہیں ندی میں پہنچ کر اسی مینڈک نے مگر مچھ کا روپ دھار لیا۔ ٹیکا ٹپنی تو ان کی ہڈیوں میں رَچ گئی تھی۔ لوگ تو ان کی لچھے دار باتوں پر فدا تھے، اور انہیں سنکی سمجھ کر ان کی ٹیکا ٹپنی کی چنتا نہیں کرتے تھے۔ کچھ بڑے بوڑھے انہیں سنکی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یہ محسوس کرتے تھے، کہ وہ گہری باتیں کرتے ہیں اور دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔

بہر حال حقیقت جو بھی ہو، کم سے کم لالہ جی اب اپنے آپ کو بیکار نہیں محسوس کرتے تھے۔ صبح ناشتہ کرتے ہی گھر سے نکل جاتے۔ بھتے وقت یعنی لنچ ٹائم پر بھوجن کرتے۔ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے کچھ دیر سو بھی جاتے۔ پھر گھر سے نکل پڑتے۔ شطرنج یا چوپڑ کھیلتے۔ دن ڈھلے لوٹتے۔ رات کے بھوجن سے پہلے اور بعد میں گھر والوں کی تھوڑی نکتہ چینی کرتے اور پھر بستر پر لیٹ کر خراٹے بھرنے لگتے۔

آج بھی لالہ جی نے لنگی پر سلک کا کرتہ پہنا، کُلّے دار پگڑی باندھی، اور چار پائی پر بیٹھ کر پراٹھے، مکھن اور لسی کا ناشتہ کیا۔ پھر ایک ہاتھ سے چھڑی تھامی، دوسرے ہاتھ سے انگوچھے کا کونا پکڑا اور لال لال مونچھوں پر سے لسی صاف کرتے ہوئے چل دیئے۔ ان کے گھر سے نکلتے ہی ہر ایک فرد کا من خوشی سے ناچ اُٹھتا۔ بہوئیں گھونگھٹ اُٹھا دیتیں، بچے قلا بازیاں کھانے لگتے، لڑکیاں ٹھمکنے لگتیں۔

ہری پورہ کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ یہاں پر بگا سنگھ رہتا تھا اور یہاں پر لالہ بالمکند ہیڈ کلرک رہتے تھے۔

ہری پورہ کا گوردوارہ بھی تاریخی ہونے کی وجہ سے دُور دُور تک مشہور تھا۔ لالہ جی ایک خاص انداز سے کھانستے کھنکھارتے بھاگ مل کر دوکان پر پہنچے۔ اس کی پنساری کی دکان گاؤں کے بیچوں بیچ تھی۔ دکان کے سامنے گوبر مٹی سے لپا ہوا خوب بڑا سا چبوترہ تھا۔ یہ اصل میں گاؤں کا بڑا چوراہا تھا۔ گاؤں میں اِدھر اُدھر کو جانے والے ہر ایک فرد کو اس چوراہے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ بزرگ لوگ چبوترے پر دو تین کھیس بچھائے اطمینان سے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے چوہدری لالہ بالمکند ہی تھے۔

جب لالہ جی بھاگ مل کر دکان کے قریب پہنچے تو کچھ لوگ پہلے سے ہی ان کے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ انہیں دیکھتے ہی انکا سواگت کیا: ''آؤ جی! ہیڈ کلرک صاحب!''

لالہ جی کی باچھیں کھل گئیں، وہ پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ مانڈ لگی پگڑی کے دو شملے ایک نیچے کو لٹکا ہوا اور دوسرا ہوا میں اُٹھا ہوا، اپنی الگ ہی بہار دکھا رہے تھے۔ تازہ کیا ہوا حقہ پہلے سے موجود تھا۔ لالہ جی بیٹھے تو حقے کا رُخ ان کی طرف کر دیا گیا۔ لالہ جی نے حقے کو چلم کے نیچے سے تھاما اور پھر حقے کی نلی کا سرا ان کی گھنی لال مونچھوں کے نیچے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر تک ان کی مونچھوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہوئے یوں لگ رہے تھے، جیسے مونچھوں میں سے بھاپ اوپر کو اُڑ رہی ہو۔

لالہ جی زیادہ تر اپنے دفتر کے زمانے کے قصے سنایا کرتے تھے۔ سنانے کے قابل کئی چھوٹے بڑے واقعات گزر چکے تھے، جن میں وہ مرچ مصالحہ بھی لگا دیتے تھے۔ ان واقعات کا سٹاک ختم ہو گیا، تو بھی ان کے ساتھ ان سے کہتے کہ لالہ جی ہمیں فلاں بات پھر سے سنایئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی شاعر سے اس کی پرانی نظموں میں سے کسی ایک کو پھر سے سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔

بھاگ مل میں بھی اس محفل میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ وہاں کی دکانداری بھی بس ایسے ہی چکر چوں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ کبھی پیسے دو پیسے کا گاہک آ جاتا، تو بھاگ مل کو اُٹھ کر بھیتر جانا پڑتا ورنہ وہ وہیں بیٹھا رہتا۔

باہمی باتیں، تو ہوتی ہی رہتی تھیں، لیکن ان بڑے بوڑھوں کا ایک شغل اور بھی تھا، یعنی چوراہے سے گزرنے والے کسی بھی فرد کی طرف متوجہ ہو جاتے، تو اسی کے بارے میں غور و فکر ہونے لگتا۔ لالہ بالمکند تو اور بھی دھڑلے کے آدمی تھے۔ انہیں گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت آبرو کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ گاؤں کی کسی بھی بہو بیٹی کو ٹوکے بنا نہ رہتے تھے۔ ان کا وچار تھا کہ کھوسٹ بوڑھیوں کے سوا گاؤں کی ہر ایک عورت اور لڑکی کو گھونگھٹ نکال کر چلنا چاہیے۔ سر پر دوپٹہ اوڑھے رہنے کی روایت تو تھی ہی، لیکن گھونگھٹ پر لالہ جی ہی زیادہ بل دیتے تھے۔ بھاگ مل کا چوراہا اس بات کے لیے مشہور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی بھی عورت گھونگھٹ نکالے بغیر اُدھر سے گزر جاتی تو لالہ بالمکند ہیڈ کلرک اپنی گرجدار آواز میں اسے وہیں ٹوک دیتے۔ اپنے ساتھیوں سے اس بات کا پتا لگا کر کہ وہ کس گھر کی بہو بیٹی تھی، وہ کسی نہ کسی موقع پر اس کے مکان پر بھی پہنچ جاتے۔ بہو بیٹیوں میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا جس عورت کو بھاگ مل کے چوراہے سے گزرنا ہوتا تھا، وہ اپنے جسم کو اچھی طرح دوپٹے میں لپیٹ لیتی، اور لمبا سا گھونگھٹ نکال لیتی۔ یہ الگ بات تھی، کہ چوراہا پار کرتے ہی وہ گھونگھٹ اُٹھا دیتی اور مسکراتی ہوئی اپنے راستے پر چلی جاتی۔

اب محفل گرم ہونے کو ہی تھی کہ شامت کی ماری ایک عورت ادھر سے گزری۔ گیہوں رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی اس نوجوان عورت کے جوبن پر ایسی قیامت کی بہار آئی تھی کہ کچھ دیر تک تو لالہ جی اور ان کے ساتھی اس کی جھلک دیکھ کر بالکل چکت سے رہ گئے۔ گھونگھٹ کی تو بات ہی چھوڑیے، عورت کے سر کا دوپٹہ بھی پیچھے کو کھسک کر اس کے جوڑے میں لگے کلپ پر پھنسا تھا۔ لالہ جی نے بار بار اپنی پیلی پیلی آنکھیں جھپکائیں، نہ جانے کتنے وقت بعد وہ ایسی عورت کو دیکھ رہے تھے، جس نے اتنی جرأت کی کہ چھوٹا سا گھونگھٹ بھی نہیں نکالا۔

اس کے پہلے کہ لالہ جی سنبھل سکیں اور عورت کو ٹوک سکیں، وہ چوراہے سے گزر کر گلی میں گھس چکی تھی۔ لالہ جی کے من کی بات من میں ہی رہ گئی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کے ساتھیوں کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ لالہ جی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا: ''یہ کون عورت ہے؟ کس گھر کی ہے؟''

اس عورت کے وہاں سے گزرتے وقت کچھ ادھر ادھر کے منچلے بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھے والے چبوترے کے قریب آ کر بولا: ''لالہ جی! آپ اسے عورت کہتے ہیں یہ تو پٹاخہ ہے۔''

لالہ جی کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے بولے:

''گھر کی بہو بیٹیوں کو پٹاخہ کہنا بڑی شرم کی بات ہے۔''

وہ آدمی پھر بولا: ''یہ کسی گھر کی بہو بیٹی نہیں ہے۔''

ایک اور آدمی قریب آ کر بولا:

''لالہ جی ٹھیک کہتے ہیں۔ مانا کہ یہ عورت اس گاؤں کی بہو بیٹی نہیں ہے لیکن کہیں نہ کہیں کی بہو بیٹی ہو گی ہی۔ کیا ہمیں باہر والوں سے اس طرح کا برتاؤ کرنا شوبھا دیتا ہے؟''

پہلا آدمی کہنے لگا:

''اس عورت میں بہو بیٹیوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔''

دوسرے آدمی نے گرم ہو کر کہا:

''وہ گھونگھٹ نکال کر نہیں چلتی، اس لیے تم ایسی بات کہہ رہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ جو عورت گھونگھٹ نکال نہ چلے، وہ فاحشہ ہوتی ہے۔''

لالہ جی نے جھگڑا بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا:

''تم دونوں نے آپس میں خواہ مخواہ جھگڑا شروع کر دیا۔ آخر اصلی بات کیا ہے؟''

دوسرے آدمی نے جواب دیا:

''لالہ جی! وہ عورت ہندوستان سے آئی ہے، اور وہ ہمارے رسم و رواج نہیں جانتی۔ اگر اسے کوئی سمجھائے تو وہ ضرور ہی مان جائے گی۔''

''مگر یہ ہے کون؟'' لالہ جی نے پوچھا۔

''اس بارے میں مَیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ پیپل والی گلی کے نکڑ پر رہتی ہے۔''

''اکیلی؟''

''نہیں، اس کے ساتھ سولہ سترہ برس کا لڑکا بھی ہے۔''

''وہ اس کا بیٹا تو نہیں ہو سکتا کیونکہ خود عورت کی عمر بہت کم ہے۔''

''بیٹا تو نہیں ہے لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔''

لالہ جی کچھ متفکر ہو کر بولے:

''تو کیا گاؤں میں اسے کوئی نہیں جانتا؟''

وہی آدمی بولا:

''میرے خیال میں چنن سنگھ آپ کو اس کے بارے میں پوری جانکاری دے سکتا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اس عورت کو اس نے ہی رہنے کے لیے جگہ دی ہے۔ چنن سنگھ پہلے اسی مکان میں رہتا تھا۔ پچھلے مہینے جب چنن سنگھ کا نیا مکان بن کر تیار ہو گیا تو وہ بڑے مکان میں چلا گیا۔ پرانا چھوٹا سا مکان خالی پڑا تھا، جو اس نے اس عورت کو دے دیا۔''

لالہ جی کو تو گاؤں کے لوگوں کی بہت زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ وہ یہیں کے رہنے والے تھے، لیکن زندگی بھر باہر نوکری کرتے رہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ چنن سنگھ کوئی اچھا آدمی نہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا:

''یہ چنن سنگھ کون ہے؟''

''اجی اسے کئی بار آپ نے چلتے پھرتے دیکھا ہو گا اکثر بادامی رنگ کا تہمد باندھے اِدھر اُدھر مٹر گشتی کرتا رہتا ہے۔ یہاں کے بگا سنگھ کا رشتے دار ہے مگر ان کی آپس میں بہت لگتی ہے۔ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور ہر وقت کوئی نہ کوئی جھگڑا چلتا رہتا ہے۔''

لالہ جی اب شہری آدمی ہو چکے تھے۔ وہ گاؤں کی پالیٹکس (سیاست) کو بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ انجانے ہی وہ گاؤں کی بہو بیٹیاں کے رکھوالے بن بیٹھے تھے۔ اس لیے ان کے من میں بے چینی سی ہونے لگی کہ آخر یہ عورت ہے کون اور چنن سنگھ اسے یہاں کیوں لے آیا تھا؟

گاؤں میں گنتی کے تو مکان تھے۔ اچھی اینٹوں اور گارے گوبر کا نیا مکان انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ اب پتا چلا کہ اس میں چنن سنگھ رہتا تھا۔

اس دن کی محفل برخواست ہوئی، تو لالہ جی گھر لوٹے اور بھوجن کر کے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ان کی آنکھوں کے آگے اس عورت کی شکل اب بھی گھوم رہی تھی۔ نہ جانے بے چاری کون پردیسن تھی، کہاں سے اور کیوں آئی تھی؟

آخر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ شام کو گھر سے نکل کر سیدھے چنن سنگھ کے پاس جائیں گے اور پوری

جانکاری پراپت کریں گے۔

تھوڑی دیر اونگھنے کے بعد لالہ جی جاگے، منہ ہاتھ دھویا، پھولی ہوئی لٹھے کی شلوار پہنی، سر پر بندھی بندھائی کُلے دار پگڑی ٹکائی اور ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی لے کر چنن سنگھ کے گھر کو چل دیے۔

نئے مکان کے بڑے دروازے کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے چبوترے تھے، جن پر مشکل سے ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ جب لالہ جی مکان کے سامنے پہنچے، تو چنن سنگھ اپنے تہمد میں ہاتھ ڈال کر خُصیے کھجارہا تھا۔ لالہ جی کو دیکھا تو ہاتھ کو تہمد سے باہر نکالے بغیر ہی میلے میلے دانت دکھاتے ہوئے بولا:

''آؤ جی، ہیڈ کلرک صاحب!''

چنن سنگھ کی شکل تو لالہ جی کو مایوس کُن لگی لیکن اُنہیں اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ چنن سنگھ نے اُنہیں ہیڈ کلرک صاحب کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مسکرا کر بولے:

''تو کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟''

چنن سنگھ کی کھیسیں نکل آئیں، کہنے لگا:

''بھلا ہیڈ کلرک صاحب کو کون نہیں جانتا۔''

یہ کہہ کر چنن سنگھ چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ لالہ جی بولے:

''میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔''

چنن سنگھ نے بڑے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''آیئے، پدھاریے!...... یہ تو چیونٹی کے گھر بھگوان کے آنے والی بات ہوئی۔''

چنن سنگھ لالہ جی کو ڈیوڑھی میں لے آیا اور بڑی سی چارپائی پر ان کے بیٹھنے کے لیے اُجلا دھاری دار کھیس بچھا دیا۔ لالہ جی بیٹھ گئے۔ پہلے بھی کئی بار وہ چنن سنگھ کو آتے جاتے دیکھ چکے تھے لیکن آج انہوں نے اس پر بڑی گہری نگاہ ڈالی۔ اس کی عمر اڑتیس چالیس کے لگ بھگ تھی۔ سر دار اور ڈاڑھی کے بالوں میں کچھ سفیدی بھی نظر آنے لگی تھی۔ اپنی شکل اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے وہ غنڈہ لگتا تھا، لیکن لالہ جی کو اس کے بولنے کا ڈھنگ اچھا لگا۔ انہوں نے سوچا کہ اس شخص سے قاعدے کی بات چیت کی جا سکتی ہے۔

پہلے تو وہ یوں ہی اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے، لیکن چنن سنگھ کو ان کی شکل سے لگتا تھا کہ لالہ جی کسی خاص مقصد سے آئے تھے۔ لالہ جی بھی اصل موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ وہ صرف یہی سوچ رہے تھے، کہ اس عورت کے بارے میں بات چیت کیسے شروع کی جائے۔ آخر انہوں نے بزرگانہ انداز سے مسکراتے ہوئے صبح والا واقعہ کہہ سنایا۔

بس اتنا ہی کافی تھا۔ چنن سنگھ بول اُٹھا:

''وہ عورت میرے ہی مکان میں رہتی ہے...... میرے پرانے مکان میں، اس کا نام رام پیاری ہے۔''

لالہ جی کے من سے بوجھ اُتر گیا کیونکہ چنن سنگھ نے خود ہی جانکاری دینا شروع کر دیا۔ اگر لالہ جی کو کرید کرید کر باتیں پوچھنی پڑتیں، تو اس سے ضرور ہی انہیں پریشانی ہوتی۔ وہ کہنے لگے:

''اس عورت کے رنگ ڈھنگ سے لگتا تھا کہ وہ ہمارے رسم ورواج نہیں جانتی۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ رام پیاری بنارس کے ایک گاؤں کی رہنے والی ہے۔''

''بنارس تو بہت دُور متبرک مقام ہے۔''

''جی ہاں، لیکن وہ نگر ہندوستان میں ہے۔ وہاں کے لوگوں کے رسم ورواج ہم سے بالکل مختلف ہیں۔''

لالہ جی کھانس کر گلا صاف کر کے بولے:

''وہ عورت ابھی بالکل جوان ہے، آخر وہ اتنی دُور کیسے چلی آئی...... کیوں چلی آئی؟''

''لالہ جی بات صرف اتنی ہے کہ میں پچھلی بار کچھ دنوں کے لیے لاہور گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کے قریب مشہور تاریخی گوردوارہ ڈیرہ صاحب ہے۔ ایک روز میں گوردوارے کے درشن کرنے گیا، تو وہاں اس عورت سے ملاقات ہوئی۔ شبد کیرتن اور پاٹھ کے بعد کڑاہ پرساد لے کر میں بڑے دروازے سے باہر نکلا تو رام پیاری نے خود ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سَت سِری اُکال کہا۔ اسے دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں اور میں اسے پہچان نہیں پا رہا۔ میری شکل سے ہی وہ دل کی بات بھانپ گئی۔ اس نے کہا ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ میں مصیبت کی ماری لاہور آئی ہوں۔ بالکل بے سہارا ہوں مجھے مدد کی ضرورت ہے آپ شکل سے بھلے آدمی لگتے ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کو ہی اپنے من کی بات بتا دوں۔''

لالہ جی ٹکٹکی باندھے چنن سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ آخر چنن سنگھ کس پہلو سے شریف آدمی دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے پوچھا:

''تو پھر رام پیاری نے اپنے بارے میں کیا بتایا؟''

''ایک طرح سے سوچیے تو اس نے کچھ بھی نہیں بتایا اور دوسری طرح سے سوچیے تو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

چنن سنگھ نے دانت دکھاتے ہوئے کہا:

''اس نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا، کہ وہ بہت مصیبت میں ہے۔ یہاں سے سیکڑوں میل دُور اپنے وطن میں اس پر ایسی بپتا پڑی کہ وہ وہاں رہ نہ سکی۔ اسے جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں سے بھاگ نکلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ آخر وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں سے نکل

پڑی۔ پہلے وہ دہلی پہنچی اور دہلی سے لاہور چلی آئی۔ اس نگر میں بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کر رہی تھی۔''

لالہ جی نے کرید کرتے ہوئے پوچھا:

''تو کیا اس نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ کس کارن سے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا؟''

''نہیں لالہ جی! یہ تو ہمارے اپنے سمجھنے کی بات ہے۔ آپ ہی سوچیے کہ اس پر کیا مصیبت پڑ سکتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قتل کر کے یا ڈاکہ مار کر گاؤں سے بھاگ آئی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے سماج میں عورتوں پر کیسے کیسے ظلم ہوتے ہیں۔ شاید اس کا مسئلہ ایسا ہو، جسے وہ ہونٹوں تک نہیں لانا چاہتی۔ میں اس سے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ جب تک وہ اپنی پوری مصیبت کھول کر نہ سنائے، تب تک میں اس کی مدد نہیں کروں گا۔ میں تو صرف اسے دُکھیاری سمجھ کر یہاں لے آیا اور رہنے کے لیے اپنا مکان بھی دے دیا۔ میں تو بس کہتا ہوں کہ کر بھلا، ہو بھلا۔''

لالہ جی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، ممکن ہے کہ انہوں نے سوچا ہو کہ چنن سنگھ اصل میں اتنا بُرا نہیں تھا جتنا کہ اس کے دشمن اسے کہتے تھے۔ چنن سنگھ پھر بولا:

''رام پیاری کو یہاں آئے صرف گنتی کے دن ہوئے ہیں میں نے سوچا تھا کہ جب اس کا دل سنبھل جائے گا تو اپنے آپ ہی من کی بات بتا دے گی۔ آپ کو دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس بات کا پتا آپ ہی لگائیں۔''

''میں!'' لالہ جی کو کچھ تعجب ہوا۔

چنن سنگھ نے کہا:

''آپ بزرگ ہیں، باپ برابر ہیں۔ رام پیاری آپ سے بے کھٹکے دل کی بات کہہ سکتی ہے۔ بے چاری دُکھیاری ہے۔ ایک طرح سے وہ ہماری مہمان ہے۔ گاؤں میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کرے، یا کم سے کم اس سے ہمدردی جتلائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''خیال تو بُرا نہیں ہے۔''

''تو کب جا رہے ہیں، آپ اس کے پاس؟''

لالہ جی چونکے، ''رام پیاری کے پاس؟''

''جی! آپ کے وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کو تو وہ بیٹی جیسی ہے۔ دیکھیے نا، میں چاہے نوجوان نہیں ہوں لیکن بوڑھا بھی تو نہیں ہوں۔ مجھے رام پیاری کے پاس جاتے ہوئے جھجک لگتی ہے سوچتا ہوں کہ مجھے وہاں آتے جاتے دیکھ کر کہیں لوگ اُلٹی سیدھی باتیں نہ اُڑانے لگیں۔ مَیں مرد ہوں، میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن وہ بے چاری تو بدنام ہو جائے گی۔ میرے وہاں زیادہ آنے جانے سے لوگ کہنے لگیں گے کہ میں عیاشی کرنے کے لیے اسے کہیں سے اُڑا

لایا ہوں۔ اگر آپ اس سے ملنا منظور کر لیں تو میں آپ کا احسان مانوں گا۔ ہمارے بزرگ ہونے کے ناطے یہ کام آپ کو ہی کرنا چاہیے۔"

لالہ جی یہاں یہ سوچ کر نہیں آئے تھے کہ خود ان پر ہی کوئی ذمہ داری ڈال دی جائے گی لیکن اب انہوں نے اپنے من کو اس کام کے لیے تیار کر لیا۔ چنن سنگھ سے وِداع ہوتے وقت انہوں نے کہا:

"بہت اچھا مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا، سو میں کروں گا۔"

چنن سنگھ نے اُتر میں کہا:

"آپ بنا کھٹکے جب جی چاہے، رام پیاری کے پاس چلے جائیں۔ آپ میرا نام لے کر کہہ دیجیے گا، کہ چنن سنگھ نے ہی مجھے بھیجا ہے۔"

اس شام تو لالہ جی رام پیاری کے یہاں نہیں گئے، لیکن ان کی آنکھوں کے آگے اس کی صورت گھومتی رہی۔ بے چاری!

دوسرے دن بھاگ مَل کے چبوترے پر محفل جمی، تو لالہ جی نے چنن سنگھ سے اپنی ملاقات کا سارا حال بتا دیا۔ رام پیاری کی کتھا بھی سنادی...... لیکن چنن سنگھ کے سجھاؤ والی بات وہ گول کر گئے۔ انہیں شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں ان کے ساتھی اس بات کا کوئی اُلٹا مطلب نہ نکال لیں۔ وہ رام پیاری سے چُپ چاپ ملنا چاہتے تھے۔ انہوں نے منصوبہ بنالیا تھا کہ اگر رام پیاری سے ان کی ملاقات کا کسی کو پتا چل بھی جائے تو وہ کہیں گے کہ وہ اِدھر سے گزر رہے تھے اور اتفاق سے رام پیاری کے ساتھ بھی بات چیت ہو گئی۔

اس شام لالہ جی پہلے تو اکیلے ہی گاؤں کے باہر کھیتوں کو نکل گئے، تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ وہ گھومنے پھرنے کو گئے ہیں۔ سورج غروب ہو جانے پر وہ گاؤں کے دوسرے سرے سے گھسے۔ وہاں پر چنن سنگھ کا پُرانا مکان تھا، جہاں رام پیاری رہتی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے۔ پاس والے پیپل کے پیڑ پر کوؤں نے شور مچا رکھا تھا۔ لالہ جی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے یہ وہ رام پیاری سے کیا کہیں گے، کیسے کہیں گے۔ آخر انہوں نے ہمت کر کے اپنی چھڑی سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر بعد بھیتر سے دروازے کا کُنڈا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کُھلا تو آگے رام پیاری ہاتھ میں مٹی کا دیا لیے کھڑی تھی۔ دیے کی کانپتی ہوئی لَو کے ہلکے پرکاش میں رام پیاری کا چہرہ بہت ہی سُندر لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا ہر نقش یُوں لگتا تھا، جیسے تراش کر بنایا گیا ہو۔ لالہ جی کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رام پیاری نے اپنے دوپٹے سے پورا سر ڈھک رکھا تھا۔ لالہ جی مُسکرا پڑے اور بولے: "تم مجھے نہیں جانتی بیٹی!"

رام پیاری نے پل بھر کو اپنی ہرنی جیسی آنکھیں ان کے چہرے پر گاڑ دیں اور انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا اس طرح سر ہلانا بھی ایک انوکھی ادا بن کر رہ گیا، کیونکہ بالوں کی ایک لٹ آگے کو گر کر اس کے سُنہرے اور دمکتے ہوئے گال پر لوٹنے لگی۔

لالہ جی پھر بولے: "مجھے چنن سنگھ نے یہاں بھیجا ہے۔"

چنن سنگھ کا نام سُن کر رام پیاری نے پیچھے ہٹ کر لالہ جی کے بھیتر آنے کا راستہ چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

رام پیاری سُریلی آواز میں بولی: ''آیئے، بھیتر چلے آیئے۔''

رام پیاری دیا ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلی اور لالہ جی اس کے پیچھے پیچھے رام پیاری اپنا بھرپور سینہ تانے بڑے بانکپن سے چلتی ہوئی صحن میں پہنچی۔ اس کی کمر سے بھی نیچے پہنچنے والی کالے بالوں کی چوٹی اتنی موٹی تھی کہ ایک ہاتھ میں سما نہیں سکتی تھی۔ اس کی کمر کے نیچے کا پھیلاؤ تانپورے کی طرح نظر آتا تھا۔

صحن سے گزر کر وہ پسار میں پہنچے، جہاں ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ رنگیلے پایوں والے پلنگ پر اُجلا بستر بچھا دیا۔ رام پیاری نے ہاتھ کے اشارے سے لالہ جی کو پلنگ پر بیٹھنے کو کہا اور خود ایک پیڑھی گھسیٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

لالہ جی کو ساری عمر سرکاری فائلوں پر ناک گھستے گزری تھی۔ اپنی سیدھی سادی شکل والی بیوی کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی پرائی عورت سے بات تک نہیں کی۔ آج حُسن کا ایک غیبی آواز شعلہ ان کے آگے بہک رہا تھا۔ پَل بھر کو ان کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور ان کی بڈھی ہڈیاں سُلگ اُٹھیں۔ دل میں یہ شک بھی پیدا ہوا، کہ ان کا اس ناواقف جوان عورت کے پاس اس طرح آنا مناسب تھا بھی، یا نہیں۔ آ ہی گئے تو اس سے کیا کہیں؟ بات کیسے شروع کریں؟

رام پیاری کی شراب سی چھلکتی ہوئی آنکھیں لالہ جی کے بوڑھے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی لمبی گھنی پلکیں جھپکا جھپکا کر اس بات کا انتظار کر رہی تھی، کہ لالہ جی کچھ کہیں۔ آخر وہ خود ہی تو آئے تھے۔ کم سے کم اس نے تو انہیں نہیں بُلایا تھا۔ لالہ جی نے کچھ بے چینی سے اپنی چھڑی کو اُنگلیوں میں پھنساتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''بیٹی! لگتا ہے کہ تم کسی اور علاقے کی رہنے والی ہو۔''

''جی ہاں! لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟ میں لباس تو وہی پہنتی ہوں، جو یہاں کی عورتیں پہنتی ہیں۔''

کوئی بھی تیز عقل کا شخص سمجھ سکتا تھا کہ رام پیاری نے جان بوجھ کر یہ بات اُٹھائی تھی وہ چاہتی تھی، کہ لالہ جی کے منہ سے زیادہ سے زیادہ باتیں کہلوا سکے۔ اس طرح ہی وہ لالہ جی کے من کی گہرائی تک پہنچ سکتی تھی۔

لالہ جی من میں خوش بھی ہوئے۔ رام پیاری نے ایک طرح سے ان کی تیز عقل کی تعریف کی تھی۔ ایک بار تو لالہ جی کے من میں آیا کہ وہ کہہ دیں کہ ہم تو اُڑتی چڑیا کو پہچانتے ہیں۔ مگر پھر وہ سنبھل کر بولے:

''بیٹی! یہ کوئی کٹھن بات نہیں ہے۔ کل صبح مَیں گاؤں کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ بھاگ مَل کی دکان پر بیٹھا تھا کہ تم ادھر سے گزریں۔ تمہاری چال ڈھال دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ تم نہ تو ہمارے گاؤں کی ہو اور نہ ہمارے علاقے کی رہنے والی ہو۔''

رام پیاری کے دمکتے ماتھے پر چنتا کی ایک ننھی سی لکیر نظر آئی۔ اس نے پوچھا:

''تو کیا مجھ سے کوئی بھول ہو گئی؟''

''اس میں بھول کی کوئی بات نہیں بیٹی...... ہر علاقے کے اپنے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں۔ اگر کسی کی چال ڈھال ان کے مطابق نہ ہوتو ایسا فرد فوراً پہچانا جاتا ہے۔''

''میری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں یہاں کے لوگوں کے طور طریقوں کا پالن کر سکوں۔''

''یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارے یہاں کی بہو بیٹیاں سدا گھونگھٹ کاڑھ کر چلتی ہیں۔ ننگے سر چلنا تو بہت ہی بُرا سمجھا جاتا ہے۔''

''جی ہاں، یاد آیا، میرا سر تو آدھے سے زیادہ کھلا تھا۔''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہیں ہمارے رسم و رواج کا علم نہیں ہے۔ تم نے کچھ جان بوجھ کر تو کیا نہیں۔''

''آئندہ میں اس بات کا پورا پورا دھیان رکھوں گی۔ مَیں نہیں چاہتی کہ میری چال ڈھال یا برتاؤ سے گاؤں والوں کو کوئی شکایت ہو، مجھے یہیں پر رہنا ہے اور مجھے آپ سب کے آشیرواد کی ضرورت ہے۔ اچھے خیالات کی ضرورت ہے۔ آپ میرے پتا سمان ہیں۔ مجھ دکھیاری کو یہاں پوچھنے والا کون ہے...... آپ لوگوں کے سوا؟''

لالہ جی کا دل بڑا نرم پڑ گیا، بلکہ موم کی طرح پگھل گیا۔ ایک بار تو ان کا جی چاہا، کہ وہ ہاتھ بڑھا کر رام پیاری کی پیٹھ پر پھیریں لیکن انجانے خوف اور جھجک کے کارن وہ ایسا نہ کر سکے۔ کہنے لگے:

''تم کوئی خاندانی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ چنتا مت کرو، یہاں تمہیں سب کا تعاون حاصل ہوگا...... ویسے بیٹی، تم ایسی بھری جوانی میں گھر سے کیوں چلی آئیں؟''

رام پیاری کی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور اس کے بڑے بڑے پپوٹے اوندھی پڑی سیپیوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔ اس کے ہونٹ کپکپائے:

''آپ نے تو ایک ہی پرشن پوچھا ہے لیکن میرے بارے میں بیسیوں پرشن اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ اگر میں ان سب کے اُتر دینا چاہوں گی، تو مجھے اپنی پوری جیون کتھا سنانی پڑے گی۔ لیکن میری جیون کتھا اتنی دُکھ بھری ہے کہ شاید ابھی میں سنا ہی نہ پاؤں...... بس، آپ اتنا سمجھ لیجیے کہ مَیں ایک صنفِ نازک ہوں...... آپ لوگوں کے سائے کے نیچے اپنے جیون کا کچھ وقت گزارنے کے لیے آئی ہوں......۔''

لالہ جی اپنے روکھے سوکھے ہاتھ آشیرواد دینے کے انداز سے ذرا اُوپر کو اُٹھاتے ہوئے بولے:

''بس بس بیٹی! اور زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ہیں۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض دُکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں زبان پر نہیں لایا جا سکتا۔''

پھر لالہ جی نے دیکھا کہ رام پیاری جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگی۔ شاید آنسو بھر آئے تھے۔ لالہ جی

بے چین ہو اُٹھے۔ اُنہیں لگا کہ اگر یہی حالت رہی تو ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں گی۔

ماحول میں ایک پاکیزہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تب لالہ جی کی نظر ایک لڑکے پر پڑی، جو کچھ دُوری پر دیوار سے کندھا ٹیکے کھڑا تھا اور اپنی ایک اُنگلی سے نتھنے کرید رہا تھا۔ لالہ جی کو اس اَن گڑ ڈبلے پتلے لڑکے سے کوئی دلچسپی تو محسوس نہیں ہوئی، لیکن صرف بات کرنے کی خاطر انہوں نے پوچھا: ''یہ لڑکا کون ہے؟''

''یہ میرا بھائی ہے۔''

وہ لڑکا شکل صورت سے رام پیاری کا بھائی بالکل نہیں لگتا تھا۔ اس نے چوڑے پانچوں کا پائجامہ اور اس پر چکن کا کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے بال بالکل سیدھے تھے، اور اس کی دوپلی ٹوپی کے بھیتر سے کانٹوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ بالکل چُغد سا لگتا تھا۔ اس کی بھویں ضرورت سے زیادہ گھنی تھیں اور ناک ضرورت سے کہیں زیادہ لمبی تھی۔

لالہ جی نے پوچھا: ''کیا نام ہے، اس کا؟''

لڑکا کچھ نہیں بولا، وہ چپ چاپ اپنی ناک کریدتا رہا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ لالہ جی نے پرشن اس کی بہن سے پوچھا تھا، اس لیے اسے اُتر دینے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ رام پیاری آنچل سنبھالتے ہوئے بولی:

''اس کا نام منگل ہے۔''

لالہ جی نے دونوں ہاتھ چھڑی پر رکھے اور اس پر بوجھ ڈال کر دھیرے دھیرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کمرے میں اُچٹتی ہوئی نگاہ دوڑائی، حالانکہ بلغم پھنسی نہیں تھی، پھر بھی اُنہوں نے کھانس کر گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولے: ''اچھا بیٹی! اب میں چلتا ہوں تمہیں کبھی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، تو میرے پاس چلی آنا۔''

رام پیاری پھر ہاتھ میں مٹی کا دیا اُٹھائے لالہ جی کے آگے آگے ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ اس کی کافر جوانی کا اُبھار دیکھ کر ایک بار پھر لالہ جی کی آنکھیں جھپک گئیں۔ انہوں نے نظر جھکالی۔

چلتے چلتے رام پیاری کہنے لگی: ''آئندہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

لالہ جی شاید کسی اور ہی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ جلدی سے سمجھ نہیں پائے، کہ رام پیاری کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ کاٹھ کے اُلو کی طرح رام پیاری کی طرف دیکھنے لگے۔

رام پیاری ان کے من کی حالت کو فوراً بھانپ گئی اور بولی: ''میں ہمیشہ گھونگھٹ کاڑ کر چلا کروں گی۔''

لالہ جی نے حوصلہ سے کام لے کر رام پیاری کی سڈول اور بھرپور پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے دی...... اور چپ رہے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر پہنچ کر رام پیاری کے قدم رُک گئے۔ لالہ جی دروازے سے نکل کر باہر گلی میں کھڑے ہو گئے۔ چراغ کی جھلملاتی روشنی میں رام پیاری بالکل جل پری سی لگ رہی تھی۔ لالہ جی کے مَن کے تہہ خانوں کی گہرائی میں سے ایک ہُوک سی اُٹھی۔ انہیں اس بات کا تلخ احساس ہوا کہ ان کی اور رام پیاری کی دُنیا میں کالے کوسوں کی دُوری تھی۔ کتنی تکلیف دہ تھی یہ حقیقت! وہ جوان ہوتے...... چاہے رام پیاری ان کی جوانی کے باوجود ان کے آگے دانہ نہ ڈالتی...... پھر وہ یہ تو محسوس کرتے کہ وہ ایک ہی سنسار کے رہنے والے تھے۔

یکا یک رام پیاری نے گہری سانس لی۔ اس کے پچکے ہوئے پیٹ کے اوپر دو بھرپور چکور جیسے پھڑ پھڑائے۔ اس کے رس بھرے ہونٹ ہلے: ''ایک بات کہوں؟''

اگر رات کی ایسی تنہائی میں آج سے تیس پینتیس برس پہلے رام پیاری نے ان سے یہی پرشن کیا ہوتا، تو ان کا دل کتنے زور سے دھڑک اٹھتا۔ لالہ جی چپ چاپ رام پیاری کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے، جیسے وہ اس کی اگلی بات کا انتظار کر رہے ہوں۔ رام پیاری کا سینہ جوں کو توں تنا رہا، صرف آنکھیں جھک گئیں، بولی:

''میں عورت ذات ہوں، گاؤں میں زیادہ گھومنا پھرنا مجھے شوبھا نہیں دیتا۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ کبھی کبھی آپ ہی میرے یہاں آ جایا کریں۔ مجھے کوئی مصیبت پڑے گی تو میں بنا کھٹکے آپ کے پاس چلی آؤں گی، لیکن اگر آپ یوں ہی گھومتے پھرتے کبھی کبھی یہاں آ جایا کریں، تو میرے من کو بڑا اسہارا ملے گا۔ میں اپنے آپ کو اکیلی نہیں محسوس کروں گی۔''

لالہ جی کا من امڈ پڑا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ پھر ڈیوڑھی میں گھس کر رام پیاری کا ماتھا چوم لیں، لیکن اپنے ارادے سے خود ہی گھبرا کر وہ ٹھٹھک گئے اور کچھ کانپتی ہوئی آواز میں بولے:

''میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔ تم گاؤں میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس نہیں کرو گی۔''

یہ کہہ کر لالہ جی نے چھڑی سنبھالی اور وہاں سے چل دیے۔

رام پیاری نے بھی دھیرے دھیرے دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیے۔

لالہ جی نہیں جانتے تھے کہ گاؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنہیں رام پیاری کے گھر کے آس پاس منڈلانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ کوئی چوہا بھی رام پیاری کے گھر میں گھسے تو انہیں اس بات کی خبر ہو جاتی تھی۔ بھلا لالہ جی کے وہاں آنے جانے کی بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ راتوں رات گاؤں بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ لالہ جی رام پیاری کے درشن کے لیے اس کے گھر گئے تھے۔ لونڈے لپاڑے کچھ سمجھیں نہ سمجھیں لیکن اگلی صبح کو جب انہوں نے لالہ جی کو دیکھا تو دور ہی سے ایک گیت کے مشہور بول گانے لگے:

نالے بابا رات رہ گیا
نالے دے گیا دوانی کھوٹی

''یعنی ایک تو بڈھا رات کسی عورت کے پاس کاٹ بھی گیا اور پھر وداع ہوتے وقت عورت کی ہتھیلی پر کھوٹی دوّنی ٹکا دی۔''

چھاہ ویلا (ناشتہ) سے فرصت پا کر لالہ جی ٹھسّے سے تیار ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے بھاگ مل کی دکان کو چل دیے۔ آج انہیں اپنے ساتھیوں کے سامنے رام پیاری سے ملاقات کی پوری رپورٹ پیش کرنی تھی۔

جب وہ چبوترے کے قریب پہنچے تو معمول سے زیادہ گرم جوشی سے ان کا سواگت کیا گیا۔ ایک سجن بول اُٹھے: ''آیئے آیئے لالہ جی! آج تو آپ کے چہرے پر نیا ہی نور دکھائی دیتا ہے۔''

لالہ جی کے من میں گدگدی سی ہوئی، چہرہ گمبھیر بنا رہا۔ چبوترے پر چڑھے، جوتے اُتارے، کھیس کے

اوپر بیٹھ گئے اور حقے کی نَے (ڈنڈی) دانتوں میں دبا کر اس کے سرور میں کھو گئے۔

سب ساتھی یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے کہ پچھلی شام کی ملاقات کیسی رہی۔ لالہ جی کی گھمبیر صورت دیکھ کر سب ہی گھمبیر ہو گئے۔ چاہے ان کے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

حقے کا کچھ آنند لے چکے، تو لالہ جی سنبھل کر بولے: ''بے چاری مصیبت کی ماری ہے۔''

ایک منچلے نے بات ہی بات میں چٹکی لی:

''اجی! مصیبت کی ماری تو وہ دیکھنے سے ہی لگتی ہے۔ ہم جاننا یہ چاہتے ہیں کہ آپ جو اتنی دیر اس کے یہاں بیٹھے رہے تو وہاں کیا کیا ہوا؟''

''...........؟'' لالہ جی نے اس آدمی کی طرف ذرا بگڑ کر دیکھا:

''ہونا کیا تھا؟ بھئی آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلائی کا زمانہ نہیں رہا۔''

تب ایک اور لالہ بولے:

''ان کی باتوں کو چھوڑیے، سوال یہ ہے کہ ایک پردیسن عورت ہمارے گاؤں میں آ گئی ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے، کہاں سے اور کیوں آئی ہے؟''

لالہ جی فوراً بولے: ''ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔''

دوسرے لالہ جی پھر بولے: ''آپ بھی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ آپ وہاں پر اتنی دیر کیا کرتے رہے؟''

لالہ بالمکند من ہی من میں ڈانواں ڈول ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رام پیاری کے بارے میں یہ بات چیت ایسا رُخ اختیار کرے۔ اس وقت ان کا زیادہ بگڑنا بھی مناسب نہیں تھا۔ بڑی گھمبیرتا سے بولے:

''میرا خیال نہیں کہ میں وہاں بہت دیر تک رُکا رہا ہوں۔''

وہاں بیٹھے ادھیڑ عمر کے سردار جی، جن کا نام مُل سنگھ تھا، زیادہ باریک باتوں میں وشواس تو نہیں رکھتے تھے، لیکن اس وقت ان کے منہ سے باریک بات نکل ہی گئی:

''لالہ جی! ایسے موقعوں پر وقت گزرنے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔''

لالہ جی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ بوکھلا گئے تو ان کے ساتھ ان کو اور زیادہ پریشان کریں گے۔ انہوں نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہا:

''بے چاری رام پیاری سچ مچ بہت دُکھی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ضرور ہو گزرا ہے، جس کے کارن اسے اپنا دیس اور گھر بار چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کا مذاق اُڑانے کی جگہ ہر طرح سے اس کی مدد کریں۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ اسے ہمارے گاؤں میں یہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہوگا اس نے میری یہ بات سویکار کر لی ہے۔ مجھے وشواس ہے کہ دھیرے دھیرے ہمیں اس بات کا پتا چل جائے گا کہ کس پریشانی کی وجہ سے اسے یہاں پردیس میں آنا پڑا۔''

ڈُوسرا غلاف

ڈار کونجاں دِے بانگ وِچ پھرن بیلے، اِک دوجے دِے سنگ سنگیلیاں نیں

(وارث شاہ)

”جیسے کونجوں (خوب صورت پنچھی) کی ڈار آکاش میں اُڑتی ہے، اسی طرح سے یہ سب سکھیاں جنگل میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتی کودتی ہیں۔“

۱

جسا سنگھ سویرے سویرے گھر سے کھیتوں کی طرف نکل پڑا۔ یہ اس کا روز کا کام تھا لیکن آج اس کی بغل میں کپڑے میں لپٹی ہوئی بارہ چودہ باسی روٹیاں بھی تھیں۔ وہ کچھ چاؤ میں تھا۔ گاؤں میں اس کا ایک بھی دوست نہیں تھا۔ ایسے گم سُم رہنے والے لڑکے سے بھلا کس کی دوستی ہو سکتی تھی۔ خود جسا اپنے کو دوسروں سے الگ الگ محسوس کرتا تھا۔ سب لڑکے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے اور گھر کی باتیں کرتے وقت اپنے بھائی بہنوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ جسے کا ایسا کوئی گھر نہیں تھا۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن، نہ بھائی۔ دوسروں کے برعکس اس کے من میں احساسِ کمتری کا جذبہ نہیں تھا کیونکہ یہ ضرورت سے زیادہ ہی کٹھور تھا، نہ اسے دوسروں سے دُوری کا سدا ہی احساس رہا۔ ہم عمر لڑکوں سے اپنی اس دُوری کو مٹانے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ جب اس کا جی چاہتا، وہ اپنی الگ سے دُنیا بسانے کی کوشش بھی کرتا۔ ہفتہ میں ایک دو بار وہ آس پاس کے گھروں سے باسی روٹیاں لے کر کپڑے میں لپیٹتا اور انہیں بغل میں دبا کر گاؤں سے باہر نکل جاتا۔ آج بھی وہ خوشی کی کچھ گھڑیاں گزارنے جا رہا تھا۔

گاؤں سے کافی دُور پر ایک کنواں تھا۔ کسی زمانے میں وہاں رہٹ چلا کرتا تھا۔ دو بیل بھاری بھرکم چرکھڑے کو گھمایا کرتے تھے اور پانی ٹنڈوں میں سے چھلا چھل گر کر پاڑچھے کے ذریعے بہتا چلا جاتا تھا۔ وہاں تھوڑی بہت گہما گہمی بھی رہتی تھی۔ گاؤں سے زیادہ دُوری پر ہونے کی وجہ سے عورتیں کپڑے دھونے کے لیے وہاں تک نہیں آتی تھیں لیکن کچھ منچلی پہنچ بھی جاتی تھیں۔ وجہ یہ کہ وہاں اُن کو بالکل تنہائی ملتی تھی۔

کنوئیں سے نکلا ہوا پانی آس پاس کے کھیتوں کی سینچائی کرتا تھا۔ رہٹ پر بیلوں کو ہانکنے کے لیے صرف ایک آدھ لڑکا موجود ہوتا تھا۔ مرد کھیتوں میں ہوتے تھے۔ عورتیں لڑکے کو بھگا دیتیں اور کسی لڑکی کو بیل ہانکنے پر لگا دیتیں۔ تب سارے رہٹ پر انہیں کا راج ہو جاتا۔ وہ بغیر کسی ڈر کے رہٹ کے پانی میں نہاتیں، کپڑے دھوتیں اور اَدھ ننگی اِدھر اُدھر گھوم پھر کر کپڑے پھیلایا کرتی تھیں۔

کئی برس پہلے کنوئیں کا پانی اپنے آپ سوکھ گیا۔ منڈیر گر گئی اور کنوئیں کی اندرونی دیوار پر جنگلی جڑی بوٹیاں اُگ آئیں۔ کچھ نشان دیکھ کر پتا چلتا تھا، کہ کسی وقت وہاں بیل چلا کرتے تھے۔ آس پاس کے شر یہنہ اور

ثوت کے درختوں پر اب اُلوؤں اور چیلوں کا بسیرا تھا۔ کچھ کتوں نے بھی اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ کبھی ان کتوں کو آس پاس کے سانسیوں نے پال رکھا تھا۔ وہ ان ہی کتوں کے ذریعے جنگلی بلوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی کتا چوٹ یا بیماری کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتا تو اسے سانسی گھر سے نکال دیتے، کیونکہ وہ بیکار کتے کو کھلا پلا نہیں سکتے تھے۔ ایسے کتے جیسے سنیاس لے کر اس اندھے کنوئیں کے پاس رہنے لگے وہ دن میں آس پاس کے دیہات کا چکر لگاتے، کوڑے کرکٹ سے کچھ کھا پی کر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتے۔ ایک دن اتفاق سے جسا وہاں جا نکلا۔ آخر وہ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ انہوں نے جسّے کو دیکھا تو دُم ہلانے لگے۔ جب جسا دوبارہ وہاں گیا تو اس کی بغل میں کئی روٹیاں دبی ہوئی تھیں۔ اس نے کتوں کو روٹیاں کھلائیں کبھی کبھی تو وہ بہت زیادہ تعداد میں روٹیاں لے جاتا۔ کتے پیٹ بھر کر کھاتے اور اپنے اس نیک مالک کی خیر مانگتے۔

یہ بھی انوکھی حالت تھی۔ ایک انسان کا لڑکا اور کتے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرنے لگے تھے۔ جسّے کو یہ بھی پتا چل گیا کہ یہ کتے شکار کھیلنے کے لیے بے چین رہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سانسیوں کے سدھائے ہوئے تھے۔ اب جسّے کو نیا شُغل ہاتھ آ گیا۔ وہ اپنے کتوں کی ٹولی کو لے کر کھیتوں، قبرستانوں اور جھڑ بیریوں میں دوڑتا پھرتا تھا۔ کبھی کوئی جنگلی خرگوش یا بلا کسی جھاڑی میں نکل پڑتا تو بس مزہ آ جاتا۔ کتے بڑی اُمنگ سے اُچھل کر شکار کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ جسا بھی ہا ہو کرتا ہوا بھاگ نکلتا۔ مانا کہ وہ کتے کسی شکار کر پکڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس بھاگ دوڑ میں جسّے کو بڑا مزہ آتا۔ شکار کے بچ نکلنے پر بھی جسا اور اس کے کتے بڑے خوش ہوتے۔ اصل میں شکار کی اس کے علاوہ اور کوئی اہمیت بھی نہیں تھی کہ اس بہانے سے وہ بھاگ دوڑ لیتے تھے۔ اتنی محنت کے بعد جسّے کو بھوک لگتی، تو وہ کھیتوں میں سے شلجم اکھاڑتا اور کھا جاتا۔

بس اپنی زندگی کی یہ کچھ گھڑیاں تھیں، جنہیں جسا اتنی خوشی اور اطمینان سے گزارتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بوجھ اور سُونے پن کو بھول جاتا۔

کچھ دن پہلے وہ نہر کی طرف جا نکلا۔ وہاں عورتیں نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ نابالغ لڑکیوں نے اپنا الگ اڈہ بنا رکھا تھا۔ ان کی چیخ چلاہٹ اور دھما چوکڑی سے اُکتا کر ان کی مائیں انہیں پَرے دھکیل دیا کرتی تھیں۔ لڑکیوں نے بھی نہر کے موڑ پر ببُول کے درختوں کے نیچے نہانا دھونا شروع کر دیا۔ پانی نہ اتنا تیز تھا کہ بہہ جانے کا ڈر ہوتا اور نہ اتنا گہرا تھا کہ ڈوبنے کا خطرہ ہوتا۔ وہ کنارے سے غڑاپ غڑاپ نہر میں چھلانگیں لگاتیں۔ بطخوں کی طرح بازوؤں اور ہاتھوں سے پانی چھپ چھپاتیں اور ایک دوسری پر چھینٹے اُڑا کر چیخ چیخ کر ہنستیں۔ جسّے نے دور سے ایسا ہی ایک منظر دیکھا تھا جو اسے بڑا بھلا لگا۔ شاید لڑکیوں کے قریب ہونا تو اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا، لیکن وہ دُور سے تو ان کے کھیل تماشوں سے اپنا من بہلا سکتا تھا۔

یہ بات صرف اس کے من میں تھی لیکن وہ دوبارہ نہر پر گیا نہیں۔ لڑکیوں کے معاملے میں اسے شک تھا کہ نہ جانے وہ اس سے کیسا برتاؤ کریں لیکن اسے اپنے کتوں پر پورا وشواس تھا۔

آج بھی کتوں کو روٹیاں کھلا دینے کے بعد وہ درختوں کی چھایا تلے کچھ ڈھلوان دھرتی پر آدھ لیٹا سا ہو رہا ہو

رہا تھا کہ اتنے میں اس کے گاؤں کا موجی رام گھوڑے پر سوار ادھر آ نکلا۔ وہ شہر سے کچھ سامان لینے جا رہا تھا۔ جسّے پر نظر پڑی تو اس نے گھوڑا روک لیا اور اُونچی آواز میں پوچھا:

''ارے تم جسّو ہو کیا؟''

جسّے کے کانوں میں جانی پہچانی آواز پہنچی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ دانتوں میں گھاس کا لمبا سا تنکا چبا رہا تھا۔ موجی رام کو پہچان کر بولا:

''ہاں چاچا! میں ہی ہوں......''

''ارے تم یہاں بیٹھے ہو، اور تمہارا چاچا سانڈ کی طرح بوکھلایا ہوا تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔''

چاچے کا نام سُن کر جسّو فوراً اُٹھ کھڑا ہو گیا، موجی رام اسے تسلی دینے کے لیے بولا:

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہارے چاچا سے کہہ دیا تھا، بچہ ہے، یہیں آس پاس کہیں کھیل رہا ہوگا۔ اتفاق سے تم دکھائی بھی دے گئے۔ اب فوراً گھر چلے جاؤ......''

موجی رام نے اپنی بات ختم کر کے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے چل دیا۔ جسا فوراً گاؤں کی طرف بھاگا۔ کتے بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ جسّے کو کتوں کو اس کے ساتھ دیکھ کر کہیں چاچا بھڑک نہ اُٹھے۔ وہ رُکا تو کتے بھی رُک گئے۔ اس نے دونوں باز و ہلا ہلا کر کتوں کو شیشکارا اور واپس لوٹ جانے کو کہا۔

کتے واپس تو نہیں گئے لیکن وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔ وہ اتنا سمجھ گئے کہ جسا انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔

اس طرح کتوں کو پیچھے چھوڑ کر جسا پھر گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

شاید جیسے کسی شاعر کو نظم تخلیق کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے، اسی طرح جسّے کو دوڑ لگانے میں خوشی ہوتی تھی۔ وہ بڑی تیز رفتار سے لمبے فاصلے تک بغیر دم ٹوٹے دوڑ سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے کتوں کے برابر دوڑ سکتا تھا۔ پہوں (چوڑے ریتلے راستوں) کھیتوں، پگڈنڈیوں پر سے ہوتا ہوا جھاڑیوں، درختوں اور ٹیلوں کے قریب سے گزرتا ہوا، جسا گھوڑے کے چنچل گھوڑے کی طرح جیسے اُڑتا چلا جا رہا تھا...... اپنے دوڑ لگانے پر اسے فخر تھا۔ کبھی کبھی وہ اس بات پر فریفتہ ہوا اُٹھتا، کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کو اتنی تیزی سے آگے اور آگے لے جا سکتی تھیں۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر بھی اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی۔ ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے پیچھے گوبر مٹی سے لپی دیواروں اور سپاٹ اور ہموار چھتوں والے مکان صبح کی، دھوپ سے جگمگا اُٹھے تھے۔ مکانوں کی منڈیروں پر سفید کالے کوے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ راستے میں کوئی چھوٹی موٹی چیز آتی تو جسا کود کر اس کے اوپر سے پھلانگ جاتا۔ چاچا کے طویلے کے پہلو میں چکی سے جُتی سانڈنی کا سرا سے دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑے فراٹے سے جب وہ طویلے کے احاطے میں گھسا تو بگا سنگھ اس کی طرف پیٹھ کیے رحیم سے کچھ کہہ رہا تھا۔

جسا ایک جگہ رُک کر ساکن ہو گیا۔ دم پھولا ہوا تھا اور اس کے منہ میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر دھول بھی تھی اور گھاس پر جمی اوس کی بوندوں کے چھینٹے بھی تھے۔

رحیم سے بات ختم کر کے بگا مڑا تو اس کی نظر جسے پر پڑی۔ بگا زیادہ غصے میں نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ جسا بڑے زور زور سے ہانپ رہا ہے، تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جسے کو جہاں بھی اس بات کی خبر ملی ہو گی کہ چاچا اسے ڈھونڈ رہا ہے، وہیں سے بگٹٹ بھاگتا ہوا وہ طویلے میں پہنچ گیا تھا۔ اس خیال سے بگا کچھ اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے ایک بار پوچھ ہی لیا:

''اے کہاں گیا تھا جسے؟''

''بگنے!''

جسے نے ایک لفظ میں جواب دے دیا اور پھر مطمئن ہو گیا۔ اس کی یہ خاموشی ایسی مضبوط تھی کہ اسے چاچے کے تھپڑ اور گھونسے بھی توڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن چاچا مار پیٹ کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ جسے کے بڑے سے جوڑے پر ہاتھ رکھ کر اسے طویلے کے کمرے میں لے آیا۔ وہاں پیتل کی قلعی دار بالٹی اُجلے جھاڑن سے ڈھکی رکھی تھی۔ بگے نے جھاڑن کا ایک کونا اُٹھایا تو جسے نے دیکھا کہ بالٹی کنارے سے چار اُنگل نیچے تک لسی سے بھری ہوئی تھی اور اس میں سے کم سے کم پاؤ بھر مکھن کا گولا تیر رہا۔ پھر چاچا نے اسے قریب پڑا لوہے کا بڑا سا کمنڈل دکھایا، جس میں تین ساڑھے سیر تازہ دودھ تھا۔

جسے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چاچا کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اس کا چاچا چاہتا کیا تھا۔

بگے نے اپنا داہنا پاؤں قریب پڑی چارپائی کی باہی پر رکھا اور بایاں ہاتھ جسے کے کندھے پر رکھ کر کچھ رازدارانہ انداز میں بولا:

''تمہیں یہ دونوں چیزیں رام پیاری کے یہاں پہنچانی ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح جسے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کاٹھ کا بنا ہو۔ جواب میں اس کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا: ''اچھا!''۔

کچھ کہنے سے پہلے بگے کو اپنے گلے میں کوئی چیز اٹکی سی محسوس ہوئی۔ اس نے زور سے کھانس کر بلغم کا لوندا باہر کو پھینکا، جو دیوار پر جا چپکا۔ اس نے جسے کی بٹن جیسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا شروع کیا:

''ہاں تو رام پیاری کا مکان......''

جسے نے بات کاٹ کر کہا:

''میں جانتا ہوں۔''

چاچے نے ٹھٹھک کر اپنا داہنا پاؤں چارپائی سے ہٹایا اور فرش پر ٹیک دیا۔ اسے لگا، جیسے جسا ضرور سے کچھ زیادہ ہی جانتا تھا۔ اس نے دھیرے سے پوچھا:

''تو تُو جانتا ہے کہ رام پیاری کس مکان میں رہتی ہے؟''

''ہاں چاچا۔'' جسے نے بڑے چوکنے پن سے جواب دیا۔

''مادر چود!...... بگے نے من ہی من میں کہا۔ پھر اونچی آواز میں بولا:
''یہ دونوں چیزیں رام پیاری کے گھر پہنچادو...... چپکے سے۔''
اتنا کہہ کر بگے نے جسّے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کاٹھ کے چہرے پر کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بگے نے پوچھا:
''میری بات سمجھ گئے ناں؟''
''ہاں، یہ دونوں چیزیں رام پیاری کو پہنچانی ہیں...... چپکے سے۔''
بگے نے لفظ چپکے سے سُن کر ایک بار پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا بگے کو اطمینان ہو گیا۔
ایک ہاتھ میں بالٹی اور ایک ہاتھ میں کمنڈل اُٹھا کر جب جسا دروازے میں سے باہر جانے لگا تو بگا بولا:
''رام پیاری سے کہہ دینا کہ چاچا نے بھجوایا ہے۔''
جسا تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ عین اسی موقع پر بگے کو جھجو کھڑی دکھائی دی۔ جھجو نے جسّے کو دروازے میں سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔
کچھ ہی دیر پہلے بگے نے مکان کے بھیتر سے لسی اور مکھن منگوایا تھا۔ بھینسوں کے دوہے ہوئے دودھ میں سے اس نے ایک کمنڈل بھر کر پہلے ہی رکھ لیا تھا، اور باقی کا دودھ بھیتر جھجو کو بھجوا دیا تھا۔ جھجو کو دودھ کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن لسی کے بارے میں وہ یہی سمجھی کہ ممکن ہے، احاطے میں بگے کے کچھ مہمان آئے ہوں گے۔ اب جسّے کو دودھ کا کمنڈل اور لسی کی بالٹی لے جاتے دیکھ کر اس کے من میں تجسّس جاگا، کہ جسا ان چیزوں کو کہاں پہنچانے جا رہا تھا۔
بہن کے من کی اس بات کو بھانپنے میں بگے کو دیر نہیں لگی۔ اس نے فوراً ہی کہا:
''میں نے یہ دودھ اور لسی اس کے گھر بھجوائی ہے...... کیا نام ہے، اس کا؟...... ارے، تمہارے پاس بھی تو میں نے ایک دو بارا سے بیٹھے دیکھا ہے...... بھلا سا نام ہے، اس کا۔ ہاں...... یاد آیا...... رام پیاری!''
بگے کو یہ نام اچھا بھلا یاد تھا، مگر وہ جان بوجھ کر اداکاری کرتا رہا۔ جھجو طویلے کے بھیتر چلی آئی۔ وہ دیوار سے ٹکے بیل گاڑی کے ایک بہت بڑے پہیے پر کہنی رکھ کھڑی ہو گئی، چاہے اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر بگے کو یہ چیزیں بھجوانے کا خیال کیسے آیا۔
بگا جھجو سے ڈرتا نہیں تھا، مگر یہ بات ہی ایسی تھی، جس پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنا ضروری تھا۔ اس نے اپنی دو لمبی لمبی اُنگلیاں پگڑی میں گھسیڑ کر سر کھجاتے ہوئے کہا:
''بے چاری کمزور ہے...... مصیبت کی ماری ہے۔''
جھجو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے پوچھا:
''تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ مصیبت کی ماری ہے؟''

کوئی اور موضوع ہوتا تو بگا بہن کو گھور کر ٹال دیتا، مگر رام پیاری کے معاملے میں وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہی چور کی ڈاڑھی میں تنکے والی بات تھی۔ اس نے اپنا بڑا سا ہاتھ ذرا سا ہوا میں لہرا کر جواب دیا:

''بھلا مجھے اس کا پتا کیسے چل سکتا تھا۔ رام پیاری سے آج تک تو میری ایک بات بھی نہیں ہوئی...... اپنے وہ لالہ جی ہیں نا...... لالہ بالمکند، ہیڈ کلرک، گورمنٹ انڈیا...... وہی رام پیاری کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے پوری چھان بین کرنے کے بعد کہا کہ وہ بے چاری مصیبت کی ماری ہے، دکھیاری ہے، اس لیے ہم سب گاؤں والوں کو چاہیے کہ اس کی ہر طرح سے مدد کریں۔''

اس پر جھجو نے ایک آنکھ بند کر لی، لیکن بگے کی نظر اس کی طرف نہیں تھی۔ وہ بولی:

''تو اس لیے تم نے لسی اور دودھ اس کے یہاں بھیجا ہے؟''

''ہاں جھجو! ہمارے یہاں تو لسی اور دودھ کی ندیاں بہتی ہیں۔ تم تو بچی ہوئی لسی مجبوراً بھینسوں کو پلا دیتی ہو، یا گاؤں سے باہر میدان میں بھی اُنڈیل آتی ہو۔ بھلا کسی غریب کے کام آ جائے تو کیا بُرا ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا کہ اس میں کوئی بُرائی کی بات ہے؟ یہ تو بہت ہی نیک کام کیا ہے، تم نے۔''

یہ کہتے وقت جھجو دروازے سے باہر نکل گئی اور پیچھے سے بگا یہ بھی نہ دیکھ پایا کہ اس کے چہرے کی کیفیت کیا تھی۔

جسا بڑی تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس نے گھٹنوں سے اوپر تک کا صرف کچھہرہ (جانگیہ) پہن رکھا تھا، جس کا نیچے کو لٹکتا ہوا میلا کمر بند اس کے گھٹنوں سے ٹکرا ٹکرا کر ناچ رہا تھا۔ وہ گاؤں کے باہر باہر سے ہو کر گیا۔ پیپل کے نیچے رام پیاری کا مکان تھا۔ پیپل ذرا اونچی جگہ پر تھا۔ جسا اس چڑھائی پر بڑی تیزی سے چڑھ گیا۔ راستے کے ڈھلوان کنارے پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ جنہیں مرغیاں پنجوں سے کریدرہی تھیں۔

دروازے کے آگے پہنچ کر پل بھر کو وہ ٹھٹھکا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں تھے۔ اس نے دروازے پر ایک پاؤں مارا تو وہ کھل گیا۔ وہ لمبا ڈگ بھر کر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ صحن کی دیوار کے پاس چارپائی پر رام پیاری بیٹھی دُھوپ سینک رہی تھی۔ جب اسے ڈیوڑھی کے دروازے میں سے جسا صحن میں آتا دکھائی دیا تو اسے تھوڑا تعجب ہوا وہ سمجھی کہ یہ لڑکا شاید بھول سے یہاں چلا آیا تھا۔

رام پیاری کو گاؤں میں کون نہیں پہچانتا تھا، ہاں، وہ بہت کم لوگوں کو پہچانتی تھی۔ خاص کر جسے کے بارے میں اسے لگا کہ اس لڑکے کو پہلے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا:

''کس کے یہاں جانا ہے تمہیں؟''

جسّے نے کھٹاک سے جواب دیا:

''میں تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔''

رام پیاری نے چارپائی سے اُٹھنے کے لیے اپنا پاؤں نیچے کی طرف بڑھاتے ہوئے حیرت زدہ آواز میں پوچھا:

''میرے پاس؟''

اتنی دیر میں جسّے نے بالٹی اور کمنڈل کو صحن کے کچے فرش پر رکھ دیا اور بولا:

''میں لسی، مکھن اور دودھ لایا ہوں۔''

رام پیاری نے اُٹھ کر بالٹی اور کمنڈل پر سے اُجلا جھاڑن اُٹھایا اور پھر انہیں ڈھک دیا۔ تب لڑکے کی طرف دیکھ کر سوال کیا:

''کہیں تم بھول سے تو یہاں نہیں چلے آئے؟''

''نہیں......تمہارا ہی نام رام پیاری ہے نا؟''

''ہاں!......تم کون ہو؟''

جسّے نے ناک سکیڑ کر جواب دیا:

''میرا نام جسا ہے۔ مجھے چاچا نے تمہارے یہاں بھیجا ہے۔''

''کون ہے تمہارا چاچا؟''

''بگا سنگھ!''

یہ نام سن کر رام پیاری کے منہ کا سائز بالکل گول سا ہو گیا......جیسے وہ سیٹی بجانے جا رہی ہو۔ پھر اس نے آواز دی:

''منگل! ارے منگل!''

منگل دُبلی بکری کی طرح چھلانگ لگا کر باہر نکل گیا۔ ایک ہاتھ سے پنی ٹوپی کو دائیں طرف کھسکاتے ہوئے پوچھنے لگا:

''کیا ہے دیدی؟''

رام پیاری نے بالٹی اور کمنڈل کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''انہیں بھیتر لے جاؤ اور اپنے برتنوں میں دودھ اور لسی اُنڈیل کر خالی بالٹی اور کمنڈل اس لڑکے کو واپس کر دو۔''

منگل نے ہونٹوں پر زبان گھمائی اور دونوں برتن اُٹھا کر بھیتر چلا گیا۔ رام پیاری نے کہا:

''تمہارے چاچا نے اتنی تکلیف کا ہے کو کی؟''

''میں نہیں جانتا۔'' جسّے نے پٹاخ سے جواب دیا۔

رام پیاری اس کے اس جواب پر مُسکرا دی، بولی:

''اس وقت تمہارا چاچا کہاں ہے؟''

''گھر پر......طویلے میں۔''

''اوا!''

جسّے کو اتنے قریب سے رام پیاری بہت اچھی لگی۔ اس کی آواز بھی سریلی تھی اور وہ باتیں بھی بڑی ادا سے کرتی تھی۔

منگل دونوں برتن خالی کر کے لے آیا تو رام پیاری بولی:

''انہیں پانی سے دھو لینا۔''

منگل نے یہ کام بھی بڑی پھرتی سے کیا۔ جسا برتن اٹھا کر چلنے لگا، تو اس کے کانوں میں رام پیاری کی چوڑیوں کی کھنک کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنا کومل ہاتھ اُٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کرتی ہوئی کہہ رہی تھی:

''ذرا ٹھہرو!''

رام پیاری کمرے کے بھیتر گئی اور ایک طشتری میں بُھنی ہوئی گیہوں کے مرونڈے، کھانڈ کا بنا ہوا گٹا اور چینی کی چوکور مٹھائی کے ٹکڑے لے کر لوٹ آئی اور جسّے سے کہنے لگی: ''یہ لو۔''

جسّے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مٹھائی کو کس چیز میں لے اگر برتن نہ بھی سامنے ہوتے تو اتنی مٹھائی اس کے دونوں ہاتھوں میں نہیں سما سکتی تھی۔ اس کا دماغ بڑا تیز تھا۔ اس نے جھٹ سے ایک ترکیب نکال لی۔ اپنے کرتے کے اگلے پلو کے دونوں کونوں کو ملا اس نے ایسے انداز سے ان کو گانٹھ لگائی کہ جھولی سی بن گئی۔ اس جھولی میں پوری مٹھائی سما گئی۔

رام پیاری اس کی یہ ترکیب دیکھ کر مسکرا دی۔ جسّے نے پوچھا:

''یہ مٹھائی چاچا کو دینی ہے؟''

اس کی اس بات پر رام پیاری بے اختیار ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس نے بڑی ادا سے ہنسی روکنے کے لیے کومل ہاتھ کو اُلٹی طرف سے منہ پر رکھ لیا اور کہنے لگی:

''نہیں، یہ مٹھائی تمہارے لیے ہے۔ تم اس راستے میں ہی کھا لینا۔ چاچا سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا، سمجھے نا؟''

جسّے نے ذرا جھینپ کر سر ہلا دیا۔ خالی برتن اُٹھا کر وہ ڈیوڑھی میں گھسا، اور جب گلی کے دروازے تک پہنچا تو اس کے کان میں پھر وہی سریلی آواز سنائی دی۔

''ذرا رُکو۔''

جسا رُک گیا۔

رام پیاری لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اسے اپنے ایک بازو میں لپیٹ لیا۔ عورت کے گُدگُدے بھرپور جسم کے لمس سے جسا بھیتر ہی بھیتر کانپ سا گیا۔ رام پیاری نے اس کے کان کی طرف منہ بڑھایا تو اس کے بوجھل بال آگے کو جھک پڑے اور ان میں لگے تیل کی مہک سے جسّے کے دماغ پر نشہ سا چھانے لگا۔ وہ پھسپھسا کر بولی:

''چاچا سے کہنا کہ کبھی درشن بھی تو دیں...... چپکے سے۔''

جسا کچھ الجھن میں پڑ گیا۔ چاچا نے بھی چپکے سے، کہا تھا اور رام پیاری سے بھی ''چپکے سے'' کا استعمال کر رہی تھی۔

رام پیاری نے شاید اس کی اُلجھن دُور کرنے کے لیے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''اب تم جاؤ۔''

جسا دروازے کے باہر نکل گیا اور رام پیاری اسے دروازے کی درار میں سے اسے گلی کے نکڑ پر غائب ہوتے دیکھتی رہی۔

جسے نے ایک ہاتھ میں خالی بالٹی اور کمنڈل کو لٹکالیا اور دوسرے ہاتھ سے جھولی میں سے مٹھائی کے دانے نکال نکال کر منہ میں پھینکنے لگا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا، تاکہ گھر پہنچتے تک مٹھائی ختم ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ گھر کے قریب پہنچ گیا لیکن اس کی جھولی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے ساتھ چل رہا تھا۔ ریتلی زمین تھی، اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے نیچے نرم سی چادر بچھی ہوئی ہے۔

وہ بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ مٹھائی کے دانے چبا رہا تھا۔ اس کی نظر دُور کھیتوں...... اور ان سے بھی پَرے مقام پر جمی ہوئی تھی۔ کبھی وہ آکاش کی طرف دیکھنے لگتا، جہاں گدھ اور چیلیں اُڑ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے رام پیاری کی صورت اس کی من کی آنکھوں کے سامنے اُتر آئی۔ وہ کیسے باتیں کرتی تھی، کیسے ہنستی مسکراتی، کیسے اپنے کومل ہاتھوں کو ہلا ہلا کر باتیں کرتی تھی۔ وہ زیادہ کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن کل ملا کر رام پیاری اسے گاؤں کی دوسری عورتوں سے بالکل مختلف لگی...... اور اچھی بھی۔ اس کے گھنے بالوں میں سے نکلنے والی سگندھ نے اس کے دماغ کو تر کر دیا تھا۔ اب تک اسے زندگی میں صرف دُرگندھ کا تجربہ ہوا تھا لیکن آج پتا چلا کہ ایسی سگندھ بھی ہوتی ہے، جس سے نشہ چھا جاتا ہے۔

آج جو کچھ اس نے کیا تھا اس میں اس کو گہرے راز کا تجربہ ہو رہا تھا۔ چاچا نے اسے چپکے سے لسی اور دودھ رام پیاری کے گھر پہنچانے کو کہا تھا اور ادھر رام پیاری نے ایک پیغام چپکے سے چاچا تک پہنچا دینے کو کہا تھا۔ وہ ان معاملوں کو ٹھیک سے سمجھتا نہیں تھا، پھر بھی اپنے من کی گہرائی میں انوکھی سی گدگدی اور سنسنی محسوس کر رہا تھا......

جسے کو پتا ہی نہیں چلا کہ مٹھائی ختم ہو جانے پر بھی وہ جہاں کا تہاں بیٹھا رہا۔ وہ اسی وقت چونکا جب اس کے کانوں میں ایک کٹھور آواز سنائی دی۔

''جسُو! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟''

جسُو نے سر اُٹھا کر دیکھا، جیسے وہ اپنے آپ کو وشواس دلانا چاہتا ہو کہ اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی تھی۔ بگے کو سامنے پا کر وہ ہڑبڑا اُٹھا، اور اسکے منہ سے نکلا: ہاں چاچا۔''

بگے نے اس کا کان اپنی چٹکی میں دبایا اور کہا:

''ہاں چاچا کے بچے! میں نے تمہیں کام سے بھیجا تھا۔''

''چاچا! میں لسی اور دودھ پہنچا آیا۔''

بگے نے دیکھا کہ خالی بالٹی اور کمنڈل قریب ہی لڑھکے پڑے ہیں۔ اس نے گھور کر کہا:

''ابے وہاں پہنچا آیا ہے کہ خود ہی سب کچھ کھا پی گیا ہے؟''

یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ جسا اتنا مکھن، دودھ، لسّی ہڑپ کر سکتا تھا اور ہضم بھی کر سکتا تھا۔ اس نے چاچا کو وشواس دلاتے ہوئے کہا:

''چاچا تم خود پتا لگا لو...... میں ابھی ابھی سب چیزیں پہنچا آیا ہوں۔''

اسے پل دو پل گھورنے کے بعد چاچا کو وشواس ہو گیا کہ بھتیجے نے اس کا کام پورا کر دیا ہے۔ اس کے پوچھ تاچھ کرنے پر جسے نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ رام پیاری کے گھر پر کیا کیا ہوا۔ ساری کہانی سُن کر بگے کے مَن کا باقی ماندہ شک بھی دُور ہو گیا۔ آخر جسُو یہ سب باتیں من سے گڑ کر تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ آخر بگا بولا:

''بچو! جب میں نے تمہیں ایک خاص کام پر بھیجا تھا، تو تمہیں لوٹ کر بتانا تو چاہیے تھا کہ تم کام پورا کر آئے ہو۔ میں گھر میں تمہارا انتظار کرتا رہا اور تم یہاں بیٹھ گئے۔''

''میں مٹھائی ختم کرنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔''

''مٹھائی! مٹھائی کہاں سے ملی؟''

''رام پیاری نے خوش ہو کر مجھے مٹھائی دی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ مٹھائی چاچا کو دے دوں، تو اس نے کہا کہ نہیں، یہ تم خود ہی کھا لینا۔''

بات چیت کے اس دلچسپ موڑ پر چاچا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسے مٹھائی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس نے پوچھا:

''تو کیا رام پیاری نے کوئی اور بات بھی کہی تھی؟''

اب یکا یک جسّے کو محسوس ہوا، کہ اس نے سب سے اہم بات تو بتائی ہی نہیں تھی۔ بولا:

''رام پیاری نے کہا تھا کہ اپنے چاچا کو ہماری طرف سے کہنا کہ کبھی خود بھی تو درشن دیں۔''

جسّے نے دیکھا کہ یہ بات سُن کر اس کے چاچے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لگتا تھا، کہ چاچا بھتیجے سے ہی بہت خوش تھا۔ بگے کے دونوں گھٹنے جھک گئے اور اس نے اپنا چہرہ جسّے کے چہرے کے قریب لا کر پوچھا:

''کچھ اور بھی پوچھا تھا اس نے؟''

جسا آنکھوں کی پتلیاں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا اور پھر یکا یک ہی بول اٹھا:

''رام پیاری نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں تمہیں یہ بات چپکے سے بتاؤں۔''

چاچا کی باچھیں کھل گئی۔ سیدھی کھڑے ہونے سے پہلے چاچا نے جسّے کی کمر پر پیار سے تھپڑ مارا اور بولا:

''چل، سور دا (کا) پتر۔''

جسّے کو یہ پتا تو چل گیا کہ چاچا نے خوشی میں دھپ جمایا تھا لیکن وہ دھپ بھی اتنا کرارہ پڑا تھا کہ ہنسی اس کے ہونٹوں تک نہیں آسکی۔ پھر بھی وہ گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ بالٹی اور کمنڈل ایک دوسرے ٹکرا ٹکرا کر شور مچار ہے تھے۔

گھر کے صحن میں بَھجّو ادھر اُدھر کے کاموں میں مصروف دکھائی دی۔ جسّے کو سامنے پا کر اس نے پوچھا:

''کہاں گیا تھا رے چھوکرے؟''

جسّے کو معلوم نہیں تھا کہ بُوا، اسے مکان سے باہر جاتے ہوئے دیکھ چکی تھی، بولا:

''کہیں نہیں بُوا۔''

''کیوں رے، مجھے بیوقوف بنا رہا ہے؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تُو رام پیاری کے پاس گیا تھا۔ آج تُو چاچے کا سگا بن بیٹھا۔ وہی چاچا جو تجھے صرف مارنا پیٹنا ہی جانتا ہے۔ میں تیری اتنی دیکھ بھال کرتی ہوں، تجھے دودھ مکھن کھلاتی ہوں، گھی کھانڈ کی پوری کھلاتی ہوں، تو مجھ ہی سے جھوٹ بولتا ہے؟''

جسّے نے اپنی بھول کو محسوس کر لیا۔ وہ جھینپ گیا اور اس نے پوری کہانی سنا دینے کے بعد کہا:

''لیکن چاچا کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''نہیں رے! وہ تو تیری چمڑی اُدھیر کر رکھ دے گا۔ تجھے پٹتے دیکھ کر مجھے کوئی خوشی تو نہیں ہوتی...... جا! ٹوکری میں سے روٹی اُٹھا لے۔ تیرے لیے دہی اور مکھن الگ ٹوکرے میں پڑا ہے۔''

مٹھائی کھا لینے کے باوجود جسّے کی بھوک جوں کی توں موجود تھی۔ اس نے ایک مٹھی بھورا کھانڈ دہی کے کٹورے میں ڈالی، اسے اُنگلی سے ہلایا اور جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔

بوا نے لاڈ سے پوچھا:

''کیوں رے جسّے! آج شام کو میرے ساتھ چلے گا؟''

''کہاں بوا؟''

''مکھن سنگھ کے لڑکے کی شادی ہونے والی ہے۔ آج کل ان کے گھر میں ہر رات ڈھولک بجائی جاتی ہے اور شادی کے گیت گائے جاتے ہیں۔''

''میں وہاں کیا کروں گا؟''

''ارے، وہاں تیری عُمر کے لڑکے اور لڑکیاں آئیں گی۔ تُم ان کے ساتھ کھیلتے رہنا۔ وہیں پر کھانے کو دو روٹیاں بھی مل جائیں گی۔ گھر پر رہ کر کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ چاچے کی جھڑکیاں کھائے گا۔''

جسا چاچے کی جھڑکیاں کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی بُوا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا لیکن اسے

چاچا کی بھی فکر تھی۔ پوچھا:

''اگر چاچے نے منع کر دیا تو؟''

''چاچا منع کیسے کرے گا؟ تُو تو میرا لاڈلا ہے۔ اس مورکھ کو تجھ سے اتنا پیار تو نہیں ہے کہ وہ تجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہے گا۔''

شاید جھجو کو اپنے بھائی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی تنہائی کو بھلانے کے لیے جسُو کو بیٹے کی طرح پیار کرنے لگی تھی، لیکن آج اسے محسوس ہوا کہ اس کے بھائی نے جسُو کو اپنا راز داں بنا لیا تھا۔

جسا بولا:

''ٹھیک ہے بُوا............ جیسا تم کہو گی، میں ویسا ہی کروں گا۔''

بُوا کھل اُٹھی، اور دُور سے ہی بھتیجے کی بلائیں لیتے ہوئے بولی:

''یہ ہوئی نا قاعدے کی بات!...... آخر بیٹا کس کا ہے؟''

جب دن میں بگا سنگھ بھوجن کرنے آیا تو جھجو نے کہا:

''تمہارے لیے رات کو روٹی پکا کر رکھ جاؤں گی۔ نکال کر کھا لینا۔''

بگے کے ماتھے پر اتنے بل پڑ گئے کہ لگتا تھا، جیسے اس کے ماتھے میں کئی دراڑیں آ گئی ہیں۔ بولا:

''تم شام کو کہاں جا رہی ہو؟''

''مکھن سنگھ کے لڑکی شادی ہے نا! آج کل انکے یہاں گانا بجانا ہو رہا ہے، وہیں جاؤں گی۔''

''جانا ضروری ہے کیا؟''

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟...... کل تمہاری شادی رچاؤں گی، سو مجھے بھی تو سب کو بلانا پڑے گا، ورنہ یہاں گیت کون گائے گا، سنسان آنگن کو دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ عجیب شادی ہے...... نہ ڈھولک نہ بیاہ کے گیت۔''

بگے کا منہ بند ہو گیا۔

لگے ہاتھ جھجو نے بتا دیا:

''جسُو بھی میرے ساتھ جائے گا۔''

بگے نے اپنا منہ بھینچ کر اور بھی بند کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ جھجو جو کہہ رہی تھی، سو کر کے رہے گی۔ یوں بھی اسے جسُو کی شکل اتنی پیاری نہیں لگتی تھی، کہ وہ اسے جھجو کے ساتھ جانے سے روک دیتا۔

شام کو جھجو نے جسُو سے کہا: ''لو بیٹا اب تیار ہو جاؤ۔''

تیار ہو جانے والی یہ بات جسے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ شادی والے گھر میں جانے کے لیے گھوڑے پر کاٹھی کسنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بس انہیں جوں کا توں چل دینا تھا۔ جسا یہی سمجھ بیٹھا تھا لیکن اس کی بُوا کا ارادہ کچھ اور تھا۔

عموماً جسا ایک کرتا اور ایک تُہمد پہنا کرتا تھا۔ سر پر پگڑی بہت کم باندھتا تھا۔ چھیتڑا نما بُوا کا پُرانا دوپٹہ پگڑی کے طور پر سر پر لپیٹ لیتا۔ عموماً وہ ننگے سر ہی رہتا۔ اس کے جُوڑے پر رنگین پھندنے والی جالی کس کر بندھی رہتی تھی۔ لگتا ہے کہ آج بُوا اسے انسان کا بچہ بنانے پر تُلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے جسُو کے لیے کھدر کا ایک پاجامہ تیار کیا تھا۔ وہ اس کے لیے گھٹیا ململ کی ایک پگڑی بھی خرید لائی تھی، جسے اس نے نیلے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دُھلی ہوئی قمیص کی تہہ جما کر پاجامے پر رکھ دی گئی تھی۔ طرّہ کہ جسُو کے لیے دیسی جوتا بھی تیار ہو چکا تھا۔

جب جسّے نے یہ سارا سامان دیکھا تو اس کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ عام لڑکوں کی طرح اسے بھی اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ اس نے کبھی اس بات کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

بُھجو اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ لیکن لڑکے کے کا چہرہ نئے جوتے کے چمڑے کی طرح تھا، اکڑا اور جذبات سے عاری، لیکن جس بے صبری سے اس نے جوتے کی طرف پاؤں بڑھایا، اس سے اس کے من کی بے صبری کا پتا چلتا تھا۔ یکایک اس نے پاؤں پیچھے ہٹا کر جوتا ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ پتھر کی طرح بھاری اور سخت تھا۔ جوتے کی نوک سے ایک لمبی سی چمڑے کی مونچھ اوپر کو اُٹھ کر پیچھے کی طرف گھوم گئی تھی۔

بُھجو لاڈ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی:

''بیٹے، پہلے پاجامہ پہن لو۔ میل کے مارے اس کچھے کو اُتار کر کونے میں ڈال دو۔ میں اسے صابن میں اُبال کر دھوڈالوں گی۔''

جسّے نے چپ چاپ نیا پاجامہ اور دُھلا ہوا کُرتا اُٹھایا اور بھیتر والے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا، تو اسے دیکھ کر بُوا کا من گدگد ہوا اُٹھا۔ اس نے پگڑی سنبھالتے ہوئے کہا:

''آج تجھے میں پگڑی باندھوں گی۔ تُو بالکل دیہاتیوں کی طرح پگڑی کو اُبڑ کھبڑ سر پر لپیٹ لیتا ہے، پگڑی ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ گوردوارے کے گرنتھی جی باندھتے ہیں۔ تو بھی اسی طرح پگڑی باندھنا سیکھ لے۔''

بُھجو نے جما جما کر پگڑی باندھ دی۔ جسّے نے شیشے میں جھانک کر دیکھا، تو سچ مُچ ہی پگڑی بڑے ٹھسّے کی نظر آرہی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ اور کنپٹی کی سیدھ میں پگڑی کے اوپر چھوٹا سا شملہ مرغے کی کلغی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گدی کے نیچے سے ایک ایسا لمبا سا شملہ نکل کر دائیں کندھے سے ہوتا ہوا نیچے کو لٹک رہا تھا۔ جسّے نے سوچا کہ چلو یہ تو اچھا ہوا، اس لمبے سے شملے سے وہ اپنی ناک پونچھ لیا کرے گا مگر پگڑی اتنی کس کر بندھی ہوئی تھی، کہ جسّے کو لگ رہا تھا، جیسے اس کا سر لوہے کے شکنجے میں کس گیا ہے۔

اب جوتوں کی باری تھی۔

نئے جوتوں میں پاؤں گھسیڑ کر وہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جوتے بڑے بوجھل تھے اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کے پاؤں کیلوں سے کچے فرش میں گاڑ دیے گئے ہوں۔ اگر چہ اس کے پاؤں بہت سخت تھے، پھر بھی

ہڈی ماس کے بنے ہوئے تھے، جوتے صرف پتھر تھے۔
بُھجو نے اس کی یہ حالت دیکھ کر پوچھا:
''کیا جوتے کاٹتے ہیں؟''
ابھی جسّے کو جوتوں کے کاٹنے کی فکر نہیں تھی، اسے پریشانی یہ تھی کہ جوتوں میں لچک نام کو بھی نہیں تھی۔ بُھجو اس کی مصیبت کو سمجھ گئی۔ وہ سرسوں کے تیل والا بڑا دِیا اُٹھا لائی اور اس نے جوتوں کو بھیتر سے تیل لگا لگا کر اچھی طرح چُپڑ دیا کہا:
''اب جوتوں میں پاؤں ڈالو تو۔''
جسّے نے پھر سے جوتے پہنے تو اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس موقع کے لیے بُوا بھی خوب سج دھج گئی۔ اس نے لٹھے کی شلوار نکالی، جسے آج ہی نیل میں بھگو کر سکھایا گیا تھا۔ نیل کا رنگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک سا بھی تو نہیں لگا تھا کہیں گہرے دھبے تھے اور کہیں بڑا ہلکا رنگ تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، شلوار تھی تو لٹھے کی۔ دوپٹے کے اوپر بُھجو نے اپنی پُرانی پھلکاری اوڑھ لی۔
اس طرح سج دھج کر بُوا اور بھتیجا گھر کے باہر نکلے۔ جوتوں کی وجہ سے جسّو ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کی ٹانگیں لکڑی کی طرح کھڑی ہو گئی ہیں۔ وہ ہر قدم تول تول کر رکھ رہا تھا۔ جیسے اسے لڑکھڑا کر گر جانے کا خوف ہو۔
طویلے کے احاطے میں کھڑے بگّے نے اسے اس انداز سے چلتے دیکھا، تو اس کی ناک سے بُل ڈاگ کے غرّانے کی سی آواز نکلی، اور وہ دھیرے بولا:
''حرام زادہ کہیں کا۔''
بیاہ والے گھر میں ابھی ڈھولک بجنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں تو ابھی عورتوں کے اکٹھے ہونے کا وقت ہی نہیں ہوا تھا۔ مکھن سنگھ کی پتنی سے بُھجو کی کچھ زیادہ ہی پٹتی تھی، اس لیے اس نے اسے جلدی آنے کو کہہ دیا تھا۔
مکھن سنگھ کی پتنی نے بُھجو کو خوش کرنے کے لے جسّو پر کچھ زیادہ ہی لاڈ دکھایا۔ پھر وہ بھیتر گئی اور دو مٹھیاں بھر نُگدی لے آئی۔ بیسن کی موٹی سویوں پر کھانڈ چڑھا کر نُگدی بنائی جاتی تھی۔ جسّا جھولی میں نُگدی ڈلوا کر اپنا کُرتا خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملا کر ساری نُگدی لے لی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے کھائے کیسے۔ بُوا نے یہ حالت دیکھی، تو جھٹ سے مٹی کی ہانڈی کا ڈھکن اس کی طرف بڑھا دیا۔ جسّے نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے نُگدی کھانے لگا۔ ایسا کرتے وقت اس کے جبڑے کسی اوزار کی طرح برابر چلتے جا رہے تھے۔ وہ اتنے زور شور سے منہ ہلا رہا تھا جیسے وہاں وہ نُگدی کھانے کے مقصد سے ہی آیا تھا۔
بُھجو اور مکھن سنگھ کی پتنی اور بیٹیوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ جب گانے والی لڑکیاں اور عورتیں آئیں تو انہیں کہاں بٹھایا جائے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ پسار میں ہی فرش پر کھیس بچھا دیے جائیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر الگ الگ رنگوں کے کھیس بچھ گئے۔ بھیتر کے کمرے میں کھونٹے پر ڈھولک لٹک رہی تھی، جس پر منوں دھول جمی

ہوئی تھی۔ مکھن سنگھ کی ایک لڑکی کھونٹے سے ڈھولک اُتار لائی، اور ایک بوری کے ٹکڑے سے اسے گھس گھس کر صاف کرنے لگی۔ ڈھولک بالکل ڈھیلی پڑی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کے چمڑے آپس میں سُتلی کی رسّی کے ذریعے بندھے ہوئے تھے، لیکن ابھی انہیں کسنے کی ضرورت تھی۔ چھوٹی بہن رسیوں میں پڑے ہوئے لوہے کے چھلوں کو کسنے لگی، تو بڑی بہن نے ٹوک کر کہا:

''ٹھہرو! یہ کام باّو کرے گی، تم بالکل اناڑی ہو، کہیں کوئی اور گڑبڑ نہ کر دینا۔''

چھوٹی کو یکا یک ہی ایک بات یاد آئی تو بولی:

''ڈھولک کے لیے روڑے کی بھی ضرورت ہوگی۔''

یہ تو بہت ہی اہم بات تھی۔ بڑی بہن بولی:

''ہاں ہاں جا، کہیں سے اچھا سا روڑا ڈھونڈ لا۔ روڑا نہ ملے تو ٹھیکری ہی لے آنا۔''

چھوٹی بہن شلوار پھڑ پھڑاتی پسار کے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد سُندر سا روڑا لے آئی۔ بڑی بہن نے روڑا دھو کر اور کپڑے سے پونچھ کر ڈھولک کے پاس رکھ دیا۔

دھیرے دھیرے عورتیں جمع ہونے لگیں، کچھ لڑکیاں بھی آ گئیں۔ آپس میں ہنسی ٹھٹھوں اور باتیں ہونے لگیں۔ ایک عورت کو خیال آیا تو بولی:

''اب تو ڈھولک پر تھاپ پڑنی چاہیے۔''

مکھن سنگھ کی بڑی لڑکی نے جواب دیا:

''ہم باّو کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہی چھلے کسے گی اور ڈھولک بجائے گی۔''

کونے میں سے ایک عورت ناک پر اُنگلی رکھ کر بولی:

''اَری باّو کیا، خاک ڈھولک بجائے گی۔''

یہ بات سُن کر سب عورتیں یوں حیران سی رہ گئیں، جیسے انہوں نے کوئی انہونی سی بات سُن لی ہو۔ دوسری عورت سنبھل کر بولی:

''ہائے ہائے، کرتارو دی بے بے! بھلا باّو بھی ڈھولک نہیں بجا سکتی تو اور کون بجائے گی؟ باّو کا تو گاؤں بھر میں کوئی جواب نہیں ہے۔''

کرتارو کی ماں، جس نے بات اُٹھائی تھی۔ پھر بولی:

''جب تک گاؤں میں کوئی اور ڈھولک بجانے والی نہیں تھی، تب تک باّو اندھوں میں...... کانی رانی بنی رہی۔''

دوسری عورت نے چڑ کر اور جھلّا کر کہا:

''ہائے، تو تم ہی بڑا لونا، اپنی کسی ہوتی سوتی کو، ذرا دیکھیں تو...... باّو سے بڑھ کر ڈھولک پیٹنے والی کون ہے، ہمارے گاؤں میں۔''

کرتارو کی بے بے گرم ہو کر بولی:

''ہے کیوں نہیں......اس کا نام رام پیاری ہے۔''

''وہی عورت جو کچھ دن پہلے ہمارے گاؤں میں آئی ہے؟ وہ دیکھنے میں بھی کتنی سُندر ہے۔ چڑیا کی طرح ہلکی پھلکی، گلی میں نظر آ جائے تو یوں لگتا ہے، جیسے چھوٹے چھوٹے قدموں سے ناچتی کو چلی آ رہی ہو۔''

''ہاں بھئی! اگر اسے ڈھولک بجاتے سُن لو، تو بس طبیعت خوش ہو جائے۔''

''اُسے بلائے کون؟ اگر ہم میں سے کسی کا اس کے یہاں جانا ہے، تو وہی اس کو بلا لائے۔''

اس بات پر سب عورتیں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔ ان میں سے ایک دو رام پیاری کو جانتی تھیں۔ لیکن جس عورت کا نہ پتی ہو، نہ بچے، اس کے گھر کون آئے جائے۔ جو اسے پسند بھی کرتی تھیں، وہ اس کے گھر جانے سے کتراتی تھیں۔

یہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں بھجو بولی اُٹھی:

''میں کہتی ہوں، کہ کسی عورت کے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا جسّا جا کر اسے بلا لائے گا۔''

جسّے نے اپنا ذکر سُنا تو پہاڑی بکرے کی طرح سر اوپر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ایک عورت نے پوچھا:

''تو کیا جسّا اکثر اس کے یہاں جایا کرتا ہے؟''

بھجو بولی:

''بھلا یہ کیا کرنے جائے گا! میں نے ہی آج اس کے ہاتھ......رام پیاری کے یہاں دودھ اور لسّی بھجوا دی تھی۔ سُنا ہے کہ لالہ بالمکند کہتے ہیں کہ بے چاری ہندوستان کی رہنے والی ہے اور بہت دُکھیاری ہے......ایسی بے سہارا کی مدد کرنا ہم سب کا فرض ہے۔''

سب عورتوں نے تعریف کی۔ دو پل بعد جسّا دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوئے گلی میں چل دیا۔ نئے اور بھاری بھرکم جوتوں نے جیسے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اندھیرے میں پہنچا تو اس نے چپکے سے جوتے اُتار کر بغل میں دبا لیے اور تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ رام پیاری کے دروازے پر پہنچ کر، پہلے تو اس نے بغل سے جوتے نکال کر پاؤں میں پہنے اور پھر کُنڈی کھٹکھٹا دی۔

دروازہ کھلا، تو منگل کی شکل دکھائی دی۔ اس نے جسّے کو پہچانا نہیں۔ وہ ہیجڑوں کی طرح ٹھٹھک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بگلے کی طرح جسّے کی طرف یوں گردن بڑھائی، جیسے وہ انسان کا نہیں، اُونٹ کا بوتا (بچہ) ہو۔ جسّے پر اس کی ان حرکتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنی پگڑی کے اُوپر کو، اُٹھے ہوئے شملے کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے بولا:

''بھیتر جا کر کہہ دو کہ جسّا آیا ہے۔''

منگل نے گُدّی پر لٹکے ہوئے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

''کون جَسا؟''

''میں آج ہی صبح لسّی کی بالٹی اور دُودھ کا کمنڈل لایا تھا۔''

منگل کے مُنہ سے بے اختیار ہی نکل گیا:

''اُوئی رام!''

منگل لپک کر ڈیوڑھی کے آلے میں رکھے ہوئے مٹی کے دیئے کو اُٹھا لایا اور اسے جسّے کے چہرے کے چاروں طرف یوں گھمانے لگا، جیسے اس کی آرتی اتار رہا ہو۔ اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد بولا:

''بھیتر چلے آؤ نا! تم تو گھر کے ہی آدمی ہو۔''

پسار میں بیٹھی رام پیاری بھی دُور سے جسّے کو پہچان نہ سکی۔ وہ پگڑی، اُجلا کرتہ، نیا پاجامہ اور پھر سب پر طرّہ یہ کہ تیل سے چمکتے ہوئے جوتے پہنے تھا۔ اپنی جیسے کاٹھ کی بنی ٹانگوں پر عجیب ڈھنگ سے چلتا ہوا، جسا جب قریب پہنچا، تو رام پیاری کی تیز آنکھوں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ پیڑھے سے اُٹھ کر دو قدم آگے بڑھ کر بولی:

''ارے جسّے! چلا آ رے، جھجک کس بات کی ہے؟''

رام پیاری نہیں جانتی تھی کہ اپنی طرف سے جَسا باقاعدہ چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے جوتوں نے مصیبت کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے کہہ بھی دیا:

''جوتے نئے ہیں نا؟...... ابھی ٹھیک سے چلا نہیں جا رہا۔''

چلنے میں اس کی یہ پریشانی دیکھ کر رام پیاری کہہ اُٹھی:

''ارے میں واری جاؤں...... یہ جوتے پہننا کیا بہت ضروری ہے؟''

جسّے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

رام پیاری نے پہلے تو جسّے کا ہاتھ تھاما، اور پھر لاڈ سے اسے گلے سے لگا لیا، جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔ جسّے کو آج تک کسی لنگڑے لُولے، بوڑھے کھوسٹ نے بھی گلے سے نہیں لگایا تھا۔ آج دوسری بار خوشبوؤں سے لدی ہوئی عورت اسے اپنی بانہوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ جسّے کا دِل تو بچوں کا سا ہی تھا۔ صبح کی طرح اب بھی رام پیاری کے جسم کا لمس اسے بھلا بھی لگا، لیکن وہ ہچکچا بھی رہا تھا۔ کم سے کم اس نے رام پیاری سے تعاون نہیں کیا۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا۔ رام پیاری نے اپنی کومل اُنگلیوں سے اس کی ٹھوڑی دبا کر کہا:

''کیوں رے، آج تو بڑے ٹھاٹھ میں، دکھائی دے رہا ہے۔''

جَسا مَن ہی مَن جھینپ گیا۔ اسے لگا، جیسے رام پیاری یہ سمجھ رہی تھی کہ صرف اسی سے ملنے کے وہ اتنے ٹھاٹ باٹ سے اس کے پاس آیا تھا۔ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے بولا:

''آج ہمیں شادی والے گھر جانا تھا، اس لیے بُوا نے مجھے نئے کپڑے پہنا دیے۔''

رام پیاری کی باچھوں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی، بولی:

''ہائے رے، تو ان کپڑوں میں کتنا سُندر لگتا ہے۔''

رام پیاری کی اس بات پر جسّے کا دماغ بالکل ہی چکر کھا گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ پایا۔ صرف ناک سُڑک کر رہ گیا۔

رام پیاری نے اس کے سیدھے لیکن ڈھیلے ڈھالے جسم کو ایک بار پھر ذرا سا بھینچتے ہوئے پوچھا:

''کیا اپنے چاچا کا کوئی پیغام لایا ہے؟''

''نہیں!''

جسّا کو لگا کہ اس کے 'نہیں' کہہ دینے سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو ذرا پیچھے ہٹا کر بولی:

''میں تو سمجھے بیٹھی تھی کہ تو خاص طور پر چاچا کا پیغام لے کر میرے پاس آیا ہے...... تو کیا تُو نے اپنے چاچا سے میری والی بات نہیں کہی تھی؟''

جسّا اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرنے لگا۔ جلدی سے بولا:

''میں نے چاچا سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود بھی تو ملنے آئے...... چپکے سے کہا تھا۔''

رام پیاری طبیعت سے بھی خوش مزاج تھی۔ جسّے کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی:

''تو پھر تیرے چاچا نے کیا کہا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

رام پیاری اپنی ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر بولی:

''کچھ تو کہا ہوگا ذرا سوچ کر بتانا۔''

جسّے نے کچھ سوچا اور پھر بولا:

''تمہارا پیغام سُن کر چاچا نے میری کمر پر زور کا تھپڑ مارا اور کہا: چل! سور دا پُتر......''

یہ سُن کر رام پیاری مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ جب کچھ سنبھلی تو پوچھا:

''تو کیا تُو مجھے اپنے نئے کپڑے دکھانے آیا ہے؟...... بڑے سُندر ہیں...... مٹھائی کھائے گا؟''

جسّے کو بڑی شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ نئے کپڑے دکھانے یا مٹھائی کھانے نہیں آیا تھا۔ اس نے اصلی پیغام بھی تو نہیں دیا تھا۔ رنگ رنگیلی رام پیاری کے قریب پہنچ کر وہ اپنے آپ کو ہی بھول گیا تھا...... بھلا پیغام دینا کیسے نہ بھولتا۔

اب اس نے اور زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا، بولا:

''تمہیں بُوا نے بلایا ہے۔''

''تمہاری بُوا جھجو ہی ہے نا؟''

''ہاں!''

رام پیاری کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا پرکاش جھلکنے لگا، مگر جب اسے پتا چلا کہ جھجو نے اپنے گھر نہیں، بلکہ مکھن سنگھ کے برھ بلایا تھا، تو اسے پھر کچھ مایوسی ہوئی۔ بولی:

"وہاں میرا کیا کام؟"

"ڈھولک بجانے کے لیے بلایا ہے۔"

"ڈھولک؟ مکھن سنگھ کے لڑکے کی شادی ہے نا بیاہ کے گیت گائیں جائیں گے۔"

"ہاں!"

"اچھا تھوڑی دیر رُک جا میں تیار ہو کر تیرے ساتھ ہی چلتی ہوں۔"

رام پیاری پچھواڑے والے کمرے میں چلی گئی۔ جسّے کے کانوں میں کپڑوں کی سرسراہٹ کا ہلکا سا شور سنائی دیتا رہا۔ اتنے میں منگل دوستانہ انداز میں اس کے قریب چلا آیا۔ جسّا اپنی ناک اوپر کو چڑھا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ منگل کے بالوں میں سے عجیب طرح کی دُرگندھ آ رہی تھی، جیسے اس نے مٹی کا تیل مَل رکھا ہو۔ رام پیاری کے بالوں کی بے ہوش کر دینے والی سگندھ کے بعد یہ دُرگندھ کیسی خراب لگ رہی تھی؟ منگل نے دانت نکوس دیے۔

رام پیاری نئے لہنگے اور رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی ہوئی جھم جھم کرتی بھیتر کے کمرے سے نکل آئی اور جسّے کے کندھے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی:

"آ رے۔"

جب وہ گلی میں چلے جا رہے تھے تو جسّے نے سوچا کہ رام پیاری "رے، رے" بہت کہتی تھی لیکن اس کے منہ سے "رے" کتنا اچھا لگتا تھا۔

اس وقت رام پیاری نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ وہ اچھے گھرانے کی سگھڑ بہو نظر آ رہی تھی۔ گلی میں سامنے سے آتے ہوئے مرد اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے انجانے میں ہی رام پیاری کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے جسّے کو فخر کا احساس ہو رہا تھا۔

جب وہ مکھن سنگھ کے گھر کے قریب پہنچے تو رام پیاری رُکی اور جسّے کے کان میں پُھسپُھسا کر بولی:

"اپنے چاچا سے کہہ دینا کہ اس نے جو ہمارے پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں اس بات پر بہت ہی دُکھ ہوا ہے...... یہ کہنا بھولو گے تو نہیں؟"

جسّے نے رام پیاری کی بڑی بڑی مدھ بھری آنکھوں میں اپنی سانپ جیسی سپاٹ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں ڈال کر جواب دیا:

"نہیں بالکل نہیں، بھولوں گا۔"

"تُو کتنا اچھا ہے رے۔"

پھر، رے...... جسّے نے اپنے آپ کو کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا لیکن رام پیاری کے کہنے سے اسے یقین ہونے لگا کہ ضرور ہی اس اس میں کوئی اچھائی ہے۔

مکان کے بھیتر پہنچے تو وہاں بیٹھی سب عورتوں کی نظریں ایک ساتھ ہی رام پیاری کی طرف اُٹھ گئیں۔ رام

پیاری کے چہرے سے خود اعتمادی جیسے ٹپک رہی تھی۔ سب نے بڑی عزت سے اسے بیٹھنے کو کہا۔ ڈھولک کے قریب اس کے بیٹھنے کو چھوٹا سا آسن بچھا دیا گیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تو کرتارو کی بے بے جو اس سے ذرا بے تکلف تھی، کہنے لگی:

''بہن سچ پوچھو، تو میں نے ہی تمہیں بلایا ہے۔''

رام پیاری نے کلّے میں پان دبا رکھا تھا۔ جب اس نے اپنا کومل منہ کھولا، تو خوشبو کی لہریں ادھر اُدھر پھیل گئیں۔ بولی:

''میں تو اپنے آپ پر سب ہی بہنوں کا حق مانتی ہوں، میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے بھلا بھیجا۔''

اس کے بولنے کے انداز پر موہت ہو کر دوسری عورت بولی:

''لیکن بہن، ہم نے تکلیف تو دی نہ آپ کو۔''

رام پیاری نے جواب دیا:

''میں تو اسے تکلیف نہیں، بلکہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔''

اس قسم کی بے تکلف باتیں ہو چکیں تو کرتارو کی ماں اصلی بات پر آ گئی:

''لڑکے کی شادی کا موقع ہے۔ میں نے سفارش کی کہ ڈھولک بجانے کے لیے تم کو بلایا جائے۔''

بلّو پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ وہ خود ہی رام پیاری سے کہنے لگی:

''میں ہی ڈھولک بجایا کرتی ہوں، سُنا ہے کہ آپ بہت ہی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں۔''

رام پیاری نے اکہرے بدن کی ہنس مکھ لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں کس قابل ہوں؟ یہ تو آپ لوگوں کی مہربانی ہے جو آپ ایسا سمجھتی ہیں۔''

بلّو نے روڑا سنبھالتے ہوئے کہا:

''آپ ڈھولک شروع کیجیے، روڑا میں بجاؤں گی۔''

رام پیاری نے چھوٹے رنگین رُومال سے باچھوں پر لگے پان کے رنگ کو پونچھتے ہوئے کہا:

''آپ کے یہاں دُوسرے ڈھنگ سے ڈھولک بجائی جاتی ہے۔ نہ جانے میں ویسی بجا بھی سکوں گی، یا نہیں۔ پہلے آپ بجایئے، تو مجھ پتا چلے کہ آپ کے یہاں کیا طریقہ ہے۔''

بلّو نے ڈھولک کو اپنے آگے گھسیٹ کر اُنگلیاں چلانی شروع کر دیں اور دُبلی پتلی ہتھیلیوں سے تھاپ دینے لگی۔

رام پیاری دو تین منٹ تک سُنتی رہی اور یہ بھی دیکھتی رہی کہ اس کی اُنگلیاں کیسے چلتی ہیں۔ تب اس نے بلّو سے کہا:

''لایئے، تو میں دیکھوں کچھ کچھ سمجھ میں تو آ گیا ہے۔''

رام پیاری نے آنکھیں جُھکا کر پہلے تو دھیرے دھیرے ڈھولک کو بجایا، اور جب ٹھیک تال پر آ گئی، تو اس نے سر پیچھے کی طرف پھینک کر اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بڑی مستی کے عالم میں ڈھولک بجانی شروع کر دی۔ اس کے کومل ہاتھ اور پتلی اُنگلیاں حرکت کرتے وقت یوں لگتی تھی، جیسے خوبصورت پرندے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے ہوا میں چک پھریاں لے رہے ہیں۔

کسی عورت نے گیت کا پہلا بول اُٹھایا۔ پھر دوسری عورتوں نے بھی اسی کی آواز کے ساتھ آواز ملا دی۔ ماحول عورتوں کے گیتوں اور ڈھولک کی آواز سے گونج اُٹھا۔

تھوڑی دیر تک جَسّا مُنہ کھولے چُپ چاپ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا مَن اُدب گیا۔ اسی درمیان کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ بڑی بُوڑھیوں نے انہیں بھیتر سے بھگاتے ہوئے کہا:

''جاؤ بھئی تم لوگ الگ سے کھیلو۔ کیوں ہمارے سر پر کائیں کائیں لگا رکھی ہے۔''

دھتکارے جانے پر بچے باہر بھاگ گئے۔ جَسّا بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ خود ہی تنگ آ گیا۔ باہر والے پسار سے بچوں کے بھاگنے دوڑنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جَسّے کے مَن میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

باہر والے پسار میں، صحن میں اور چوڑے تختوں والی سیڑھیوں پر لڑکے لڑکیوں نے ہڑ دھنگ مچا رکھا تھا۔ جَسّا ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اپنی صورت، کپڑوں اور خاص کر پگڑی کی وجہ سے اس کی اہمیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ انجان ہونے پر بھی ہر لڑکے اور لڑکی کی نظر اس پر پڑنے سے رہ نہ سکی۔ مگر وہ صرف اس کی طرف دیکھ لیتے تھے، بات چیت کسی نے نہیں کی۔

ان سب میں جَسّے سے کچھ چھوٹی ایک لڑکی بہت سُندر اور چنچل تھی۔ اس نے سب ہی سے چھیڑ چھاڑ چالو کر رکھی تھی۔ کسی کی ایک آدھ چٹکی لے کر وہ بڑے زور سے بھاگ نکلتی۔ دوسرا اس کا پیچھا کرنے لگتا، تو وہ زور زور سے چیخنے لگتی۔

اسی بھاگ دوڑ میں کبھی بچے زینے پر چڑھ جاتے، اور کبھی دھڑ دھڑاتے ہوئے نیچے اُتر آتے۔ ایک آدھ عورت اِدھر نکل آتی تو ڈانٹ کر کہتی:

''تم لوگوں نے بہت زیادہ ہڑ دنگ مچا رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک آدھ زینے سے گر پڑے......اور نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔''

بچے ڈانٹ سُن کر پل بھر کو رُک جاتے اور پھر اُسی طرح ہڑ دنگ مچانے لگتے۔ جَسّے کی آنکھیں بے اختیار اس چنچل لڑکی کا پیچھا کرنے لگیں۔ لڑکی کی آنکھیں چمکدار اور گال پھولی ہوئی کچوری کی طرح نظر آتے تھے۔ بلاشبہ وہ ان سب لڑکیوں سے کہیں زیادہ سُندر تھی۔ جَسّا چُپ چاپ اسی کی شرارتوں کو دیکھتا رہا۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے انہوں

نے آنکھ مچولی شروع کردی۔

یہ بلاّ گلا چالو رہا۔ جسّا جہاں کا تہاں کھڑا موج لے رہا تھا۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ کچوری کی سی گالوں والی لڑکی زینے پر چڑھ کر نیچے نہیں اُتری۔ اس کے نہ ہونے سے دوسرے بچوں کی چیخ چلاہٹ پھیکی پھیکی سی لگنے لگی۔

جسّا نہ رہ پایا۔ وہ ناپ تول کر قدم رکھتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پہنچ کر بھی اسے دوسرے بچوں میں وہ لڑکی دکھائی نہیں دی۔ وہ سب بھی اِدھر اُدھر دوڑ کر شاید اسی کی تلاش کر رہے تھے۔

جسّا بھی حیران تھا کہ آخر وہ چلی کہاں گئی۔ اگرچہ گاؤں کے اتنے حصے میں دس گیارہ مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں، مگر وہ کسی بھی چھت پر چلی جاتی تو چھپ نہیں سکتی تھی، کیونکہ کسی بھی چھت پر دو چار اُنگل سے زیادہ اُونچی منڈیر نہیں تھی۔

ایک بار پھر نیچے آنگن سے کسی بُڑھیا کے چلانے کی آواز آئی:

''نہ جانے ان بچوں پر کیا مستی آئی ہے...... چلو، سب لوگ نیچے اُتر آؤ ورنہ میں ابھی ڈنڈا لے کر اُوپر آتی ہوں۔''

یہ ڈانٹ سُن کر بچے باری باری زینے سے نیچے اُترنے لگے۔ یہ زینہ لکڑی کے تختوں والا نہیں تھا بلکہ کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ زینے کے اوپر چھوٹی سی چھت بھی تھی اور دروازہ بھی۔ اسے مُمٹی کہا جاتا تھا۔

دراصل وہ لڑکی مُمٹی کے اوپر چڑھ کر چھپ گئی تھی۔ مکان کی چھت سے مُمٹی کی چھت کم سے کم سات فُٹ اونچی تھی۔ اسی لیے وہ لڑکی دکھائی نہیں دی۔ مُمٹی کے پچھواڑے اُونچی منڈیر تھی، اسی پر پاؤں رکھ کر لڑکی مُمٹی پر پہنچ گئی تھی......

چھت بچوں سے خالی ہو گئی تو بھی جسّا وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اس کے من میں پریشانی سی لگی ہوئی تھی کہ آخر وہ لڑکی گئی تو گئی کہاں۔

کہیں کسی چھت سے نیچے گر کر چپ چاپ مر نہ گئی ہو، اس کے مر جانے کے خیال سے جسّا بڑا اُداس ہو گیا۔

اتنے میں اسے لڑکی کو مُمٹی سے لٹک کر اونچی منڈیر پر پاؤں رکھتے دیکھا اور پھر وہ منڈیر سے چھلانگ لگا کر چھت پر آ گئی۔ جسّا اس سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا لیکن لڑکی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی شرارت کی چمک تھی، ہنسی پھوٹی پڑتی تھی، اس کے دانت دُودھیا مکّی کے دانوں کی طرح تھے، ہنستے وقت اس کے پُھولے پُھولے گال کتنے پیارے لگتے تھے۔

جسّا اسے چُپ چاپ دیکھتا رہا، من ہی من میں وہ خوش تھا کہ وہ مری نہیں تھی۔ دیوار پر اُترنے چڑھنے سے لڑکی کے کپڑوں پر بھوسے کے تنکے چپک گئے تھے۔ وہ کپڑوں اور اُلجھے ہوئے بالوں میں پھنسے ان تنکوں کو جھاڑتی رہی اور پھر مٹک مٹک کر زینے سے اُترنے لگی۔

جَسّے کے پاؤں کچھ تو جوتوں کی وجہ سے پہلے ہی بھاری ہو رہے تھے، لیکن دل کی کیفیت کی وجہ سے اور بھی بوجھل ہو گئے...... پھر بھی کھویا کھویا سا دھیرے دھیرے وہ زینے سے اُترنے لگا۔

۲

دوسرے دن جَسّے کو چاچا نے طویلے کے کمرے میں بلایا۔ وہاں اور کوئی شخص نہیں تھا۔ چاچا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"دیکھو جُسّو! آج بھی رام پیاری کے ہاں دودھ، لسی اور مکھن دے آنا، میں نے تمہاری بُوا کو سمجھا دیا تھا۔"

اب بگا سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ جُھجُو کو سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا ہے، اب وہ اسے پورا پورا تعاون دے گی، ورنہ وہ کوئی جھگڑا اُٹھاتی۔

جَسا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چاچا کا ہاتھ بھی اس کے کندھے سے پھسل گیا۔ وہ بولا:

"چاچا! میں لسّی دینے نہیں جاؤں گا۔"

بگّے کی گھنی بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پوچھا:

"کیوں نہیں جائے گا؟"

جَسا خاموش رہا۔

بگا بگڑ کر اُونچی آواز میں بولا:

"اب میں پوچھتا ہوں کہ تُو کیوں نہیں جائے گا؟"

جَسّے نے جھکی جھکی آنکھیں اوپر کو اُٹھائیں اور منہ بنا کر بولا:

"وہ غصہ ہے۔"

"کون غصہ ہے؟"

"وہی...... رام پیاری۔"

"کیا وہ تجھ سے غصہ ہے؟ تُو نے ایسا کیا کیا؟"

اب کے بگّا ذرا پیچھے کو ہٹ گیا، بولا:

"اس سے تو آج تک میری ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے کیوں غصہ ہونے لگی؟...... کل تُو اس کے پاس سے لوٹ کر آیا تو تُو نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کہی۔"

"صبح نہیں، اس نے کل رات کہا۔"

"اب کل رات تیری اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟"

''میں اس کے گھر گیا تھا۔''

بگّے کی بھویں اوپر کو اُٹھ گئیں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بالشت بھر کے اس لونڈے کو کیا سوجھی کہ وہ رات رام پیاری کے یہاں جا پہنچا۔

جسّے نے اپنے وہاں جانے کی وجہ بتائی اور کہا:

''جب میں اور رام پیاری، مکھن سنگھ کے مکان کی طرف جا رہے تھے تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے چاچا خود ہم سے ملنے نہیں آتے، اس لیے ہم خفا ہیں۔''

یہ سن کر بگّے کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا:

''اچھا، تو یہ بات ہے...... بچُو! تو اس بات کی فکر مت کر۔''

''مگر اب اس نے مجھ سے یہی بات کہی تو میں کیا جواب دوں گا؟''

بگّے نے ڈاڑھی میں دو اُنگلیاں گھسیڑ کر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا:

''تُو اسے سمجھا دینا کہ چاچا کو آج کل بہت کام ہے، فرصت پاتے ہی وہ ضرور آئے گا...... بول، اب تو وہاں دودھ اور لسّی پہنچا آئے گا نا؟''

''ہاں!''

جسُّو لوٹنے لگا، تو چاچا نے روک کر کہا:

''تو ہر صبح لسّی دُودھ پہنچا دیا کرنا۔ چاہے میں کہوں، نہ کہوں، تم یہ کام کر ڈالنا۔''

''اچھا!''

چار دن گزر گئے۔ اپنے چاچا کے حکم کے مطابق جسا ہر صبح رام پیاری کے یہاں لسّی اور دودھ پہنچا آتا تھا۔ اس نے جب چاچے والی بات رام پیاری سے کہی تو وہ خوش ہو کر بولی:

''اچھا تو میں تمہارے چاچا کے انتظار میں رہوں گی۔''

دن کے بھوجن کے بعد سے لے کر شام تک جسُّو کو بالکل فرصت رہتی تھی۔ چاچا کھیتوں کو چلا جاتا اور اسے عموماً جھنو ہی دوپہر کا کھانا پہنچا دیتی تھی، گاؤں سے آدھے کوس پرے ان کا اپنا رہٹ تھا، رہٹ کے قریب ایک اور طویلہ تھا، گھر کے طویلے میں دودھ دینے والی بھینسیں، گائیں اور گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ باہر والے طویلے میں کھیتوں اور رہٹ میں جوتے جانے والے بیل بندھے رہتے تھے۔ جو گائے یا بھینس دودھ دینا بند کر دیتی تھی، اُنہیں بھی باہر والے طویلے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اب گھر کا سارا کام جسّے کے ذمہ تھا اور حویلی رام یا تو کھیتوں میں رہتا، یا باہر والے طویلے میں۔

جسا موقع پاتا تو سارا سارا دن موج اُڑا لیتا تھا۔ بُوا اسے لاڈ کرتی تھی، کسی بات سے ٹوکتی نہیں تھی۔ چاچا کا خوف تھا، مگر چاچا زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ کبھی جسُّو کی غیر موجودگی میں چاچا گھر آ بھی جاتا اور اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا، تو بُوا اسے یہ کہہ کر ٹرخا دیتی کہ یہیں کہیں ہوگا جسُّو!

ایک دو پہر بھوجن کے بعد جسّے کو بھجو نے کہا:

''کیوں رے لڑکے، آج تُو چاچا کو کھانا پہنچا دے گا؟''

جسّا انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

''نہیں بُوا! تم ہی جاؤ۔''

''بیٹا! آج میں تھک گئی ہوں، تُو ہی چلا جانا۔''

''نہیں بُوا! میرا جی نہیں کرتا، وہاں جانے کو۔''

اتنا تو بھجو بھی جانتی تھی کہ اس کا بھائی کتنے کٹھور مَن کا تھا اور بچوں سے تو بات تک کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس نے یُوں ہی پوچھ لیا:

''تو کیا تجھے کہیں جانا ہے؟''

''ہاں بُوا!''

''کہاں؟''

''میں نہر پر نہانے جاؤں گا۔''

''اتنی سردی میں؟ کہیں ٹھنڈ نہ کھا جانا بیٹا!''

''نہیں بُوا، بھلا دو پہر کے وقت بھی ٹھنڈ لگتی ہے؟''

''اچھا تو جا...... میں ہی تیرے چاچا کو کھانا پہنچا آؤں گی۔''

اصل میں جسّا کا نہ تو نہر پر جانے کا اور نہ وہاں نہانے کا ارادہ تھا۔ یہ بات تو جسّے کے منہ سے یوں ہی نکل گئی۔ جلدی میں اسے اور کوئی بہانہ نہیں سوجھا۔

بُوا سے چھٹکارا پا کر جسّا گاؤں کے باہر نکل گیا۔ گاؤں کے آس پاس تھوڑی سی ریتلی اور تھوڑی سی سخت اور بنجر دھرتی تھی۔ کھیت کچھ دُور ہی پر شروع ہوتے تھے۔ جسّے نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ گاؤں کے لڑکوں میں سے کوئی اس کا پکا دوست نہیں تھا۔ دو چار سے تھوڑی بہت واقفیت تھی، مگر وہ پڑھنے کے لیے دوسرے گاؤں کے مدرسے میں گئے ہوئے تھے۔

کھیتوں سے ہو کر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں اس نے کچھ گہری سانس لی، تو وہ اپنے آپ کو تازہ دَم محسوس کرنے لگا۔ اس کو انگ انگ میں بجلی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، کاش اس کے پَر ہوتے، تو وہ نیلے آکاش میں اُڑ جاتا لیکن اب وہ یا تو اپنے کُتّوں کے پاس جا سکتا تھا، یا کھیتوں میں مٹر گشتی کر سکتا تھا۔ آس پاس کے دو تین گاؤں کی سیر بھی ہو سکتی تھی۔ پھر یکا یک ہی اسے نہر والی بات یاد آ گئی۔

گاؤں کی دوسری گلی میں سے اس نے آٹھ دس عورتوں کو نکلتے دیکھا، جو لوہے کے تسلے پر سر پر رکھے نہر کو جا رہی تھیں۔ تسلوں میں انہوں نے سوڈے میں بھیگے کپڑے جما رکھے تھے۔ ان عورتوں کی وجہ سے چوڑی نہر پر میلہ سا لگ جاتا تھا۔ جہاں عورتیں ہوں گی، وہاں چھوٹی بڑی لڑکیاں بھی ہوں گی اور جہاں چھوٹی بڑی لڑکیاں ہوں

گی، وہاں اس لڑکی کے ہونے کا بھی امکان تھا، جسے اس نے مکھن سنگھ کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ عشق پریم کی منزل سے ابھی بہت دور تھا، اس کے باوجود وہ لڑکی اسے بڑی اچھی لگی تھی۔ وہ اسے پھر دیکھنا چاہتا تھا، بلکہ بار بار دیکھنا چاہتا تھا۔

اس خیال سے اس کے مَن میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اگر لڑکی کی نظر آ گئی، تو اس کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ اس کی زندگی میں یہ ایک نیا شُغل تھا اور نئے پن کے ساتھ اس میں پُراسرار کشش بھی تھی۔

یہ فیصلہ کر کے وہ نہر کی طرف چل دیا۔ نہر کے دونوں کناروں پر کھڑے شیشم اور بَبُول کے پیڑوں کے پتے اسے صاف طور سے دکھائی دے رہے تھے۔ چلتے چلتے اس کے ہاتھ ایک لمبی سی چھڑی لگ گئی۔ کھیتوں میں سے گزرتے وقت وہ اس چھڑی کو تلوار کی طرح گھما کر پودوں پر مارتا، تو کئی پودوں کی کونپلیں ٹوٹ کر نیچے کو جھک جاتیں۔

وہ اپنے دھیان میں ہی چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے سامنے سے ایک لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔ لڑکے نے بغل میں لکڑی کی تختی، سلیٹ اور کچھ کتابیں داب رکھیں تھیں۔ گویا وہ مدرسے سے لوٹ رہا تھا، مگر ابھی چھٹی کا وقت تو نہیں ہوا تھا۔ طالب علموں کو دن ڈھلے فرصت ملتی تھی، کیونکہ پڑھائی ختم ہو جانے کے بعد بھی انہیں مدرسے کی پھلواری میں کافی کام کرنا پڑتا تھا۔ لڑکے کا نام سنتُو تھا۔ دُور ہی سے اس کے ناک سُڑکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ان دونوں میں اتنی کم دُوری رہ گئی تھی کہ جسُّو کسی اور سمت کو کھسک بھی نہیں سکتا تھا۔ سنتُو سے اس کی بہت معمولی جانکاری تھی۔ اس سے بات کرنا اس کے لیے ضروری نہیں تھا۔ مَن میں یہی سوچ کر جسّے نے بے پرواہی سے اس کے قریب سے گزر جانے کی کوشش کی، مگر سنتُو نے خود ہی اس کو آواز دے دی:

”ارے جسُّو! تُو کہاں جا رہا ہے؟“

جسّا اس سوال کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اُلٹا سنتُو ہی سے سوال کر ڈالا:

”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“

”مدرسے سے۔“

”ابھی چھٹی تو نہیں ہوئی ہوگی۔“

”نہیں!“

”تو کیا وہاں سے پٹ کر آئے ہو؟“

سنتُو کے چہرے سے یُوں لگا جیسے وہ اپنے کو مجرم محسوس کر رہا ہے۔ جلدی سے بولا:

”نہیں، پٹ کر نہیں آیا، میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا، میں نے چھٹی لے لی۔“

لیکن سنتُو کی شکل سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے پیٹ میں کوئی تکلیف تھی، وہ جسّے کے قریب بڑے اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ جسّا اس انتظار میں تھا کہ وہ گاؤں کی طرف قدم اُٹھائے، تو یہ بھی آگے کو بڑھ جائے لیکن سنتُو ہر ممکن اس کا ساتھ دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

''تم کہاں جارہے ہو؟''
پہلے تو جُسّے کے مُنہ سے اصلی بات نکلنے لگی، لیکن پھر وہ بول اُٹھا:
''تم مُجھ سے یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟''
سنُتو تھوڑا سا جھینپ کر بولا:
''میں سوچ رہا تھا کہ اگر تم اِدھر اُدھر مٹر گشتی کرتے جارہے ہو تو کیوں نہ ایک ساتھ مل کر گھمائی کی جائے۔''
جُسّو نے فوراً ہی اعتراض اُٹھایا:
''تم تو کہہ رہے تھے، کہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''
جُسّو کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا:
''پہلے ہو رہا تھا، اب ٹھیک ہوں۔''
اسی درمیان جُسّو کو اس سے بچ نکلنے کا طریقہ سوجھ گیا بولا:
''میں تو طویلے میں چاچا کے پاس جارہا ہوں۔''
سنُتو نے ہاتھ جھٹک کر کہا:
''چھوڑو بھی، چاچا کے پاس جا کر کیا کرو گے؟ آؤ ذرا موج منائیں۔''
''نہ بابا! چاچا تو مار مار کر میری ہڈیاں توڑ دے گا۔ اس نے مجھے بُلا رکھا ہے، نہ جاؤں گا تو میری خیریت نہیں۔''
ایسا دوٹوک جواب پا کر سنُتو کو مایوسی ہوئی اور وہ مجبوراً بوجھل قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیا۔
جُسّے کے مَن سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔
وہ احتیاط سے چلنے لگا، تا کہ پھر کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اب تو اسے دُور سے آتا کوئی دکھائی دیا، تو وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اس طرح چلتے چلتے وہ نہر کے قریب پہنچا، تو نہر کی پٹڑی کی اوٹ میں کپڑے دھونے کا شور سنائی دینے لگا۔ عورتیں ڈنڈوں سے کپڑے کوٹ رہی تھیں۔
جُسّے نے بالکل سیدھے نہر پر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سب عورتوں کی نظر خواہ مخواہ اس پر پڑے۔ وہ داہنے ہاتھ کو مُڑ گیا، اور لمبا سا چکر کاٹتے ہوئے نہر کی جانب بڑھا۔
اب اسے پٹڑی پر دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دکھائی دیں۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پتلی پتلی چوٹیاں بل کھائی ناگنوں سی لگ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر جُسّو کو کچھ تسلی ہوئی، وہ لڑکیوں کی اس ٹولی سے بھی کئی قدم آگے نکل گیا اور پھر ان کا جائزہ لینے کے لیے نہر کی پٹڑی پر چڑھ گیا۔ نہر کے کنارے لگ بھگ بیس پچیس لڑکیاں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ان میں سے کبھی کچھ اُٹھ کر کھیتوں میں دُھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے لیے چلی جاتیں، اور کچھ کو شرارت سوجھتی، تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتیں۔ تقریباً سب ہی زور زور سے چیخ چلا رہی تھیں۔

پہلے تو جُسّا دم لینے کے لیے کچھ دیر پٹڑی پر بیٹھا رہا، وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس پر کسی قسم کا شک ہو۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس نے کُرتہ اُتار دیا تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ وہ بھی نہر پر نہانے دھونے آیا تھا۔
جُسّا اتنا چھوٹا تھا کہ اس پر اعتراض اُٹھانے کا کسی کو خیال ہی نہیں آ سکتا۔ جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، وہاں کچھ قدموں کے فاصلے پر ایک پُل تھا۔ راہ گیر مرد اس پُل پر سے چُپ چاپ گزر جاتے تھے، عام طور سے وہ عورتوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ دھوپ میں بیٹھے بیٹھے جُسّا اپنی نظریں دوڑاتا رہا۔ اسے اُس خاص لڑکی کی تلاش تھی۔ ابھی تک وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ مایوس ہونے لگا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ جس کی تلاش اسے تھی وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ جُسّے کی نگاہ گِدھ کی طرح تیز تھی ورنہ ڈھیر سی لڑکیوں میں سے اتنی دُور سے کسی خاص لڑکی کو پہچان لینا آسان نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کُرتہ پہن کر کسی اور سمت کو چل دے، تو ٹھیک رہے گا۔ دھیرے دھیرے اس نے کُرتہ پہن بھی لیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ہی اسے ایک لڑکی پر شک ہوا، جو ابھی تک پیٹھ پھیرے کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ دیکھ کر یہ اسے نہیں پہچان سکا، مگر جب وہ کچھ دُھلے اور نچوڑے ہوئے کپڑے بازو پر اُٹھا کر پٹڑی پر چڑھنے لگی تو اس کا پورا چہرہ جُسّے کے سامنے تھا۔ اسے یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔
پٹڑی پر پہنچ کر وہ لڑکی لگ بھگ آٹھ دس قدم کے فاصلے پر نیچے کھیتوں کی طرف اُتر گئی۔
اُف! جُسّے کے دل میں تو ہلچل سی مچ گئی۔ اس ہلچل کی وجہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پایا۔ ممکن ہے، مایوسی کے بعد یکا یک وہی لڑکی سامنے دیکھنے سے ہی اس کا دل اُچھل پڑا تھا۔ وہ کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھتا۔ کھیت میں جا کر لڑکی نے کپڑے گھاس والی جگہ پر رکھ دیے اور پھر ایک ایک کو جھاڑ جھاڑ کر پھیلانے لگی۔ جب وہ کپڑے جھٹکتی تھی، تو اس کے ساتھ ہی اس کی کلائیوں کی چوڑیاں بھی کھنکتی تھیں۔
جب وہ سارے کپڑے سوکھنے کے پھیلا چکی، تو نہر کی طرف لوٹ پڑی۔ جُسّے کے دل میں نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ پھر سے کُرتہ اُتار کر وہیں بیٹھ جائے۔ اگر کوئی لڑکی اسے پہلے بھی کُرتہ اُتارتے اور پہنتے دیکھ چکی ہے تو وہ کیا کہے گی، یا من میں کیا سوچے گی؟
وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ یکا یک ہی اس کے کانوں میں بڑے زور کی 'سی' کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا کہ اسی لڑکی نے اچانک ہی اپنا ایک پاؤں دھرتی سے اُوپر اُٹھا لیا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھیت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔
کھیتوں میں عموماً سانپ بھی پائے جاتے تھے۔ یہ خیال بجلی کی طرح جُسّے کے دل میں کوند گیا کہ کہیں لڑکی کو سانپ نے تو نہیں ڈس لیا۔ دوسرے کھیتوں میں کپڑے پھیلانے والی کچھ لڑکیاں اپنی سہیلی کی طرف بھاگیں۔ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جُسّا رہ نہ سکا۔ وہ بھی بظاہر بے پرواہی سے چلتا ہوا ان سے چند قدموں کی دُوری پر رُک گیا اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ سانپ نے نہیں ڈسا تھا، بلکہ لڑکی کے پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا تھا، ایک لڑکی کہہ رہی تھی:

''ہائے رے! کانٹا تو چُبھ کر ٹوٹ گیا ہے، یہ نکلے گا کیسے؟''

وہ ہنس مکھ لڑکی اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کا ایک گھٹنا کھیت کی نرم مٹی میں دھنسا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنا گھما کر وہ اپنے پاؤں کو دیکھتی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ پاؤں سے خون ٹپک رہا تھا۔

دوسری لڑکی مایوسی سے سر ہلا کر بولی:

''یہ تو گھر جا کر سوئی سے ہی نکالنا پڑے گا یہاں تو کسی کے پاس سوئی ہوگی نہیں۔''

جَسا جیسے کسی انجانی ڈوری سے کھنچا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کوئی معمولی کانٹا نہیں تھا، اچھا خاصا موٹا اور مضبوط کانٹا تھا۔ ایڑی میں چبھا ہوتا تو ممکن تھا کہ اتنی تکلیف نہ ہوتی، مگر وہ پنجے والے حصے میں چُبھا تھا۔ ایڑی کا ماس سخت ہوتا ہے اور پنجے کے نیچے والا کومل۔ بلاشبہ لڑکی کو بہت تیز درد ہو رہا تھا۔

ایک اور لڑکی بولی:

''اب تو یہ اس پاؤں کو دھرتی پر رکھ بھی نہیں سکے گی۔ گاؤں تک کسی کے سہارے سے جانا ہوگا۔''

اتنے میں لڑکیوں نے جَسے کو بھی دیکھ لیا۔ وہ کانٹے کے معاملے میں ایسی اُلجھی ہوئی تھیں، کہ اس لڑکے کو سرسری نظر سے دیکھ کر رہ گئیں اور انہیں اس کی موجودگی عجیب بھی نہ لگی...... ممکن ہے ان میں سے کچھ نے جَسے کو گاؤں میں چلتے پھرتے دیکھا بھی ہوگا اور انہیں اس بات پر بھی اطمینان ہوگا کہ وہ لڑکا انہیں کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔

جَسے نے اپنا تعارف کرائے بغیر کہا:

''اس کانٹے کو سوئی کے بغیر بھی نکالا جا سکتا ہے۔''

اب سب نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ جسا پھر بولا:

''کوئی موٹی سی سُول (کانٹا) مل جائے تو اسی سے اس کو نکالا جا سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، بعض کھیتوں کے کنارے کنارے لمبے لمبے کانٹوں والی باڑ بھی تھی۔ جَسے نے تلاش کے بعد دو بڑے مضبوط کانٹے توڑ لیے۔ سب لڑکیاں اپنے آپ ہی اسے مدد دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔

جَسا اصلی دیہاتی لڑکا تھا۔ وہ کئی بار کانٹے ہی سے پاؤں میں چُبھے ہوئے کانٹوں کو نکال چکا تھا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ کہا اور نہ لڑکی کچھ بولی۔ وہ کھیت میں بیٹھ گیا اور اس نے لڑکی کا پاؤں اُوپر اُٹھا کر اپنے دونوں گھٹنوں میں دبا لیا، تاکہ پاؤں اِدھر اُدھر ہلایا نہ جا سکے۔ اس لڑکی کو بھی لگا جیسے اس کا پاؤں شکنجے میں کس دیا گیا ہے۔ جَسے نے کانٹے والی جگہ کا ماس چٹکی میں بھر لیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانٹے سے چُبھے ہوئے کانٹے کے آس پاس کا ماس کُریدنے لگا۔

اس پر لڑکی کی ہلکی ہلکی چیخیں نکلنے لگیں۔ جَسے نے پاؤں سے نظر اُوپر اُٹھائی اور دوسری لڑکیوں سے کہا:

''اس کے دونوں کندھے اچھی طرح سے پکڑے رہو۔ یہ ہلنے نہ پائے۔''

لڑکیوں نے ایسا ہی کیا۔ جسّے نے پھر کانٹے کے آس پاس کے ماس کو کُریدنا چاقو کر دیا لڑکی کو تو پہلے ہی اتنے زور کا درد ہو رہا تھا اور جب جسّے نے کانٹا چبھو چبھو کر ماس کو کاٹنا شروع کیا تو درد کئی گنا بڑھ گیا۔ جسّے نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''کانٹے کے آس پاس کا ماس ہٹے گا، تو کانٹے کا سرا ننگا ہو جائے گا۔ تب اسے ناخنوں سے پکڑ کر باہر نکال دُوں گا۔''

اس بات کو تو سب ہی لڑکیاں سمجھ رہی تھیں مگر جس کا ماس کُریدا جا رہا تھا، ساری تکلیف تو اسے سہنا پڑ رہی تھی۔

جسّے کے دل میں پَل بھر کے لیے بھی خوف پیدا نہ ہوا۔ وہ ماہر ڈاکٹر کی طرح اپنے کام میں جُتا ہوا تھا۔ ماس کے ننھے ننھے ٹکڑے کٹتے رہے، خون بہتا رہا، آخر کانٹے کا سَر تھوڑا سا ننگا ہو گیا۔

جسّے کی اُنگلیوں کے ناخن معمولی طور سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے ناخنوں سے کانٹے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ایک بار کانٹے کا سرا اس کی پکڑ میں آ گیا تو اس نے اسے پوری طاقت سے باہر کو کھینچا۔

ایک بار تو لڑکی تڑپ اُٹھی۔ دوسرے ہی پَل کانٹا نکل کر باہر آ گیا۔ وہ خون سے بھیگا ہوا تھا۔ جسّے نے لگ بھگ آدھ انچ لمبے کانٹے کی نوک کو کُرتے کے سرے سے پونچھ ڈالا۔ وہ اس بات کی تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں کانٹے کی نوک بھیتر ہی تو نہیں ٹوٹ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ نوک جُوں کی تُوں موجود تھی، تو اس کے کٹھور چہرے پر ہلکی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے لڑکی سے کہا:

''ہاتھ آگے بڑھاؤ۔''

کانٹا نکلتے وقت لڑکی کو بہت تیز درد تو پہنچا تھا، لیکن کانٹا نکلتے ہی جیسے عجیب سے سکون کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ہتھیلی آگے کو بڑھائی، تو جسّے نے کانٹا ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اتنے لمبے کانٹے کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں ڈر اور حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی ایک سہیلی بولی:

''دیکھو دیپی! کتنا بڑا کانٹا ہے، جبھی تو اتنا درد ہو رہا تھا۔''

دوسری لڑکی، جو عمر میں ذرا بڑی تھی، کہنے لگی:

''تمہاری تو بہت بڑی مصیبت کٹ گئی، ورنہ گاؤں تک پہنچنا بھی محال ہو جاتا۔''

دیپی اپنا پاؤں اس کے گھٹنوں میں سے نکالنے لگی، تو جسّے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر کھیت کی چٹکی کانٹے والے گھاؤ میں بھر دی۔

لڑکیاں اُٹھ کر جانے لگیں تو جسّے نے کہا:

''اس جگہ پر کَس کر پٹی باندھ دینا۔''

اس واقعہ کو گزرے پندرہ سولہ دن بیت گئے۔ جسّے کو اب تک یاد تھا، کہ کانٹا نکلوانے کے بعد جب دیپی اپنی سہیلیوں کے ساتھ واپس جا رہی تھی، تو اس نے دو تین بار اس کی طرف مُڑ مُڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے

ہی الگ رہا تھا، کہ وہ اس کا کتنا احسان مان رہی تھی۔

جسّا دیپی سے کیا چاہتا تھا؟ اس بات کا خود جسّے کو بھی پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنے مَن سے کبھی یہ سوال ہی نہیں کیا تھا، کہ وہ دیپی سے، کس چیز کا طلب گار ہے۔ اتنی گہرائی تک سوچنے کی اس کی عمر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ دیپی اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کے قریب رہنا چاہتا تھا، اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اور اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ گاؤں میں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کے ایک ساتھ کھیلنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ دونوں چھوٹے تھے، دونوں نابالغ تھے، مگر پھر بھی ان کی عُمر تک پہنچتے پہنچتے لڑکوں اور لڑکیوں کے شعبے الگ الگ ہو جاتے تھے۔

پہلے کچھ دن گاؤں میں چلتے پھرتے جسُّو کو رُوکھے سُوکھے بالوں والی پیاری پیاری دیپی دکھائی دے جاتی تھی۔ اس کے پاؤں پر میلی سی پٹی بھی بندھی نظر آتی تھی، جو ان دونوں کو کانٹا چُبھنے والا واقعہ یاد دلا دیتی تھی۔ دیپی کی آنکھیں اس سے ملتیں، تو وہ بچوں کی طرح مُسکرا دیتی، ممکن ہے، دیپی کے مَن میں جسُّو کے برعکس آدھی بھی ملنے کی لگن نہیں ہو گی۔ البتہ جسُّو محسوس کرنے لگا کہ اگر یہی حالت رہی تو دھیرے دھیرے ان کا ناطہ بالکل ہی ٹوٹ جائے گا۔ ایسا کوئی طریقہ ہونا چاہیے تھا، جس سے انہیں آپس میں اُٹھنے بیٹھنے کا موقع مل سکے۔

دیپی سجن سنگھ کی بیٹی تھی، سجن سنگھ بڑی لمبی اور بی بی داڑھی والا تھا۔ بی بی سے مطلب ایسی بھرپور داڑھی جس سے شرافت ٹپکتی ہو۔ وہ بے چارہ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ کبھی وہ اس کے چاچا سے ملنے آتا تھا اور نہ چاچا اس کے یہاں جاتا تھا۔ بگا سنگھ گاؤں کے اُن لوگوں میں سے تھا جو بدمعاش اور کچھ بدنام مانے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شمجو بھی اس کے یہاں بہت کم جاتی تھی، یوں تو گاؤں میں کون کسی کو نہیں جانتا، مگر ان دونوں کنبوں کے تعلقات گہرے نہیں تھے۔ بے چارے جسُّو کے راستے میں یہ ایک بہت بڑی رُکاوٹ بن گئی۔

پندرہ سولہ دن کے بعد پورنماشی کا دن آیا۔ اس دن گوردوارے میں بڑی ہی چہل پہل ہوتی تھی۔ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ وہاں جمع ہوتے۔ شبد کیرتن ہوتا، اور گورو کا لنگر بھی چلتا تھا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کسی کو کسی کی خبر نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقع جسُّو اور دیپی جیسی عمر کے بچے بھی آسانی سے گھل مل سکتے تھے۔ گوردوارے میں جمع سنگت کو کئی طرح کے چھوٹے موٹے کام مِل جُل کر کرنے پڑتے تھے۔ عورتیں زیادہ تر لنگر والے حصے میں رہتیں۔ بڑے بڑے دیگچوں میں اڑد، چنے کی دال چڑھا دی جاتی۔ اڑد، چنے کی دال پک پک کر آخر کار کھوئے کی طرح ہو جاتی اور کھانے میں بڑی لذیذ لگتی تھی۔ دال تیار ہو جانے پر بڑی بڑی بھٹیوں میں آگ جلائی جاتی اور ان کے اوپر لوہے کی چادروں کے لمبے چوڑے توے ٹِکا دیئے جاتے تھے۔ ان پر ایک ہی بار میں بیس بیس، بائیس بائیس پرشاد (چپاتیاں) تیار ہو سکتے تھے۔

ایسا ہی موقعہ اس دن بھی تھا۔ دال صبح چار بجے ہی چڑھا دی گئی۔ دھوپ پھیلی، تو عورتیں اُٹھ کر لنگر والے حصے میں چلی گئیں۔ مرد گوردوارے کے بھیتر ہی ٹکے رہے، لڑکے بچے اِدھر اُدھر کود پھاند رہے تھے۔ جسُّو دُور ہی دُور دیپی کے چاروں طرف منڈلا رہا تھا۔ اب کم سے کم اسے اس بات کا خوف نہیں تھا، جو ایک ناواقف دیپی سے ہو سکتا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔ لنگر میں بیٹھی دو عورتوں نے دیپی اور اس کی دو سہیلیوں کو مٹر گشتی

کرتے دیکھا تو ایک بولی:

''اری لڑکیو! تم لوگ بیکار میں گُداڑے مارتی ہوئی پھر رہی ہو، جاؤ کنوئیں سے پانی لے آؤ۔''

کنواں کچھ دوری پر گوردوارے کے باغ میں تھا۔ یہ بیلوں یا اونٹ کے ذریعے چلنے والا رہٹ نہیں، بلکہ چرکھی والا کنواں تھا۔ یوں تو گوردوارے کے کھیتوں میں بنا ہوا رہٹ بھی چالو تھا، مگر وہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کوئی نہار ہا تھا، کوئی مُنہ ہاتھ دھو رہا تھا اور کوئی صرف اپنے پاؤں ہی صاف کر رہا تھا۔ چرکھڑی والا کنواں خالی پڑا تھا۔ دیپی دولڑکیوں کو لے کر اس کنوئیں پر پہنچی۔ چاروں طرف گول چبوترا بنا ہوا تھا، جس کے اوپر کنوئیں کی طرف جھکا ہوا چرکھڑا تھا۔ چرکھڑے پر موٹا رسّا لپٹا ہوا تھا، جس کا ایک سرا لوہے کے بھاری بھرکم ڈھول سے بندھا ہوا تھا۔ یہ ڈول اتنا بڑا تھا، کہ اس میں بڑی بڑی دو بالٹی پانی بھر سکتا تھا۔

لڑکیاں چاؤ میں کنوئیں پر جا پہنچیں اور انہوں نے ڈول پانی میں پھینک دیا...... جب وہ بھر گیا، تو ایک لڑکی سے اُوپر کھینچتے نہ بنا۔ اب دولڑکیاں جُٹیں، ڈول دو چار ہاتھ اوپر آیا، کہ ان کے ہاتھ سے چرکھڑا چھوٹ گیا۔ کنوئیں کی گہرائی میں ڈول کے گرنے گرنے کی آواز سنائی دی۔ گویا قسمت اب بھی جسّو کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ چبوترے کے قریب پہنچ کر بولا:

''لاؤ میں ڈول کھینچتا ہوں۔''

دیپی نے مُڑ کر اسے دیکھا۔ فوراً پہچان گئی۔ بولی:

''تم اکیلے ہی بھرا ہوا ڈول نکال لو گے؟''

جسّو کا جسم جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس نے دیپی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جوتے اُتار کر ننگے پاؤں چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چرکھڑے کی مُٹھیوں پر رکھے اور بڑی آسانی سے چرکھڑے کو گھمانے لگا۔ ڈول چھلکتا ہوا اُوپر آ گیا۔ لڑکیاں بڑی خوش تھیں۔ خود جسّو نے ہی ان کی بالٹی بھر دی۔ ڈول میں اب بھی بالٹی بھر پانی باقی تھا۔ دیپی نے ساتھ والی لڑکیوں سے کہا:

''تم دونوں بالٹیوں کو لنگر میں پہنچا دو۔ واپسی پر ایک چھوٹی بالٹی لیتی آنا۔ اگلی بار میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چھوٹی بالٹی بھر کر چلوں گی۔''

کنویں سے ڈول نکالتے وقت جسّو سوچ رہا تھا کہ اگر دیپی اپنی دونوں سہیلیوں کو بھیج دے تو کتنا اچھا ہو۔ دیپی نے وہی کیا، جیسے وہ اس کے مَن کی بات کو سمجھ گئی تھی یا اگر سمجھی نہیں، تو خود اس کا مَن جسّو سے باتیں کرنے کو چاہ رہا ہوگا۔ اکیلے رہ جانے پر دیپی بولی:

''تُو تو بڑا تگڑا ہے۔''

جسّو نے نرم آواز میں جواب دیا:

''میں لڑکا ہوں۔''

دیپی نے اپنے سفید سفید دانت نکال دیئے۔ اس نے پھر پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جسا سنگھ ہے...... ویسے مجھے جسا کہتے ہیں۔"

پل دو پل دیپی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ ممکن ہے، وہ اس انتظار میں ہو کہ وہ کچھ کہے لیکن جب جسّو خاموش ہو رہا، تو اس نے خود ہی باتیں شروع کر دیں:

"جانتے ہو، گوردوارے کی پھلواری میں رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔"

"اچھا! مجھے نہیں معلوم، میں اِدھر کبھی نہیں آیا۔"

دیپی نے بھنویں اُوپر اُٹھا کر پوچھا:

"کیوں؟"

"میں اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہوں، میں دُوسرے گاؤں سے آیا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ دن یہاں رہ کر واپس لوٹ جاؤ گے؟"

"نہیں، میں اپنے چاچا کے ساتھ ہی رہوں گا۔ بگا سنگھ میرا چاچا ہے۔"

"تو کیا اپنے ماں باپ سے ملنے کو تمہارا من نہیں چاہے گا؟"

یکا یک ہی جسّے کا چہرہ کٹھور ہو گیا۔ اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا:

"میرے ماں باپ نہیں ہیں اگر ہوتے تو میں یہاں کیوں آتا؟"

دیپی کو لگا کہ بات غلط راستے پر جا رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی رُخ بدل کر کہنا شروع کیا:

"گوردوارے سے کچھ دُوری پر ایک قبرستان ہے۔ قبرستان میں چھوٹی چھوٹی بیریاں ہیں۔ ان میں بڑے میٹھے بیر لگتے ہیں۔ ہم وہاں بیر کھانے جایا کرتے ہیں۔"

"اچھا تو ایک دن چلیں گے۔"

"نہیں جسّو، وہ بیر تو گرمیوں میں لگتے ہیں، آج کل نہیں۔"

"تو کیا گوردوارے کے باغ میں پھلوں کے پیڑ نہیں ہیں؟"

"ہیں تو لیکن جا کر دیکھنا پڑے گا، کہ کون سے پھل ملتے ہیں۔ کسی دن یہاں آئیں گے۔"

"کیا تمہارے گھر والے آنے دیں گے؟"

دیپی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی، لیکن فوراً ہی بول اُٹھی:

"میں لڑکیوں کے ساتھ یہاں بھی آتی ہوں اور نہر پر بھی جاتی ہوں کیوں نہیں۔"

جسا گم سا ہو گیا۔ شاید وہ صرف دیپی کے ساتھ وہاں آنا چاہتا تھا لیکن دیپی اکیلی نہیں آ سکتی تھی، تو چلو اس کی سہیلیاں بھی ساتھ ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔

دیپی پھر بولی:

"تم بھی تو نہر پر جایا کرتے ہو۔"

''نہیں......جس دن تمہارا کانٹا نکالا تھا، اس دن میں پہلی بار وہاں گیا تھا۔''

''تو پھر تم کہاں جایا کرتے ہو؟''

جسّا خاموش رہا۔ اس کے جانے کی کوئی خاص جگہ تو تھی نہیں اور جو تھی بھی وہ بھی بتانے کے قابل نہیں تھی۔ دیپی کو جسّے کا اس طرح چپ رہنا عجیب بھی لگا اور اسے جسّے پر ترس بھی آیا۔ بے چارہ اناتھ (یتیم) تھا ممکن ہے اس کا ایک بھی دوست نہ ہو، اس نے پھر جسّو سے پوچھا:

''بتاتے کیوں نہیں؟ تم لڑکی تو نہیں کہ گھر میں بیٹھ رہو۔''

جسّے نے اپنے کان کا پچھلا حصہ کھجاتے ہوئے جواب دیا:

''میرے جانے کی کوئی خاص جگہ تو ہے نہیں۔ اکثر کھیتوں میں رہتا ہوں۔ وقت مل جائے، تو آس پاس کے گاؤں میں بھی گھوم آتا ہوں۔''

کچھ سوچ کر جسّے نے کتّوں والی بات بھی بتادی۔ اس پر دیپی بہت خوش ہوئی۔ بولی:

''ہائے، تو کتّوں کے ساتھ شکار کھیلنے میں تمہیں خوب مزہ آتا ہوگا۔''

جسّے نے رُک رُک کر کہا:

''ہاں، مزہ تو بہت آتا ہے...... کبھی تم بھی چلو نا۔''

''بھلا لڑکیاں بھی شکار کھیلتی ہیں کہیں؟''

''شکار نہ سہی، تم میرے کتّوں کو تو دیکھ سکو گی۔''

''ہاں، مجھے کتّے بہت اچھے لگتے ہیں۔ تم نے ان کے نام بھی رکھے ہوں گے۔''

''ہاں......ایک کا نام ڈبو ہے، دوسرے کا نام کالو ہے، تیسرے کا نام موتی ہے......بس اسی طرح کے نام ہیں۔ تم بھی چلو، تو کتنا مزہ آئے گا۔''

دیپی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی:

''اگر میری ایک دو سہیلیاں ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں، تو میں چل سکتی ہوں۔''

''تو پھر سہیلیوں کو تیار کر و نا!''

دیپی کچھ جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ اُسے دُور سے اپنی دونوں سہیلیاں آتی دکھائی دیں۔ وہ کہنے لگی:

''دیکھو، وہ دونوں پانی پہنچا کر لوٹ آئی ہیں۔ اب پھر باتیں ہوں گی، کیونکہ میں ان کے ساتھ ہی چھوٹی بالٹی میں پانی لے جاؤں گی۔''

''تو پھر ہم باتیں کب کر سکیں گے؟''

''ابھی تو سارا دن پڑا ہے۔ تم یہیں پر رہو گے ناں؟ تمہیں واپس لوٹنا تو نہیں پڑے گا؟''

''نہیں تو......میں لنگر میں ہی کھانا کھاؤں گا۔''

''تمہیں لنگر کی سیوا بھی تو کرنی چاہیے۔''

''میں کیا سیوا کر سکتا ہوں؟''

''تم کلہاڑی سے لکڑیاں پھاڑ سکتے ہو، لکڑیوں کو بھٹی میں جھونک سکتے ہو۔ کرنا چاہو گے تو کئی چھوٹے موٹے کام سُوجھ جائیں گے۔ جب کھانا تیار ہو جائے گا، تو تُم سنگتوں کو بھوجن کھلانے کا کام بھی تو کر سکتے ہو۔ اگر تُم لنگر میں رہو گے، تو باتیں کرنے کا موقعہ بھی مل جائے گا۔''

دیپی کی سہیلیاں کنویں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی بات چیت بند ہو گئی۔ جسّے کو دیپی کا یہ سُجھاؤ پسند آیا کہ لنگر میں کام کرتے وقت دونوں کو بات چیت کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔

جب تک لڑکیاں پانی ڈھوتی رہیں، تب تک جسّا کنویں میں سے ڈول بھر بھر کر نکالتا رہا اور جب دیپی آخری بار پانی کی چھوٹی بالٹی اُٹھا کر چلی گئی، تو تھوڑی دیر کے بعد جسّا بھی لنگر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ وہ تو خواہ مخواہ ہی جھجک رہا تھا۔ اس کی عمر کے کئی اور لڑکے لنگر میں گھوم پھر کر چھوٹے موٹے کام کر رہے تھے۔ کام کا کوئی بندھن بھی نہیں تھا۔ کسی نے جو کچھ کہہ دیا، کر دیا، ورنہ اِدھر اُدھر مٹر گشتی کرتے رہو۔

جب سے جسّا ہری پُورے آیا تھا، تب سے اُکھڑا اُکھڑا گھوم رہا تھا۔ آج پہلی بار اس کا مَن بہل گیا۔ لنگر میں سارا دن کئی بار دیپی سے چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں دن کا بھوجن ختم ہونے کے بعد عورتوں نے کچھ دیر آرام کیا، اور پھر رات کے لنگر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

کئی عورتیں جسّے کو پہچاننے لگی تھیں، کیونکہ وہ کام چور نہیں تھا اور ہر کسی کا کہنا مان لیتا تھا۔

جسّے کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ دیپی سارا دن اس کے سامنے رہی۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی یہ بات تھی کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف نہیں تھے۔

۳

آج بگا سنگھ کے کھیتوں والے طویلے میں محفل جمی ہوئی تھی۔ یار دوستوں کے ساتھ شراب کا دَور چل رہا تھا۔ طویلے کے صحن میں بھٹی پر مہا پرشاد (ماس) کا بہت بڑا پتیلہ رکھا ہوا تھا۔ جسّا وہاں موجود نہیں تھا، کیونکہ اس پر صرف گھر کا کام کرنے کی ہی ذمہ داری تھی۔ یہاں پر حویلی رام مہمانوں کی سیوا کر رہا تھا۔ خوب ہی ہلّا مچا ہوا تھا۔ گپ شپ میں رام پیاری کا موضوع بھی چل نکلا۔ لدّھا سنگھ نے بگا سنگھ سے کہا:

''سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تم ہر روز رام پیاری کو لسّی اور دُودھ پہنچاتے ہو۔''

بگّے نے مونچھوں کی شراب انگوچھے سے پونچھتے ہوئے بڑا سا منہ پُھلا کر جواب دیا:

''ہاں یہ کوئی افواہ نہیں ہے، میں سچ مچ ہی یہی کر رہا ہوں۔''

دریام سنگھ نے پوچھا:

''آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟''

بگا سنگھ نے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے کہا:

''ایک بے چاری بے سہارا کی مدد کرنا، ہمارے لالہ بالمکند بھی تو کہہ چکے ہیں کہ رام پیاری ہماری مہمان ہے......''

لدّھا سنگھ بولا:

''تُم پہلے جٹ (بگلا بھگت جاٹ) ہو۔ اس لیے یہ ماننا کٹھن ہے کہ تُم یہ سب کچھ سیوا کے جذبات کے نظریے سے کر رہے ہو۔''

جواب میں بگّے نے سر پیچھے پھینک کر قہقہہ لگایا۔ اس وقت اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی، جب اس نے سر پیچھے کو پھینکا تو اس کے بالوں کا جُوڑا اور بھی ڈھیلا ہو گیا۔

کشن سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر بگّے کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:

''میری رائے یہ ہے بگا سنگھ...... تُم چاہے اور جو کچھ بھی کرو، لیکن کسی اُلجھے میں نہ پھنس جانا۔''

بگّے نے کشن سنگھ کی طرف بڑے دھیان سے دیکھا۔ وہ کشن سنگھ کی رائے کو سدا ہی بہت اہمیت دیتا تھا۔ بولا:

''کشن سنگھ اس میں اُلجھے کی کیا بات ہے؟ وہ عورت ہے اور میں مرد ہوں، نہ رام پیاری دُودھ پیتی بچی ہے اور نہ بگا سنگھ دُودھ پیتا بچہ ہے۔''

کشن سنگھ کی آنکھیں سُکڑ گئیں اور وہ بولا:

''لیکن یہ مت بُھولو کہ رام پیاری کو چنن سنگھ گاؤں میں لایا تھا اور اسی کے دیئے ہوئے گھر میں وہ رہ رہی ہے۔''

لدّھا سنگھ نتھنے پُھلا کر بولا:

''اگر چنن سنگھ رام پیاری کو یہاں لایا ہے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ اس کی جائیداد بن گئی ہے۔ آخر چنن سنگھ کا رام پیاری پر کیا حق ہے؟''

لدّھا سنگھ کی حمایت پا کر بگا سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ کشن سنگھ سے کہنے لگا:

''ٹھیک ہی تو ہے، چنن سنگھ زیادہ رُعب گانٹھے گا تو رام پیاری کے رہنے کا میں الگ سے بندوبست کر دُوں گا۔''

دریام سنگھ بولا:

''اگر چنن سنگھ نے رام پیاری کو رہنے کے لیے جگہ دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس سے وہ چاہے اس سے رام پیاری بات کرے، جس سے وہ نہ چاہے، اس سے رام پیاری ناطہ توڑ لے...... یہ تو خود عورت پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے اپنا لے اور جسے چاہے ٹُھکرا دے۔''

اب بگا سنگھ اور بھی شیر ہو گیا۔ اس نے چارپائی کی باہیں پر مُکا جماتے ہوئے کہا:

''اگر میں چاہوں تو رام پیاری کو چنن سنگھ سے چھین سکتا ہوں، آخر چنن سنگھ ہے کس ہوش میں؟''
کشن سنگھ کے چہرے پر ناراضگی اور پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے کہا:
''بگا سنگھ، تم میں اور چنن سنگھ میں یہی فرق ہے۔ تم آگا پیچھا بالکل نہیں دیکھتے، بس منہ زور گھوڑے کی طرح بڑھتے ہی جاتے ہو۔''
بگے نے اُٹھ کر دونوں ہاتھ کشن سنگھ کے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیئے اور بھاری آواز میں بولا:
''کشن سنگھ! تم میں خرابی یہ ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہو۔ ایسے گھوڑے کے مقابلے میں جو ایک جگہ کھڑا بن بتیاں ہلاتا رہے، مُنہ زور گھوڑا ہمیشہ بازی لے جاتا ہے۔ وشواس رکھو، کہ میں کافی محتاط ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مت بھولو کہ رام پیاری میری مٹھی میں ہے۔''
کشن سنگھ بے چینی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولا:
''کیا تم اپنے اتنے حوصلے کی وجہ بتا سکتے ہو؟''
بگے نے جواب دیا:
''اُنیس بیس دن پہلے میں نے رام پیاری کے یہاں لسّی اور دودھ بھجوایا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار جسّے کی زبانی مجھ سے ملاقات کرنے کا پیغام بھیجا، مگر میں آج تک اس کے یہاں نہیں گیا۔ وہ ہمارے گھر جھنجو سے ملنے جُلنے کے لیے بھی آتی رہتی ہے، لیکن جب مجھے پتا چلتا ہے تو میں اِدھر اُدھر کھسک جاتا ہوں۔ اسی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قدر محتاط ہوں۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق میں صرف اگر ایک منہ زور گھوڑا ہی ہوتا تو اب تک کئی بار رام پیاری سے مل چکا ہوتا۔''
لدّھا سنگھ نے کشن سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا:
''اب تو تم بگا سنگھ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔''
لگتا ہے کہ کشن سنگھ بھی من میں بگا سنگھ کی دُور اندیشی کو مان گیا تھا۔ وہ دھیرے سے بولا:
''اگر یہ معاملہ ٹھیک ہے تو۔''
بگا سنگھ شراب والے گلاس کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا:
''لیکن دوستو! آج تم سب لوگوں کو میں نے اس لیے بلایا ہے تاکہ میں اس بارے میں تم لوگوں سے صلاح مشورہ کر سکوں۔''
کرپال سنگھ اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ بگا سنگھ کی اس بات پر سب کو چُپ پا کر اس نے پوچھا:
''ہاں، تو بگا سنگھ تم کیا صلاح لینا چاہتے ہو؟''
بگا سنگھ بولا:

''یہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں رام پیاری کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں؟''

لدّ ھا سنگھ دانت دکھا کر بولا:

''میرے خیال میں تم رام پیاری کے پاس جائے بغیر نہیں رہو گے۔ صلاح مشورہ بے کار ہے۔''

بگا سنگھ کے چہرے پر شرارت کھیلنے لگی:

''تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ آخر وہاں جانے میں حرج بھی کیا ہے؟''

سب لوگ کشن سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تو سوچ میں ڈوبا رہا لیکن وریام سنگھ نے کہا:

''آخر بگا سنگھ مرد ہے۔ جب رام پیاری عورت ہو کر اسے بار بار بُلا رہی ہے تو اس میں بگا سنگھ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

بگا سنگھ بم کر بولا:

''ارے بھئی! بگا سنگھ یہ جانتا ہی نہیں کہ ڈر کس چڑیا کا نام ہے۔ میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر چنن سنگھ نے زیادہ ٹُوں ٹڑی کی، یا رام پیاری کو مجھ سے ملنے سے منع کیا تو پھر میں خود ہی رام پیاری کے رہنے کا بندوبست کر دُوں گا۔ چنن سنگھ ہمارے گاؤں کا مالک تو نہیں ہے۔ یہاں ہم بھی بستے ہیں۔ ہم پہل نہیں کریں گے لیکن اگر اس نے شرارت کی تو، پھر اسے مزہ بھی چکھا دیں گے۔''

کشن سنگھ چُپ چاپ ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ اسے بگا سنگھ کر بڑھ چڑھ کر باتیں کرنا پسند نہیں تھا۔ خود وہ ان آدمیوں میں سے تھا، جنہیں اگر لڑنا بھی ہو تو وہ شیخی نہیں بگھارتے۔ اس کے بعد کشن سنگھ نہیں بولا اور باقی لوگ بگا سنگھ سے اس بارے گپیں ہانکتے رہے۔

کچھ دیر بعد کشن سنگھ اُٹھ کھڑا ہوا اور بگا سنگھ سے کہنے لگا:

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔''

کرپال سنگھ نے پوچھا:

''مہا پرشاد پک رہا ہے، کھانا نہیں کھاؤ گے کیا؟''

کشن سنگھ نے جواب دیا:

''یہ تو میں نے بگا سنگھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں یہاں بھوجن نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں رشتے دار آئے ہوئے ہیں، انہیں کے ساتھ کھانا پڑے گا۔''

کشن سنگھ صرف پینے پلانے میں ہی ان کا ساتھ دینے کے لیے آیا تھا۔ وہ طویلے سے باہر نکل گیا، تو لدّھا سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''یارو! کشن سنگھ بھی رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ ہم جاٹ لوگ ہیں ہم تو پہاڑ کا بھی سُرمہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔''

سب کے قہقہوں سے ماحول گونج اُٹھا۔تب وریام سنگھ نے بگا سنگھ کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا:

''تم کسی کی فکر مت کرو، بے دھڑک ہو کر رام پیاری سے ملو۔ آخر وہ تمہیں بُلا رہی ہے۔ جب تمہیں چنن سنگھ سے ڈر نہیں لگتا تو تمہیں بھی دبنے کی کیا ضرورت ہے؟''

بگا سنگھ نتھنے پُھلا کر بولا:

''ارے ڈرتا کون ہے نہ جانے کتنے چنن سنگھ میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکال دیئے ہیں۔''

لدّھا سنگھ نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھینک کر کہا:

''یہ ہوئی ناں مردوں والی بات...... تمہیں رام پیاری بلا وجہ تو نہیں بُلا رہی ہوگی۔ جب کوئی خوب صورت عورت کسی جوان مرد سے ملنا چاہے تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔ اُستاد! تم نے لسّی، مکھن اور دودھ بھیج کر رام پیاری کے مَن میں اپنے لیے جگہ تو بنالی ہے۔ اب تو دو چار ملاقاتیں بھی کرلو اور پھر موقع پاتے ہی اسے جھک جاؤ۔''

''ہی، ہی، ہی'' عجیب انداز سے بھی کے ہنسنے کی آواز چاروں طرف گونج گئی۔ مہا پرشاد تیار ہو گیا اور تندور کی روٹیاں حویلی رام گھر سے لے آیا، تو پھر سب یاروں نے خوب پیٹ بھر کر بھوجن کیا۔ ان میں سے اپنے گھر کوئی نہیں لوٹا۔ اتنا نشہ کرنے کے بعد گھر جانا ٹھیک بھی نہیں تھا۔ وہ سب وہیں لوٹ پوٹ ہو گئے۔

دوسرے دن صبح جب جسا لسّی اور دُودھ لے کر رام پیاری کے گھر کو جانے لگا تو بگا سنگھ نے اسے سمجھا دیا کہ وہ رام پیاری سے کہہ دے کہ آج چاچا تم سے ملنے آئے گا۔

سارا دن بگا سنگھ بڑا بے چین سا رہا۔ شام ہوئی تو مُنہ ہاتھ دھو کر اس نے لال کنارے والا بینگنی رنگ کا لاچا (تہمد) باندھا، لمبی سلک کی قمیص پہنی، سر پر طُرّے دار پگڑی باندھی اور ہاتھ میں پیتل کی شام والی لٹھ تھام کر وہ تیار ہو گیا۔ دن میں جسے نے اس کے جوتے بھی تیل سے چُپڑ دیئے تھے۔ گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے بگا سنگھ نے مٹی کے چراغ میں پڑے سرسوں کے تیل میں اُنگلیاں ڈبوئیں اور اپنی مونچھوں اور ڈاڑھی کو چکنا کر لیا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کے باہر باہر سے رام پیاری کے مکان تک جا پہنچا۔ اس نے لاٹھی کے سرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ منگل نے کنڈا کھولا، اور بگا سنگھ کو اپنے سامنے پا کر جیسے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ مٹی کے دیے کو دیوار کے آلے میں رکھ کر بغیر کچھ کہے سُنے بھیتر بھاگ گیا۔

بگا سنگھ کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس خیال سے کہ کہیں کوئی اسے رام پیاری کے دروازے کے آگے کھڑا نہ دیکھ لے، وہ قدم بڑھا کر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ اتنے میں رام پیاری ہاتھ میں لالٹین لٹکائے، بڑی پُھرتی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ اس کے پاؤں میں پائل چھن چھنا رہی تھی اور وہ سونے چاندی کے گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ کاجل کی دھار نے اس کی موٹی اور کٹیلی آنکھوں کٹار بنا کر رکھ دیا۔ اس کی سج دھج سے لگتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو بگا سنگھ کے سواگت کے لیے خوب اچھی طرح تیار کر رکھا تھا۔

منگل نے بڑھ کر گلی والا دروازہ بند کر دیا اور رام پیاری اپنے دونوں کومل ہاتھ ذرا پھیلا کر بولی:

''بھیتر چلے آیئے نا...... آج تو چیونٹی کے گھر بھگوان کے تشریف لانے والی بات ہوئی۔''

لمبے اُونچے ڈیل ڈول والا بگا سنگھ جس دروازے میں سے گزرتا، اسے اپنا سر نیچے کو جھکانا پڑتا تھا۔ پسار کے ایک سرے پر رنگ رنگیلے پایوں والا بھاری بھر کم پلنگ پڑا تھا، جس پر اُجلا بستر بچھا تھا اور سرہانے کی طرف ڈھلے ہوئے کھول والا ایک گاؤ تکیہ پڑا تھا۔

رام پیاری کی بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ اس کے دانت چھوٹے اور چمکیلے تھے۔ دانتوں کے ساتھ ناک میں پڑی کیل بھی چمک رہی تھی۔ وہ چاؤ بھری آواز میں بولی:

''پدھاریئے نا!''

بگا سنگھ نے اپنی لمبی لاٹھی دیوار کے ٹکادی اور خود تہمد کو سمیٹ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ رام پیاری نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک اونچا سا موڑھا کھینچ لیا۔

مکان میں کوئی خصوصیت نہیں تھی، لیکن بگا سنگھ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نئے سنسار میں پہنچ گیا ہے۔ رام پیاری کے پھول سے مکھڑے میں سے کیسے میٹھے میٹھے سے بول نکل رہے تھے۔ باتیں کرنے کا اس کا انداز بھی بالکل انوکھا تھا۔ وہ اسے آپ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

جوں ہی وہ آمنے سامنے بیٹھے، تو رام پیاری نے کہا:

''بڑی لمبی راہ دکھائی آپ نے۔''

بگا سنگھ کچھ شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ وہ جلدی میں واضح جواب بھی نہیں دے پایا۔ رام پیاری جانتی تھی کہ مہمان کو اگر بولنے میں کوئی ہچکچاہٹ ہو تو کم سے کم اسے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ وہ پھر بولی:

''میں تو ہر روز ہی جسّے سے کہا کرتی تھی کہ اپنے چاچا کو یہاں بھیجو۔ پھر بھی نہ جانے آپ نے اتنے دن کیوں لگا دیئے۔''

بگا سنگھ نے محسوس کیا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے بولا:

''مَن تو میرا بھی چاہتا تھا لیکن کچھ تو کام کی وجہ سے نہ آسکا اور کچھ......''

بگا سنگھ کی زبان کو اس طرح اٹکتے دیکھ کر رام پیاری کی آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے چنچلتا سے پوچھا:

''تو کیا آپ کی بہن یہاں نہیں آنے دیتی تھی؟''

اب کے بگا سنگھ کو پھر کوئی جواب نہ سوجھا۔ عورت کی زبان بہت تیزی سے چلتی تھی اور بگا سنگھ کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ اتنی خوب صورت، اتنی چنچل اور اتنی تیز زبان والی عورت سے بات کرنے کا اسے پہلے کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔

بگا سنگھ سے کوئی جواب نہ پا کر رام پیاری نے کچھ اُداس ہو کر کہا:

''آپ کی بہن نے یہاں آنے سے منع کیا ہے، تو ٹھیک ہی تو ہے۔ میں پردیسن ہوں، اجنبی

ہوں.....اور جانے کون ہوں۔ مجھ سے ملنے میں کسی کا ہچکچانا ممکن ہی تو ہے۔ بھلا یہ آپ کی مہربانی کم ہے کہ ہر روز مجھے اتنا دودھ، اتنا مکھن اور لسّی بھجوا دیتے ہیں۔ اس گاؤں میں اتنا بڑا دل تو میں نے کسی اور کا نہیں پایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی، کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ آ جاتا ہے لیکن آپ کی طرح ہر روز اتنا بھیجنے والا اور کون بیٹھا ہے، میرا یہاں۔"

حُسن کو اتنا اُداس پا کر بگّا سنگھ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ اُٹھ کر اس رنگین چڑیا کو موڑھے سے اُٹھا لے اور خوب پچکار پچکار کر پیار کرے۔ آخر اسی طرح اس کے ننھے سے دل کو تسلی دی جا سکتی تھی.....مگر اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ سنبھل کر بولا:

"بُجھو نے تو مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ ویسے بھی میں بُجھو کے کہنے سے تھوڑا رک سکتا تھا۔ بس یوں ہی ہچکچاہٹ کی وجہ سے نہیں آ سکا۔"

رام پیاری کا چہرہ پھر کھل اُٹھا، آگے کو جھک کر گویا رازدارانہ آواز میں بولی:

"بھلا اپنے گھر میں ہچکچاہٹ کی کیا بات!"

بگّا سنگھ کو اپنے پن کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ کہا:

"آپ کے لیے میں بھی تو انجان تھا، میں سوچ رہا تھا کہ میرا آپ کے گھر میں آنا، نہ جانے آپ کو کیسا لگے۔"

"واہ جی! یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ اپنوں کے بارے میں تو مَن میں ایسی کوئی بات آ ہی نہیں سکتی۔ آپ نے ہم پر اتنی مہربانی کر کے ہمارا دل جیت لیا ہے، ہمیں اپنا بنا لیا ہے۔ اب آپ کے آنے سے یہ بھی نہیں لگتا کہ میں پردیس میں ہوں، یہ گاؤں اپنا دیس نظر آنے لگا ہے۔"

ان میٹھی میٹھی باتوں پر موہت ہو گیا۔

رام پیاری نے منگل سے کہہ کر پاندان منگوایا۔ اس کا ڈھکن کھول کر وہ اپنی پتلی پتلی اُنگلیوں سے پتے پر چونا کتھا لگانے لگی۔ اس میں کئی مصالحے بھی ڈالے اور پتے کو تہہ کر کے بڑی ادا سے اسے بگّا سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

"لیجیے! پان کھائیے۔"

پان کھانا تو درکنار، بگّے نے آج تک کسی کو پان کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ پوچھا:

"تو کیا یہ پتا ایسے کچا ہی کھا لیا جاتا ہے؟"

رام پیاری معشوقانہ انداز سے مسکراتے ہوئے بولی:

"اجی آپ اسے منہ میں تو رکھیے، بتاشے کی طرح گل جائے گا۔ میں آپ کو جان بوجھ کر ایک ہی پان دیا ہے۔ ہم لوگ تو چار چار پان گلوں میں دبا لیتے ہیں۔"

دیکھنے میں بگّا سنگھ کو پان میں کوئی کشش نہ دکھائی دی، پھر بھی رام پیاری کے کہنے سے اس نے منہ میں رکھ

لیا۔ پل بھر میں اس کے بالوں والے نتھنے سگندھ سے بھر گئے۔ پان میں پتے سمیت جو کچھ بھی تھا، اسے دانتوں سے پیس پیس کر بگا سنگھ بھیتر نگل گیا۔ پیک دان دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بگا سنگھ کو پتا ہی نہ چلا کہ لمبی گردن والا برتن، رام پیاری نے اس کی طرف کیوں بڑھا دیا تھا۔ اس نے پوچھا:

''ہمارے علاقے میں تو کبھی پان کی شکل بھی نہیں دکھائی دیتی، آپ یہ پتے کہاں سے منگواتی ہیں؟''

''لاہور یا دہلی آنے جانے والے کسی نہ کسی آدمی سے منگوا لیتی ہوں۔ پانوں کے بنا بڑی پریشانی رہتی ہے۔ دن بھر میں دس بارہ سے زیادہ نہیں کھا پاتی۔ اپنے دیس میں تو ہر روز پچاس پچاس پان کھا لیتی تھی۔''

بگا سنگھ حیران ہو رہا تھا یہ عورت بکری ہے یا گائے، کیا کوئی انسان اتنے پتے بھی کھا سکتا ہے۔ اسے اس طرح حیرانگی میں ڈوبا پا کر رام پیاری بولی:

''ہمارے یہاں کا رواج یہ ہے کہ گھر میں کوئی ملنے آئے تو پان سے ہی اس کی خاطر کی جاتی ہے۔''

بگا سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں، لیکن اس نے اس موضوع پر زیادہ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پوچھا:

''میں یہ جاننے کے لیے آیا تھا کہ آپ کو یہاں پر کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

یہ سن کر رام پیاری ہاتھ اس کے سینے پر جا ٹکا اور وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی:

''یہ جاننے کے لیے تو آپ کو ہر روز یہاں آنا پڑے گا......''

اس کے اِن لفظوں پر بگے نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور رام پیاری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اس وقت میں ٹھیک ٹھاک ہوں، لیکن نہ جانے کل شام تک کیا تکلیف ہو جائے۔ اگر آپ ہر روز مل لیا کریں گے، تو میں اپنی تکلیف بتا دیا کر دوں گی۔ یوں تو چھوٹی موٹی تکلیف تو آپ کے درشن پا کر ہی ٹھیک ہو جایا کرے گی۔''

بگے کو بار بار خیال آ رہا تھا کہ یہ عورت کیسے مینا کی طرح چہچہا رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے اور یہ بیٹھا سنتا رہے۔ واہ! کیسے بات میں سے بات نکالتی تھی۔

رام پیاری نے بھی کلّے میں دو پان دبا لیے اور پاندان منگل کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی:

''لو تم بھی ایک پان کھا لو...... تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ کیا کوئی اور کام نہیں ہے؟''

منگل صرف اس خیال سے ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ممکن ہے، بہن کو اس سے کوئی کام پڑ جائے۔ ڈانٹ کھا کر اس نے ایک بیڑہ مُنہ میں رکھا اور جا کر ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا۔ رام پیاری نے کہا:

''آپ کہاں کھو گئے سرکار! میں تو یہاں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔''

بگا سنگھ کو رام پیاری کی اداؤں نے اُدھ موا کر دیا۔ اس جادوگرنی کے جادو نے اسے ساری دُنیا بھلا دی۔ ساری اِتّی سِتّی بھول گیا۔ یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی بانکی عورت سے اب وہ کیا کہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید اب تک بگا اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیتا۔ مگر اس وقت تو وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں ہی لگا رہا۔

رام پیاری نے پھر بات شروع کی:

''سرکار! ایسے چُپ چاپ ہی بیٹھے رہیں گے، کیا؟''

بگّے نے ہمت سے کام لے کر جواب دیا:

''سچ تو یہ ہے کہ میں آپ ہی کی باتوں کے جادو میں کھو گیا ہوں۔''

رام پیاری دونوں گھٹنوں میں ٹھوڑی دبا کر بڑے پیارے انداز سے ہنس دی۔ بگّے نے گھمبیر ہو کر پوچھا:

''کیا چنن سنگھ یہاں نہیں آتا؟''

''کبھی کبھار!''

''کبھی کبھار کیوں؟ اسے تو آپ کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ آخر وہی تو آپ کو یہاں لایا ہے۔''

''وہ نہیں لائے، میں خود آئی ہوں، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کی یہ مہربانی بھی کم نہیں ہے کہ انہوں نے رہنے کے لیے مجھے مفت مکان دے رکھا ہے۔''

بگا سنگھ، چنن سنگھ کی تعریف پر خوش نہیں ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر رام پیاری اس کا اتنا احسان مان رہی ہے۔ اس نے اس کے خلاف کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ذرا عقل سے کام لے کر بولا:

''ٹھیک ہی تو ہے، آپ تو سارے گاؤں کی مہمان ہیں۔''

بگا سنگھ کو 'آپ' کہہ کر بات کرنا بڑا کٹھن لگ رہا تھا، کیونکہ اس انداز سے بات کرنے کی اس کی عادت نہیں تھی۔ وہ کھردری طبیعت والا انسان تھا اور کھردرے ڈھنگ سے ہی بات چیت کر سکتا تھا۔

اب بات چیت کو آگے چلانے کے لیے بگا سنگھ کو کچھ نہیں سُوجھا، تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدل کر بولا:

''اچھا، تو میں چلتا ہُوں۔''

رام پیاری کی کٹار جیسی بھنویں اوپر کو اُٹھ گئیں اور وہ میٹھی آواز میں کہنے لگی:

''اِتنی جلدی؟''

''ہاں، ابھی کچھ کام ہے۔'' بگا سنگھ نے جھوٹ بولا۔

رام پیاری آنچل سنبھالتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی:

''اگر کوئی ضروری کام ہے، تو میں نہیں روکوں گی لیکن آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ اکثر مجھے ملنے آیا کریں گے۔''

بگا سنگھ اس کومل اور حسین جوان عورت پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایسی مَن موہنی

حسینہ کو کیا وہ سچ مچ اس حد تک اچھا لگا تھا کہ وہ اس سے ہر روز ملنے کی خواہشمند تھی۔

رام پیاری کے ہونٹ مسکرا رہے تھے، اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں...... بگا سنگھ کو چکر سا آنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے کہہ سکا:

''میں ضرور آیا کروں گا۔''

بگا سنگھ نے پیار کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو رام پیاری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ یکا یک بگا سنگھ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''بس! آپ بھیتر ہی بیٹھیے، باہر سردی بہت ہے۔''

رام پیاری نے نینوں کے تیر چلاتے ہوئے جواب دیا:

''اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے...... لیکن اپنا وعدہ نہ بھولیے گا۔''

رام پیاری کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی بگا سنگھ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اسے اپنے بھیتر نہ جانے کیا کیا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگا تھا، جیسے اس نے دہکتے ہوئے شعلے کو پکڑ لیا ہے۔

منگل بگا سنگھ کو وداع کرنے کے لیے ڈیوڑھی تک گیا۔ اس نے گلی میں پاؤں رکھا تو ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہو گیا۔ بگا سنگھ ذرا بوکھلایا ہوا سا تھا۔ پل دو پل وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہا اور پھر جب اس نے واپس آنے کے لیے قدم بڑھایا تو ٹھٹھک کر رہ گیا...... دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کوئی لمبا سا آدمی کھڑا تھا۔

بگا سنگھ کی اُنگلیاں لاٹھی پر کس گئیں۔ دوسرے آدمی نے پگڑی کے شملے سے اپنا چہرہ ڈھک رکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھا لیکن اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اُدھر سے آواز آئی:

''کیا تم بگا سنگھ ہو؟''

بگے نے چنن سنگھ کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں! تم چنن سنگھ ہو؟''

چنن سنگھ نے اپنے چہرے کا نقاب اُٹھا دیا اور دو قدم آگے بڑھ کر رام پیاری کے مکان کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کوئی جواب نہ پا کر بگا سنگھ آگے کی طرف بڑھ گیا، تو اسے اپنے پیچھے سے کنڈے کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔

۴

بگا سنگھ کا رام پیاری کے گھر جانا کوئی ایسی بات نہیں تھی، جو ڈھکی چھپی رہ جاتی۔ خاص کر جب چنن سنگھ نے اپنی آنکھوں سے اسے رام پیاری کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنن سنگھ ایسے سُنہرے موقعہ کو بھلا کیسے ہاتھ

سے جانے دیتا۔

دوسرے دن صبح جب لالہ بالمکند کی محفل جمی، تو چنن سنگھ ٹہلتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ لالہ جی اور ان کے ساتھیوں نے چنن سنگھ کا سواگت کیا اور تھوڑی دیر بیٹھنے پر اصرار کیا۔

چنن سنگھ بولا:

''میں تو ذرا کھیتوں کو جا رہا ہوں، آپ کو دیکھ کر رُک گیا۔''

لالہ جی بولے:

''گھڑی دو گھڑی یہاں بیٹھ جانے سے آپ کا کوئی خاص حرج تو ہو نہیں جائے گا۔''

چنن سنگھ دراصل وہاں بیٹھنے کے لیے وہاں آیا ہی تھا۔ سکھ، تمبا کو نہیں پیتے، اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے حقے کو ذرا پرے ہٹا دیا گیا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں چل نکلیں۔ اتفاق سے لالہ جی نے خود ہی رام پیاری کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا:

''جہاں تک میں جانتا ہوں، ہمارے گاؤں کے بھی لوگ رام پیاری سے تعاون کر رہے ہیں اور اس کی مدد بھی کر رہے ہیں۔''

چنن سنگھ اس موقعہ کی تاک میں تھا، طنزیہ انداز میں بولا:

''جی ہاں، یہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو رام پیاری کا جی بہلانے کے لیے باقاعدہ اس کے گھر بھی جانے لگے ہیں۔''

یہ سُن کر لالہ جی کے کان کھڑے ہو گئے کیوں اس بیچ وہ بھی وہاں کے تین چار چکر لگا چکے تھے۔ مگر وہ وہاں پانچ سات منٹ سے زیادہ کبھی نہیں رُکے۔ چنن سنگھ بھی اس بات کو جانتا تھا۔ جو شخص بھی رام پیاری سے ملنے جاتا، اس کی خبر چنن سنگھ کو مل جاتی تھی مگر چنن سنگھ اس معاملے میں لالہ جی کا نام نہیں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ اسے تو بگا سنگھ کے خلاف زہر اُگلنا تھا۔ بولا:

''کل رات بگا سنگھ کافی دیر تک رام پیاری کے گھر میں بیٹھا رہا۔''

یہ سُن کر لالہ جی کے من سے بوجھ اُتر گیا۔ انہوں نے اطمینان سے اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

''ہم نے تو صرف اتنا سنا تھا کہ بگا سنگھ رام پیاری کو ہر روز لسّی اور دودھ بھجواتا ہے۔''

چنن سنگھ نے کہا:

''وہ تو اچھی بات ہے، اس پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے۔''

اسی وقت لدھا سنگھ وہاں سے گزرا تو لالہ جی کی محفل میں چنن سنگھ کو پا کر یہ بھی رُک گیا۔ اسے دیکھ کر چنن سنگھ کی بات جہاں کی تہاں ٹوٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لدھا سنگھ، بگا سنگھ کا آدمی ہے۔ وہ ہچکچاہٹ صرف پَل بھر کو ہی رہی۔ چنن سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ لدھا سنگھ یہ محسوس کرے کہ اس کے آ جانے پر اس موضوع پر بات چیت ہی

ٹوٹ گئی۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:

''رات برات اگر کوئی مرد کسی عورت کے پاس بیٹھا رہے...... تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

لدّھا سنگھ نے یہ پہلے ہی سن لیا تھا کہ بگا سنگھ کی چرچا چل رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پچھلی رات بگا رام پیاری کے یہاں گیا تھا، اگرچہ وہ جانتا تھا کہ بگا وہاں جانے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے من میں کہا کہ کل پہلی بار ہی بگا رام پیاری کے یہاں گیا ہوگا، ورنہ جاتا تو اسے خبر مل جاتی۔ اس نے اونچی آواز میں کہا:

''کیا بگا کا ذکر ہو رہا ہے؟''

سب لوگ تو چپ رہے چنن سنگھ ہی بولا:

''ہاں بگا سنگھ کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کل رات رام پیاری کے یہاں گیا تھا......''

لدّھے نے اس کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا:

''پر چنن سنگھ، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ خود رام پیاری نے اسے بلایا تھا، میں جانتا ہوں کہ کتنے دنوں سے رام پیاری اسے بُلا رہی ہے، لیکن وہ وہاں گیا نہیں۔ آخر کل چلا بھی گیا، تو اس میں قہر کی کیا بات ہے؟''

چنن سنگھ لدّھے یا بگے کی طرح موٹی عقل کا شخص نہیں تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اس میں قہر کی کوئی بات ہے۔ اگر رام پیاری خود ہی اُسے بلاتی ہے تو اس کے وہاں جانے میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بگا سنگھ دن کے وقت بھی تو وہاں جا سکتا تھا۔ آخر رات کے اندھیرے میں ملاقات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

لدّھا بولا:

''ممکن ہے کہ رام پیاری نے رات کو ہی بلایا ہو۔''

چنن سنگھ آہستہ سے ہنس کر بولا:

''لدّھیا! تم بھی کبھی کبھی بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہو۔ تم ایک طرح سے ایک خوب صورت اور نوجوان عورت پر الزام لگا رہے ہو، کہ اس نے جان بوجھ کر ایک انجان مرد کو رات کے وقت اپنے پاس بلایا...... کیا تم کبھی رام پیاری سے ملے ہو؟''

لدّھے نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''نہیں میں نے اس سے کبھی بات چیت نہیں کی۔ دور سے دو چار بار اسے دیکھا ضرور ہے۔''

''اب تم خود ہی سوچو کہ جس عورت سے تم ناواقف ہو اس کے بارے میں واضح طور پر کیا کہہ سکتے ہو؟ کم سے کم سب لوگوں کے سامنے کسی عورت کو فاحشہ ثابت کرنے کی کوشش تو بہت ہی بُری بات ہے۔''

اتنا کہہ کر چنن سنگھ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا تا کہ اس کے الفاظ سننے والوں کے من میں اچھی طرح

بیٹھ جائیں۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:

''ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایک خوبصورت اور جوان عورت کی آبرو بڑی ہی نازک چیز ہوتی ہے۔ وہ بے چاری ہم لوگوں کے بھروسے پر وہاں بیٹھی ہے اور اگر ہم لوگ اسے بدنام کرنے لگیں تو اسے کتنا دُکھ ہوگا...... جہاں تک میں جانتا ہوں رام پیاری نے بگا سنگھ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ اسے ہر روز لسّی، مکھن اور دودھ بھیجا کرو۔ چلو مان لیا کہ بگا سنگھ نے اپنی مرضی سے یہ سب کچھ بھیجنا شروع کر دیا۔ اس پر تو کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن رات برات اکیلی اور جوان عورت کے گھر میں جا گھسنا، تو ضرور ہی قابلِ اعتراض بات ہے۔ رام پیاری نے احسان مان کر بگا سنگھ کو بلا بھیجا ہوگا لیکن یہ تو بگا سنگھ کے سوچنے کی بات تھی کہ وہ رات کی جگہ دن میں ہی اس کے یہاں ہو آتا۔''

اب لالہ جی کو بھی اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے موقع مل گیا۔ بولے:

''سردار چنن سنگھ! یوں تو میں بھی تین چار بار رام پیاری کے یہاں جا چکا ہوں لیکن میں دن کے وقت جاتا تھا اور پانچ سات منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رُکتا تھا میں اس کی صرف خیر خیریت پوچھ کر ہی لوٹ آتا تھا۔''

چنن سنگھ نے کہا:

''لالہ جی! آپ کی بات کچھ اور ہے۔ آپ اس کے پِتا کے سمان ہیں۔ آپ بزرگ ہیں۔ کھری بات یہ ہے کہ نہ تو آپ پر کوئی شک کیا جاتا ہے اور نہ آپ کے معاملے میں رام پیاری پر شُبہ کیا جا سکتا ہے اگر وہ آپ کو بلا بھیجے تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایک بیٹی نے کسی کام سے اپنے پِتا کو بلایا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رام پیاری نے بگا سنگھ یا میری عمر کے آدمی کو رات کے وقت ملنے کے لیے بلایا ہے تو اس سے خواہ مخواہ بے چاری عورت بدنام ہوگی۔''

لدّھا سنگھ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں بیٹھے سبھی لوگ چنن سنگھ سے متفق ہو رہے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا:

''کوئی کسی کے من میں تو گھس نہیں سکتا۔ یہ کہنا کٹھن ہے کہ کون اچھا ہے کون بُرا۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ رام پیاری بلاتی رہی لیکن بگا سنگھ اس سے ملنے کے لیے نہیں گیا، اگر وہ کل گیا بھی ہوگا تو اس کا یہ پہلا ہی موقعہ ہے۔ یہ بات تو میں پورے وشواس سے کہہ سکتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر لدّھا سنگھ وہاں سے چل دیا۔

چنن سنگھ اسے جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ دُور نکل گیا، تو وہ بولا:

''لدّھا سنگھ تو بگا سنگھ کا اپنا آدمی ہے اور اس کا کٹر حمایتی ہے۔ ہم تو کسی کی طرف داری نہیں کرتے۔ ہم تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ اتفاق سے ایک دُکھیاری ہمارے ہی سہارے پر گاؤں میں

رہ رہی ہے، اُس لیے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے، جس سے وہ بے چاری بدنام ہو، اس طرح کی نہ ہی کوئی حرکت کریں۔ لالہ جی! آپ بزرگ ہیں، آپ ہی بتائیے کہ کیا میں نے کوئی بے جا بات کی ہے؟''

اس طرح سب کو متاثر کر کے چنن سنگھ وہاں سے چل دیا۔

اسی وقت لدّھا سنگھ بگا سنگھ کو یہ خبر پہنچانے کے لیے اس کے گھر پر گیا۔ پتا چلا کہ وہ کھیتوں والے طویلے میں ہے۔ لدّھا سنگھ فوراً کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جب وہ طویلے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ بگا سنگھ سر کے بال بکھرائے دھوپ میں کھرلی پر بیٹھا ہے۔ اسے دیکھتے ہی بگا سنگھ نے للکار کر پوچھا:

''آ او ئے لدّھیا! صبح صبح اِدھر کہاں آ ٹپکے؟''

''تم اسے صبح کہتے ہو؟ اتنی دُھوپ چڑھ آئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ تُم گھر پر ہو گے وہاں پتا چلا کہ تم یہاں پر ہو۔''

''ہاں! آج میں نے سر دھویا تھا۔ گیلے بال لپیٹ کر یہاں چلا آیا۔ یہاں کھیتوں کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی اور بال بھی سُکھا لوں گا...... تم کہو کوئی خاص بات ہے کیا، جو تم اس طرح لپکتے ہوئے یہاں آئے ہو؟''

''میں بھاگ مَل کی دکان کے پاس سے گزرا تو وہاں چبوترے پر لالہ جی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ان میں چنن سنگھ کو بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو اپنی محفل گاؤں کے دوسری طرف دھرم شالہ کے قریب جمایا کرتا ہے۔ میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ رات تم رام پیاری کے یہاں گئے تھے......''

''اوہ ہو، تو چنن سنگھ نے یہ خبر لالہ جی تک پہنچا دی۔ ہاں، میں رات رام پیاری کے یہاں گیا تھا۔ جب میں اس کے گھر سے باہر نکل رہا تھا تو چنن سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ اسی وقت مجھے شک ہو گیا کہ اب یہ بدمعاش مجھے گاؤں بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''وہی تو...... یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے چنن سنگھ کے تن من کو آگ لگ گئی ہے۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ بگا سنگھ اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا۔ نہ جانے اس کو خود رام پیاری نے کتنی بار بلا بھیجا لیکن بگا سنگھ ٹالتا رہا۔ میں نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ اگر رام پیاری کے بُلانے سے وہ وہاں چلا بھی گیا، تو اس میں قہر کی کیا بات ہے؟''

''تم نے یہ ٹھیک کیا۔''

''چنن سنگھ تو بھرا بیٹھا تھا کہنے لگا کہ یہ نو جوان خوب صورت عورت کی عزت بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ اس میں گاؤں کی بدنامی ہونے کا بھی ڈر ہے۔''

اب بگا سنگھ نے بپھر کر کہا:

''یہ بھی خوب رہی اگر میں وہاں جاؤں، تو عورت کی آبرو خطرے میں ہے اور گاؤں کی بدنامی ہوتی ہے لیکن اگر چنن سنگھ جائے تو اس میں سے کسی بھی بات کا ڈر نہیں ہے۔ تو گو یا رام پیاری اس کے باپ کا مال ہے۔ اسے رہنے کے لیے دو کمرے دے کر اس نے رام پیاری پر اتنا حق جمالیا ہے کہ اسے کسی اور کا اس سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔''

لدّھا سنگھ نے حامی بھرتی ہوئے کہا:

''خود رام پیاری یہ بات کبھی بھی نہیں مانے گی۔ وہ چنن سنگھ سے متفق ہوتی تو تمہیں اتنی بار بلاوا کیوں بھیجتی۔''

بگّا سنگھ نتھنے پھلا کر بولا:

''میں چنن سنگھ کو ٹھینگے پر رکھتا ہوں۔ میں رام پیاری کے پاس ڈنکے کی چوٹ پر جاؤں گا، اس حرامجادے سے جو بن پڑے سو کرے۔''

''ٹھیک ہی تو ہے۔ تم کیا چنن سنگھ کا دیا کھاتے ہو۔''

''ارے بھائی! میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر چنن سنگھ کو اپنے مکان کی اتنی دھونس ہے تو میں رام پیاری کے رہنے کے لیے الگ انتظام کر دوں گا۔ بس چنن سنگھ کی ساری دھونس ختم ہو جائے گی۔''

''تم اس بات کا رام پیاری سے بھی ذکر کرو۔ سنو تو وہ کیا کہتی ہے۔''

''میں نے سوچا تھا کہ دو تین دن رُک کر رام پیاری کے یہاں جاؤں گا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج ہی شام کو پھر اس سے ملوں گا۔ ذرا دیکھوں تو کون مائی کا لال مجھے وہاں جانے سے روکتا ہے۔''

اس شام بگّا سنگھ نے بڑے ٹھسّے سے کپڑے وغیرہ پہنے۔ پیلے رنگ کا انگوچھا بائیں بغل سے نکال کر داہنے کندھے پر پھینک لیا۔ کلائی والے موٹے کڑے پر خوب بڑے ریشمی رومال کی گرہ لگائی اور لاٹھی لے کر رام پیاری سے ملنے کو چل دیا۔

پچھلے روز کی طرح آج بھی اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس نے شام چڑھی لاٹھی سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ڈیوڑھی میں ہلکا سا پرکاش پھیل گیا۔ دروازے کے قریب ہی بھیتر سے زنانہ آواز سنائی دی:

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔''

''میں کون؟...... میں گھر میں اس وقت اکیلی ہوں۔ نام بتایئے۔''

''میں بگّا سنگھ ہوں۔''

''اُف ہو، معاف کیجیے میں آواز نہیں پہچان پائی۔''

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے لالٹین کی روشنی میں رام پیاری کھڑی تھی اور اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کے گال گرم گرم کچوریوں کی طرح پھول گئے تھے۔ لگتا تھا کہ بگا سنگھ کو دیکھ کر اس کا من گدگد ہوا اُٹھا تھا۔ بگا سنگھ نے پوچھا:

''بھیتر آ جاؤں؟''

''ضرور آ جایئے...... بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟''

''آپ نے بتایا نہ کہ آپ گھر پر اکیلی ہیں......''

''تو کیا ہوا۔ آپ کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔ جلدی میں آپ کی آواز پہچان نہیں سکی اس لیے نام پوچھ لیا۔''

بگا سنگھ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، تو رام پیاری نے گلی والے دروازے کا کنڈہ بھیتر سے چڑھا دیا۔ وہ لالٹین لے کر آگے آگے چلی۔ اس کے ناچ کرتے ہوئے کولہے پانی کی لہروں پر ہچکولے لیتے ہوئے کنول کی طرح لگ رہے تھے۔

پسار میں پہنچ کر رام پیاری نے بگا سنگھ کو پچھلے روز کی طرح پلنگ پر بٹھایا اور خود اُونچے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ بولی:

''آپ نے بہت اچھا کیا، جو چلے آئے میں بڑا سونا پن محسوس کر رہی تھی۔''

''منگل کہاں ہے؟''

''نہ جانے کہاں نکل گیا ہے کہہ گیا تھا میں کچھ دیر سے آؤں گا۔ آخر بے چارا کہاں تک میرے ساتھ بندھا رہے گا۔''

بگّے نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہا: ''یہ گھر بھی تو گاؤں کے ایک سرے پر پڑ جاتا ہے، کافی سونا رہتا ہے اِدھر۔''

''کیا کیا جائے، یہی غنیمت ہے کہ سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔''

بگا سنگھ کے من میں آیا کہ وہ مکان بدلنے کا سجھاؤ دے دے لیکن اتنی جلد بازی بھی ٹھیک نہیں تھ۔ اس کے لیے کچھ میدان تیار کرنا ہوگا۔

رام پیاری مسکرائے جا رہی تھی بگّے نے بھی مسکرا کر کہا:

''آپ بہت خوش نظر آتی ہیں۔''

رام پیاری کا چہرہ اور بھی کھل اُٹھا بولی:

''آپ کو یہاں پا کر بہت خوش ہو رہی ہوں میں ڈر رہی تھی کہ آپ ضرور تین چار دن کا ناغہ کر جائیں گے۔ یہ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ آج ہی یہاں چلے آئے۔''

''لیکن رام پیاری، بعض لوگ ایسے بھی ہیں، جنہیں میرا یہاں آنا پسند نہیں ہے۔''

''ہائے رام! آپ کے یہاں آنے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

رام پیاری متفکر نظر آنے لگی۔ وہ موڑھے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور دھیرے دھیرے پلنگ کے پاس پہنچ گئی۔

بگا سنگھ نے کہا:

''آپ سنیں گی تو آپ کو بڑا تعجب ہوگا شاید آپ بھی مجھے یہاں آنے سے منع کر دیں۔''

رام پیاری اسے کھوئے کھوئے انداز میں بگا سنگھ کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور گھمبیر آواز میں بولی: ''آخر وہ ہے کون؟''

''آپ کا چنن سنگھ۔''

رام پیاری کے ماتھے والے بَل گہرے ہو گئے۔ حیران ہو کر بولی:

''ارے انہیں آپ کے یہاں آنے پر اعتراض کیوں ہے؟''

''اس کی وجہ تو میں بھی نہیں جانتا۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہے۔''

''مجھے دھوکا نہیں ہوا، خود میرے آدمی لدھا سنگھ نے چنن سنگھ کو یہ بات کھلی محفل میں کہتے سُنا۔''

کچھ دیر کو ماحول پر پوری خاموشی چھا گئی۔ رام پیاری کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ بگا سنگھ بولا: ''اگر آپ کو بھی بُرا لگتا ہے تو میں آگے سے نہیں آؤں گا۔''

اس پر رام پیاری نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بگا سنگھ کے ہاتھ پر رکھ دیا:

''نہیں، آپ کا آنا مجھے بُرا نہیں لگتا۔ آپ آتے ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرے پاس اور لوگ بھی تو آتے ہیں۔ آپ بے کھٹکے آیا کیجیے۔''

اگر آپ کے چنن سنگھ نے اور زیادہ شور مچایا تو؟''

رام پیاری پختہ آواز میں بولی:

''انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن جو ہو، سو ہو میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔''

تیسرا غلاف

وارث شاہ نہ تھاں دَم مَارنے دا، چار چَرم دی جدوں گھمسان ہوئی

(وارث شاہ)

''اے وارث شاہ! جہاں چار آنکھوں میں گھمسان جنگ چھڑ جائے، وہاں کوئی دوسرا دم بھی نہیں مار سکتا۔ یعنی دوسرے لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

ا

جب سے جَسّا اپنے چاچا کے پاس ہری پورے آیا تھا، تب ہی سے اس کا من اکھڑا اکھڑا سا تھا لیکن جب دیپی سے اس کی ملاقات ہوگئی تو اس کا من بھی بہل گیا۔ گوردوارے والے واقعہ کے بعد انہیں عموماً ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ ایک دوسرے کے لیے ان کا لگاؤ بالکل بچگانہ سا تھا لیکن ان کے شعور کی گہرائی میں اس باہمی ناطے کی کوئی گہری وجہ بھی موجود تھی۔ چاہے وہ اس بات کو ابھی نہیں سمجھتے تھے مگر یقیناً عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ان پر واضح ہوئے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔

دیہات میں ان کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کا ایک ساتھ دیکھا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اس بات کی اُمید کی جاتی تھی کہ دس بارہ برس کی لڑکیوں کو لڑکیوں کے ساتھ اور جسّے کی عمر کے لڑکوں کو لڑکوں کے ساتھ ہی کھیلنا شوبھا دیتا ہے۔ ایک دو برس گزر جانے پر تو ضرور رہی ان کے لیے کھلم کھلا بات چیت کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہ نظر بچا کر ملتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بڑوں کو اس پر اعتراض کیوں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کھیلنا، کودنا یا باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔

ملنے جلنے کا سب سے اچھا موقع اس وقت ہوتا تھا جب عورتیں دوپہر بھر کے لیے نہر پر کپڑے دھونے کے لیے چلی جاتیں۔ دیپی پہلے سے بنائی ہوئی سکیم کے مطابق اپنی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ وہاں سے کھسک جاتی اور جسّے سے جا ملتی۔ وہ سب مل جل کر گپیں ہانکتے اور کوئی نہ کوئی کھیل بھی کھیلتے۔

جسّے نے دیپی کو اپنے کتے بھی دکھائے۔ دیپی اور اس کی سہیلیوں کا من خوش کرنے کے لیے اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ کسی خرگوش یا جنگلی بلے کے پیچھے کتوں کو دوڑائے۔ اتفاق سے نہ تو کبھی کوئی خرگوش نظر آیا اور نہ جنگلی بلا۔ بے بس ہو کر جسا کتوں کو گلہریوں کے پیچھے ہی دوڑاتا رہا۔ گلہریاں فوراً ہی پیڑوں پر چڑھ جاتیں اور کسی شاخ پر دُم اُٹھا اُٹھا کر پُھدکنے لگتیں۔ لڑکیوں کے لیے اتنا سا ہی تماشا کافی تھا۔ وہ اُچھل اُچھل کر تالیاں بجاتیں اور چیخ چیخ کر ہنستیں۔

اب جسّے کو رام پیاری کوئی بھی کھانے کی چیز دیتی تو وہ اسے سنبھال کے رکھتا اور ملاقات ہونے پر دیپی کو دے دیتا۔ دیپی کہتی:

''لو تم بھی تو کھاؤ۔''

جسّا اپنے پیٹ کو پھلا کر اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا:

''نہیں دیپی، میں بہت کچھ کھا چکا ہوں۔ دیکھو تو میرا پیٹ مشک کی طرح پھولا ہوا ہے۔''

دیپی اپنے چھوٹے چھوٹے چمکیلے دانت دکھا کر ہنستی۔ اسے کھلا پلا کر جسّے کے من کو کتنی خوشی ہوتی تھی۔

نہر کے بہت نیچے کی طرف جا کر وہ ایک ساتھ نہاتے بھی تھے۔ ان لڑکیوں کے جسم ابھی لڑکوں کی طرح سپاٹ تھے۔ پھر بھی جسّے کو ان کے ساتھ نہر میں تیرنا اور غوطے لگانا اچھا لگتا تھا۔ وہ ان سب کا قائد مانا جاتا تھا۔ ہر کٹھن موقعہ پر جسّا ہی ان کے کام آتا تھا۔ ان سہانے دنوں کا سلسلہ جلد ہی ٹوٹنے لگا۔ دوسری لڑکیوں نے دیپی اور اس کی سہیلیوں کی شکایت گھر والوں کو پہنچا دی کہ وہ اِدھر اُدھر غائب ہو کر جسّے کے ساتھ کھیلنے کے لیے نکل جاتی ہیں۔ دیپی کو اس بات پر ڈانٹ بھی پڑی۔ اب ان کا میل جول اور کھیلنا کودنا ختم ہو گیا۔ تین دن غائب رہنے کے بعد ایک روز دیپی گلی میں مل گئی تو آنکھ چرا کر جسّے کے پاس سے نکل گئی۔ جسّے نے آواز دے کر بلایا تو وہ رُک گئی۔ اس نے پوچھا:

''دیپی! آج کل تم کہاں رہتی ہو؟''

دیپی نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

''اب ہم نہیں مل سکتے۔''

جسّے کے سینے میں جیسے گھونسا سا لگا۔ پوچھا: ''کیوں؟''

''گھر والے کہتے ہیں کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنا اچھا نہیں ہے۔''

جسّے نے کچھ سوچ کر سجھاؤ دیا:

''اچھا ہم ایک ساتھ نہیں کھیلا کریں گے، لیکن ہم ویسے تو مل سکتے ہیں۔''

''نہ بابا۔''

''کتنی ڈرپوک ہو تم کیا بات کرنے میں بھی گھر والوں کو اعتراض ہو گا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

جسّے کو یوں لگا، جیسے خود دیپی ہی جان بوجھ کر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ س نے جلدی سے آگے پیچھے نظر دوڑائی۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ اس نے گدھ کی طرح پنجا بڑھا کر دیپی کی چٹیا دبوچ لی اور اسے بڑے زور کے ساتھ اپنی طرف کھینچا۔

درد کے مارے 'آہ' کہہ کر دیپی سہمی ہوئی جسّے کی طرف دیکھنے لگی۔ جسّے کا چہرہ ہتھوڑے کی طرح گول مٹول ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں فولاد کی سی چمک تھی۔ اس نے بھینچے ہوئے دانتوں کے ساتھ غرّا کر کہا:

''تم مجھے اچھی لگتی ہو...... یاد رکھو اگر تم نے مجھ سے ملنے میں آنا کانی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔''

دیپی نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا:

''تم ہمیں گھروالوں سے پٹوانا چاہتے ہو کیا؟ ہم بُری طرح پٹیں گی، تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟''

جسّے نے من میں سوچا کہ بے چاری دیپی کی پٹائی ہونے پر اس کے من کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوگی۔ اس نے چٹیا چھوڑ دی اور ذرا نرم آواز میں بولا:

''تم اپنی سہیلیوں کو اپنے ساتھ کیوں چپکائے رکھتی ہو؟ اسی لیے تو ساری گڑبڑ ہوتی ہے۔''

''تو کیا کروں؟''

''اکیلی آیا کرو......''

بات بیچ میں ہی رہ گئی، کیونکہ گلی کے نکڑ سے کوئی آتا دکھائی دیا، تو دیپی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ جسا آرام سے دوسری سمت کو چل دیا۔

نکڑ سے جو آدمی مڑا تھا وہ چنن سنگھ تھا۔ وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر چنن سنگھ رُک گیا۔ جسا سمجھا کہ اس نے اسے دیپی کی چٹیا کھینچتے یا اس سے بات کرتے دیکھ لیا ہے۔ مگر چنن سنگھ نے دوسری بات شروع کر دی۔ اس نے پوچھا:

''کیوں بے، تُو ہی بگّا سنگھ کا بھتیجا ہے؟''

جسّے کے پتھر جیسے چہرے پر جڑی بٹن جیسی آنکھیں پل بھر کو اُٹھیں، اور وہ بولا:

''ہاں!!''

''کیا نام ہے تیرا؟''

''جسا''

''ہاں......جسّو! میں نے نام سن رکھا تھا یاد نہیں آ رہا تھا۔''

جسّے نے چنن سنگھ کی بات چیت میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ وہ مڑ کر وہاں سے چلنے لگا تو چنن سنگھ پھر بولا:

''سنو تو۔''

جسا رُک گیا۔

چنن سنگھ نے اپنی لمبی موٹی اُنگلی اس کے کندھے پر ٹکاتے ہوئے پوچھا:

''تمہارا چاچا کہاں ہے اس وقت؟''

''معلوم نہیں۔''

''معلوم کیسے نہیں؟......کیا تم گھر میں نہیں رہتے ہو؟''

''رہتا ہوں لیکن ابھی تو کافی دیر سے میں باہر ہی گھوم رہا ہوں۔''

چنن سنگھ نے کڑوے پن سے کہا:

''آوارہ گردی نہیں کرو گے تو اور کیا کرو گے......جیسا چاچا ویسا ہی بھتیجا۔''

جسّے کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ چنن سنگھ جیسے لمبے چوڑے آدمی کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ چپ چاپ وہاں سے چلنے لگا تو چنن سنگھ نے اس کا کندھا تھام کر کہا:

''رُکو!''

وہ رُک گیا۔

چنن سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا:

''آج کل کہاں کہاں جاتا ہے، تیرا چاچا؟''

جسّے نے روکھے پن سے جواب دیا:

''میں کیا جانوں، میں اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا ہوں؟''

چنن سنگھ ٹھ نما لڑکے کو پل بھر گھورتا رہا اور پھر دھیرے سے پوچھا:

''تجھے یہ تو معلوم ہوگا کہ آج کل تیرا چاچا رام کے پاس دن میں کتنی بار جاتا ہے۔''

''میں نہیں جانتا۔''

''اب تو شاید تو یہ بھی کہے گا کہ تُو رام پیاری کو بھی نہیں جانتا۔''

جسّے نے ہٹ دھرمی سے کہا:

''ہاں، میں اسے بھی نہیں جانتا۔''

جسا بڑا ڈھیٹ اور نڈر لڑکا تھا۔ چاہے وہ چنن سنگھ سے بھڑ نہیں سکتا تھا لیکن دبنے والا بھی نہیں تھا۔ اتنی بات چیت کے بعد جسا وہاں سے چل دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر چنن سنگھ نے رُکنے کے لیے کہا بھی تو وہ نہیں رُکے گا۔

چنن سنگھ کھڑے کھڑے جسّو کو جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ گلی کے نکڑ سے غائب ہو گیا تو چنن سنگھ دانت پیستے ہوئے بڑبڑایا:

''حرام کا تخم!''

اب جسا گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کا چاچا رحیم سے باتیں کر رہا ہے۔ جسے نے نظر بچا کر کھسک جانے کی کوشش کی لیکن چاچا نے اسے دیکھ لیا۔ وہ دھاڑ کر بولا:

''اوئے، حرامی کے پلّے، ذرا اِدھر تو آ۔''

جسا چاچے کی طرف چل دیا۔ چاچے نے پوچھا:

''کیوں بے، تو سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہے؟''

جسا سمجھ گیا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ چنن سنگھ والا بہانہ بھی اچھا تھا۔ وہ فوراً بولا:

''میں آ رہا تھا تو گلی میں چنن سنگھ ملا۔''

چنن سنگھ کا نام سن کر بگا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے۔ پوچھا:

''تو کیا تجھ سے کچھ کہہ رہا تھا؟''

''ہاں!!''

''کیا؟''

''پہلے اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ہی تمہارا بھتیجا ہوں......''

''اس بھان چھودکا اس بات سے کیا مطلب......پھر؟''

''جب میں نے بتایا تو اس نے پوچھا کہ آج کل تیرا چاچا کہاں کہاں جاتا ہے۔''

جسّے کے ان لفظوں پر بگا سنگھ بدکا...... ممکن ہے رحیم کی موجودگی کی وجہ سے۔ وہ جسّے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بھیتر لے گیا اور ذرا دھیمی آواز میں کہا:

''اب بتا کہ اس نے کیا کیا کہا۔''

''اس نے مجھ سے پوچھا کہ تیرا چاچا دن میں کتنی بار رام پیاری کے پاس جاتا ہے۔''

یہ سُن کر بگا سنگھ آگ ببولا ہو گیا اور منہ سے تھوک اُڑاتے ہوئے بولا:

''حرامجادہ کہیں کا، بھلا لڑکے کو گلی میں روک کر ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا بچو! اگر میں نے بھی گج بھر لاٹھی نہ کر دی، تو میرا نام بگا سنگھ نہیں۔''

چاچے کے غصہ کو نئی سمت بڑھتے دیکھ کر جسّے کو اطمینان ہوا۔ چاچا نے پھر پوچھا:

''اور کیا کیا کہا، چنن کے بچے نے؟''

جسّے نے باقی باتیں بھی بتا دیں۔ بگا دانت پیسنے لگا۔ جسّے نے اس موقعہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے پوچھا:

''میں جاؤں چاچا؟''

بگا کھوئے کھوئے بولا۔ ''جا''۔

جسّے نے لوٹنے کے لیے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ یکا یک ہی بگے کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر جسّے کو جوڑے سے دبوچ لیا اور لال لال آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا:

''بچو! تو کہاں کو چلا؟ تیری میری تو بات ہوئی نہیں۔''

جسا سمجھے بیٹھا تھا کہ اس کی جان چھوٹ گئی ہے اور چاچا اسے جس بات پر پھٹکارنا چاہتا تھا، وہ چنن سنگھ کے جھگڑے میں ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ چاچا کو اس سے کس بات پر شکایت ہے اور وہ کیوں اسے ڈانٹنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ چاچا اسے بغیر وجہ بھی دوسرے تیسرے دن دو چار تھپڑ لگا دیتا مگر اس کا آج کا غصہ زیادہ گہرا اور تیز معلوم ہوتا تھا۔

جسّے کو جوڑے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے چاچا نے ڈانٹ کر پوچھا:

''کیوں بے، آج کل تجھے لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کی دُھن کیوں رہتی ہے؟''

جسّے نے انجان بن کر پوچھا:

''لڑکیاں؟''
''میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ میرے سامنے بننے کی کوشش مت کیا کرو۔ یہ بھی مت سمجھو کہ میں افیم کھا کر اور اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے اونگھتا رہتا ہوں۔ میری آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔''
جسّے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود چاچے نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا، یا کسی نے اس سے شکایت کی تھی۔
چاچے نے پوچھا:
''یہ وِیرو اور پریتو کے ساتھ تمہارا گھومنے کا مطلب کیا ہے؟''
پریتو اور ویرو دیپی کی سہیلیاں تھیں اور وہ دونوں دیپی کے ساتھ اس کے پاس آیا کرتی تھیں۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ چاچانے دیپی کا نام کیوں نہیں لیا، آخر اس کے گہرے تعلقات تو دیپی ہی سے تھے۔
چاچانے پھر کہا:
''ویرو اور پریتو دونوں کے باپ تمہاری شکایت کرنے آئے تھے۔ وہ تو خود ہی تمہاری ہڈیاں توڑ دیتے لیکن تمہیں میرا بھتیجا جان کر انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب تو یہ بتا کہ گاؤں میں کیا سب لڑکے مر گئے ہیں؟ لڑکیوں میں گھس بیٹھی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ سُور کی اولاد! ابھی پیدا تو ہو لے، عشق کرنے کو ساری عمر پڑی ہے۔''
جسّے نے بہانہ بنایا:
''چاچا، یہ دونوں لڑکیاں تو خود ہی میرے پاس ایک دو بار آئیں میں نہر پر نہانے گیا تھا، وہیں ان سے بات چیت ہوئی۔ میں ان کے ساتھ کبھی نہیں کھیلتا۔''
چاچانے اس کے جوڑے کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ کر اسے خوب اچھی طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا:
''بدذات کہیں کے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو جتنا دھرتی کے باہر ہے اس سے دوگنا دھرتی کے بھیتر ہے۔ اگر تیری کھوپڑی میں تِل برابر بھی عقل ہے تو آج میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ آئندہ میں نے تیری شکایت سُنی تو ایسی مار ماروں گا کہ دیکھنے والوں کو پتا نہیں چل پائے گا کہ تیرا منہ کدھر اور گانڈ کدھر ہے...... سمجھا؟''
بال کھنچ جانے سے درد کے مارے جسّے کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ دھیرے سے بولا:
''ہاں چاچا سمجھ گیا۔''
چاچے نے اس کا جوڑا چھوڑ دیا۔ جسا گھر کی طرف چلا گیا۔ جھنو نے اسے دیکھا تو بولی:
''کیوں چاچے سے ڈانٹ پڑی ہے کیا؟''
جسا چپ چاپ ایک طرف بیٹھ کر تنکا توڑنے لگا۔

بھجو نے پھر کہا:

"اب کے تو میں تیرے چاچا پر دوش نہیں دھروں گی۔ غلطی تیری ہے تو کیسا لڑکا ہے۔ لڑکیوں میں کھیلتا ہے۔ اب تو اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ تو سب سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ تو لڑکا ہو کر لڑکوں سے دُور بھاگتا ہے۔ اس معاملے میں میں تیرا ساتھ بالکل نہیں دُوں گی۔"

جسّے نے بُوا کو بھی اپنی مخالفت کرتے دیکھا تو اس کا دل اور بھی اُداس ہو گیا۔

بھجو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی:

"دیپی کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ وہ تیرے چاچا سے ملنا چاہتی تھی، لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ اس نے بتایا کہ تم نے دیپی سے بھی بڑا میل جول بڑھا رکھا ہے۔ دیپی کا باپ بے چارہ بہت ہی بھلا آدمی ہے۔ وہ تیرے چاچا کے پاس جان بوجھ کر نہیں آیا۔ اب میں تجھ سے صرف اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ آئندہ تو ایسی کوئی بھی حرکت ہرگز نہ کرنا، ورنہ تمہارا چاچا تمہاری چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دے گا۔"

اس کے بعد بھی بُوا اسے بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ ایک اناتھ لڑکا ہے، اس لیے اسے بہت سنبھل کر رہنا چاہیے۔

جسّے کے من پر ان سب باتوں کا اتنا ہی اثر پڑا کہ وہ اور زیادہ اُداس ہو گیا اور اس کے من میں دیپی سے ملنے کی خواہش پہلے سے بھی زیادہ تیز اور مضبوط ہو گئی۔

وہ چپ چاپ اُٹھا اور مکان کے پچھواڑے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پہلے وہ گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہا اور پھر گاؤں کے باہر جوہڑ کے کنارے گرے ہوئے پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر ان بھینسوں کو دیکھتا رہا جنہیں کچھ لڑکے پانی کے چھینٹے مار مار کر نہلا رہے تھے۔

وہاں سے اُٹھ کر جسّا بیاں کے بوتے (اونٹ کا بچہ) کی طرح کھیتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس کا مسئلہ بڑا گھمبیر تھا۔ اسے یا تو بوا بھجو سے پیار ملتا تھا، یا دیپی سے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ آج اسے دیپی سے اپنا نازک تعلق ٹوٹتا نظر آیا اور پھر اسے بُوا سے بھی مدد کی آشا نہیں رہی تھی۔

اِدھر اُدھر سٹر گشتی کرتے وقت وہ چاروں طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

۲

دن گزرتے جا رہے تھے۔ بگّا سنگھ لگ بھگ ہر روز شام کا وقت رام پیاری کے پاس گزارتا تھا۔ وہاں جانے کا حوصلہ اس لیے بھی بڑھا کہ خود رام پیاری بھی یہی چاہتی تھی۔ اُن کی ملاقاتیں بالکل ایسی ہی ہوتی تھیں،

جیسی دو دوستوں میں ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے لمبی چوڑی باتیں کرتے، کچھ اپنے من کی کہتے کچھ دوسرے کی سنتے۔ ہلکی پھلکی ہنسی اور مذاق وغیرہ بھی چلتا رہتا۔ کل ملا کر ان کے یہ تعلقات بات چیت تک ہی محدود رہے۔

ان کی ان ملاقاتوں کا ایک نیا پہلو یہ تھا کہ سارے گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ ان دونوں کا تعلق عشق معشوق والا تعلق ہے۔ بگا سنگھ نہیں جانتا تھا کہ رام پیاری کے کانوں تک یہ باتیں پہنچتی تھیں یا نہیں لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا عموماً لوگ اشارے بازی کیا کرتے تھے۔ بگا سنگھ ان اشارے بازیوں سے نہ تو چڑتا تھا اور نہ اسے برا لگتا تھا۔ بلکہ اس کے من میں سہانی سی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ جب کسی مرد کا نام رام پیاری جیسی حسینہ سے جوڑا جائے تو ایسے مرد کو ضرور ہی اچھا لگے گا۔ وہی حال بگا سنگھ کا تھا۔ جو لوگ اس سے زیادہ بے تکلف نہیں تھے، وہ صرف اشارے سے کام لیتے اور جن سے اس کی بے تکلفی تھی، وہ اپنے من کی بات کھلم کھلا کہہ ڈالتے۔ بگا ہر کسی کی بات کو ہنسی میں ٹال دیتا۔

گاؤں میں ایک مانا ہوا شخص ایک اور بھی تھا۔ اس کا نام شیر سنگھ تھا۔ چڑھتی جوانی کے زمانے میں اس نے بھی کئی کارنامے کر دکھائے۔ شادی ہو گئی، کچھ بچوں کا باپ بنا، تو وہ سنبھل گیا۔ بری عادتیں بہت حد تک چھوٹ گئیں۔ ایک عام گرہست بن جانے کے باوجود اس کا دھاکڑ پن کم نہیں ہوا تھا۔ گاؤں میں تین ہی تو گٹ تھے...... بگا سنگھ کا، چنن سنگھ کا اور شیر سنگھ کا۔ چنن سنگھ چونکہ رشتے دار تھا، اس لیے بگا سنگھ کی اس سے چلتی تھی۔ شیر سنگھ سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ دو اینٹھ والے اشخاص میں دوستی نہیں ہو سکتی لیکن وہ ایک دوسرے کو عزت تو دے سکتے ہیں۔ یہی حال بگا سنگھ اور شیر سنگھ کا تھا۔ وہ آپس میں بڑی بے تکلفی سے ہنس بول لیتے تھے مگر ایک دوسرے کے راستے میں روڑا اٹکانے سے باز رہتے تھے۔ نہ تو شیر سنگھ، بگا سنگھ سے ٹکر لینا چاہتا تھا اور نہ بگا سنگھ شیر سنگھ کے مقابلے میں آنا چاہتا تھا۔

چھوٹا موٹا مسئلہ اُٹھتا بھی تو اس کے پہلے کہ وہ زیادہ گھمبیر ہو پائے، یا تو شیر سنگھ پیچھے ہٹ جاتا تھا یا بگا سنگھ کنّی کاٹ جاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس، والا اصول چلتا تھا۔ جو لوگ کمزور پڑتے تھے وہ دب کر رہتے، اور ہر گٹ سے بچنے کی کوشش کرتے۔ جو تھوڑے حوصلے والے ہوتے وہ کسی نہ کسی گٹ میں شامل ہو جاتے۔ ہر گاؤں کے مانے ہوئے دھاکڑ اپنی بستیوں کی بہو بیٹیوں کی حفاظت کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ گویا اس طرح دیہات کی سماجی گاڑی چکر چوں کرتی ہوئی چلتی تھی۔

ایک دن صبح سویرے بگا سنگھ گورو گرنتھ صاحب کے آگے ماتھا ٹیکنے کے بعد گورودوارے سے لوٹ رہا تھا تو گاؤں کے باہر شیر سنگھ سے اس کی بھینٹ ہو گئی۔ ایک دوسرے کو 'ست سری اکال' کہنے کے بعد بگا سنگھ نے شکایت کی:

''اوئے شیریا! نہ جانے کہاں رہتا ہے تُو، کبھی تیری شکل تک دکھائی نہیں دیتی۔''

شیر سنگھ نے دوستانہ انداز سے ہلکا سا گھونسا بگا سنگھ کے سینے پر جماتے ہوئے جواب دیا:

''میں تو گاؤں میں ہی رہتا ہوں نہ کہیں آنا، نہ جانا۔ یہ الگ بات ہے کہ تجھے میں نظر نہیں آتا، جو

تیری طرح اونچا اُڑ رہا ہو، اسے گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے لوگ کیسے دکھائی دے سکتے ہیں؟''

بگا سنگھ اس کی چوٹ کو سمجھ گیا۔ اس نے بات کا رُخ پلٹ کر پوچھا:

''تُو نے کہیں آنا جانا بند کیوں کر رکھا ہے؟''

''بچو! میں نے جان بوجھ کر بند نہیں کیا۔ گھر گرہستی نے زبردستی بند کرا دیا ہے۔ تیری میری عُمر لگ بھگ ایک ہی برابر ہے۔ تو اکتیس بتیس سال کا ہوگا اور میں تینتیس چونتیس سال۔ مجھے دیکھ...... بڑی لڑکی نو دس برس کی ہو چکی ہے۔ چھ سات سال گزرنے میں کون سا دیر لگتی ہے۔ میری عورت کو تو ابھی سے ہی بڑی لڑکی کا فکر کھائے جا رہا ہے۔ اس کی شادی ہو جانے پر دو لڑکیاں اور تیار ہو جائیں گی۔ ہمیں تو بھیا اسی جنجال سے فرصت نہیں، ہم نئے لچھے کیا پا لیں گے...... مگر تیرا جواب نہیں۔ اب بھی گھنگرو ے بجاتا پھر رہا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ زندگی ہو تو تمہارے جیسی، یعنی موج بھی ماری اور سر پر بال بچوں کی ذمہ داری بھی نہ آئی۔''

''یار تُو تو بے کار میں جل رہا ہے۔''

شیر سنگھ نے بڑی گھمبیرتا سے کہا:

''دھرم نال (قسم سے) میں جلتا بالکل نہیں۔ جلے تو وہ جس نے اپنی زندگی میں خود کچھ نہ کیا ہو۔ میرا بھی ایک زمانہ تھا، جب میری پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا تھا...... ہم تو بس یہ کہتے ہیں کہ موج اڑائے جاؤ، مال بہت اچھا ہے...... بالکل کڑاہ (حلوہ) ہے کڑاہ۔''

بگا سنگھ نے ہونٹوں پر جیبھ گھماتے ہوئے اپنا ہاتھ شیر سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا اور بھاری آواز میں بولا:

''دیکھ شیریا! دوسرے لوگ بھی ایسے اشارے کرتے ہیں تو میں صرف ہنس دیتا ہوں لیکن تجھ سے میں کچھ چھپانا نہیں چاہتا، شاید تمہیں میری بات پر وشواس نہ آئے لیکن اصلیت یہ ہے کہ رام پیاری سے میرا تعلق صرف بات چیت کا ہی ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔''

''اوئے، بُردے بُن! کیا تم نے سچ مچ اسے ابھی تک نہیں چکھا؟''

''نہیں۔''

''وجہ؟''

''وجہ بھی کوئی خاص نہیں ہے۔''

''کیا وہ تجھ سے بھڑکتی ہے یا بچ کر رہنے کی کوشش کرتی ہے، یا تجھے صرف باتوں پر ٹرخا دینا چاہتی ہے؟''

''نہ وہ مجھ سے بھڑکتی ہے اور نہ بچ کر رہنے کی کوشش کرتی ہے لیکن میں یہ نہیں جان پایا کہ وہ مجھے صرف باتوں پر ٹرخا دینا چاہتی ہے یا اس کے من میں کچھ اور بھی ہے۔''

''اوئے، گنگا بہہ رہی ہے اور تُو سکھم سوکھا کنارے پر بیٹھا ہے۔ مار دے چھلانگ بگا سنگھ ڈرتا کس سے ہے۔''

بگا سنگھ خاموش رہا۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ رام پیاری کے معاملے میں اَب تک اسے ڈر کی کوئی بات ہی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ صرف ذرا سی جھجک تھی۔ اس بات کا شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رام پیاری پر ہاتھ ڈالے تو آگے سے ٹکا سا جواب مل جائے۔ وِداع ہونے سے پہلے شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''بچو! جیون میں ایسے موقعے بار بار نہیں آیا کرتے۔ یاد رکھ کہ جو آدمی اپنا آگا پیچھا نہیں سوچتا، وہ دراصل گدھا ہوتا ہے مگر جو شخص ضرورت سے زیادہ آگا پیچھا سوچتا رہتا ہے وہ بھی گدھا ہی ہوتا ہے۔''

دو قدم آگے بڑھ کر شیر سنگھ کو جیسے نئی بات سوجھی۔ اس نے مڑ کر پل بھر کو بگا سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر کہا:

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، اس لیے رام پیاری اور اپنے بارے میں تُو نے جو کچھ کہا، میں نے اس پر وشواس کر لیا۔ گاؤں کا کوئی اور شخص تیری اس بات کو بالکل نہیں مانے گا۔ تُو یہ بھی تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے کچھ مہربان ایسے بھی ہیں جو تجھے دن رات بدنام کرتے رہتے ہیں......''

اس بات پر بگا سنگھ کا بھدا چہرہ اور بھی بھدا ہو گیا۔ اس کا دھیان فوراً ہی چنن سنگھ کی طرف چلا گیا۔

لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے شیر سنگھ نے اپنا ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر صلاح دی:

''ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اس مُفت کی بدنامی سے تجھے کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ اوئے بدنام ہی ہونا ہے تو کچھ کر کے بدنام ہو......اچھا ست سری اکال۔''

شیر سنگھ کی یہ باتیں دن بھر اس کے دماغ میں گھومتی رہیں۔ وہ بہت ہی بے چین رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ رام پیاری کا ہاتھ تھام لے گا۔ جو ہو سو ہو وہ سیدھی طرح نہیں مانے گی تو زبردستی ہی سہی۔ اگر وہ اب تک پھوکٹ میں باتیں ہی کرتی رہی ہے تو میرے زبردستی کرنے پر زیادہ سے زیادہ چنن سنگھ کے سامنے اپنا رونا روئے گی۔ چنن سنگھ نے کچھ کیا تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

اب تک رام پیاری کے بارے میں بگا سنگھ کئی طرح کی باتیں سوچتا رہا تھا۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ کیا رام پیاری صرف اس کا احسان مان کر اس سے گھلی ملی رہتی تھی یا اس کے من میں کچھ اور بھی تھا۔ پہلی بات کے ٹھیک ہونے میں تو کوئی شُبہ ہی نہیں تھا۔ اور دوسری بات کو واضح کرنے کا اب تک اسے حوصلہ نہیں ہو پایا۔ مگر آج اس بات کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔

شام ہوئی، تو بگا سنگھ نے منہ ہاتھ دھو کر دُھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ لاچا، پگڑی، کرتہ وغیرہ سب ہی کچھ بدل ڈالا۔ ڈاڑھی میں مکھن لگا کر اسے کنگھے سے صاف کیا۔ ایک انگوچھا کندھے اور بغل کے آر پار پھینکا۔ دونوں آنکھوں میں سُرمے کی سلائی، ہلکے سے چھوا دی۔ اس طرح بانکا بن کر بانکے انداز سے چلتا ہوا وہ رام پیاری کے

دروازے تک جا پہنچا اور اپنے خاص انداز سے اس نے لاٹھی سے دروازے کو کھنکھٹایا۔
دروازہ منگل نے کھولا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا دیا تھا۔ بگا سنگھ نے بڑی خوش مزاجی سے پوچھا:
''کہو منگل کیا حال ہے؟''
منگل کو تھوڑا تعجب ہوا کیونکہ بگا سنگھ بہت کم اس کا حال چال پوچھا کرتا تھا۔ بولا:
''ٹھیک ہوں، سردار جی!''
بگا سنگھ نے پوچھا:
''تم نے کھانا کھالیا؟''
منگل نے بگے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:
''ہاں!''
بگا سنگھ نے مٹی کا دیا منگل کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:
''اچھا تو جاؤ، ذرا گھوم آؤ۔''
''گھوم آؤں؟ کہاں گھوم آؤں؟''
بگے نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر ہلکے انداز سے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا:
''ارے کہیں بھی گھوم آؤ۔ اب میں آ گیا ہوں فکر کس بات کا ہے۔ میرے ہوتے گھر میں ڈاکہ تو نہیں پڑ سکتا۔''
منگل گلی میں جا کھڑا ہوا۔ وہ پل دو پل بگے کے کٹھور چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا:
''اچھا اگر آپ کہتے ہیں تو میں گھومنے چلا جاتا ہوں۔''
''شاباش''
منگل اپنے کندھے پر پڑی چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر آگے بڑھ گیا اور بگے نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھادی۔
جب اس نے پلٹ کر صحن کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں رام پیاری کھڑی تھی بگا کچھ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ رام پیاری نے مسکرا کر دھیمے لہجے میں پوچھا:
''منگل کو کہاں بھگا دیا؟''
''میں نے نہیں بھگایا، وہ کھانا کھا چکا تھا، اب ٹہلنے گیا ہے۔''
اس پر رام پیاری کھل کھلا کر ہنس پڑی۔
ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ دونوں پسار میں پہنچے تو رام پیاری نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا لیکن اس نے رام پیاری کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور کہا:
''آخر یہ کب تک چلے گا؟''

رام پیاری نے بگّے کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے ہاتھ کو دھیرے دھیرے جھلاتے ہوئے پوچھا:

''کیا کب تک چلے گا؟''

''یہی جو ہم ہاتھ میں ہاتھ لے لیتے ہیں۔''

''کیا ہاتھ میں ہاتھ لینے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''ہاں...... ہے۔''

''اچھا جی، میں بھی تو سنو کہ اعتراض کیا ہے؟''

''اعتراض یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہونے چاہئیں۔''

بگّے نے دیکھا کہ رام پیاری نے اس کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ وہ معشوقانہ انداز سے سر پیچھے کو پھینک کر کہنے لگی:

''آج تو آپ بڑی انوکھی بولی بول رہے ہیں۔''

''کیا کروں، مجبوری ہے۔''

''مجبوری کیسی؟''

''دنیا مجبور کر رہی ہے۔''

''واہ بھئی واہ! میں تو سمجھی تھی کہ آپ کہیں گے کہ میری آنکھوں، میری زلفوں، میرے رس بھرے ہونٹوں اور میری بھرپوری جوانی نے آپ کو مجبور کر دیا ہے۔''

''مجبور تو ان چیزوں نے بھی کر رکھا ہے پھر بھی میں اپنے آپ کو سنبھالے رہا...... مگر اب......''

''اب کیا؟''

بگّے نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

''جانتی ہو ہم سارے گاؤں میں بدنام ہو گئے ہیں۔''

رام پیاری بڑی آسانی سے اس کی گود میں چلی گئی اور پھر اپنی کومل اُنگلیوں سے اس کی ناک دباتے ہوئے بولی:

''بس؟ اتنے میں چھکے چھوٹ گئے؟ اسی بوتے پر روز ہی آیا کرتے تھے؟''

''رام پیاری، میں تو سدا سے ہی بدنام آدمی ہوں فکر تو تمہارا تھا کہ کہیں تمہاری بے عزتی نہ ہو...... لیکن......''

''آج تو بجھارتوں میں باتیں کر رہے ہیں۔''

''میں تو سیدھے سیدھے بدنامی والی بات کہہ رہا ہوں۔ بجھارت کیسی؟...... سچ پوچھو تو اس میں تمہارے مہربان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔''

''کون مہربان؟''

''ایک ہی تو مہربان ہے تمہارا۔''
''ایک نہیں کئی ہیں......اور آپ میرے سب سے بڑے مہربان ہیں۔''
''میرا مطلب چنن سنگھ سے ہے۔''
''تو کیا آپ چنن سنگھ سے ڈرتے ہیں؟''
''دیکھو آئندہ یہ بات کبھی نہ کہنا۔ مجھے تو فکر تمہاری ہے۔ تمہیں تو اس کا بڑا احسان ماننی ہو۔''
''بے شک میں اس کا احسان مانتی ہوں لیکن میں اس سے ڈرتی نہیں۔''
''وہ تمہارے میرے میل جول پر بُری طرح جلتا ہے۔''
''جو جلتا ہے اسے جلنے دو۔''
''اگر غصہ میں آ کر اس نے تمہیں گھر سے نکال دیا تو؟''
''مجھے اس بات کی فکر نہیں ہے۔ اس کی فکر تو آپ کو ہونی چاہیے۔''
بگّے نے ہمت کر کے اس کے گال کی چٹکی بھرتے ہوئے کہا:
''بے شک! اگر چنن بہت رُعب گانٹھے تو میرے پاس تمہارے رہنے کی بہت جگہ ہے۔''
''مجھے آپ سے اسی بات کی اُمید تھی۔''
''چلو یہ بات تو طے ہو ہی گئی۔''
رام پیاری معنی خیز انداز سے بولی:
''آج ہماری طرف سے سب ہی کچھ طے سمجھئے۔''
بگّے نے رام پیاری کی تھرکتی ہوئی کمر کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا:
''اگر میں کہوں کہ مفت میں بدنام ہونے کا کیا فائدہ......تو تم کیا کہو گی؟''
''کہنا کیا ہے......میں آپ سے متفق ہوں۔''
''تم میرا مطلب سمجھیں؟''
''سمجھا دیجیے نا۔''
''مطلب یہ کہ مفت میں بدنام ہونے کا کیا فائدہ، اگر بدنام ہی ہونا ہے تو کچھ کر کے بدنام ہونا چاہیے۔''
رام پیاری نے پھر بگّے کی ناک دبا کر کھینچی اور بناوٹی انداز سے دانت پیستے ہوئے بولی:
''ہاں تو کچھ کیجیے نا۔''
''کیا کریں، تمہارا آزار بند ہی غائب ہے۔''
''بڑے مرد بنے پھرتے ہیں۔ آزار بند نہیں ملتا تو توڑ دیجیے نا۔''
''لو توڑ ڈالا۔''

۳

دن کے گیارہ بجے تھے، اور بگے کے مکان والے طویلے میں کولا ہل مچا ہوا تھا۔ اس کے یار دوست کمرے کے باہر گھیرا باندھے کھڑے تھے۔ دور سے رحیم بھی یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ تماشا یہ تھا کہ جسے کی پٹائی ہو رہی تھی۔

ویسے تو ہر دوسرے تیسرے دن جسے کو پیٹنے کے لیے بگے کی ہتھیلی کھجانے لگتی تھی، کیونکہ اس کے بنا بگے کو کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا...... لیکن آج بڑے تگڑے انداز سے ٹھکائی کی جا رہی تھی۔

جسا باہر سے لوٹا تو اس وقت بگا اپنے یار دوستوں کے ساتھ احاطے میں بیٹھا تھا۔ جسا سدا کی طرح نظر بچا کر گھر کی طرف جانے لگا تو چاچا نے اسے آواز دے کر بلایا۔ جسا جہاں کا تہاں رُک گیا۔ بگا چارپائی سے اُٹھا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے تہمد کے دونوں پلوؤں کو ایک بار کھولا اور پھر انہیں کس کر تہمد میں اُڑس لیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے بھتیجے کی طرف بڑھا اور پھر انہی قریب پہنچ کر بغیر کسی تمہید کے اس نے گھسیٹ کر ایک تھپڑ جسے کے منہ پر رسید کیا۔

اس وقت جسا پگڑی باندھے ہوئے تھا، جو سر سے اُچھل کر پرے لڑھک گئی جسا زمین پر گر پڑا۔

بگے نے ایک اُنگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ جسا کھونٹے کی طرح بالکل سیدھا اس کے آگے جا کھڑا ہوا۔ اب کے بگے نے اُلٹے ہاتھ کا جھاپڑ رسید کیا۔ جسا لڑکھڑا کر پرے لڑھک گیا۔ چاچے نے پھر ایک ہی اُنگلی سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ بغیر کسی تامل کے جسا فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر تھپڑ پڑا۔ جسا پھر لڑھکایا۔

تھپڑ بازی کا یہ سلسلہ کچھ دیر تک یوں ہی چلتا رہا۔ نہ بگے نے ہاتھ روکا اور نہ جسا مار کھانے سے پیچھے ہٹا۔ جسے کی ناک اور مسوڑھوں میں سے خون بہہ نکلا۔ وہ بار بار نیچے گرتا تھا۔ خون اس کے چہرے پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر بار خون کی وجہ سے اس کے چہرے پر دھول اور بھوسے کے تنکے چپک جاتے۔

پہلے تو دیکھنے والے کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لدّھے نے کہا:

''بگا سنگھ! مار پیٹ بند کر دو، اب تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اس چھوکرے کا منہ کدھر ہے یا ناک اور آنکھیں کہاں ہیں۔''

بگے نے آنکھوں سے قہر برساتے ہوئے کہا:

''یہی تو میں چاہتا ہوں۔''

جسا اب بھی جوں کا توں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے آس پاس دھول کی پرت جم گئی تھی اور اس کی بھنوؤں سے چپکے ہوئے تنکے آنکھوں تک لٹک آئے تھے۔ بگے نے جسے کو ڈانٹا:

''بچو! میں نے تجھ سے کہا تھا نہ کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جا ورنہ وہ مار ماروں گا کہ یہ پتا بھی نہیں

چلنے کا کہ تیرا منہ کدھر کو ہے اور گانڈ کدھر کو ہے......"

سچ مچ بگا بہت ہی غصے میں تھا۔ کہنا چاہیے کہ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ہاتھ اوپر اٹھایا تو دو تین آدمیوں نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ ایک نے کہا:

"بس بہت ہو چکا، چاہے اس کا کچھ بھی دوش ہو۔ اس کے لیے یہ ڈنڈ کم نہیں ہے۔"

بگے کے دونوں ہاتھ قابو میں کر لیے گئے، تو اس نے ایک لات جسے کے سینے میں کھینچ ماری۔ لڑکا پڑے کی طرح پیچھے کی طرف دھڑام سے جا گرا۔ مگر سب کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دوسرے ہی پل جسو پھرتی سے اُٹھ کر پھر چاچا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار بھی اپنا ہاتھ یا بازو اُٹھا کر یا پہلو بدل کر بگے کے تھپڑ کا وار بچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی بٹن کی سی آنکھوں کو بنا جھپکے سانپ کی طرح چاچا کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

اس پر بگے کو اور آگ لگی۔ مگر اب سب لوگ اس سے لپٹ گئے اور اسے دھکیل کر پیچھے کی طرف لے گئے۔ یہاں تک کہ اسے زبردستی چارپائی پر بٹھا دیا۔ ایک نے کہا:

"اب ٹھنڈا پانی پیو بگا سنگھ...... لڑکے کو جٹکائی (قصائی) کی طرح پیٹنے میں کوئی بہادری نہیں ہے۔"

بگے نے سب کو لال لال آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا:

"تم بہادری کی بات کرتے ہو...... میں اس کو کتے سے بدتر سمجھتا ہوں۔ اس کی کھال کھینچ کر چیلوں اور گدھوں کے آگے ڈال دوں گا......"

کسی نے پوچھا:

"بھئی آخر ایسی کیا بات ہو گئی؟"

"ارے! اس اناتھ لونڈے کو میں نے اپنے پاس رکھ لیا، لیکن یہ تو میری عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ کئی لڑکیوں کے باپ مجھ سے اس کی شکایت کر چکے ہیں۔ ذرا اس کی شکل دیکھو...... اس کی عمر دیکھو، ارے، میں کہتا ہوں کہ پہلے پیدا تو ہو لو۔ ان سب کاموں کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔"

لڈھا بولا:

"اُنگل برابر لڑکا، بھلا یہ لڑکیوں سے کیا کہے گا لوگ باگ تو یوں ہی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں تو لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ بھی کھیل لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ برس کا ہو گا یہ!"

بگا دھاڑ کر بولا:

"یہی تو رونا ہے، یہ عمر اور یہ کارنامے۔"

"ارے کارنامے کیا کرے گا یہ ہم نے اسے کبھی کبھار آٹھ دس برس کی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ

کھیلتے دیکھا ہے۔اس میں اتنا بہکنے کی کیا بات ہے؟''
بگّے نے اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کہا:
''ہٹاؤ یار، تم کہتے ہو تو میں اسے نہیں مارتا لیکن اب یہ میرے گھر میں ایک پل بھی نہیں رہ سکے گا۔''
لدّھے نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:
''ارے بابا! یہ تو بتاؤ کہ اس نے ایسا بڑا اپرادھ کیا کیا ہے؟''
بگا اپنی مونچھوں پر سے تھوک کے ننھے ننھے چھینٹے انگوچھے سے پونچھتے ہوئے بولا:
''سننا ہی چاہتے ہو تو سنو!...... آج میں نے دیکھا کہ کھیت کی منڈیر پر سجن سنگھ کی لڑکی بیٹھی موت رہی تھی اور یہ حرام جادہ چار قدم پرے کھڑا دیکھ رہا تھا۔''
بگا سنگھ کی اس بات پر سناٹا چھا گیا۔وہ پھر بولا:
''پوچھو تو اس کتے کے پلے سے، یہ بات ٹھیک ہے یا غلط؟''
سب نے جسّے کی طرف دیکھا۔جسا بالکل ساکن اور سیدھا کھڑا تھا۔اس نے اس اپرادھ سے انکار نہیں کیا۔ یہ بھی پتا نہیں چلا کہ دھول اور خون سے ڈھکے چہرے پر کسی قسم کا کوئی جذبہ یا علامت اُبھری یا نہیں۔
بگا چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔غصے کی شدت ماند ہو چکی تھی لیکن من میں وہ ایک قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔وہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:
''میں یہ سب دیکھ کر خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔لڑکی کا معاملہ تھا۔میں بولتا تو وہیں تماشا بن جاتا۔''
اب بگّے نے دُور کھڑے رحیم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا:
''رحیما! تو اسی وقت تیار ہو جا اور اس کتے کے پلے کو یہاں سے دور لائیلپور کی زمینوں پر چھوڑ آ۔ میں اب اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔وہاں پر جگیر سنگھ ہے ہی...... اسے میری طرف سے سمجھا دینا کہ یہ لونڈا بڑا بدذات ہے، اس لیے اسے شکنجے میں کس کر رکھنے کی ضرورت ہے۔اگر یہ کبھی ہری پورہ آنے کی کوشش کرے تو وہیں پر اس کی ٹانگیں توڑ دے...... اور اگر جگیر سنگھ کو جھانسہ دے کر یہ یہاں آ بھی گیا تو پھر میں اس کی ٹانگیں اور بازو توڑ کر رکھ دوں گا۔''
اتنے میں جھجّو بھی وہاں آ پہنچی۔جسّے کا حلیہ دیکھ کر وہ پریشان ہو اُٹھی، اِدھر بگّے کو اتنے غصے میں پا کر وہ ذرا پرے ہی کھڑی رہی۔
رحیم نے پوچھا:
''تو ٹیشن (سٹیشن) تک ریڑھی لے جاؤں؟''
ریڑھی ڈبہ نما چوکور سی گھوڑا گاڑی کو کہتے تھے۔اس ریڑھی سے بہت سے کام لیے جاتے تھے۔شہر سے ضرورت کا سامان، کھیتوں میں مویشیوں کے لیے چارہ لانے اور سٹیشن تک سواری کو پہنچانے کا کام اسی سے لیا جاتا

تھا۔

بگّے نے جواب دیا:

''ٹھیک ہے، اپنے ساتھ حویلی رام کو بھی لے جا۔تم دونوں کو گاڑی پر چڑھا کر حویلی رام ریڑھی کو واپس لے آئے گا۔''

پھر بگّے نے جسّے سے کہا:

''جا، اپنے جو دو چار کپڑے ہیں، سنبھال لے۔اَب تو یہاں ایک پَل نہیں رہ سکتا۔''

جھنجو بولی:

''اتنا غصہ بھی کیا! روٹی پک چکی ہے، اسے کھانا کھا لینے دو سٹیشن پر گاڑی پہنچنے میں ابھی تو بہت دیر ہے۔''

جب بگّے کے سر پر غصے کا بھوت سوار ہوتا تھا، وہ آگا پیچھا نہیں دیکھتا تھا۔اس نے جھنجو کو بھی ڈانٹ دیا اور کہا:

''اس کی روٹیاں جھاڑن میں لپیٹ کر دے دو۔سٹیشن پر جا کر کھا لے گا۔''

جھنجو کو جسّے پر بڑی دیا آ رہی تھی مگر وہ اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتی تھی۔اس نے صرف اتنا کہا:

''چل رے، منہ تو دھو لے۔''

بگّے نے اس کے منہ دھونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ریڑھی تیار ہو گئی، جسا بغل میں روٹیاں اور دو چار کپڑوں کی پوٹلی دبائے ریڑھی کے بھیتر گھس گیا۔اس کے پہلو میں کھڑے رحیم نے گھوڑے کی لگام کھینچی، تو زور کی کھڑکھراہٹ کے ساتھ ریڑھی آگے کو چل نکلی۔بگا سنگھ بڑبڑایا:

''جب سے آیا تھا، یہ لونڈا میرے کھوپڑے پر سوار تھا۔مجھے حیرانی تو اس بات پر ہے کہ اسے لائیلپور بھجوانے کی ترکیب پہلے کیوں نہیں سوجھی۔''

ریڑھی کچے راستے پر چل نکلی، تو جسّے نے پَل پَل پیچھے کو ہٹتے ہوئے گاؤں پر آخری نگاہ ڈالی۔اس کی زندگی بچپن سے اب تک پریشانیوں سے بھری رہی تھی۔یہ نئی حالت بھی اس کے لیے بہت انوکھی نہیں تھی۔لیکن اس کے باوجود اس گاؤں میں کچھ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے چہرے اب بھی اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔خاص کر دیپی کا چہرہ یاد کر کے وہ کافی اُداس ہو گیا۔لڑکوں میں مانا کہ کوئی اس کا گہرا دوست نہیں بن سکا، پھر بھی ان میں کچھ گنے چُنے لڑکے تھے، جن سے اس کی واقفیت ہو گئی تھی۔ان میں سے ایک موہن سنگھ تھا۔وہ بڑا خوب صورت اور تگڑا تھا۔جسّے سے کچھ برس بڑا ہونے کے باوجود وہ اسے پسند کرتا تھا اور یہ اس سے مل کو خوش ہوتا تھا۔آج وہ یہ سب کچھ چھوڑے جا رہا تھا۔وہ جذباتی بھی ہو رہا تھا لیکن اس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ لوٹ کر ہری پورے کبھی نہیں آئے گا۔چاچا کے برتاؤ سے اس کے من میں ضد پیدا ہو گئی تھی۔

رحیم نے اسے اس قدر چپ چاپ دیکھا تو مسخرے پن سے بولا:

''کیوں بھی جسو! آخر تُو کیا دیکھ رہا تھا، جس کی وجہ سے تجھے اتنی مار کھانی پڑی؟''

جسے کو رحیم کا یہ گندہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا۔ رحیم کا برتاؤ اس سے سدا ہی سے اچھا رہا تھا۔ جسے کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن اس وقت وہ بڑی بھدی بات کر رہا تھا...... جسا خاموش رہا۔

رحیم نے اپنا منہ اس کے قریب لا کر کہا:

''ارے بھائی مجھ سے کیا چھپانا۔ ہم دونوں تو یار دوست ہیں۔ مجھے تو بتا دے۔ بول...... دیکھی؟''

یکا یک جسا جھنجھلا کر رحیم پر پل پڑا۔ رحیم اچھا تگڑا جوان تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے جسے کو اپنے ایک بازو میں یوں لپیٹ لیا کہ لڑکے کے دونوں ہاتھ اس کے چنگل میں پھنس گئے۔ رحیم خوش مزاجی سے بولا:

''غصہ مت کرو، سردار جسا سنگھ!...... اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ سب مرد ایسا کرتے ہیں، چاہے تم ابھی مرد نہیں ہو لیکن مرد بننے کی تیاریاں تو بڑے زور شور سے کر رہے ہو۔''

جسے نے تڑپ کر اپنے آپ کو رحیم کے چُنگل سے چھڑا لیا۔ تب رحیم ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر اسے روکتے ہوئے بولا:

''بس، بس! جسا سنگھ سردار...... تمہاری میری کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ اب تم ہاتھا پائی کرو گے، تو سامنے طویلے کے قریب کھڑا حویلی رام دیکھ لے گا۔ پھر تو وہ ضرور سمجھ جائے گا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔''

جسے نے ہاتھا پائی کرنی بند کر دی۔ پہلے بھی لاڈ ہی لاڈ میں رحیم سے اس کی، جھپٹا جھپٹی ہو جایا کرتی تھی۔

کھیتوں والے طویلے کے سامنے پہنچ کر رحیم نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور ریڑھی رُک گئی۔ حویلی رام نے دور سے ہی پوچھا:

''کہاں کو چل دیئے رحیم؟''

''ٹیشن تک جا رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''اپنے جسے کو لے کر گاڑی پر بٹھانا ہے...... تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ بڑے سردار جی نے کہا ہے۔''

حویلی رام نے نزدیک آ کر کہا:

''میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟ یہاں بہت سا کام کرنے کو پڑا ہے۔''

''بھائی میرے! میں جسے کو لے کر لائلپور میں چک پیراں تک جا رہا ہوں۔ ہم دونوں تو ریل گاڑی پر سوار ہو جائیں گے، تم ریڑھی واپس لے آنا۔''

حویلی رام نے دونوں ہاتھوں سے ریڑھی کا کنارا پکڑا، ایک پاؤں پہیے کے دُھرے پر رکھا اور پھر اُچھل کر اان کے پہلو میں آ گیا۔

ریڑھی چل دی۔

حویلی رام نے پوچھا:

''چک پیراں میں کیا کرنے جا رہے ہو؟''

''مجھے تو وہاں کچھ نہیں کرنا، جسا سنگھ اب وہیں رہے گا۔''

حویلی رام نے جسّے کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''تم منہ بنائے کیوں کھڑے ہو؟ (ریڑھی میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی)......وہاں تم موج میں رہو گے۔ اتنی بھینسیں، اتنی گائیں ہیں وہاں کہ تم نہ صرف دن بھر پیٹ بھر کر دودھ پیا کرو گے بلکہ چاہو گے تو دودھ میں نہا بھی سکو گے......اچھا ہوا جو تم وہاں جا رہے ہو۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ روز روز چاچے کے جوتے، لات اور گالی گلوچ سے تو بچو گے۔''

جسّے کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ رحیم نے اس کے وہاں سے نکالے جانے کی وجہ نہیں بتائی۔

راستے بھر رحیم اور حویلی رام گپیں ہانکتے رہے اور جسا جنگلی بِلّے کی طرح منہ پھلائے رہا۔ جب وہ سٹیشن کے قریب پہنچے، تو حویلی رام نے جسّے سے پوچھا:

''تم پہلے کبھی ریل گاڑی پر سوار ہوئے ہو؟''

جسّے نے انکار میں سر ہلا دیا۔

حویلی رام بڑے حوصلے سے منہ پھیلا کر بولا:

''تب تو بچو! آج تم بمبوکاٹ (انجن) دیکھو گے۔''

جسّے کے ہونٹ سِلے رہے۔

حویلی رام نے آگے کو جھک کر پوچھا:

''جانتے ہو، بمبوکاٹ کیا ہوتا ہے؟......نہیں جانتے؟......جس طرح ریڑھی کے آگے گھوڑا جوتا جاتا ہے، اسی طرح ریل گاڑی کے آگے بمبوکاٹ جوڑ دیا جاتا ہے۔ بمبوکاٹ ہی تو ریل گاڑی کو کھینچتا ہے۔ ریل گاڑی لوہے کی بندھی ہوئی پٹریوں پر چلتی ہے۔''

جسا چاہے خاموش تھا، لیکن اسے حویلی رام کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہر بات کو کان دھر کر سن رہا تھا۔

پکّی اینٹوں کے بنے ہوئے دو کمروں والے سٹیشن کے نزدیک ریڑھی رُک گئی۔ رحیم اور جسا چھلانگ لگا کر اُتر پڑے۔ حویلی رام نے پوچھا:

''اب میرے یہاں رُکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟''

رحیم نے جواب دیا:

''تم فوراً لوٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جانے پر سردار جی چلائیں۔''

جانے سے پہلے حویلی رام نے پوچھا:

''تم واپس کب آؤ گے؟''

''میں جسے کو جگیر سنگھ کے پاس چھوڑ کر چلا آؤں گا۔''

''تمہارے آنے کا کچھ ٹھیک پتا ہو تو تمہارے لیے سٹیشن پر ریڑھی بھیج دوں؟''

''ریڑھی ویڑھی کی بات چھوڑو، جب لوٹتے وقت گاڑی سے اُتروں گا تو ہمارے گاؤں کا نہ سہی آس پاس کے گاؤں کا کوئی آدمی تو میرے ساتھ اُترے گا ہی۔ بس اسی کے ساتھ میں لوٹ آؤں گا۔ چاہے پیدل آنا پڑے، چاہے اسی کی کوئی سواری مل جائے۔''

حویلی رام نے بازو ہوا میں لہراتے ہوئے گھوڑے کی لگام کھینچ دی اور اونچی آواز میں بولا:

''تو میں چلا۔''

رحیم نے دو ٹکٹیں خریدیں۔ پلیٹ فارم اور اس کے پاس ریل کی پٹڑیاں دیکھ کر جسا مبہوت رہ گیا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ رحیم بولا:

''اب روٹی کھالو، وہ دیکھ پلیٹ فارم کے کونے پر دستی بمبا ہے۔ وہیں پر پانی پی لینا۔''

جسے نے روٹی کھائی۔ پانی پیا اور پھر وہ دونوں گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ وقت سے بہت پہلے آ گئے تھے۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا تو کچھ اور لوگ بھی آتے گئے۔ یہاں تک کہ دس گیارہ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دُور سے دھواں اُڑاتے ہوئے کالا کالا انجن آتا دکھائی دیا۔ دھیرے دھیرے گڑگڑاہٹ کی آواز اونچی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جب انجن پلیٹ فارم کے قریب پہنچا، تو دھرتی کانپنے لگی۔ جسے کے لیے انجن بڑا انوکھا دیو تھا۔ بڑی اُمنگ سے وہ انجن کو اپنے قریب سے گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ رحیم نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا:

''یہی بمبو کاٹ ہے۔''

ریل گاڑی کو دیکھ کر ایک بار تو جسا اپنا سارا دُکھ درد بھول گیا۔ اُترنے یا چڑھنے والے یاتریوں کی بھیڑ تو تھی ہی نہیں، پھر بھی رحیم نے جسے کا ہاتھ کھینچ کر کہا:

''چلو، جلدی سے ڈبے میں بیٹھ جائیں۔ یہاں گاڑی بہت کم وقت کے لیے رُکتی ہے۔''

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں رحیم نے پہلے جسے کو چڑھنے کا موقع دیا اور خود بھی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ ان دنوں بہت کم ڈبے پورے طور سے بھرا کرتے تھے۔ وہ دونوں...... پلیٹ فارم کی طرف کھڑکی کے قریب پسر کر بیٹھ گئے۔ سیٹی بجی، گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی، انجن نے چھکا چھک کا شور مچا کر زور مارا، اور گاڑی دھیرے دھیرے آگے کو کھسکنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاص سر تال کے ساتھ گاڑی تیز رفتار پر چل نکلی۔ جسا پیچھے کو بھاگتے ہوئے درختوں اور کھیتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر آج اس کے چاچا کا دماغ اتنا کھٹر نہ جاتا تو ممکن ہے

جسے کو لمبے عرصے تک ریل گاڑی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوتا۔
من ہی من جسے کو یہ سب دیکھ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا، بولا:
"رحیمیا! کیا اتنی لمبی گاڑی کو اکیلا بمبوکاٹ ہی کھینچتا ہے؟"
رحیم بولا:
"ہاں، بمبوکاٹ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"
"لیکن رحیمیا، بمبوکاٹ میں اتنی طاقت آئی کہاں سے؟ وہ کیسے اتنے بڑے بڑے ڈبوں کو کھینچ لے جاتا ہے؟"
یہ سوال رحیم کے لیے بھی بڑا ٹیڑھا تھا۔ اس نے بزرگانہ انداز سے ماتھے پر بل ڈال کر اس مشکل پر گہری سوچ بچار کی اور پھر نتھنے پھولا کر بولا:
"جسا سنگھ سردار! بات یہ ہے کہ یہ بمبوکاٹ فرنگی کا بنایا ہوا ہے۔"
جسے کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا پھیل گئیں اور اس نے پوچھا:
"یہ فرنگی کون ہے؟"
"تو نہیں جانتا...... پنجاب اور ہندوستان پر فرنگی راج کرتا ہے۔"
"میں نے فرنگی کبھی نہیں دیکھا۔"
"کسی دن دیکھ لو گے...... فرنگی کا چہرہ بالکل لال ہوتا ہے...... بندر کی چوتڑ کی طرح۔"
جسے نے بھولے پن سے کہا:
"میں نے تو وہ بھی نہیں دیکھے۔"
رحیم نے بناوٹی جھلاہٹ سے کہا:
"عجیب بات کرتے ہو، مداری بندر لے کر گاؤں گاؤں گھومتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم نے کسی بندر کی......"
"میں نے دھیان نہیں دیا۔"
رحیم نے شرارت سے منہ پھیلا کر کہا:
"تیرا دھیان تو دوسری طرف لگا رہتا ہے۔ تیرا چاچا تیرے بارے میں ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ یہ لونڈا جتنا دھرتی سے اوپر ہے، اس سے دوگنا دھرتی کے بھیتر ہے۔"
جسے نے رحیم کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے پوچھا:
"یہ فرنگی کہاں رہتا ہے؟"
"فرنگی ولایت میں رہتے ہیں۔"
"کیا ولایت پنجاب میں ہے، یا ہندوستان میں؟"

رحیم جسّے کی اس مورکھتا پر دل کھول کر ہنسا اور پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا:

''ولایت یہاں سے سیکڑوں، لاکھوں، کروڑوں کوس کی دوری پر ہے۔''

جسّے کا سر چکرا گیا۔ رحیم اسے چکر میں دیکھ کر اسے دوسرے ڈھنگ سے سمجھانے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی سات اُنگلیاں کھڑی کر کے جسّے سے کہا:

''فرنگی کا دیش یہاں سے سات سمندر پار ہے۔''

جسا اب بھی کچھ نہیں سمجھا، لیکن وہ یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے منہ کی گول سی صورت بنا کر رحیم کی طرف دیکھا اور پوچھا:

''تو سات سمندر پار فرنگی ولایت میں بیٹھ کر بمبوکاٹ بنایا کرتے ہیں؟''

''ہاں! اب تم سمجھے اصلی بات۔''

اس موضوع کو یہیں پر چھوڑ دیا گیا، کیونکہ ایک طرف تو رحیم کا گیان ختم ہو چکا تھا، اور دوسری طرف جسّے کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ وہ نئے نئے موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ لائلپور تک کا سفر بڑے آرام سے کٹا۔

لائلپور کے سٹیشن سے گاؤں تک کا فاصلہ دو کوس کا انہیں پیدل طے کرنا تھا۔ رحیم جوان تھا اور جسا پھرتیلا چھوکرا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے چک پیراں کے نزدیک جا پہنچے۔ جسے نے دیکھا کہ یہ گاؤں کافی اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ دو ڈھائی ہزار برس پہلے سے لے کر اب تک ایک ہی جگہ پر کئی گاؤں بس چکے تھے۔ کسی وجہ سے ایک گاؤں اُجڑ جاتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ وہ ذرا سا اونچا ٹیلا بن جاتا۔ پھر کسی کو خیال آتا، تو اس ٹیلے پر گاؤں بسا دیتا۔

اسی طرح نہ جانے کتنے گاؤں اُجڑے اور کتنے بس گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب، چک پیراں والا ٹیلا ننھی سی پہاڑی کی طرح نظر آتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ جس مکان میں جسّے کو جانا تھا وہ دوسرے مکانوں کے برعکس کافی نیچے والی ڈھلان پر بنا ہوا تھا۔ دیواریں اور مکان کی بناوٹ بہت ہی بھدی تھی۔ ایسے مکان راشے بنایا کرتے تھے۔ راشے اصل میں پٹھان مزدور ہوتے تھے، جو مکان بنانے کے لیے گاؤں کے باہر بہت سی دھرتی کھود کر مٹی گوندھ ڈالتے۔ جب مٹی تیار ہو جاتی تو وہ اس کے بڑے بڑے لوتھڑے پیٹھ پر لاد لے آتے اور انہیں نیچے اوپر پھینکتے ہوئے، دیواریں کھڑی کر دیتے۔ بعد میں گھر کی عورتیں ان دیواروں پر گوبر، مٹی اور بھوسے کی لیپا پوتی کرتی رہتی تھیں، لیکن دیواریں پھر بھی اُبڑ کھبڑ اور بے ڈول نظر آتی تھیں۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو کچھ کتوں نے بھونک بھونک کر ان کا سواگت کیا۔ ننگے بچے اور اپنے پھولے ہوئے پیٹ کھجا کھجا کر انہیں ٹک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی گلی میں چند قدم چل کر وہ بہت بڑے احاطے میں جا گھسے۔ وہاں کئی بیل، بھینس اور گائیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ رحیم نے احاطے کے کونے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہ دیکھو، سامنے جگیر سنگھ بیٹھا ہے۔''

جگیر سنگھ کو دیکھ کر جسا سناٹے میں آ گیا۔ وہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جگیر سنگھ اس کے چاچا کی طرح لمبا چوڑا اور ظالم آدمی ہوگا مگر یہ جگیر سنگھ تو کافی بوڑھا تھا۔ سر سے ننگا تھا، اوپر سفید بالوں کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا تھا اور آدھے بال پیچھے کو اُلٹ کر گدی پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ ٹانگیں چوڑی کیے ایک چھپر کے نیچے بیٹھا تھا۔ ٹانگوں کے بیچ میں بہت بڑا کونڈا تھا، جس میں وہ ایک بھاری ڈنڈے سے گھوٹائی کر رہا تھا۔ ڈنڈا بھی اپنے ڈھنگ کا انوکھا تھا، نیچے سے پتلا اور اوپر سے جگیر سنگھ کے سر کے برابر موٹا۔ موٹی طرف کچھ گھنگرو لٹک رہے تھے، جو گھوٹائی کے وقت چھنا چھن بولتے تھے۔

ان دونوں کو احاطے میں دیکھ کر جگیر سنگھ نے نظر کونڈے سے ہٹائی اور ان دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے سفید بال بہت گھنے تھے، اور بُری طرح ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے سارے جسم پر لمبے لمبے بال موجود تھے۔ کانوں کے بال دائیں بائیں پنکھی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ منہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جسے کو یوں لگا جیسے کوئی شخص گھنی جھاڑی کی اوٹ میں چھپا اسے چپ چاپ دیکھ رہا ہے۔ رحیم نے جسے کے کان میں پھسپھسا کر اسے سمجھایا کہ جگیر سنگھ کی نظر کمزور ہے اور کانوں سے بھی وہ اونچا ہی سنتا ہے...... اور پھر رحیم اونچی آواز میں بولا:

”چاچا! میں رحیم ہوں۔ ہری پورے سے آیا ہوں۔“

یہ سن کر جگیر سنگھ اپنی جگہ سے اُٹھا تو جسے نے دیکھا کہ بوڑھے کی ٹانگیں دونوں طرف کو کمان کی طرح مُڑ کر چوڑی ہو چکی تھیں۔ وہ آگے بڑھا، تو یوں لگا جیسے کیکڑا چلا آ رہا ہے۔ نہر کے کنارے جسے نے کئی بار کیکڑوں کو اس طرح سے چلتے دیکھا تھا۔

جب جگیر سنگھ بالکل ان کے قریب آ گیا تو جسے کو پتا چلا کہ اس کی سفید بھنویں بھی جھک کر اس کی آنکھوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ جگیر سنگھ یہ قبول کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر کمزور ہو چکی ہے۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا:

”رحیمیا! بھلا میں تجھے بھی نہیں پہچانتا لیکن یہ چھوکرا کون ہے؟ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

جگیر سنگھ کی آواز بھی بڑی کھر کھراتی ہوئی سی تھی۔ رحیم نے جسے کے بارے میں اور تو سب کچھ بتا دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اسے کس اپرادھ پر مار پیٹ کر گھر سے نکالا گیا تھا۔ آخر میں اتنا ہی کہا:

”چاچا! جسا سنگھ یہیں تمہارے پاس ہی رہے گا۔“

اس بیچ جگیر سنگھ اپنے گھٹنوں تک لمبے کُھھرے (جانگیہ) کے لٹکتے ہوئے میلے آزار بند کو کئی بار سنبھالنے کا جتن کر چکا تھا، لیکن وہ اب بھی جوں کا توں نیچے کو جھول رہا تھا۔

رحیم نے کونڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

”اتنی ٹھنڈ میں بھی بھنگ چھان رہے ہو چاچا؟“

جگیر سنگھ ہنس پڑا اور اس کے کھوکھلے منہ کا اگلا ایک دانت صرف ہوا میں لٹکتا سا نظر آنے لگا، بولا:

”آج کل شردائی (ٹھنڈائی) نہیں بناتا۔ بھنگ کو گھوٹ کر گولی تیار کر لیتا ہوں اور پھر اس گولی کو

ملائی میں لپیٹ کر نگل لیتا ہوں۔"
اتنے میں ہی پچھلے کمرے سے جگیر سنگھ کی بوڑھی عورت باہر آ گئی۔ اسے دیکھ کر رحیم بولا:
"پیریں پیا، چاچی!"
چاچی بولی:
"گوراں دیار کھاں! جوانیاں مانیں...... یہ چھوکرا کون ہے؟"
جگیر سنگھ ڈانٹ کر بولا:
"چل، چل، آئی چھوکرے کی کچھ لگتی، جا کر اس کے لیے روٹی دوٹی پکا۔"
بُڑھیا غُرّا کر بولی:
"مکڑ کہیں کا اتنی بار سمجھایا ہے کہ ہر بات میں ٹانگ مت اڑایا کر۔ روٹی تو میں پکاؤں گی ہی۔"
رحیم بولا:
"چاچی! میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔"
جگیر سنگھ یہ سنتے ہی مکڑے کی طرح اکڑا اور کھر کھراتی آواز میں بولا:
"اوئے کیوں؟"
"چاچا! تم جانتے ہی ہو کہ یہاں میرا ایک دوست ہے...... شریف، رات میں اسی کے پاس رہوں گا۔ روز روز ملاقات کا موقع کب ملتا ہے۔ کل صبح تمہارے درشن کر کے واپس چلا جاؤں گا۔"
چاچی بولی:
"سوکھے منہ تھوڑا جانے دوں گی۔ تھوڑا دودھ ہی پی لے...... یہاں ایک پیپا گھی کا تیار ہو گیا ہے وہ کل لیتے جانا۔"
دودھ پینے کے بعد رحیم اپنے دوست کے پاس چلا گیا اور جسا پیٹ بھر روٹی کھا کر سو گیا۔
صبح سویرے جسّے نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ جگیر سنگھ اس پر جھکا ہوا ہے۔ یہ بے چارا کچھ سمجھ نہ پایا۔ جگیر کہہ رہا تھا: "اُٹھ!"
جسّے کی نیند سے بوجھل آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔
جگیر سنگھ نے اسے اور بھی جھنجھوڑ کر کہا: "اُٹھ!"
جسّے کو بوڑھے سے ڈر نہیں لگ رہا تھا، اس لیے وہ کروٹ بدل کر بولا:
"مجھے تو نیند آئی ہے۔"
یکا یک ہی جگیر نے اس کے گریبان کو پچھلی طرف سے پکڑ کر اوپر کو جھٹکا دیا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جگیر پھر کھر کھراتی آواز میں بولا: "چل!"

جسّے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بڈھا اسے کہاں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ کیکڑے کے چنگل سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے وہ کچھ سویا کچھ جاگا لڑکھڑاتے قدموں سے بوڑھے کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ جگیر سنگھ نے اب بھی اس کے گریبان کو پچھلی طرف سے تھام رکھا تھا۔

ایک موٹی تازی بھوری بھینس کے قریب پہنچ کر وہ پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور جگیر سنگھ نے کہا:

''منہ کھول!''

جسّے نے منہ کھول دیا۔

اس کے منہ میں دودھ کی دھاریں ٹکرانے لگیں۔ وہ گھونٹ پر گھونٹ بھرتا گیا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے منہ بند کرلیا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ بڈھے نے کہا: ''جا!''

وہ نیند میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹا اور بستر میں گھس گیا۔

دھوپ چڑھ آئی۔ اگر رحیم اسے آکر اُٹھا نہ دیتا تو نہ جانے وہ کب تک پڑا سویا رہتا۔ جسّے نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملیں کیونکہ دھوپ کی چمک میں وہ کھل نہیں پا رہی تھیں۔ وہ کھپریل کے نیچے چارپائی پر سویا تھا۔ آنکھیں ملنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، نیچے کی طرف ڈھلان تھی۔ خاصی دوری پر پانی کا نالہ بھی نظر آ رہا تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر ببول کے درخت تھے۔

ناشتے پانی کے بعد رحیم جانے کو تیار ہوا تو پانی بھرنے والے مہرے کو بلایا گیا، تاکہ وہ گھر کا کنسٹر سٹیشن تک چھوڑ آئے۔ وِداع ہونے سے پہلے رحیم نے مذاق سے جگیر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''سردار بگا سنگھ نے تاکید کی ہے کہ جسّے کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ لونڈا جتنا زمین سے اوپر ہے اس سے دوگنا دھرتی سے نیچے ہے......''

جگیر سنگھ ٹانگیں چوڑی کیے کھڑا تھا۔ رحیم کی بات سُن کر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جسّے کی طرف دیکھا۔ جسّے نے بٹن نما آنکھوں سے جیسے رحیم کو گھورا اور رحیم نے دانت دکھا دیے۔

چوتھا غلاف

وارث شاہ، ایس عشق دے وَنج وِچوں، کسے پلّے نہ بدھی دمڑی اے

(وارث شاہ)

''اے وارث شاہ، عشق کے اس بیوپار میں کبھی کسی دمڑی بھر کا فائدہ نہیں ہوا۔''

ا

ہری پورے میں جھنو جسے کے چلے جانے سے اُداس ہوگئی۔ اس نے بھائی سے کہا:
''تمہیں غصہ آ جائے تو آ گا پیچھا نہیں دیکھتے۔ خواہ مخواہ جسے کو چک پیراں بھیج دیا۔ بے چارا اناتھ لڑکا تھا۔ اس کا بھی یہاں من لگ گیا تھا۔''
بگا سنگھ نے بہن کو ڈانٹ کر کہا:
''تم ہر کام میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس سُور کے بچے کا یہاں من کیوں لگ گیا تھا۔''
جھنو جھلا کر بولی:
''اس کل کے چھوکرے کو تو تم نے بیکار سی بات پر یہاں سے بھگا دیا لیکن تم اپنی کہو۔ اس آٹھ دس اُنگل لمبی ڈاڑھی کے ہوتے ہوئے تم کیا عمل کر رہے ہو۔''
بگا آگ ببولا ہو گیا:
''کیا عمل کر رہا ہوں، باہر والے بدنام کریں، سو کریں، اب گھر والوں نے بھی طعنے دینے شروع کر دیئے۔''
''سوال طعنے کا نہیں ہے، بلکہ یہ تو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تمہاری ان حرکتوں کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔''
''بڑی بہن ہو نا، اسی طرح شراپ (بدُعا) دیتی رہو گی، تو بُرا نتیجہ تو ضرور ہی نکلے گا۔''
جھنو نے چمٹے سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو کونچتے ہوئے کہا:
''جو ہو گا وہ تیرے ہی اعمال کی وجہ سے ہو گا۔ میں تو ابھی سے کہہ رہی ہوں کہ بعد میں کسی اور پر دوش نہ دھرنا۔''
''تو ٹھیک ہے جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔''
''تمہیں شراپ لگا بھی، تو بے چارے معصوم لڑکے کا لگے گا، جسے پہلے تو تم نے مار مار کر آدھ مرا کر

دیا اور پھر کان پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا۔"

"ہاں، ہاں، وہ لڑکا تو بڑا ستیہ گی مہاتما ہے۔ جس کا شراپ مجھے بھسم کر کے رکھ دے گا۔"

بھجّو نہیں جانتی تھی کہ جو نشہ اس وقت بگّا سنگھ کو چڑھا ہوا تھا وہ اَب اتنی جلدی اُترنے والا نہیں تھا۔ ہر روز رام پیاری سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، ہر رات پریم کا جھولا جھولا جاتا تھا...... اور منگل پل پل کی خبر چنن سنگھ کو پہنچا دیتا تھا۔

چنن سنگھ نے الگ اُدھم مچا رکھا تھا۔ اس نے سارے گاؤں میں بگّا سنگھ کو بدنام کر ڈالنے کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ منگل کے ذریعے جو کچھ اسے پتا چلتا، یہ سب چنن سنگھ گاؤں کے ہر ایک شخص کے کانوں تک پہنچا دیتا۔ شیر سنگھ کا گٹ الگ تھا۔ وہ کسی کے حق میں نہیں تھا، لیکن ایک دن اس نے چنن سنگھ سے اتنا کہا:

"ارے بھئی! تم خواہ مخواہ ہی بگّا سنگھ کی بدنامی کیوں کرتے ہو؟"

چنن سنگھ نے جواب دیا:

"میں تو گاؤں والوں تک سچی باتیں پہنچاتا ہوں۔ اگر سچی بات کہنے سے بگّے کی بدنامی ہوتی ہے تو اس میں میرا کیا دوش۔ اسے چاہیے کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔"

شیر سنگھ اس بات کو لے کر چنن سنگھ سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"بھلا اس سنسار میں کیا نہیں ہوتا، جہاں گڑ ہوگا، وہاں مکھیاں بھی منڈلائیں گی۔ رام پیاری جوان ہے، خوب صورت ہے...... اگر کوئی مرد اس کی طرف کھنچتا ہے تو اسے اس کی بے عزتی تو نہیں سمجھنا چاہیے۔ خاص کر، جبکہ رام پیاری خود اسے بڑی خوشی سے قبول کرتی ہے۔ یہ تو آپس میں پٹنے کی بات ہے۔ رام پیاری نابالغ تو ہے نہیں، نہ بگّا سنگھ دودھ پیتا بچہ ہے۔ رام پیاری بدمعاش بھی نہیں ہے کیونکہ بگّے کے علاوہ اور کسی کے بارے میں رام پیاری کی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ رام پیاری سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے، وہ نہ تمہاری جورو ہے نہ بہن نہ بیٹی۔ آخر تم خواہ مخواہ آپے سے باہر کیوں ہو رہے ہو؟"

"شیر سیاں! رام پیاری کو گاؤں میں تو میں ہی لایا ہوں، میں نے ہی اسے رہنے کو جگہ دی ہے، اسی لیے مجھ پر ہی اس کی ذمہ داری بھی ہے۔"

"چلو، تمہاری یہ بات بھی مان لی، مگر تمہاری ذمہ داری تب ہی ہو سکتی ہے، جب رام پیاری تم سے شکایت کرے۔ اگر وہ یہ کہے کہ فلاں آدمی اسے تنگ کرتا ہے تو تم پر ذمہ داری آتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم پر بھی ذمہ داری آتی ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ مدعی سست، گواہ چست والی حالت ہو گئی ہے۔ تمہارے اس طرح بیکار تڑپنے سے لگتا ہے کہ دراصل تم خود میٹھے چاولوں میں ہاتھ مارنا چاہتے ہو۔ تم ٹھہرے بال بچے دار، رام پیاری کو جچے نہیں، تو اس نے بگّے سے یاری گانٹھ لی۔ تم جوں جوں بھڑکتے ہو، توں توں تمہارے لیے ہمارا شک بڑھتا جاتا ہے۔"

''یار، بیکار کی مین میخ مت نکالو، جاؤ اپنا کام کرو۔''
شیر سنگھ مسکرا دیا:
''کوئی جواب سوجھا نہیں، تو اس بات پر اُتر آئے، ہمارا کیا جاتا ہے..... صرف دوستی یاری کے ناطے سمجھانا چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ آپس میں دشمنی پیدا کرنے کا کیا فائدہ۔''
''اگر ایسی بات ہے، تو اس اوندھی کھوپڑی والے بگا سنگھ کو بھی سمجھاؤ۔''
''ضرور سمجھاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ معاملہ اتنا بڑھ جائے گا لیکن میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ اگر تم رائی کا پہاڑ نہ بناتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تم دونوں کے تعلقات اور زیادہ بگڑنے نہ پائیں۔ لیکن اگر تم دونوں آپس میں سر پھٹول کرنے پر تلے ہوئے ہو، تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نہ تمہارا دشمن ہوں اور نہ اس کا۔ اگر میں اور میرے جیسے دوسرے لوگ تم دونوں کو لڑنے جھگڑنے سے روک نہ سکے تو پھر الگ بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔''
''جسے تماشا دیکھنا ہے، بے شک دیکھے بگے کو بھی سمجھا دینا کہ یہ تماشا اسے مہنگا پڑے گا۔''
شیر سنگھ نے چپ رہنا مناسب سمجھا، اگر چہ وہ یہ اب تک نہ سمجھ پایا کہ چنن سنگھ آپے سے باہر کیوں ہو رہا تھا۔

دن گزرتے گئے بگا سنگھ اور رام پیاری کے لیے یہ بڑے ہی مستی کے دن تھے۔ ان کی ہر رات نشیلی اور رنگین ہوتی تھی۔
ایک شام بگا سنگھ رام پیاری کے گھر پہنچا، تو منگل باہر نکل آیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر رات یہی ہوتا تھا۔ منگل سیدھا چنن سنگھ کے پاس پہنچا۔ چنن سنگھ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا گپ ہانک رہا تھا۔ جب منگل وہاں پہنچا تو چنن کے ایک ساتھی شام سنگھ نے کہا:
''ارے منگل! یہ معاملہ کیا ہے۔ اِدھر رات ہوتی ہے، اُدھر تو یا تو یہاں پہنچ جاتا ہے، یا بھوکے گیدڑ کی طرح گاؤں کی گلیاں ناپتا رہتا ہے۔''
منگل کے کچھ کہنے سے پہلے دوسرا آدمی بُدھ سنگھ بولا:
''ارے بھائی! میرے خیال میں اسے باہر ہی کہیں سونا بھی پڑتا ہے۔ کئی بار تو میں نے اسے ڈیوڑھی میں ہی سوئے دیکھا ہے۔''
منگل نے ان دونوں سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چنن سنگھ کے کان میں پھسپھسایا:
''سردار جی پہنچ گئے ہیں گھر پر۔''
چنن سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ایک تیسرے ساتھی جیون سنگھ نے پوچھا:
''کیا بات ہے؟''

چنن سنگھ بولا:

''بات تو روز والی ہی ہے......یعنی ہمارے رانجھا صاحب اپنی ہیر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔''

بدھ سنگھ ناک چڑھا کر بولا:

''اب تو کچھ کرنا چاہیے۔''

چنن سنگھ چار پائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور انگوچھا کمر سے لپیٹ کر اسے کستے ہوئے بولا:

''ٹھیک ہے، میں جا کر اس سے دو دو باتیں کرتا ہوں۔''

''اکیلے؟'' شام سنگھ نے پوچھا۔

''ہاں، اکیلے جاؤں گا، تو وہ مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔'' چنن سنگھ نتھنے چوڑے کر کے غرایا۔

منگل نے بکری کی طرح ممیا کر چنن سنگھ سے پوچھا:

''میں بھی چلوں؟''

''تو چل کر وہاں کیا اُکھاڑ لے گا، بیٹھ یہیں پر۔ میں بگے سے اکیلا ہی نپٹ لوں گا اگر وہ سیدھے سیدھے مان گیا تو ٹھیک ہے ورنہ جس طرح وہ چاہے گا، اس سے نپٹ لیا جائے گا۔''

یہ کہہ کر چنن سنگھ نے پگڑی کو ذرا ٹھیک ٹھاک کیا، لاٹھی سنبھالی اور گلی میں چل نکلا۔ مکان کے دروازے پر پہنچ کر چنن سنگھ نے باہر لٹکے ہوئے کنڈے کو ایک سرے سے پکڑ کر زور زور سے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر دروازے کی دراڑوں میں سے لگا، جیسے ڈیوڑھی میں ہلکا ہلکا پرکاش پھیل گیا ہے۔ بھیتر سے رام پیاری کی آواز سنائی دی:

''کون ہے؟''

''میں ہوں......چنن سنگھ۔''

چنن سنگھ کو لگا، جیسے رام پیاری پھسپھساتی آواز میں کسی سے پوچھ رہی ہے، کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔ اس کا مطلب تھا کہ رام پیاری کے قریب بگا سنگھ بھی موجود تھا۔ اس نے نہ جانے عورت سے کیا کہا، لیکن پل بھر رُک کر رام پیاری بولی:

''کیا کام ہے؟''

وہ گویا بگا سنگھ ہی یہ سب باتیں اسے سکھا رہا تھا۔ چنن بولا:

''بات صرف یہ ہے کہ میں بگا سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

بھیتر تھوڑی تک پھسپھساہٹ ہوئی۔ تب رام پیاری بولی:

''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بگا سنگھ ایک عورت کے کندھے پر بندوق رکھ کر کیوں چلا رہا ہے۔ میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔ وہ سیدھے سیدھے مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟''

پھر خاموشی!

آخر رام پیاری نے پوچھا:

''آپ کے ساتھ کون کون ہے؟...... دیکھیے سردار بگا سنگھ کے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈر تو مجھ کو لگ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جس گھر میں میں رہ رہی ہوں وہاں خواہ مخواہ کوئی گڑبڑ یا جھگڑا ہو۔''

چنن سنگھ تسلی دیتے ہوئے بولا:

''میں اکیلا ہوں رام پیاری!...... فکر مت کرو، میں یہاں لڑنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔''

بگا سنگھ خوفزدہ ہونے والا شخص نہیں تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ رام پیاری کے پاس کچھ خوشی کی گھڑیاں گزارنے آیا تھا۔ چنن سنگھ کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایسے بے وقت چنن سنگھ کا آنا بھی کسی اچھی بات کی علامت نہیں تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ چنن سنگھ نے دیکھا کہ دروازے کے آگے خود بگا سنگھ کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی رام پیاری ہاتھ میں دیا لیے موجود تھی۔ بگے نے قہر بھری نظروں سے چنن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''مالوم ہوتا ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑا دھاکڑ سمجھنے لگے ہو۔ جبھی تو کہہ رہے تھے کہ بگا سنگھ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہاری کھوپڑی میں تل برابر بھی عقل ہوتی تو تم یہ شبد نہ کہتے۔ اگر تمہیں اپنے آپ پر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو جاؤ کچھ ساتھیوں کو بھی بلا لاؤ۔ میں اکیلا ہی تمہارا انتظار کروں گا۔''

چنن سنگھ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہوئے کہا:

''رام پیاری کے من پر اپنا رعب جمانے کے لیے تم جو بھی کہو، سو کم ہے۔ تمہیں لڑنے کا بہت شوق ہے، تو فکر مت کرو، وہ گھڑی بھی آ جائے گی۔ تب تم دل کا غبار نکال لینا۔ اس وقت میں یہاں لاٹھی گھمانے کے لیے نہیں آیا۔''

بگا سنگھ نے اڑیل پن سے پوچھا:

''تو پھر کیوں آئے ہو تم یہاں؟''

چنن سنگھ نے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی، بولا:

''بگا سنگھ تم بھول رہے ہو کہ یہ مکان میرا ہے، میں جب چاہوں یہاں آ سکتا ہوں...... البتہ میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

یہ کہہ کر چنن سنگھ ڈیوڑھی سے نکلا اور صحن میں سے ہوتا ہوا اسار میں جا پہنچا۔ رام پیاری اور بگا سنگھ پیچھے پیچھے چلے آئے۔ حالانکہ وہ دبی آواز میں بات چیت کر رہے تھے، پھر بھی ماحول میں بڑا ہی کٹھور تناؤ پیدا ہو چکا تھا۔

چنن سنگھ نے اپنی لمبی ناک کو کسی شکاری پرندے کی چونچ کی طرح اوپر کو اٹھا کر کہا:

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، بگا سنگھ!''

بگا سنگھ نے بڑے پلنگ کے بازو پر کوہنی ٹکا دیے اور ڈاڑھی میں اُنگلی گھسیڑ کر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا:

''تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا؟ تمہارا یہ مطلب ہے کہ جب کبھی تم میرے گھر آؤ تو میں بھی تم سے یہی سوال کروں...... کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے، ہمارا خون کا رشتہ ہے...... چاہے دُور کا ہی سہی۔ ہم ایک دوسرے کے گاؤں میں آ جا سکتے ہیں...... لیکن جب تم نے میرے ہی گھر میں مجھ پر یہ اعتراض اُٹھایا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں تو مجھے جواب میں یہ بات کہنی پڑی۔''

''ٹھیک ہے، تمہارے اس سوال کا جواب رام پیاری ہی دے سکتی ہے۔ میں یہاں رام پیاری کی مرضی سے آتا ہوں...... زبردستی نہیں۔''

چنن نے اسی گھمنڈ بھرے انداز سے رام پیاری کی طرف دیکھا وہ بولی:

''بے شک یہ میری مرضی سے آتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ ان کے یہاں آنے پر آپ کو کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔''

چنن سپاٹ آواز میں بولا:

''رام پیاری، میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم بہت بدنام ہو رہی ہو۔''

اب بگا سنگھ بیچ میں بول اُٹھا:

''اس نے بدنامی والی کوئی حرکت نہیں کی۔ یہ تم ہی ہو جو علاقے بھر میں اس کی بدنامی کرتے پھر رہے ہو۔''

چنن سنگھ نے جواب دیا:

''تم جو چاہو سو سمجھتے رہو۔ سوال یہ ہے کہ جب لوگ مجھ سے تم دونوں کی رنگ رلیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو میں کیا جواب دوں؟''

بگا سنگھ ذرا گرم ہو کر بولا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تمہیں سے کیوں پوچھتے ہیں؟''

چنن ماتھے پر بل ڈال کر کہنے لگا:

''تم نے پھر وہی گھن چکروں والی بات کہی نا! ارے، جب وہ میرے مکان میں رہ رہی ہے تو یہاں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے بارے میں لوگ مجھ ہی سے تو پوچھیں گے۔''

رام پیاری نے کہا:

''یہ ٹھیک ہے کہ بگا سنگھ جی میرے پاس آتے ہیں، لیکن یہ بھی تو ٹھیک ہے کہ میں نے گاؤں کے

کسی آدمی سے کبھی ایک بات تک نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مجھے کیوں بدنام کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے مکان میں رہنے کا یہ مطلب ہے کہ میں دنیا میں کسی سے نہ ملوں؟''

چنن بولا:

''تم عورت ہو، تمہیں عورتوں کے پاس ہی اُٹھنا بیٹھنا چاہیے۔''

رام پیاری طنزیہ لہجے میں بولی:

''اچھا تو آپ کے یہاں عورتیں صرف عورتوں سے ہی تعلق رکھتی ہیں انہیں مرد کی ضرورت کبھی نہیں محسوس ہوتی؟''

رام پیاری کی اس بات پر چنن سنگھ کا منہ مٹکے کی طرح کھل گیا۔ لمحہ بھر کو اس کے کنٹھ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکل پائی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔ آخر وہ بولا:

''آہا، تو سیدھے سیدھے کہو نا کہ تمہیں مرد کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

بگا سنگھ تڑپ کر سیدھا کھڑا ہو گیا، اس کی گردن اصیل مرغے کی طرح آگے کو کھنچ گئی، اس کی آنکھیں انگارہ بن گئیں اور وہ چنن سنگھ کی ناک سے ناک بھڑا کر بولا:

''تم اس طرح رام پیاری کو ذلیل نہیں کر سکتے۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟''

چنن کو لگا جیسے اس کی مونچھوں پر بگا سنگھ کی تھوک کے چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ وہ بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا:

''یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں، وہ خود کہہ رہی ہے۔''

اتنا کہہ کر چنن سنگھ نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پھر وہ رام پیاری کی طرف دیکھ کر بولا:

''تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بعض حالتوں میں عورت مرد کے میل جول پر سماج کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے لوگوں سے کہہ رکھا کہ تم بیاہتا عورت ہو۔ یہ بات تمہیں نے مجھے بتائی تھی۔''

بگا سنگھ چنن کے ان لفظوں پر چونک پڑا۔ اس نے چند قدم پر کھڑی رام پیاری کی طرف دیکھا۔ بگے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ بیاہتا تھی۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے رام پیاری سے شکایت تھی، کہ اس نے یہ راز اب تک بتایا کیوں نہیں۔

رام پیاری کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور بگا سنگھ کے گلے سے لپٹ گئی...... پھر اس نے مُڑ کر چنن سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''میں ان سے پریم کرتی ہوں۔''

چنن سنگھ نے پوچھا:

''اور تمہارا خاوند؟''

''اس سے میری مرضی کے بغیر زبردستی دھوکے سے شادی کر دی گئی۔ میں اس کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے تو میں وہاں سے بھاگ نکلی۔''

چنن سنگھ طنزیہ انداز سے دانت نکالتے ہوئے بولا:

''بھوت اور پری کا یہ جوڑا تو واقعی بہت اچھا ہے...... لیکن رام پیاری، قانون کی نظر میں تم اپنے خاوند کی بیوی ہو۔''

رام پیاری کے جوان اور بھرپور جسم کو اپنے جسم سے لپٹے پا کر بگا سنگھ نے عورت کے پھول جیسے چہرے پر اور مستی بھری آنکھوں پر نگاہ ڈالی، اور سانڈ کی طرح ڈکار کر کہا:

''تم اس کے خاوند کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟ بڑا آیا قانون جھاڑنے۔''

چنن سنگھ نے دونوں ہاتھ اپنی پیٹھ پر باندھ لیے اور بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ یکا یک رُکا اور دونوں پریمیوں کی طرف دیکھا، جواب بھی ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا:

''مجھے مالوم نہیں تھا کہ یہاں ہیر رانجھے کا تماشا ہو رہا ہے......''

رام پیاری اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر بولی:

''یہ تماشا نہیں ہے...... ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔''

چنن نے کہا:

''چلو مان لیا کہ تم دونوں کا پریم تماشا نہیں ہے لیکن یہ تو ضرور ہی تماشا ہے کہ تم لوگ اپنے اس مہان پریم کا کھیل میرے مکان میں کھیل رہے ہو۔''

بگا سنگھ جھلا کر بولا:

''تم بار بار اپنے مکان کی دھونس گانٹھ رہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ اس گاؤں میں رام پیاری کو تمہارے گھر کے سوا رہنے کو اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔''

چنن دانت دکھاتے ہوئے بولا:

''کیوں نہیں مل سکتی، اسے اپنے پریمی...... یعنی تمہارے دل میں رہنے کے لیے جگہ مل سکتی ہے۔''

اب رام پیاری بھی کچھ غصہ میں آ کر بولی:

''سردار چنن سنگھ! آپ کو یہ سب اتنا ہی بُرا لگ رہا تھا تو آپ نے مجھے گھر سے کیوں نہ نکال دیا؟''

چنن نے جواب دیا:

''تم نے میرا سہارا مانگا، میں نے تمہیں سہارا دیا۔ یہ تو میں نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں

یہ سب کچھ ہو جائے گا۔"
بگّے نے رُعب گانٹھتے ہوئے کہا:
"ابھی تو بہت سی ایسی باتیں ہوں گی، جو تم سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتے۔"
چنن نے کڑواہٹ کا جواب کڑواہٹ میں دیتے ہوئے کہا:
"جب ایسی باتیں ہوں گی تو ان سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔"
غصے کے مارے بگّے کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور بازو کس گئے۔ رام پیاری اس کے نس نس کے تناؤ کو محسوس کر کے اور بھی زور سے اس کے ساتھ چپک گئی اور دھیمی آواز میں بولی:
"آپ کو میری قسم! اس جھگڑے کو اب اور نہ بڑھایئے......"
کچھ دیر تک بگّا سنگھ چنن سنگھ کو یوں قہر بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جیسے اسے کچا ہی کھا جائے گا۔ اس کے کانوں میں رام پیاری کی آواز کی مٹھاس بھی گھل رہی تھی۔ وہ ذرا ٹھنڈا ہو کر رام پاری سے کہنے لگا:
"اب میں تمہیں یہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنے دوں گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسے کمینے کے مکان میں رہنا منظور کیوں کر لیا۔"
چنن سنگھ رام پیاری کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا:
"ٹھیک ہے تمہیں مجھ جیسے کمینے کے گھر میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم اس راجہ بھوج کے گھر میں رہ کر دیکھ لو۔"
بگّا سنگھ بولا:
"چلو رام پیاری!"
رام پیاری نے بگّے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:
"میرا سامان؟"
بگّے نے جواب دیا:
"تمہارا سامان رحیم کو بھیج کر منگوا لوں گا۔ چنن میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ تمہارا سامان دینے سے انکار کر دے۔"
چنن سنگھ نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا:
"میں عورتوں کے ساتھ جوجھنے کا عادی نہیں ہوں، میں اس کی سوئی تک بھجوا دوں گا۔"
رام پیاری نے جھپٹ کر اپنا پاندان اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ جیسے اس میں پان نہیں تھے بلکہ ڈبہ ہیرے موتیوں سے بھرا ہوا تھا۔
رام پیاری کولہے مٹکاتی ہوئے چلنے لگی، تو چنن سنگھ نے پکار کر کہا:

''وہ تمہارا بھیا منگل!...... کیا اسے بھی وہیں تمہارے پاس بھجوا دوں؟''
اس بار بگا اپنے گھونسے کو ہوا میں ہلاتے ہوئے بولا:
''ہاں، ہاں، بھیج دینا۔ منگل کے کھانے پینے کے لیے میرے یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔''
چنن سنگھ دھیرے دھیرے ان کے پیچھے بڑھا۔ ڈیوڑھی کے دروازے تک پہنچ کر وہ رُک گیا۔ گلی میں دونوں پریمی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہاں سے جاتے ہوئے ایک دوسرے کا عکس لگ رہے تھے۔
چنن سنگھ لوٹ کر پسار میں آیا اور تالہ ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوڑھی کے باہر کی کنڈی چڑھا کر اپنے گھر کو چل دیا۔ وہاں اس کے ساتھ اَب بھی موجود تھے اور منگل ایک کونے میں پڑا اونگھ رہا تھا۔
چنن کو دیکھتے ہی شام سنگھ کا چہرہ کھل اُٹھا، بولا:
''آ گئے تم؟''
چنن نے بے پرواہی سے لاٹھی ایک طرف ٹکاتے ہوئے جواب دیا:
''تو کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ بگا سنگھ مجھے وہیں مار ڈالے گا؟''
''نہیں یہ بات نہیں، بگا اڑیل آدمی تو ہے ہی۔ وہ کسی طرح کا بھی جھگڑا کھڑا کر سکتا تھا۔ تم نے دیر بھی کافی لگا دی۔''
''وہ بحث کرنے لگا۔ اسی تُو تو میں میں کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔''
بدھ سنگھ نے پوچھا:
''آخر اس تُو تُو، میں میں سے نوبت کہاں تک پہنچی؟''
''میں نے ان کا بستر بوریا گول کر دیا ہے۔''
باتوں کا شور سن کر منگل بھی جاگ اُٹھا۔ بدھ سنگھ نے پھر پوچھا:
''تمہارا مطلب کیا ہے؟''
''مطلب یہ کہ میں نے انہیں مکان سے باہر نکال دیا ہے۔''
سب لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شام سنگھ نے پوچھا:
''کیا اس وقت رام پیاری تمہارے مکان میں نہیں ہے؟''
''نہیں بگا سنگھ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''
منگل ہڑبڑا کر بولا:
''تو اب میں کہاں جاؤں گا؟''
چنن نے کہا:
تم خواہ مخواہ پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ تم سے یا رام پیاری سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔''
''سو تو ٹھیک ہے، مگر بگا سنگھ سے تمہارے جھگڑے کی وجہ سے میری بہن کو خواہ مخواہ پریشانی ہو

رہی ہے۔اب وہ بے چاری نئی پریشانی میں پھنس گئی ہے۔''

چنن بولا:

''مورکھ کہیں کا، کھامکھا کیوں گھبرا رہے ہو، تمہاری بہن اپنے پریمی کے گھر گئی ہے۔اس کا پریمی اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھے گا۔''

منگل مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا:''نہ جانے یہ کیا ٹھڑا ہے.....آخر میرا کیا بنے گا؟''

شام سنگھ نے منگل کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

''میں جانتا ہوں کہ تمہارا کیا بنے گا۔تمہارا بھرتہ بنے گا۔بینگن کا بھرتہ دیکھا ہے نا کبھی؟''

منگل بچوں کی طرح پھیل گیا اور کہنے لگا:''یہ دیکھو! اُلٹا ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں۔''

چنن نے بڑی گھمبیر آواز میں کہا:

''یہ لو مکان کی چابی، تم وہاں جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔صبح ہونے پر اپنا سامان سمیٹ لینا۔''

منگل نے پریشان ہو کر پوچھا:''سامان تو سمیٹ لوں گا مگر میں جاؤں گا کہاں؟''

''بگا سنگھ کے گھر.....میرے مکان کو تالا لگا کر چابی یہاں گھر پر دے جانا۔''

''نہ بابا! میں بگا سنگھ کے گھر نہیں جاؤں گا۔اگر اس نے بھی جوتا دکھادیا تو پھر میں کیا کروں گا؟''

''گھبراؤ مت، وہ تمہیں جوتا نہیں دکھائے گا بلکہ بڑے پریم سے اپنے پاس رکھے گا۔مجھ سے بات چیت کے وقت اس نے کہا تھا کہ تم کو وہ اپنے پاس ہی رکھے گا۔''

منگل نے چابی چنن کے ہاتھ سے لے لی اور بُرا سا منہ بنا کر سب کی طرف دیکھنے لگا۔اس کی عجیب سی شکل دیکھ کر سب کو ہنسی آ گئی۔بدھ سنگھ نے کہا:

''ابے! اندھیرے میں ڈر لگتا ہو تو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں۔''

اس پر منگل کا منہ اور خراب ہو گیا۔پھر وہ چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا۔

منگل کے جاتے ہی محفل میں گرمی آ گئی۔جیون سنگھ بولا:

''یار چنن، یہ تو تم نے کمال کر دیا۔تم نے دونوں کو گھر سے باہر ہی نکال دیا۔ہمیں تم سے اتنی اُمید نہیں تھی۔''

چنن کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ کر بگے سے اپنی جھڑپ کا قصہ سنانے لگا۔

۲

بگا سنگھ نے رام پیاری کو رات بھر اپنے احاطے والے کمرے میں ہی رکھا۔ مجھو کو رات کے وقت ہی اس

بات کا پتا چل گیا تھا کہ اس کا بھائی رام پیاری کو گھر لے آیا ہے۔ اس وقت وہ خاموش رہی۔

صبح ہوئی، کافی دھوپ نکل آئی، تو بگا سنگھ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ بہت جلدی جاگنے کا عادی تھا۔ رحیم اور دوسرے کارندے حیران تھے، کہ آج بگا سنگھ کو کیا ہو گیا۔ انہیں رات والی کارروائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ گئی رات تک رام پیاری اور بگا آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اتنی دیر سے سونے والا صبح سویرے کیسے جاگ سکتا تھا۔

دروازہ کھول کر بگا سنگھ اپنے ڈھیلے جوڑے کو کس کر لپیٹتا ہوا مکان کے بھیتر چلا گیا۔ انجانے میں رحیم نے کسی کام سے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے اُدھ لیٹی رام پیاری کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ پل بھر کو اسے اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہوا۔

رام پیاری بھی سنبھل کر بیٹھ گئی اور سُریلی آواز میں بولی:

"چلے آؤ! بے شک اپنا کام کرو......"

رحیم نے کمرے میں سے دو پھاوڑے اُٹھائے اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ بگا سنگھ نے چولہے کے قریب جا کر بہن سے کہا:

"آج دو کا ناشتہ چاہیے۔"

بھجو نے بھن بھناتے ہوئے کہا:

"جانتی ہوں۔"

بگے نے بہن کو ذرا غور سے دیکھا اور پوچھا:

"بات کیا ہے؟ آج تو بہن کا مزاج بگڑا نظر آتا ہے۔"

بھجو بگڑ کر بولی:

"تم اسے یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

بگے نے انجان بن کر کہا:

"کسے یہاں لے آیا ہوں؟"

"رام پیاری کو......اور کس کو؟"

"تو کیا ہوا......؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی تو بات ہے نہیں، دنیا جانتی ہے کہ میں رام پیاری کے یہاں جاتا ہوں۔"

"تمہارے وہاں جانے کی بات کچھ اور تھی......لیکن اسے اپنے گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم عورتیں بھی خوب ہوتی ہو وہ تو تمہارے پاس بھی آیا کرتی تھی۔ بیاہ شادی کے گھر میں اسے ڈھولک بجانے کے لیے بھی بلایا جاتا ہے۔ اگر وہ یہاں آ گئی تو اس میں ظلم کی کیا بات ہے؟"

''میں پوچھتی ہوں کہ تم ساری عمر کوڑ کرکٹ ہی سونگھتے پھرو گے؟ کیوں نہیں قاعدے سے شادی کر لیتے۔ جیسی بھی عورت ملے، لے آؤ اور گھر بسا لو۔ یہی بھلے آدمیوں کا قاعدہ ہے۔ بڑی بہن کے سر میں بدنامی کی راکھ کیوں ڈالتے ہو؟''

''تم خامخا آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ دُنیا کا کیا ہے۔ دنیا تو رشی مُنیوں پر بھی کیچڑ اُچھالنے سے باز نہیں آتی۔''

''تم جیسے رشی مُنی ہو، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں...... لیکن اتنا یاد رکھو کہ میں رام پیاری کو گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ اگر تم نے بڑی دھاکڑ بازی دکھائی تو میں گھر چھوڑ کر لاہور چلی جاؤں گی۔ گوردوارے کے لنگر میں روٹی کھاؤں گی، وہیں رہوں گی اور گوردھر کی سیوا کروں گی۔''

''تم بے کار میں بگڑتی جا رہی ہو۔ وشواس کرو، میں رام پیاری کو گھر میں نہیں ٹکاؤں گا۔''

بھجو نے لال لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

''تو کہاں رکھو گے اسے؟''

''میں اسے کنویں والے طویلے میں ہی رکھوں گا۔''

اب بھجو کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ تھالیوں میں پراٹھے رکھنے لگی۔

جسّے کو بھگا دیا گیا تھا اور حویلی رام کھیتوں کے کام میں ہی جٹا ہوا تھا اور رحیم کے ہاتھ وہ رام پیاری کو ناشتہ بھجوا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مسلمان کا چھوا کھانا وہ ہرگز نہیں کھائے گی۔ اس لیے وہ خود ہی دونوں تھالیاں پکڑ کر احاطے کی طرف چلا گیا۔

ناشتہ دیکھ کر رام پیاری بولی:

''ہائے رام!! ابھی تو میں نے کلّا بھی نہیں کیا۔''

''یہاں پانی رکھا ہے، منہ ہاتھ بھی دھو لو، اور کلّا بھی کر لو۔''

''نہانے کا کیا ہوگا؟''

''نہ جانے تم کہاں کی براہمنی ہو، ناشتہ تو کر لو دھوپ چڑھے گی تو گرم پانی سے نہا لینا۔''

رام پیاری نے مسکرا کر اس کی بات مان لی۔

ناشتہ کرتے وقت رام پیاری نے کہا:

''نہ جانے بے چارہ منگل کہاں بھٹکتا ہوگا۔ میرے ساتھ اس کی مٹی بھی خراب ہو رہی ہے۔''

''آ جائے گا، گھبرانے کی کیا بات ہے۔ وہ دودھ پیتا بچہ تو نہیں ہے۔''

ناشتے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ بگّا یوں بول پڑا، جیسے یکا یک ہی کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''رام پیاری!''

''جی!''

''تمہاری زبان کتنی میٹھی ہے۔''

رام پیاری ہنس پڑی:

''میں سمجھی تھی کہ کوئی خاص بات کرنے جا رہے ہو۔''

''بات تو کہنی ہے۔ تم جانتی ہی ہو کہ تمہارے یہاں آ جانے پر آج چنن سنگھ گاؤں بھر میں شور مچا دے گا۔''

''ہاں لیکن اب جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ اب ایک قدم اُٹھا ہی لیا ہے تو اب ڈرنے کی کیا ضرورت؟''

''یہاں بھی کون ڈرتا ہے۔ میں ڈرنے یا نہ ڈرنے کی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ جب گاؤں میں باتیں اُڑیں گی تو تمہارے کانوں تک بھی پہنچیں گی...... تمہارا من بھی خراب ہو گا......''

رام پیاری نے بڑی بڑی آنکھیں بگّے کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا:

''تو......؟''

بگّے نے رام پیاری کا ہاتھ تھام کر کہا:

''تم یہ مت سمجھنا کہ میرا من ڈول رہا ہے۔ تمہاری خاطر تو میں پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا ہوں۔ یہ چنن سنگھ اور اس کے ساتھ میری نظر میں مچھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مجھے فکر صرف تمہاری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں اُڑنے والی افواہوں اور اُلٹی سیدھی باتوں سے تم دُور رہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں رہنے کی بجائے تم گاؤں کے باہر میرے رہٹ والے طویلے میں ٹِک جاؤ۔ وہاں جگہ کم ہے، لیکن اس کا انتظام ہو جائے گا۔ میں ایک دو دنوں میں راشوں کو بلا کر وہاں دو ئی کوٹھڑیاں بنوا دوں گا...... بولو، منظور ہے؟''

''بالکل منظور ہے۔ چنن سنگھ سے تو نبھ نہیں پائی، اب آپ سے جیسے بھی ہو گا، نبھاؤں گی۔''

''تو ٹھیک ہے تمہارے لیے دودھ دینے والی ایک گائے باہر والے طویلے میں پہنچ جائے گی تا کہ تمہیں دودھ، دہی، مکھن وغیرہ کی کوئی تکلیف نہ رہے۔ اچھا، تو میں رحیم کو ابھی کہہ دوں کہ وہ راشوں کا انتظام کر دے۔''

بگّا دروازے سے باہر نکلا تو سامنے منگل سر پر کچھ سامان اُٹھائے آتا دکھائی دیا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو منگل ٹھٹھک کر رُک گیا۔ بگّے نے ہاتھ اُٹھا کر بڑی گرم جوشی سے اس کا سواگت کرتے ہوئے کہا:

''آؤ، آؤ، تمہارا ہی انتظار تھا۔''

بگّے کو اتنے اچھے موڈ میں پا کر منگل کے چہرے پر رونق آ گئی۔ بگّا لپک کر کمرے کے بھیتر پہنچا اور اونچی آواز میں بولا:

"دیکھو رام پیاری کون آیا ہے۔"

اتنے میں دروازے پر منگل کی شکل دکھائی دی۔ بہن پر نظر پڑتے ہی اس نے کھیسیں نکال دیں۔ بگا بولا:

"اور منگل! تیری بہن تیری وجہ سے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے سمجھایا کہ منگل کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے، صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ جائے گا۔"

بھائی بہن کو چھوڑ کر بگا 'بھجو کو یہ کہنے کے لیے مکان کے بھیتر چلا گیا کہ وہ منگل کے لیے بھی ناشتہ تیار کر دے۔ اس نے بہن کو سمجھایا:

"میں منگل کو ہی یہاں ناشتہ کرنے کے لیے بھیجوں گا۔ تم چپ چاپ اسے کھلا پلا دینا کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنا۔ میں نے رام پیاری کو باہر والے طویلے میں رہنے کے لیے راضی کر لیا ہے۔ اب وہ تمہارے پاس گھر میں نہیں رہے گی۔"

بہن کو یہ تاکید کر کے بگا رام پیاری کے پاس پہنچ گیا۔

دن کے بھوجن کے بعد رام پیاری منگل کو لے کر رہٹ والے طویلے میں چلی گئی۔ رحیم نے قریب والے گاؤں میں جا کر راشوں سے بات چیت کی اور وہ دوسرے ہی دن کام کرنے پر تیار ہو گئے۔

ایک ہفتہ تک راشے دھڑا دھڑ کام کرتے رہے اور انہوں نے دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کی کچی دیواریں کھڑی کر دیں۔ کوٹھڑیوں پر چھت بھی پڑ گئی۔ یہ کوٹھڑیاں نئی ہونے کی وجہ سے صاف سُتھری تھیں۔ دو مہریوں نے جا کر دونوں کوٹھڑیوں کے بھیتر اور باہر گوبر گارے کی لیپا پوتی بھی کر دی۔ تو کوٹھڑیاں جگمگانے لگیں۔ کوٹھڑیوں میں پلنگ، چار پائیاں اور موڑھے بھی پہنچ گئے۔ سردیوں کا اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا اور آنے والے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے دو چولہے صحن کے کونے میں بنا دیئے گئے۔ چولہے کے آس پاس بالشت بھر اُونچا کچا چبوترا بھی تیار ہو گیا۔ اس طرح رسوئی گھر سمیت رام پیاری کا چھوٹا سا گھر بن گیا۔ بگا سنگھ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتا اور اسے یوں لگتا تھا، جیسے اب وہ پکا گرہستھ ہو گیا ہے۔

گاؤں والے اس تماشے کو کافی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے..... ہاں ان کے لیے یہ تماشا ہی تو تھا۔

بستی میں رہنے والے ایک طرح سے چار حصوں میں منقسم تھے۔ ان میں زیادہ تر تو وہ لوگ تھے، جن کا دھاکڑ بازی سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صبح سے شام تک ان کا بنا بنایا پروگرام ہوتا تھا۔ گاؤں میں ہندو اور سکھ زیادہ گنتی میں تھے اور مسلمان برائے نام ہی تھے۔ وہاں مسجد کوئی نہیں تھی، صرف گوردوارہ تھا۔ ہندو بھی شری نانک دیو سے لے کر گورو گووند سنگھ تک، دسوں گوروں میں عقیدت رکھتے تھے۔ وہ بھی گوردوارے میں جاتے، گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے اور ہر ایک مذہبی تہوار پر سکھوں کے ساتھ برابر کا حصہ لیتے۔ اصل میں تہوار ہندو سکھ دونوں ہی ذاتیں ایک ساتھ مناتی تھیں۔ یہ بھلے لوگ دھاکڑوں سے ذرا دُور دُور رہتے تھے۔ دھاکڑ انہیں بے جا طور پر کبھی بھی نہیں ستاتے تھے۔ دھاکڑ کی ٹکر دھاکڑ سے رہتی تھی۔ دوسری طرح کے لوگوں میں بگا سنگھ زیادہ مشہور یا بدنام تھا۔ وجہ یہ کہ اس کی عقل موٹی تھی، وہ ہتھ چھٹ اور منہ پھٹ بھی تھا۔ اسی لیے اسی کے خاندان کے لوگ، یعنی

چنن سنگھ وغیرہ خاص طور پر زیادہ ہی اس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ باہمی نفرت اور دشمنی کی نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو مٹی میں ملا دینا چاہتے تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بگا اور چنن سنگھ کے گُٹ کے علاوہ چوتھا گُٹ شیر سنگھ کا تھا۔ وہ اس پہلوان کی طرح تھا، جو خلیفہ کہلاتا ہے، یعنی خود لنگوٹ کھول بیٹھا تھا، مگر اپنے پٹھوں کو ضرورت پڑنے پر کسی نہ کسی سے بھڑا دیتا تھا۔ کبھی کبھی شیر سنگھ خود بھی داؤ کھیل جاتا۔

بگا سنگھ اور رام پیاری کے واقعہ کے بارے میں تینوں گُٹ باہم کانا پھوسی کرتے رہتے تھے۔ شیر سنگھ کو نہ بگّے سے زیادہ دلچسپی تھی اور نہ چنن سے۔ وہ دُور بیٹھا اطمینان سے آگ تاپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ معاملہ ابھی طُول پکڑے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے عموماً کہا کرتا تھا کہ اس واقعہ کے پیچھے کوئی گہرا راز ہے۔ وہ کیا راز تھا، اس بات کا ابھی کسی کو پتا نہیں تھا۔

بگا سنگھ ایسی بات کو ایک کان سے سُنتا اور دوسرے سے اُڑا دیتا۔ رام پیاری جیسی حسین اور لُس لُس کرتی عورت پا کر وہ جیتے جی سورگ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی ہر رات دیوالی کی رات ہوتی تھی۔

ایک دن جبکہ دُھوپ خوب چڑھ آئی تھی، بگا سنگھ اور رام پیاری کوٹھڑیوں کے آگے والے چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ منگل صحن کے پَرلے کونے پر منہ دوسری طرف کیے چھوٹا سا حُقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناطے سے بگا سنگھ کو حقے اور سگریٹ سے سخت کراہت ہوتی تھی۔ صرف رام پیاری کی خاطر اس نے منگل کو ان کوٹھڑیوں میں، حقہ سگریٹ لانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے منگل کو منع کر دیا تھا کہ وہ کبھی اُس کے سامنے بیٹھ کر تمبا کو نہ پیئے۔

رام پیاری اور بگا کافی دیر سے گپیں ہانک رہے تھے۔ یکا یک بگّے نے پہلو بدل کر کہا:

''اب تو دھوپ گرم لگنے لگی ہے۔ اے منگل! ذرا چارپائیاں چھاؤں میں تو کھسکا دے۔''

منگل نے فوراً اپنی گڑگڑی صحن کے کونے میں ٹِکا دی۔ وہ ادھر آنے ہی کو تھا کہ دُور سے کچھ دیکھ کر چونک پڑا۔ دو قدم بگّے کی طرف بڑھ کر وہ دھیرے سے بولا:

''سردار جی! کوئی آ رہا ہے۔''

''آ رہا ہے تو آنے دو۔ تمھیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے؟''

منگل نے چارپائیاں دیوار کی چھایا میں کھسکا دیں اور ان دونوں کی طرف معنی خیز انداز دیکھتے ہوئے بولا:

''وہ چنن سنگھ ہے۔''

بگا سنگھ چونکا۔ جب سے رام پیاری اس کے گھر میں آئی تھی، تب سے چنن اس سے ملنے کبھی نہیں آیا۔ کبھی گلی میں آتے جاتے ملاقات ہوتی، تو آپس میں دو چار روکھی سوکھی باتیں بھی ہو جاتیں۔ آج وہ اس کے یہاں کیوں آ رہا تھا؟

انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ صحن کی چار دیواری اتنی نیچی تھی کہ جب چنن سنگھ وہاں آیا تو کمر

سے اُوپر تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آپس میں آنکھ ملی تو چنن نے وہاں سے ہی ست سری اکال کہہ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

بگّے اور رام پیاری نے بھی بناوٹی انداز سے اس کا سواگت کیا۔

جب وہ صحن میں پہنچا، تو چار پائیوں کے قریب اس کے بیٹھنے کے لیے دوفٹ اُونچا گول موڑھا رکھ دیا گیا۔

چنن بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ اس کا اس طرح خوش ہونا بگّے کی پریشانی کی وجہ سے بنا ہوا تھا۔ چنن نے اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں اُلجھا کر سرسری نظر سے چاروں طرف دیکھا، اور مسکرا کر بولا:

"رام پیاری نے تو بڑا سُندر چھوٹا سا گھر بنالیا ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

اب بگّے کو وشواس ہوگیا کہ چنن سنگھ کچھ نہ کچھ شرارت کرنے آیا ہے مگر وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ رام پیاری نے اِدھر اُدھر کی بات چیت چالو رکھی۔

کچھ کریدنے کے خیال سے رام پیاری نے چنن سنگھ سے کہا:

"لگتا ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہو گئے تھے۔ آج آپ چلے آئے تو یہ شک بھی دُور ہو گیا۔"

چنن سنگھ بولا:

"تم میرا مکان چھوڑ کر چلی آئیں، تو اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل بھی ناراض نہیں تھا۔ مجھے تو تمہارے وہاں رہنے میں اعتراض نہیں تھا لیکن دیکھو نا دنیا والوں کا منہ کیسے بند کیا جا سکتا ہے۔ بس اتنی سی بات میں نے اُس روز بھی کہی تھی، جو بگّا سنگھ کو بُری لگی۔ رام پیاری! سچ پوچھو تو فرق ہی کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ چاہے تم میرے یہاں رہتیں، یا بگّے کے یہاں...... بات ایک ہی ہے۔ بگّے کا اور میرا خون کا رشتہ ہے۔ جب دو برتن ساتھ ساتھ رکھے ہوتے ہیں، تو کبھی ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ بس یہی ہم دونوں ماملا بھی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ حالت زیادہ بہتر ہے۔ چوری چوری ملاقاتوں کی بجائے کھلم کھلا ایک ساتھ رہنا ٹھیک ہے......"

بگّے نے من میں سوچا کہ چنن سنگھ کی ان چکنی چپڑی باتوں کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے۔ وہ چپ چاپ اپنے دشمن رشتے دار کو گھورتے جا رہا تھا۔ چنن نے دیکھا کہ ان دونوں کی طرف سے بات چیت رُک گئی تھی تو پھر وہ بھی مطلب کی بات پر آ گیا:

"تم دونوں کا کتنا اچھا چل رہا تھا۔ اس سے مجھے تو کیا، کسی بھی گاؤں والے کو اعتراض نہیں تھا...... مگر......"

بگّا بپھر کر بولا:

"مگر کیا؟"

چنن نے اپنی آواز میں کچھ ہمدردی اور درد پیدا کرتے ہوئے کہا:

"یہ ماملا ایسے ہی ہے، جیسے کھیر کھاتے وقت منہ میں کنکر آ جائے۔"

بگّے کا خون بھیتر ہی بھیتر کھولنے لگا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''تمہارا مطلب کیا ہے؟''

چنن کا چہرہ یکا یک گھمبیر، بلکہ کٹھور ہو گیا بولا:

''رام پیاری کا خاوند آ پہنچا ہے۔''

رام پیاری یہ سنتے ہی اُچھل پڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بول اُٹھی:

''کہاں ہے وہ؟''

''میرے گھر پر ہی بیٹھا ہے۔''

بگّے کی شکل بگڑ گئی، اور وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا:

''تو تم یہ، خوشخبری سنانے کے لیے ہی یہاں آئے ہو؟''

''میں آیا نہیں، بھیجا گیا ہوں۔''

رام پیاری نے پوچھا:

''اسے اس بات کا پتا کیسے چلا کہ میں یہاں پر ہوں؟''

چنن نے دونوں کندھے ہلا دیئے اور منہ بنا کر بولا:

''یہی میں کیا جانوں؟ وہ تمہارا اُتا پتا پوچھتا ہوا آ گیا ہوگا۔''

رام پیاری نے سوال کیا:

''وہ چاہتا کیا ہے؟''

''وہ تمہیں یہاں سے لے جانا چاہتا ہے۔''

اَب رام پیاری تو خاموش رہی اور بگا سنگھ بھڑک اُٹھا:

''رام پیاری کہیں نہیں جائے گی۔ وہ میرے پاس ہی رہے گی۔''

چنن سنگھ نے ہمدردی جتلاتے ہوئے کہا:

''میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تُم اس بات پر راضی نہیں ہو گے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ رام پیاری میری بیاہتا ہے اور میں اسے حاصل کرنے کے لیے پولیس کی مدد بھی لے سکتا ہوں۔''

بگا گرج کر بولا:

''پولیس نہیں، پولیس کا باپ آ جائے..... تو بھی رام پیاری یہاں سے نہیں جائے گی۔''

چنن سنگھ نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر رانوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا:

''تو میں جاتا ہوں، وہ پولیس تک یہ بات پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں محتاط کر دُوں.....''

بگا سنگھ کا منہ اور بھی بھینچ گیا۔

جانے سے پہلے چنن سنگھ نے ایک بار پھر کہا:

''بگا! یہ ٹھیک ہے کہ میری تمہاری کبھی نہیں بنتی۔ بہت حد تک ہماری دُشمنی بھی ہے پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ ہم بھلے ہی آپس میں لڑتے بھڑتے رہیں لیکن اگر مصیبت باہر سے آئے تو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی جاگ ہی اُٹھتی ہے۔ میں رام پیاری کے خاوند کا دوست نہیں ہوں لیکن یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ قانون اسی کے حق میں ہے۔ اس بات سے رام پیاری کو بھی انکار نہیں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے...... میں نے سوچا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بگا پھر بھی اپنا ہے۔ مجھے اسے آنے والے جھنجٹ سے خبردار کر دینا چاہیے۔ سب کچھ جان لینے کے بعد تُم جو قدم بھی اُٹھانا چاہو، اس میں مَیں تمہیں روک نہیں سکتا۔''

بگا سنگھ نے مَن میں سوچ رکھا تھا کہ رام پیاری کے خاوند کا صفایا ہی کر دیا جائے گا۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اس کے بعد جو ہوگا، سو دیکھا جائے گا۔

چنن دروازے کی طرف بڑھا، تو رام پیاری بول اُٹھی:

''رکیے!''

چنن کے قدم رُک گئے اور وہ مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔

رام پیاری نے آنچل سنبھالتے ہوئے پوچھا:

''کیا آپ اسے یہاں نہیں لا سکتے؟ میں خود اس سے بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔''

چنن بولا:

''اسے یہاں پر کوئی اعتراض تو ہونا نہیں چاہیے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ پتی پتنی کی آمنے سامنے بات ہو جائے، تو کسی اور کو اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی...... لیکن شرط یہ ہے کہ اگر میں اسے یہاں لے آؤں تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہوگی۔ جب تک وہ میرے ساتھ رہے، تب تک کسی کو اس پر اُنگلی اُٹھانے کی بھی جرأت نہیں ہونی چاہیے۔''

یہ کہتے کہتے چنن سنگھ نے بگے کی طرف دیکھا۔ رام پیاری اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی:

''اس بات سے بےفکر رہیے۔ میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔''

بگا خاموش رہا اور چنن لاٹھی سنبھال کر وہاں سے چل دیا۔

اکیلے رہ جانے پر بگے نے رام پیاری سے پوچھا:

''تم خامخا گھبرا گئیں...... اسے یہاں بُلانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''جو معاملا بات چیت سے طے ہو جائے، وہی ٹھیک ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ پولیس کو لے کر یہاں آئے۔''

''جب میں پولیس سے نہیں ڈرتا، تو تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے؟''

''میں پہلے سے ہی بدنام ہوں۔ پولیس کے آ جانے سے میری بدنامی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''مگر وہ مجھے یہاں سے لے تو جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کھلم کھلا پولیس سے بھڑ بھی جائیں، تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انگریز کا راج ہے۔ اس بات کا کیا فائدہ، کہ آپ پولیس سے ٹکر لے کر مصیبت میں بھی پھنسیں اور میں بھی ہاتھ سے نکل جاؤں۔''

''تم ہاتھ سے کیسے نکلو گی۔ میں تمہیں یہاں سے غائب کر دوں گا۔ میں پولیس سے کہہ دوں گا کہ بے شک رام پیاری آج تک اپنی مرضی سے میرے پاس رہتی تھی، لیکن اب وہ نہ جانے کہاں چلی گئی پولیس پوچھ تاچھ کے بعد دفع ہو جائے گی اور میں پھر تم کو یہیں پر لے آؤں گا۔''

''اگر پولیس پھر آ گئی تو؟''

''میں تمہیں پھر غائب کر دوں گا...... سوچنے کی بات یہ ہے کہ پولیس کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ بار بار میرے گھر کے چکر لگاتی رہے۔ میرے پاس ایسے آدمی ہیں جو پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے خبردار کر سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ پولیس کب تک یہ آنکھ مچولی کھیلتی رہے گی اور کب تک تمہارا یہ خاوند یہاں سر ٹکراتا رہے گا۔ چاہے وہ چنن سنگھ کی حفاظت میں رہے، میں موقعہ پا کر اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا دوں گا۔ اسے گھبرا کر تمہارے بنا ہی یہاں سے لوٹنا پڑے گا۔''

''اس جھنجٹ بازی کا کیا فائدہ...... اسے آنے تو دیجیے۔ سب باتیں ہمارے آمنے سامنے ہو جائیں گی۔''

بگے کو رام پیاری کے یہ وچار پسند نہیں آئے۔ کافی دیر تک ان دونوں کی بحث چلتی رہی۔ یہاں تک کہ منگل نے آ کر خبر دی کہ چنن رام پیاری کے خاوند کو لے کر چلا آ رہا ہے۔

جب چنن سنگھ صحن میں آیا تو اس کے ساتھ چالیس بیالیس برس کا پلپلے جسم والا ایک آدمی تھا۔ جس نے چوڑی دار پائجامہ، ریشمی قمیص اور گرم واسکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر کالے رنگ کی کشتی نما ٹوپی تھی، اور پاؤں میں پمپ شو تھے۔ اس کے منہ میں پان کے بیڑے ٹھنسے ہوئے تھے اور ہاتھ میں پاندان تھا۔

آتے ہی چنن نے کہا:

''میں اکیلا آیا ہوں، تا کہ پتی پتنی اطمینان سے بات چیت کر سکیں مجھے اُمید ہے کہ میں نے جو شرط رکھی تھی، وہ آپ لوگوں کو یاد ہوگی۔''

بگا سنگھ چپ چاپ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نئے آدمی کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے بھیڑیا بکری کے بچے کو دیکھتا ہے۔ رام پیاری نے بگے کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ بات چیت میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔

وہ چاروں پسار میں بیٹھ گئے، کیونکہ دُھوپ سارے صحن میں پھیل چکی تھی۔ چنن سنگھ نے نئے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام پارس ناتھ ہے۔

شکل وصورت سے پارس ناتھ کافی گھمبیر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز اور بولنے کا انداز بھی گھمبیر تھا۔ اس نے بڑے نرم ڈھنگ سے بیوی سے بات شروع کی:

''دیکھو رام پیاری، تمہیں اس طرح چپ چاپ گھر سے نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ تمہاری اس حرکت سے میرے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں اور تمہارے خاندان کی بھی بے عزتی ہوئی۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ایک جانے مانے خاندان کی لڑکی ہو۔''

رام پیاری نے بڑی دلیری سے جواب دیا:

''اس ساری بدنامی کی وجہ تو آپ خود ہیں۔''

پارس ناتھ نے اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا:

''رام پیاری، میں نے تو تم سے صرف بیاہ کیا ہے۔ نہ تم میرے پاس رہیں، نہ تم نے میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی تو پھر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ شادی کرنا تو کوئی پاپ نہیں ہے، ہاں، میرے گھر میں رہ کر اگر تمہیں کوئی پریشانی ہوتی، تو تم مجھ پر الزام دھر سکتی تھیں۔ تم نے تو مجھے آزما کر تو دیکھا ہی نہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ مجھے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنے آپ میں ہی بھڑک اُٹھیں۔''

''سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی ہیں، میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ آپ بُرے آدمی ہیں یا اچھے...... میری تو سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی تو پھر آپ نے میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے داروں پر زور ڈال کر مجھ سے شادی کیوں کی؟''

پارس ناتھ پل بھر چپ رہ کر بولا:

''تم مجھے اچھی لگتی تھیں، اس لیے میں نے شادی کی۔ مجھے پورا وشواس تھا اور اب بھی ہے کہ میرے پاس کچھ دن رہ لو گی تو تمہیں مجھ میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئے گی۔ تمہارا جیون سُکھی رہے گا۔''

''میں نے بھی پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اگر زبردستی میری شادی کی گئی تو میں آپ سے کوئی مطلب نہیں رکھوں گی۔''

''بغیر کسی کو جانے بوجھے اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا تمہیں شوبھا نہیں دیتا۔''

''مجھے کیا شوبھا دیتا ہے اور کیا شوبھا نہیں دیتا، یہ میں بھلی بھانت سمجھتی ہوں۔ آپ ہی مجھے بتائیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی، مجھ سے زبردستی شادی کرنا آپ کو شوبھا دیتا ہے؟''

''میں مانتا ہوں کہ اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں

کہ تمہاری سندرتا نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی مرد کو کوئی لڑکی پسند آ جائے تو وہ ہر غلط طریقے سے بھی اس سے شادی کر سکتا ہے اور اگر لڑکی کو آدمی پسند نہ ہو تو وہ کسی طرح بھی اس کے چنگل سے بچ نہیں سکتی۔"
جگّے کو رام پیاری کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کی حیثیت بے زبان بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں رام پیاری کا تڑاق پھڑاق باتیں کرنا جگّے کو عجیب بھی لگا اور اچھا بھی لگا۔ آخر وہ اس موہنی پر مرتا تھا۔
پارس ناتھ نے رام پیاری سے کہا:
"دیکھو، جو ہونا تھا سو ہو چکا، بیسیوں لوگوں کے سامنے میری تمہاری شادی ہوئی......"
رام پیاری بات کاٹ کر بولی:
"وہ اس لیے کہ مجھے ماں باپ نے مجبور کر دیا تھا۔ مگر شادی کی رسم پوری ہوتے ہی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے مجھے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا ہے۔"
"لیکن شادی تو ہو گئی نا۔"
رام پیاری بھڑک کر بولی:
"زور زبردستی اور دھوکے بازی کی یہ شادی......شادی نہیں ڈاکہ ہے۔"
پارس ناتھ نے اپنے دماغ میں ذرا بھی گرمی نہیں آنے دی، اور اسی نرم آواز میں بولا:
"تمہارا ایسا سمجھنا ہی تو تمہاری بھول ہے۔ میری محبت کا اندازہ تم اسی بات سے لگا سکتی ہو، کہ تمہاری ان سب حرکتوں اور بدنامی کے باوجود میں تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں۔"
رام پیاری چلا کر بولی:
"میں کہتی ہوں کہ میری جیسی بدنام عورت کو گھر لے جا کر کیا کرو گے؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"
"نہیں، مَیں اپنی پتنی کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ جس کام کے لیے میں سیکڑوں میل سے یہاں تک آیا ہوں۔ اسے پورا کر کے ہی چھوڑوں گا۔ اگر تم صلح صفائی سے میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ ہوئیں، تو مجھے مجبوراً قانون کا سہارا لینا پڑے گا۔"
کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تب رام پیاری نے جگّے کو اشارہ کیا اور وہ دونوں پچھواڑے والی کوٹھڑی میں چلے گئے۔ رام پیاری نے پہلے تو اپنی کالی اور موٹی موٹی آنکھیں جگّے کی آنکھوں میں ڈال دیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی:
"میرے خیال میں ابھی میں اس کے ساتھ چلی ہی جاؤں، تو اچھا ہے۔"
یہ سُن کر جگّا سنگھ یکا یک اس طرح پیچھے کو ہٹا، جیسے اسے ناگ نے ڈس لیا ہو بولا:

"میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا، رام پیاری!...... میں صرف تمہاری خاطر اتنی دیر سے اس کی ٹرٹر سن رہا ہوں۔ تم نے بگا سنگھ کے ہاتھ نہیں دیکھے ہیں۔ میں تو اسے زندہ ہی دھرتی میں گاڑ دوں گا، یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اندھے کنوئیں میں پھینکوا دوں گا۔"

رام پیاری نے ماتھے پر بل ڈال لیے اور کچھ رُوٹھنے کے انداز سے اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹکا دے کر بولی:

"جاؤ! آپ کی اسی طرح کی باتیں تو مجھے پسند نہیں ہیں۔ ذرا میری طبیعت کو سمجھنے کی بھی تو کوشش کیجیے۔"

"تو تم یہ چاہتی ہو کہ مجھے چھوڑ کر اس لفنگے کے ساتھ چلی جاؤ اور میں یہاں ٹاپتا رہ جاؤں۔"

رام پیاری نے جھٹ سے اپنا کومل ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے کہا:

"آپ کو چھوڑنے کی بات میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"یہ کیا تماشا ہے؟ خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"اوہو! آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، میں اس کے ساتھ واپس اپنے گاؤں کو نہیں جاؤں گی، میں اسی گاؤں میں رہوں گی، صرف آپ کے گھر سے نکل کر چنن سنگھ کے مکان میں چلی جاؤں گی۔ چنن سنگھ نے اس کو بھی اسی مکان میں ٹھہرایا ہوگیا، جو اس نے مجھے دے رکھا تھا۔"

"پھر؟"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ کوئی قانونی کارروائی نہ کرنے پائے، پولیس والا جھنجٹ بھی پسند نہیں ہے۔ میں اکیلے میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی کہ میں کسی بھی شرط پر اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہوں۔ اسے یہ بھی سمجھانا پڑے گا کہ اگر وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے بھی گیا، تو اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا اور وہ کبھی سکھ سے نہیں رہ سکے گا۔"

بگا سنگھ کو یہ ترکیب پسند تو نہیں تھی، لیکن اسے رام پیاری کا بھی بہت خیال تھا...... وہ نہیں چاہتا تھا کہ رام پیاری کا من اسے سے اُکھڑ جائے۔ اس نے دھیرے سے پوچھا:

"اگر تمہارے سمجھانے پر بھی وہ نہ مانا تو؟"

"تو کیا...... آپ تو یہیں پر ہیں نا۔ میں آپ کو خفیہ پیغام بھیج سکتی ہوں۔ اگر میں آپ سے ایک آدھ بار ملنا بھی چاہوں گی، تو وہ مجھے نہیں روکے گا۔ مطلب یہ کہ اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تو ہم دونوں کوئی نیا منصوبہ بنا لیں گے۔ ضرورت پڑی تو میں چنن سنگھ کے مکان سے رات کے اندھیرے میں نکل آؤں گی۔ آپ مجھے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیجیے گا۔"

"میں تو اَب بھی تمہیں چھپا سکتا ہوں۔ پھر اتنا لمبا جھنجٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ سمجھے نہیں، اگر میں یہاں سے غائب ہو جاؤں، تو اس کا الزام آپ پر لگے گا۔ لیکن اگر میں

چنن سنگھ کے مکان سے بھاگ جاؤں، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے گھر سے تو اسے اس کا خاوند لے گیا تھا، اب میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

بگا چپ چاپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ...... رام پیاری صرف لاجواب سُندری ہی نہیں بلکہ چالاک بھی تھی۔

رام پیاری نے اپنی ایڑیاں اُٹھا کر دونوں بازو بگے کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

''اب آپ کچھ نہ بولیے گا۔ میری یہ ترکیب بہت اچھی ہے۔ میرا آدمی مکّار ہے۔ آپ کی زبانی مجھے یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ چنن سنگھ بھی دھوکے باز ہے۔ ایسے لوگوں سے سیدھی طرح سے نبٹا نہیں جا سکتا۔ دھوکے بازی کا جواب دھوکے بازی سے ہی دینا چاہیے۔''

اس حسین پھول کو اپنے گلے کا ہار بنا دیکھ کر بگے کے دماغ پر پھر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بھاری آواز میں بولا:

''اچھا رام پیاری، تم یہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے...... میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

آپس میں صلاح مشورہ کر کے وہ دونوں کوٹھڑی سے نکل کر پسار میں آ گئے...... چنن سنگھ اور پارس ناتھ کی آنکھیں ان کی طرف اُٹھ گئیں۔ رام پیاری آگے آگے تھی اور بگا سنگھ پیچھے پیچھے۔

رام پیاری نے ان دونوں سے تو کچھ نہیں کہا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر صحن میں کھڑے منگل کو باریک آواز میں بلایا: ''منگل!''

''ہاں، دیدی!''

منگل دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ رام پیاری بولی:

''بھائی، اپنا سارا سامان سمیٹ لو، ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔''

یہ سن کر پارس ناتھ اور چنن سنگھ کے چہرے کھل اُٹھے۔

رام پیاری نے چنن سنگھ سے پوچھا:

''انہیں آپ نے کہاں ٹھہرایا ہے؟''

''وہیں، اسی مکان میں، جس میں تُم رہ چکی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔''

منگل نے بڑی پھرتی سے دُھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑی الگ باندھی اور میلے کپڑوں کی الگ۔ سامان بہت تھوڑا تھا، جسے منگل نے آسانی سے اُٹھا لیا۔ پاندان رام پیاری نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح ان چار افراد کا چھوٹا سا قافلہ گھر سے نکل پڑا۔ جاتے وقت چنن سنگھ نے کہا:

''چلو، ساری بات خوش اسلوبی سے طے ہو گئی۔''

بگا سنگھ چپ رہا۔ رام پیاری نے صرف ایک اُچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی، اور پھر وہ منہ پھیر کر چل دی۔

بگا سنگھ صحن میں کھڑا ان سب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کھیتوں میں چلتے چلتے وہ اس کی نظروں سے اوجھل

ہو گئے ۔ بگا سنگھ کے من کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی ۔ اس کا دل ان کے ساتھ ہی کھنچا چلا جا رہا تھا ۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے اب اسے رام پیاری پھر کبھی بھی دکھائی نہیں دے گی ۔

بگا سنگھ کا من سارا دن اُڑا اُڑا سا رہا ۔ کہاں تو رام پیاری کی مدبھری آنکھیں اسے نشہ پلایا کرتی تھیں اور کہاں اب اسے سارے گھر میں بھوت ناچتے نظر آتے تھے...... اِدھر اُدھر مٹر گشتی کر کے اس نے سارا دن گزار دیا ۔ اندھیرا پڑنے پر اس بات کی اُمید بندھی، کہ رام پیاری اسے کوئی نہ کوئی پیغام بھیجے گی ۔ ایک ایک پل گزارنا مصیبت بن کر رہ گیا ۔ دن میں تو کھیتوں، رہٹ، یا گھر پر اِدھر اُدھر کے کاموں میں اس کا دھیان بٹا رہا، لیکن رات نے تو جیسے بڑی ہی بھیانک صورت اختیار کر لی ۔ رام پیاری کے ساتھ اتنے دنوں تک اس نے جیون کا جو آنند پایا تھا، اَب گویا اسی کا اسے ڈنڈل رہا تھا ۔ سپنے میں بھی اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ایک گھڑی ایسی بھی آئے گی، جب اسے اتنا دُکھ سہنا پڑے گا ۔

پل پل گنتے آدھی رات گزر گئی ۔ سارے گاؤں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ پہلے اس نے کبھی کتوں کے بھونکنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا...... اور آج اسے یہ شور بڑا ہی بھیانک لگ رہا تھا ۔ اس خیال سے کہ کہیں رام پیاری بُرا نہ مانے، اس نے پتا لگانے کے لیے کسی کو نہیں بھیجا ۔ پریشانی تو اس بات کی تھی کہ رام پیاری کو کیوں خیال نہیں آیا کہ اس کا پریمی اس کے بنا بے چین ہو رہا ہوگا ۔

ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی ۔ وہ گھر والے طویلے کے کمرے میں ہی لیٹا رہا تھا ۔ جب بھور کا تارا چمکا تو وہ اپنے جسم پر موٹا سا کھیس لپیٹ کر رہٹ کے طویلے کی طرف چل دیا ۔ قریب پہنچا، تو اس کی آنکھیں بے اختیار اس چھوٹے سے گھر کی طرف اُٹھ گئیں، جس میں رام پیاری کچھ ہفتے گزار چکی تھی ۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ رات کو وہ کسی وقت اپنے اس پیارے مکان میں لوٹ آئی ہو ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا ہونا ناممکن تھا، وہ مکان کی طرف کھنچا چلا گیا ۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی ۔ جب دروازے میں گھسا تو صحن سنسان پڑا تھا اور دروازے کے کنڈے پر تالا لٹک رہا تھا ۔ یاد آیا کہ تالے کی چابی بھی تو اسی کے پاس تھی ۔

صحن میں ٹہلتے ٹہلتے دن چڑھ آیا ۔ سورج کی پہلی کرن چمکی، تو اسے حویلی رام جاتا دکھائی دیا ۔ کھدر کی چادر لپیٹے منہ میں داتن ٹھونسے وہ کھیت میں ہگنے جا رہا تھا ۔ اس وقت تو بگا کچھ نہیں بولا، مگر جب وہ لوٹ کر آیا تو بگے نے اسے آواز دی ۔ حویلی رام نے قریب آ کر پوچھا:

''کیا بات ہے سردار جی؟''

''رات کو منگل تو ادھر نہیں آیا تھا؟''

''نہیں!''

''رام پیاری کا کوئی پیغام یہاں نہیں پہنچا؟''

''نہیں!''

بگا سنگھ جانتا تھا کہ رام پیاری کا پیغام اسے گھر پر بھی مل سکتا تھا پھر بھی وہ اپنی تسلی کے لیے پوچھ تاچھ کرتا رہا:

''تم نے کل سارا دن یا رات کو ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا...... میرا مطلب منگل اور رام پیاری سے ہے۔''

''میں تو کھیتوں میں ہی رہا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''اچھا، تو تم ہاتھ منہ دھو کر میرے پاس آؤ۔''

تھوڑی دیر بعد حویلی رام آیا، تو بگّے نے کہا:

''تم ذرا رام پیاری کا پتا تو لگاؤ۔''

''کہاں سے؟''

''تم جانتے ہو کہ وہ چنن سنگھ کے مکان میں رہتی تھی؟''

''جی ہاں، وہ مکان میرا دیکھا ہوا ہے۔''

''بس...... تو تم مکان تک ہو آؤ، ذرا بھیتر جھانک لینا منگل یا رام پیاری کی نظر تم پر پڑے گی تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے۔''

''بہت اچھا!''

''مگر تم بڑی پھرتی سے جاؤ اور پھرتی سے ہی لوٹ کر آؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔''

حویلی رام اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے قدم اُٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف لپکا، بگّا پسار والے پلنگ پر لیٹ گیا اور اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے ذرا سا سر اوپر اٹھایا، تو صحن میں لدھا سنگھ اور وریام سنگھ آتے دکھائی دیئے۔ بھیتر گھستے ہی ان دونوں نے چاروں طرف دیکھا، پھر لدّھے نے پوچھا:

''رام پیاری کہاں گئی؟''

بگّے نے جواب دیا:

''کیا تمہیں مالوم نہیں کہ اس کا آدمی اسے لینے آیا تھا؟''

''وہ تو مالوم ہے...... لیکن رام پیاری یہاں سے جانے کو راضی کیسے ہوئی؟''

''بگّے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

وہ تینوں اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ وہ صحن میں پھیلی ہوئی دھوپ میں آ بیٹھے۔ بگّے کی آنکھیں دُور گاؤں پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حویلی رام نے لوٹنے میں بہت دیر کر دی۔

آخر حویلی رام آتا دکھائی دیا۔ یہ بڑی تیزی سے قدم اُٹھا رہا تھا اور جب وہ ان کے پاس پہنچا تو ہانپ رہا تھا آتے ہی بولا:

''رام پیاری تو اس مکان میں نہیں ہے۔''

بگّے کو یہ بات بڑی عجیب لگی۔ اس نے پوچھا:

''اور منگل؟''
''وہ بھی نہیں تھا...... وہاں ہوتا کون، دروازے پرتو تالا پڑا ہوا تھا۔''
بگا چار پائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
''لگتا ہے، کہ چنن سنگھ نے رام پیاری اور اس کے آدمی کو اپنے گھر ہی میں ٹھہرایا ہے۔ تم لوگوں کا کیا خیال ہی؟''
وریام سنگھ بولا:
''ہاں، دال میں کچھ کالا ہے۔''
بگے نے پلٹ کر حویلی رام سے پوچھا:
''تم چنن سنگھ کے گھر پر تو نہیں گئے؟''
''اس بات کا خیال تو آیا تھا لیکن میں گیا نہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا...... اگر آپ کہیں تو میں اب چنن سنگھ کے گھر چلا جاتا ہوں۔''
دو پل سوچ کر بگا بولا:
''نہیں، تمہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
حویلی رام چپ چاپ کھیتوں کی طرف چل دیا۔
بگے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
''میں نے سارا ماملا تم لوگوں کے آگے رکھ دیا ہے۔ اس بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟''
وریام سنگھ نے کہا:
''ہماری رائے کیا ہو سکتی ہے؟ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔''
لدھا سنگھ بولا:
''اگر تم رائے لینا ہی چاہتے ہو تو پھر کشن سنگھ سے ہی صلاح مشورہ کرو...... دیکھو وہ ادھر ہی چلا آرہا ہے۔''
کشن سنگھ قریب پہنچا، تو ان سب کی شکلیں دیکھ کر کہنے لگا:
''بات کیا ہے؟ آج تم سب بڑے گھمبیر نظر آرہے ہو؟''
اب کے لدھا سنگھ نے ساری بات کہہ سنائی اور آخر میں بولا:
''اب بگا سنگھ ہماری رائے جاننا چاہتا ہے تم ہی سیانے ہو، تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیے؟''
کشن سنگھ نے بگے کی طرف دیکھ کر کہا:
''پہلے تو یہ پتا لگانا چاہیے کہ رام پیاری کہاں ہے؟ دو تین باتوں میں سے ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یا تو رام پیاری چنن سنگھ کے گھر میں ہے، یا پھر چنن سنگھ نے پتی پتنی کو کہیں چھپا دیا ہے اور یا پھر وہ

یہاں سے بھاگ نکلے ہیں۔''

بگا سنگھ بولا:

''میرے خیال میں رام پیاری چپ چاپ یہاں سے بھاگ نہیں سکتی۔ وہ اپنے آدمی کو چھوڑ کر ہی تو یہاں آئی تھی۔ بھلا اب اسی کے ساتھ واپس کیسے لوٹ جائے گی؟''

کشن سنگھ نے جواب دیا:

''مجھے اس بات کا دعویٰ تو نہیں ہے کہ وہ اپنے آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں نے تو صرف وہ باتیں بتائی ہیں جو ممکن ہو سکتی ہیں...... بہتر تو یہی ہو گا کہ تم خود چنن سنگھ کے گھر جا کر اس بات کا پتا لگاؤ۔''

''میں خود جاؤں؟'' بگا سنگھ بول اُٹھا۔

کشن سنگھ نے کہا:

''اس میں جھجھک کی بات ہی کیا ہے؟ جب چنن سنگھ تمہارے یہاں آ سکتا ہے تو تم وہاں کیوں نہیں جا سکتے؟''

بگا سنگھ صحن میں دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر اس نے کہا:

''ٹھیک ہے، مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔''

کشن سنگھ نے رائے دی:

''تمہارا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کل چنن سنگھ اور رام پیاری سے صرف تمہاری ہی بات چیت ہوئی تھی۔''

بگا سنگھ کے من کی بے تابی بہت بڑھ چکی تھی۔ اب ایک پل چین سے بیٹھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے تہمد کو ذرا کس کر باندھا اور ہاتھ میں لاٹھی لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ لدّھا سنگھ نے پیچھے سے آواز دے کر کہا:

''اچھا تو ہم بھی اپنے اپنے کام پر جاتے ہیں۔ اگر ہماری ضرورت پڑی تو ہم فوراً تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔''

بگا سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھتا گیا۔ گلیوں میں چکر لگاتا ہوا وہ چنن سنگھ کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا پا کر وہ بنا رُکے بھیتر چلا گیا۔

صحن میں چنن سنگھ چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا:

''آ بگا! میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

بگا سنگھ کو چنن سنگھ کا ہر لفظ زہر میں بُجھا ہوا لگا۔ چنن پھر بولا:

''اس طرح کیوں کھڑے ہو؟ چارپائی پر بیٹھ جاؤ نا۔''

بگا سنگھ بہت دھیرے سے نیچے کو جھکتا ہوا چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ چنن سنگھ کے گھر کی عورتیں اِدھر اُدھر کام کرتی پھر رہی تھیں، لیکن ان کے بگا سنگھ سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے کسی نے اس سے ایک بات تک نہیں کی۔

بگا سنگھ نے پوچھا:

''تم یہ کیسے جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا؟''

بگا چنن کا اشارہ تو سمجھ چکا تھا، اس نے صرف بات چلانے کی خاطر یہ الفاظ کہے۔ چنن نے ایک ہلکا سا بناوٹی قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

''اس بات کا اندازہ لگانا کہ تم ضرور آؤ گے، ایسی کٹھن بات تو نہیں، میری جگہ تم ہوتے، تو تمہیں بھی یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی۔''

بگا ہنسی مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے من میں تو صرف ایک ہی الجھن تھی کہ رام پیاری کہاں ہے...... سب کے سامنے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے بگے نے کہا:

''چنن! مکان سے باہر آؤ...... تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

چنن سنگھ فوراً اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ جب وہ گلی میں پہنچے تو چنن بولا:

''مجھے مالوم ہے، کہ تم کیا جاننا چاہتے ہو۔''

بگے نے کٹھور آواز میں کہا:

''جب تم اس بات کو جانتے ہی ہو تو پھر جواب بھی دے دو۔''

''جواب یہ ہے کہ اب رام پیاری کی تلاش کرنا بیکار ہے۔''

بگے نے محسوس کیا، جیسے چنن نے بیچ کھیت کے اسے للکارا ہے۔ بگڑ کر بولا:

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔''

بگے کے پاؤں کے نیچے سے جیسے دھرتی کھسک گئی۔ وہ جلدی سے بولا:

''میں یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا۔''

''یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں، کہ تم اسے ماننے سے ہی انکار کر دو۔''

''تم نے ضرور اسے کہیں چھپا دیا ہے۔''

''بگے! میں ایسی نیت کا آدمی نہیں ہوں۔ میری اپنی بیوی ہے، بچے ہیں، یہ کام تو کوئی ایسا بانکا ہی کر سکتا ہے، جسے بیوی نہ ملتی ہو۔''

بگا غصے سے لال پیلا ہو کر بولا:

''دیکھو چنن! میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھ پر چوٹیں کرو؟ میں اپنی سیدھی سادی بات کا

سیدھا سادہ جواب چاہتا ہوں۔''
''سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ رام پیاری اپنے پتی کے ساتھ واپس لوٹ گئی ہے۔''
''یہ ناممکن ہے۔''
''یہ ناممکن ہے...... یوں کیوں نہیں کہتے تمہارا من اس بات کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔''
بگا ٹکٹکی باندھ کر چنن کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا...... جیسے وہ اس کی کھوپڑی میں گھس کر حقیقت کو پا جائے گا۔ آخر اس نے پھر پوچھا:
''وہ رات بھر کہاں رہی تھی؟''
''یہ بتانا میرے لیے ناممکن ہے۔''
''کیوں؟''
''اس لیے کہ وہ رات یہاں تھی ہی نہیں۔ کل دن ڈھلے وہ، منگل اور اپنے پتی کے ساتھ پیدل چل کر پکی سڑک پر پہنچی۔ وہاں سے انہیں شیخوپورے کو جاتی ہوئی لاری مل گئی۔ وہ تینوں لاری میں بیٹھ گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب تو وہ لاہور سے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل کو چل دیے ہوں گے۔''
یہ سن کر بگا سنگھ کا چہرہ اُتر گیا۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ رام پیاری اتنی آسانی سے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی۔ وہ اس سے بے وفائی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے خاوند کو وہ خود ہی چھوڑ کر ہری پورے میں آئی اور خود ہی اس نے محبت جتلائی۔ اس سے کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ جس خاوند سے وہ نفرت کرتی تھی، بھلا اسی کے ساتھ وہ چپ چاپ اسے چھوڑ کر کیسے چلی گئی۔ بگے نے یہی بات چنن سے کہی، تو اس نے جواب دیا:
''میں نے مانا، کہ اپنے پتی کے بارے میں اس کے من میں کچھ غلط فہمی تھی اور وہ تمہاری طرف جھک گئی تھی، لیکن من میں وہ بھلی بھانت جانتی تھی کہ پارس ناتھ کے ساتھ وہ شادی کے بندھن میں بندھ چکی تھی۔ ٹھیک ہے تم نے رام پیاری کو کوئی پٹی پڑھائی ہوگی...... لیکن اکیلے میں پارس ناتھ نے بھی اس مسئلہ کا اُونچ نیچ سمجھا دیا ہوگا۔''
بگا تیز آواز میں بولا:
''اس میں سراسر تمہاری شرارت ہے۔''
''اگر تم اس میں میری شرارت ہی سمجھتے ہو، تو میرے لیے کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ میں نے تو تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا۔ تم چاہتے تو نتیجے کی پروا کیے بغیر رام پیاری کو اپنے گھر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رام پیاری نے تمہیں کیا سمجھایا بجھایا، لیکن یہ بات تو صاف ہے کہ تم نے خود اسے جانے کی اجازت دے دی......''

''اس نے مجھے وشواس دلایا تھا کہ وہ پارس ناتھ کے ساتھ نہیں جائے گی۔''

''اس کے باوجود وہ چلی گئی...... اس بات کا جواب بھی رام پیاری ہی دے سکتی ہے۔ میں نہیں۔''

کوئی ثبوت نہ ہوتے ہوئے بھی بگا سنگھ کو اس بات میں چنن ہی کی شرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے من کی حالت کو بھانپ کر چنن نے پھر کہا:

''بگّے! ذرا سوچو تو کہ اگر مجھے رام پیاری سے کوئی دلچسپی ہوتی تو جن دنوں وہ میرے مکان میں رہ رہی تھی، انہیں دنوں میں اس سے پریم جتلاتا۔ کیا رام پیاری نے تم سے ایک بار بھی کہا تھا کہ میری نیت ٹھیک نہیں تھی؟''

بگا جانتا تھا کہ رام پیاری نے چنن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ چنن بولتا گیا:

''محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔ یہی حالت تمہاری بھی ہوئی۔ اگر رام پیاری کنواری ہوتی تو پھر کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔ میں نے تمہارا بھلا سوچا تھا کسی کی بیاہتا عورت کو اپنے گھر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ پارس ناتھ پولیس کو لانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پولیس آ جاتی تو تمہاری کتنی بدنامی ہوتی۔ تمہارے ساتھ ہم لوگوں کا منہ بھی کالا ہو جاتا...... چاہے تمہیں بُرا لگے، میں تو یہی کہوں کہ جو ہوا سو اچھا ہوا، اسی میں تمہاری بھی بھلائی ہے۔''

بگا گھگھیا کر بولا:

''تم اور میری بھلائی؟...... ناممکن، میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

چنن سنگھ بگّے کی کھسیاہٹ کا بڑا مزہ لے رہا تھا کہنے لگا:

''بس، یہی تو دُکھ کی بات ہے آج کل بھلائی کا بدلہ بھی بُرائی میں ہی ملتا ہے۔''

بگا اٹل وشواس میں بولا:

''رام پیاری مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتی۔ وہ یہیں کہیں ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''ضرور ڈھونڈ نکالو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رام پیاری تمہارے پاس رہے، یا پارس ناتھ کے پاس...... میرے جوتے سے۔ مجھے تو کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر تمہارے دل کو یہ جان کر تسلی ہوتی ہے کہ رام پیاری یہیں کہیں ہے تو بھی ٹھیک ہے۔ ہاں، جاتے جاتے ظہیر چھیبے سے پوچھ تاچھ کر لینا کیونکہ وہی رام پیاری کا سامان اُٹھا کر انہیں پکی سڑک تک چھوڑ آیا تھا۔''

غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے بگا بولا:

''ظہیر چھیبے سے تو میں پوچھ ہی لوں، لیکن تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

چنن نے کُھسیے کھجاتے ہوئے جواب دیا:

''ٹھیک ہے مجھ سے بھی نمٹ لینا۔''

بگا آنکھوں سے قہر کی آگ برساتا ہوا وداع ہو گیا۔

چھیبے وہ لوگ ہوتے تھے، جو چھوٹی موٹی محنت کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے گھروں کے کپڑے بھی صاف کرتے اور کھیتوں کی مزدوری بھی۔ ان کا گٹ گاؤں کے ایک اہم کونے میں رہتا تھا۔ بگا لپکتا ہوا سیدھا وہیں پر پہنچا۔ وہ ان کے چوہدری کے صحن میں جا کھڑا ہوا۔ چوہدری چارپائی پر بیٹھا چمٹی سے حقے کی چلم کو کرید رہا تھا۔ بگے کو یکا یک ہی اپنے سامنے پایا تو حقہ پرے رکھ کر ہڑبڑاہٹ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ یوں تو گاؤں کے کسی بھی خاندانی شخص کا وہاں آنا اچنبھے کی بات تھی، لیکن بگے جیسے دھاکڑ کا پہنچ جانا تو جیسے طوفان کے آنے سے کم نہیں نہیں تھا۔

چودہری نے اپنے کندھوں پر پڑے ہوئے میلے اور پھٹے ہوئے کھیس کو سنبھال کر بدن سے لپیٹا اور پوچھا:

''کہیے سردار بگا سنگھ جی!...... کیسے آنا ہوا؟''

بگے نے کٹھور آواز میں پوچھا:

''ظہیر چھیما کہاں ہے؟''

کچھ جواب دیئے بنا چودھری تنگ اور گندی سی گلی میں دوڑتا ہوا گیا، اور ظہیر کی کوٹھڑی کے سامنے رُک کر زور زور سے اس کا نام پکارنے لگا۔

ظہیر چھیما پینتیس چھتیس برس کا دُبلا پتلا شخص تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا، تو چودہری نے اپنا چہرہ اس کے قریب لے جا کر پھسپھسا کر کہا:

''لگتا ہے کہ تیری مصیبت آئی ہے۔''

''کیوں؟'' ظہیر نے کچھ سہم کر پوچھا۔

''بگا سنگھ آئے ہیں...... ان کے تیور اچھے نہیں دکھائی دیتے...... تو نے کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی؟''

ظہیر نے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا:

''نہیں چوہدری، مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں پڑتی...... لگتا ہے تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ سردار بگا سنگھ مجھے کوئی کام بتانے کے لیے آئے ہوں گے۔''

''ارے میاں! ایسی ہی بات ہوتی تو کیا سردار جی کسی نوکر کو بھیج کر تجھے نہیں بلوا سکتے تھے؟''

ظہیر کو بھی محسوس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ دھیرے دھیرے بگا سنگھ کی طرف بڑھا اور قریب جا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

بگے نے چھوٹتے ہی پوچھا:

''کیوں بے، کل رات تو گاؤں سے کسی کا سامان اُٹھا کر پکی سڑک تک پہنچانے گیا تھا؟''

''ہاں جی!''

''ہاں جی کے بچے، کون تھے وہ؟''

''ایک عورت تھی اور دو آدمی۔''

''وہی عورت جو چنن سنگھ کے مکان میں رہتی تھی؟''

''ہاں جی!''

''کیا تجھے مالوم نہیں تھا کہ اب وہ میرے پاس رہ رہی تھی؟''

''مالوم تھا۔''

''تو پھر مجھ سے پوچھے بنا تو اسے سڑک تک پہنچانے کیوں گیا؟''

''مجھے اس بات کا بالکل پتا نہیں تھا کہ آپ کو اس پر اعتراض ہوگا۔ پھر بھی میں نے جانے سے انکار کیا تھا۔''

''انکار کے بعد بھی تُو چلا گیا؟''

''بادشاہو، ہم تو مزدور ہیں۔ ہمیں چار پیسے دے کر کوئی بھی کام کرایا جاسکتا ہے۔''

بگا بھڑک کر بولا:

''ابے، میں کام کرنے سے کہاں منع کرتا ہوں...... میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ جب تو نے ایک بار انکار کر دیا تو پھر ان کا سامان کیوں لے گیا؟''

''مجھے مالوم نہیں تھا کہ آپ اتنا غصہ کریں گے لیکن میں نے اتنا کہا کہ کہیں آپ کو اعتراض نہ ہو......''

''کہا؟...... کس سے کہا؟''

''میں نے اسی آدمی سے کہا، جو رام پیاری کے ساتھ تھا۔ اس آدمی نے مجھے تسلی دی کہ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... یہاں تک کہ سردار چنن سنگھ نے بھی یہی بتایا کہ یہ سب کچھ آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہا کہ آپ نے اپنی مرضی سے رام پیاری کو گھر سے جانے کی اجازت دی تھی۔''

بگّے نے یکا یک ہی اپنا پنجہ آگے پھینک کر ظہیر کے لمبے لمبے پٹے دبوچ لیے اور دھاڑ کر کہا:

''بچو! تجھے اچھی طرح مالوم تھا۔ دھیرے دھیرے ساری باتیں قبول کرتا جا رہا ہے۔ اب تیری خیر نہیں۔''

ظہیر کو کپکپی چھوٹ گئی، منمنا کر بولا:

''مجھے تو بی بی رام پیاری نے بھی کہا تھا کہ آپ کو اس کے چلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

اچانک ہی بگّے نے پنجہ کھول دیا اور اس کے بال چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

''جھوٹ!''

''بالکل سچ!''

یہ بھاری آواز پچھواڑے سے سنائی دی تھی۔
بگّے نے پلٹ کر دیکھا تو چنن سنگھ کھڑا نظر آیا۔
پہلے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر چنن بولا:
"اس غریب مزدور کو کیوں دھا کڑ پنا دکھا رہے ہو؟ اس کا قصور کیا ہے؟"
"ہاں، قصور تو حقیقت میں تمہارا ہی ہے۔ اس ساری سازش میں تمہارا ہی ہاتھ تھا۔"
چنن نے سینے کو ذرا پھلاتے ہوئے کہا:
"تو پھر تم ہم سے بات کرونا۔"
"تم سے بات زبان سے نہیں ہوگی......"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"
بگا سنگھ کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ ناگ کی طرح پھنکار کر بولا:
"چنن سنگھ! تیرے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔"
"واہ، یہ بات تو یوں کہہ رہے ہو، جیسے سب کی زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"
"اچھا چنن! اب میں چلتا ہوں...... تمہاری میری بات اب بیساکھی کے میلے پر ہوگی۔ دیکھ لے، تجھے خبردار کر دیا ہے۔ میں نے تاکہ بعد میں تجھ کو رونے دھونے والے یہ نہ کہہ سکیں کہ بے چارہ چنن دھوکے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"
چنن کڑوی ہنسی ہنس کر بولا:
"اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے کہ تمہیں رونے دھونے والا سوائے بوڑھی بھجو کے اور کوئی نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو اس کی بھی جان مصیبت سے چھوٹ جائے گی۔"
یہ سن کر بگا سنگھ کی آنکھیں ہی نہیں، بلکہ اس کی گردن اور چہرہ بھی انگارے کی طرح لال ہو گئے۔ بولا:
"چنن! تم یہ خواہش من میں ہی لیے ایک روز چتا پر جا لیٹو گے، یا ممکن ہے تمہیں چتا بھی نصیب نہ ہو اور تمہارا ماس چیل کوے کھا جائیں......"
چنن نے محسوس کیا کہ بگا حد سے زیادہ بڑھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے بایاں ہاتھ بڑھایا اور بگّے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ بگّے نے ایک انگلی تک نہیں ہلائی۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ پہلے ایک نظر اپنے گریبان پر ڈالی اور پھر قہر بھری آنکھیں چنن کی آنکھوں میں گاڑ کر کہا:
"میرا گریبان چھوڑ دے، یاد رکھ کہ ابھی وہ آدمی پیدا ہی نہیں ہوا، جو بگا سنگھ کی جان لے سکے...... بگا جب مرے گا وہ گوردا کال پرکھ کے حکم سے مرے گا۔ وہ چنن جیسے کسی چوتیا کے ہاتھ سے نہیں مرے گا۔"

چنن طاقتور شخص تھا مگر اپنے من کی گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ ہیں اسی وقت بھرات ہوگئی تو بگا سنگھ اس کی جان لینے میں دریغ نہیں کرے گا۔ اسے تو لوگ جنم جنم کا قاتل کہتے تھے۔

بگے نے اپنی بات دہرائی:

''چنن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دے۔ تیری جان تو میرے ہاتھ سے جائے گی ہی..... لیکن ابھی نہیں۔''

بگے کی اس للکار سے چنن کا خون کھول اُٹھا، مگر اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے گریبان چھوڑ دیا۔ بگے نے ہاتھ سے کھینچ کھانچ کر اپنی قمیص کے بل ٹھیک کیے اور جاتے جاتے کہا:

''اب ہماری ملاقات بیساکھی کے میلے پر ہوگی۔ یاد رکھو کہ میلے سے ہم دونوں جیتے جاگتے نہیں لوٹ پائیں گے۔ صرف میں زندہ آؤں گا۔''

بگا سنگھ بڑے آرام سے قدم رکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ چنن سنگھ پیچھے سے اسے دیکھتا رہا۔ ان دونوں میں ایک بڑا فرق تو یہ تھا کہ چنن کے کہنے کے مطابق بگے کو رونے دھونے والا کوئی نہیں تھا۔ چنن کی خانگی زندگی تھی۔ اس کے باوجود اس کی زندگی میں بعض لمحے ایسے آ جاتے تھے، وہ جب وہ گرہستی کو بھول کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا موقعہ آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اکیلا لڑ پڑے تو بگا سنگھ کا پلڑا بھاری ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ بیساکھی کے میلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہ یہ حساب چکا سکتا تھا۔

۳

چھیموں کی گلی میں چنن اور بگے کی جھڑپ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شام تک سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی۔ امن پسند طبقے کے بڑے بوڑھوں نے اس پر دُکھ کا اظہار کیا۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے انہوں نے طے کیا، کہ وہ چنن اور بگے سے الگ الگ ملیں گے، اور ان سے اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے پر اصرار کریں گے۔

شیر سنگھ کے کانوں تک یہ سب باتیں پہنچیں، تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''چنن اور بگا سنگھ کی لڑائی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان میں سے ایک نہ ایک یا تو قتل ہو جائے یا اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا بیٹھے گا۔''

شیر سنگھ کے ساتھی جیمل سنگھ نے کہا:

''رام پیاری والا یہ واقعہ نہ ہوتا، تو شاید ان دونوں کی دُشمنی ایسا بھیانک روپ اختیار نہ کرتی۔''

شیر سنگھ بولا:

''اس میں کچھ شُبہ نہیں کہ رام پیاری کے معاملے میں چنن سنگھ نے جان بوجھ کر بگے کو چوٹ پہنچائی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔''

شیر سنگھ کے ساتھیوں کی دلچسپی بڑھی۔ ان میں سے سوہن سنگھ نے پوچھا:

''سازش تو یہ ہے نا کہ چنن سنگھ نے بگا سنگھ کے گھر سے رام پیاری کو نکلوانے میں رام پیاری کے پتی کا ساتھ دیا۔ پھر رات کے اندھیرے میں چنن کی مدد سے ہی وہ لوگ اتنے چپکے سے کھسک کر غائب ہو گئے کہ بگا سنگھ کو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔''

شیر سنگھ نے کہا:

''اس سازش کو بس اتنا ہی نہ سمجھو۔''

سوہن سنگھ نے پوچھا:

''تو کیا اس میں کوئی اور راز بھی ہے؟''

شیر سنگھ نے جواب دیا:

''کوئی ایسا راز تو نہیں ہے، جو مجھے ٹھیک سے مالوم ہو مگر میرے مَن میں ہی شک اُٹھ رہا ہے۔''

''کیا؟''

شیر سنگھ کچھ تردّد سے بولا:

''جو کچھ میں کہوں، اس کا کسی اور سے ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ وجہ یہ کہ مجھے صرف شک ہے، فیصلہ گُن رُوپ سے کچھ پتہ نہیں۔ اگر یہ بات اِدھر اُدھر پھیل گئی، تو ہم بھی اس جھگڑے کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ ہمیں اس میں کچھ لینا نہ دینا...... گناہ بے لذت کا کیا فائدہ۔''

جیمل سنگھ نے کہا:

''یہ بھی تو بتاؤ کہ تمہیں شک کس بات کا ہے؟''

شیر سنگھ نے اپنے سارے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور رازدارانہ انداز میں بولا:

''مجھے رام پیاری گھریلو قسم کی عورت نہیں لگی۔ اس کا بھائی اپنی شکل وصورت اور عادتوں کے لحاظ سے بڑا ئٹ پونجیا سا لگتا تھا۔ میں نے اس آدمی کو بھی دیکھا، جسے چنن سنگھ رام پیاری کا پتی بتاتا تھا۔ اس سالے کی شکل بھی رنڈیوں کے دَلّے (دلال) جیسی تھی......''

یہ سُن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ اس طرف تو ان کا دھیان گیا بھی نہیں تھا۔ اِن میں سے ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں سوچنے لگا کہ کیا سچ مچ چنن سنگھ نے بگے کو تباہ کرنے کے لیے یہ جال بچھایا تھا؟

شیر سنگھ کے اس شک کے بارے میں بگے کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ رام پیاری کے چلے جانے سے اس کے جیون میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنا وقت ایسی حسین اور جوان عورت کی محبت میں گزارنے کے بعد اب اسے ایک ایک پل گزارنا کٹھن ہو رہا تھا۔

بگے کے لیے دن گھسٹ گھسٹ کر گزرنے لگے۔ وہ اب بھی اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ ممکن ہے کہ یکا یک ہی کہیں سے رام پیاری آ نکلے۔

بار بار رام پیاری کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ بار بار بگا اپنے من کو سمجھاتا کہ رام پیاری جیسی عورت اسے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اسے کتنا پیار کرتا ہے۔

بگے کے من میں آشاؤں کے دیپک جلتے رہے اور جل جل کر بجھتے رہے۔ رام پیاری کا کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر وہ کہاں گئی کیا زمین نے اسے نگل لیا یا آسمان نے اُسے اُٹھالیا؟ اگر وہ اس دھرتی پر تھی، تو کہاں تھی؟

بگا سنگھ کے ان سوالوں کا جواب نہیں ملتا تھا۔ اس کے پاس رام پیاری کا پتا بھی تو نہیں تھا، ورنہ وہ اس کے پاس پہنچ جاتا۔ بیساکھی بھی قریب آرہی تھی۔ بگے نے فیصلہ کیا کہ بیساکھی میں چنن سنگھ سے نمٹ لینے کے بعد وہ رام پیاری کی تلاش میں نکل جائے گا۔ وہ بنارس کے کس گاؤں کی رہنے والی تھی۔ یہ تو وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس علاقے کا ایک ایک گاؤں چھان مارے گا اور رام پیاری جہاں کہیں بھی ہوگی، وہ اُسے ڈھونڈ نکالے گا۔

جوں جوں بیساکھی قریب آنے لگی، توں توں دونوں گُٹ لڑائی کی تیاریاں کرنے لگے۔ امن پسند بزرگ جھگڑے کو ٹالنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ خود لالہ بالمکند اس میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ پوری ہوشیاری سے کبھی چنن سنگھ سے بات چیت کرتے اور کبھی بگے سے۔ ایک بار انہوں نے بگے کا من ٹٹولنے کے لیے کہا:

''ہم نے چنن سنگھ کو سمجھایا تھا کہ وہ بال بچے دار آدمی ہے، اس لیے اسے ایسے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

بگا بولا:

''اگر اسے اپنے بال بچوں کا ذرا سا بھی خیال ہوتا، تو وہ میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑاتا۔''

لالہ جی بولے:

''ہم اسے سمجھانے کی کوشش تو کر رہے ہیں...... ممکن ہے کہ بیساکھی کے موقع پر وہ جھگڑا کرنے سے باز آجائے۔''

لالہ جی نے یہ بات جان بوجھ کر کہی تھی، کہ دیکھیں، بگا سنگھ کے من میں کیا بات ہے۔ بگے نے اس کا دو ٹوک جواب دیا:

''اگر چنن سنگھ میلے میں لڑائی کرنے سے کنی کاٹ گیا تو بھی میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے لیے اچھا یہی رہے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مردوں کی طرح میرا مقابلہ کرے، کیونکہ وہ اب کسی طرح سے بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا۔ اس نے زندگی بھر مجھ سے دُشمنی کی ہے۔ اب میں سدا کے لیے اس کی دھاندلی ختم کردینا چاہتا ہوں۔''

بگے کے ان الفاظ سے ظاہر ہوگیا کہ اب یہ لڑائی ہو کر رہے گی۔ لالہ جی یہ بھی سمجھ گئے کہ اس جھگڑے کا نپٹارا امن پسند طبقہ کی بات نہیں ہے۔

واپس لوٹ کر جب لالہ جی نے اپنے ساتھیوں کو ساری حالت بتائی تو ان سب نے رائے دی کہ ایسے گھمبیر معاملے کو ممکن ہے، شیر سنگھ سلجھائے مگر جب شیر سنگھ سے پوچھ تاچھ کی گئی تو اس نے اس جھگڑے میں ٹانگ اڑانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ چنن اور بگا دونوں سے ہی اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ وہ برسوں سے ان کے باہمی جھگڑوں سے واقف تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ ان دونوں کو جتنا سمجھایا جائے گا، وہ اتنا ہی بھڑکتے جائیں گے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ چنن سنگھ تو شاید کسی کا کہنا مان بھی لیتا، لیکن بگا اپنی ہٹھ کا پورا تھا، اسے روکنا ناممکن تھا۔

بگے کے دماغ پر عشق کا بھوت سوار نہ ہوتا اور اس نے دل پر ایسی گہری چوٹ نہ کھائی ہوتی، تو شاید یہ لڑائی ٹل جاتی۔ برسوں کی دُشمنی اور کڑواہٹ اب بہت ہی بھیانک روپ اختیار کر چکی تھی۔ دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں۔

بیساکھی کے موقع پر جگہ جگہ منڈیاں لگتی تھیں۔ جہاں اناج کے سودے ہوتے تھے اور مویشی بھی بیچے جاتے تھے۔ بیسیوں دکاندار چادریں تان تان کر اپنی دکانیں بناتے اور اس طرح میلے کی رونق بڑھاتے تھے۔

جس منڈی میں چنن سنگھ اور بگا جایا کرتے تھے، وہاں بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ دُور دُور تک تنبو تان دیئے جاتے تھے۔ کئی طرح کے کھیل تماشے ہوتے، اور لوگ پنگھوڑوں میں بھی جھول کر مزے لیا کرتے تھے۔ جیسے ویرانے میں ایک نیا نگر بس جایا کرتا تھا۔

دونوں پارٹیوں کے لوگ میلے میں پہنچ گئے۔ یہ بات تو بنا کہے ہی واضح تھی کہ جھگڑا میلے کے آخری دن ہو گا۔ اس طرح کی سب ہی لڑائیاں میلے کے آخری دن بھگتائی جاتی تھیں، تا کہ چاہے کسی کی جان چلی جائے، اس کے کام کاج کا حرج نہ ہونے پائے۔ مضبوط لمبی لاٹھیاں اُٹھائے وہ جب ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے، تو بڑے معنی خیز انداز میں کھانستے۔ ان لاٹھیوں کو کئی دن تک سرسوں کے تیل میں بھگو کر رکھا جاتا تھا۔ پھر ان کے اوپر ایک ایک بالشت کے فاصلے پر تانبے کی تاریں کس دی جاتیں۔ اس طرح لڑائی بھڑائی کے موقعوں پر لاٹھیوں کے ٹوٹنے کا بہت کم خطرہ ہوتا تھا۔ لاٹھی کے موٹے والے رخ اور پتلے سرے پر پیتل کی ٹوپی چڑھی ہوتی تھی۔ لاٹھی کی مثالی لمبائی تب سمجھی جاتی تھی، جب لاٹھی کے اوپر والا سرا آدمی کے کان تک پہنچے۔

کشن سنگھ ہی ایک ایسا شخص تھا، جو بہت حد تک بگے کو اپنی رائے سے متاثر کر سکتا تھا۔ اس موقعہ پر وہ بگے کو لڑائی سے الگ تو نہیں رکھ سکا، مگر لڑائی کے ہتھیاروں کے معاملے میں اس نے بگے کو اس بات پر راضی کر لیا کہ صرف لاٹھیوں کا ہی استعمال کیا جائے۔ بگا لاٹھیوں پر چھویاں چڑھانا چاہتا تھا اور صفا جنگ کا استعمال بھی کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار آمنے سامنے کی لڑائی میں بہت خطرناک مانے جاتے تھے۔ چھوی بنا دانت کی درانتی سے ملتی جلتی ہوتی تھی، جسے لاٹھی کے سر پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ جب چھوی کی نوک پیٹ میں گھستی تو لاٹھی کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچ لیا جاتا اور ایک ہی بار میں آنتیں باہر کو اُبل پڑتیں۔ صفا جنگ ایک طرح کی کلہاڑی ہوتی تھی۔ اس کا وار سر یا گردن پر کیا جاتا تھا۔ کشن سنگھ نے سوچا کہ صرف لاٹھیوں کی لڑائی میں کسی کی موت نہ ہو۔ اس طرح کی

لڑائیوں سے بگا سنگھ کے من کی بھڑاس بھی نکل سکتی تھی اور اس بات کا بھی بہت کچھ امکان تھا کہ اس لڑائی کا کوئی بھیانک نتیجہ نہ نکلے۔

آخری دن بھی آ پہنچا۔ تیسرے پہر کے بعد دونوں نے گُٹ جتھے بند ہو کر ایک دوسرے کی تلاش میں گھومنے لگے۔ انہوں نے جی بھر کر شراب پی رکھی تھی۔ تنی ہوئی مونچھوں کے بالوں میں سرسوں کا تیل رچا رکھا تھا۔

ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے پھرتے دن ڈھل گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ میلے میں جگہ جگہ پر دکانداروں نے گیس جلا رکھے تھے، جن کی روشنی سے ماحول جگمگا رہا تھا۔ ایک بہت چھوڑے ریلتے راستے کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے بگے کا گُٹ آتا دکھائی دیا اور دوسری طرف سے چنن کا گُٹ آ رہا تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے برابر پہنچے تو ان کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ وہ قریب ایک دوسرے کے پہلو سے گزر چکے تھے، کہ بگے کے اشارے پر لدھا سنگھ نے چنن سنگھ کے ایک ساتھی کے ٹخنے پر اپنے پاؤں کے موٹے جوتے کی ٹھوکر جما دی۔

جس کو یہ ٹھوکر لگی، اس کا نام بال سنگھ تھا۔ لوگ اسے بالا کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ بالے کو ٹھوکر مارنے کی وجہ یہ تھی کہ غصہ اس کی ناک کی نوک پر بیٹھا رہتا تھا۔ بگا سنگھ نے سوچا کہ چھیڑ خانی ایسے شخص سے کی جائے، جو جھٹ پٹ لڑنے کو تیار ہو جائے۔ میلے میں پولیس بھی کافی تعداد میں موجود تھی۔ بگا چاہتا تھا کہ کھٹا کھٹ لاٹھیاں چلنے لگیں اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے پہلے چنن سنگھ کا کھوپڑا کھول دیا جائے۔

بالے کے ٹخنے پر ٹھوکر لگی تو اس نے لکڑ بگھے کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے لدھا سنگھ سے کہا:

''دیکھتے نہیں ہو؟ یا اندھے ہو؟''

لدھے نے فوراً لاٹھی ہاتھ میں تول کر کہا:

''اوئے بالیا! منہ سنبھال کر بول۔ لاٹھی کے ایک ہی وار سے جبڑا توڑ دوں گا۔''

اب تو بالے کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ پھنکار کر بولا:

''اس بات کا فیصلہ تو ابھی ہو جائے گا، کہ تُو میرا جبڑا توڑتا ہے، یا میں تیرا جبڑا توڑتا ہوں، لے سنبھال!''

ان الفاظ کے ساتھ ہی بالے نے اپنی لاٹھی گھما دی۔ لدھا بھی کچا لاٹھی باز نہیں تھا۔ اس نے بالے کا وار اپنی لاٹھی پر روکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب نے لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں۔ بگا کود کر چنن کے سامنے جا پہنچا۔ پل بھر کو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دہکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ بگے نے لاٹھی بہت اوپر اٹھائی اور پنجوں کے بل آگے کو جھک کر بھرپور وار کیا۔ اس وار سے چنن کا کھوپڑا پھٹ جاتا لیکن اس کے دو ساتھیوں نے اپنی لاٹھیاں بڑھا کر اس خطرناک وار کو روک لیا۔

میلے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ لاٹھیاں سنسانے لگیں۔ دو چار پگڑیاں کھل گئیں۔ دو چار کے پاؤں تہمد میں اُلجھ

گئے اور وہ لڑکھڑا گئے۔ کچھ دکانداروں کے گیس ٹوٹ گئے، ہر طرف کولاہل (کہرام) مچ گیا............۔

یہ لڑائی تین چار منٹ سے زیادہ نہ چل سکی۔ میلے کا موقع تھا، پولیس زیادہ دور نہیں تھی۔ فوراً ہی سیٹیاں بجنے لگیں۔ پولیس کے جوان بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور سب لڑنے والوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اتنی سی دیر میں چوٹیں تو کئی ایک کو آئیں، مگر ایک ہی آدمی مرا۔ وہ آدمی چنن سنگھ نہیں تھا، بلکہ میلے میں گھومتا پھرتا کوئی شخص لڑائی کی لپیٹ میں آ گیا اور دھوکے سے اپنی جان کھو بیٹھا۔ لڑنے والی پارٹیوں میں سے دو تین کے سر پر بڑی گھمبیر چوٹیں آئیں اور وہ دھول میں گر پڑے۔

پولیس نے دنگا کرنے والوں کو حراست میں لے لیا۔ اس کھلبلی میں بگا سنگھ بچ نکلا، چنن سنگھ پکڑا گیا۔ بگا سنگھ کے سارے ساتھی بھی پکڑے گئے۔ بگا موقع پا کر گھوڑی پر سوار ہوا اور اس نے اپنے گاؤں میں آ کر ہی دم لیا۔

کشن سنگھ نے اس لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، وہ شاید جان بوجھ کر میلے میں نہیں گیا تھا۔ لڑنے بھڑنے کی اس کی عمر ہی نہیں رہی تھی۔ گھوڑی کو طویلے میں رحیم کے حوالے کر کے بگا سنگھ سیدھا کشن سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی کشن سنگھ نے حالات کا اندازہ لگا لیا۔ بگا سنگھ نے جاتے ہی کہا:

''لڑائی ہوئی بھی لیکن چنن میرے ہاتھ سے بچ گیا۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں میلے میں یہ لڑائی نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ پولیس فوراً وہاں پہنچ گئی۔''

کشن سنگھ جانتا تھا کہ بگے کے لیے لڑائی بھڑائی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب ایک لمبی مصیبت شروع ہو گئی ہے۔ اس نے پوچھا:

''کوئی مرا تو نہیں ہے؟''

''میرے خیال میں ایک آدمی مر گیا ہے۔''

''کون تھا وہ؟''

''وہ ہم دونوں کے گٹ کا آدمی نہیں تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ دو تین دوسرے آدمیوں کے سر پھٹ گئے ہیں۔ کہنا مشکل ہے کہ وہ بچیں گے یا نہیں۔ مجھے تو صرف دُکھ اس بات کا ہے، کہ چنن سنگھ پر میں نے دو تین وار کیے مگر اس کے ساتھیوں نے بیچ میں آ کر اپنی لاٹھیوں پر میری لاٹھی کے وار روک لیے۔''

کشن سنگھ چنن سنگھ کے بچ جانے پر خوش تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے چنن سنگھ سے محبت تھی، بلکہ اس لیے کہ اگر وہ مر جاتا تو بگا سنگھ قتل کے مقدمے میں پھنس جاتا۔

کشن سنگھ نے پوچھا:

''پورا حال بتاؤ، آخر ہوا کیا؟''

''ہونا کیا تھا لڑائی گرم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ میں تو پہلی سیٹی کی آواز سن کر ہی لاٹھی پھینک کر وہاں سے کھسک آیا۔ میری گھوڑی ایک پیڑ کے نیچے تیار کھڑی تھی۔''

''یہ تو اچھا کیا تم وہیں پر پکڑے جاتے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہ ہوتا۔''
''میں بھاگ تو آیا ہوں لیکن کل پولیس بھی یہاں ضرور پہنچے گی۔''
''ہاں! سو تو ہوگا ہی......اب تمہارا یہ بیان ہونا چاہیے کہ تم میلے میں گئے ہی نہیں۔''
بگا سنگھ شرارت سے مسکرایا:
''اسی لیے تو میں وہاں سے کھسک آیا۔ جب دیکھا کہ لڑائی چالو نہیں رہ سکے گی تو میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ پولیس کے قابو میں آنے کا فائدہ کیا۔''
''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔''
کچھ اور صلاح مشورے کے بعد بگا سنگھ گھر میں لوٹ آیا اور اطمینان سے سو گیا۔ دوسرے دن جب ناشتہ کر چکا تھا، تو چنن سنگھ کی نشان دہی پر پولیس اس کے گھر آ پہنچی۔
طرے باز تھانیدار گھر والے طویلے کے کمرے میں بیٹھ گیا اور رحیم بگا سنگھ کو گھر سے بلا لایا۔
تھانیدار کا من بگے کے ڈیل ڈول دیکھ کر متاثر تو ہوا مگر اس نے پولیس والی اکڑ سے کام لیتے ہوئے پوچھ تاچھ شروع کر دی۔
بگا اس بات سے بالکل مکر گیا کہ وہ میلے میں گیا تھا۔
چنن سنگھ اور اس کے ساتھی پولیس کو بیان دے چکے تھے کہ یہ لڑائی بگا سنگھ نے ہی شروع کی اور وہ میلے میں موجود تھا۔
اسی بیان کا ذکر کرتے ہوئے تھانیدار نے کہا:
''ہمارے پاس ایسے لوگ ہیں جو آپ ہی کے گاؤں کے رہنے والے ہیں اور وہ اس بات کی گواہی دینے کو تیار ہیں کہ آپ میلے میں موجود تھے۔''
بگا بڑے اطمینان سے بولا:
''تھانیدار صاحب! میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میرے رشتے دار ہیں۔ میرے شریک (رشتے دار) ہونے کی وجہ سے ان کے من میں میرے خلاف دُشمنی بھری ہوئی ہے۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ برسوں سے وہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہی ہیں کہ مجھے کہیں نہ کہیں پھنسا دیا جائے۔''
تھانیدار نے مُسکرا کر کہا:
''سردار بہادر، دُشمنی تو دونوں ہی طرف سے چلا کرتی ہے۔ آپ کو بھی تو ان سے دُشمنی ہوگی۔''
یہ سارے اینچ پینچ کشن سنگھ نے پچھلی رات ہی بگے کو سمجھا دیے تھے۔ بگا بولا:
''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سو ٹھیک ہے۔ جو مجھ سے دُشمنی کرے گا، مجھے بھی اس سے نفرت ہو جانا قدرتی ہی ہے مگر میں ان سے ہمیشہ بچ کر رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چنن سنگھ نے مجھ کو دھمکی

دی تھی کہ بیساکھی کے میلے میں تمہاری خبر لی جائے گی۔ میں چپ رہا۔ میلے کے پہلے دن میں وہاں گیا اور اپنا سارا کام اپنے آدمیوں کو سونپ کر اسی روز شام کے وقت گاؤں لوٹ آیا۔ میں عزت آبرو والا آدمی ہوں، غنڈے لوگوں سے بچ کر رہتا ہوں۔''

تھانیدار اور قریب کھڑے سپاہی بگا سنگھ کی اس بات پر مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا، جب تھانیدار نے کہا:

''چنن سنگھ کا دعویٰ یہ ہے کہ بیساکھی کے میلے میں لڑائی کی دھمکی آپ ہی نے دی تھی۔''

بگا سنگھ نے جواب دیا:

''آپ نے چنن سنگھ کا بیان پہلے لیا، اس نے اسی بات کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر آپ پہلے مجھ سے مل لیتے تو پھر آپ کو ماننا پڑتا کہ یہ دھمکی میں نے نہیں، چنن سنگھ نے ہی دی تھی۔''

تھانیدار بولا:

''اگر معاملہ صرف گھائلوں تک رہتا تو پولیس اسے دنگا فساد کہہ کر ختم کر سکتی تھی۔ مگر ایک آدمی کی موت ہو جانے سے معاملہ گھمبیر ہو گیا ہے۔ فی الحال میں آپ کو گرفتار کر کے تھانے لے جاؤں گا۔''

بگا سنگھ ایسی باتوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اگر یہ معاملہ صرف اسی کی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو ممکن ہے وہ تھانیدار سے بھی سر پھٹول کرنے پر تیار ہو جاتا۔ بعد میں جو ہوتا، سو دیکھا جاتا لیکن وہ کشن سنگھ جیسے سوجھ بوجھ والے گرو کا پڑھایا ہوا تھا۔ اس نے سمجھا دیا کہ تھانیدار کے سامنے اکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر گرفتاری ہو بھی گئی تو وہ بعد میں ضمانت پر چھوٹ سکتا ہے۔ جو آدمی مرا تھا، وہ دنگے فساد میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔

بگا سنگھ گرفتاری کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ تھانے میں جا پہنچا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی بند تھے۔

کشن سنگھ نے ایک بڑے ہوشیار وکیل کو یہ کیس سونپ دیا۔ بگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا اور مقدمہ شروع ہو گیا۔

کچھ مہینوں تک مقدمہ چلتا رہا۔ شیر سنگھ سے ایک ملاقات کے دوران وہ بگا سنگھ سے بولا:

''بگیا! تمہارے مقدمے کا کیا حال ہے اب؟''

''میں نے سنا ہے کہ چنن سنگھ نے کئی ایسے گواہ بھگتائے ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس آدمی کی موت تمہاری لاٹھی لگنے سے ہوئی۔''

''ہاں، بہت سے گواہوں نے ایسا کہا ہے، کوئی بات نہیں، میں ان سب کو چن چن کر ٹھکانے لگاؤں گا۔''

شیر سنگھ نے کہا:

''مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہے، کہ بگا سنگھ کے خلاف گواہی دینے کی ان لوگوں کو جرأت کیسے

ہوئی۔ وہ بھی تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بگا ان سے انتقام لیے بنا نہیں رہے گا۔ تم پہلے بھی تو کئی اُلٹی سیدھی کارروائیاں کر چکے ہو، مگر گواہ نہ ملنے کی وجہ سے تمہارا بال بھی بانکا نہیں ہو سکا۔''

''اس بار بھی میرے خلاف ایک گواہ نہیں مل سکتا تھا۔ دراصل چنن سنگھ نے انہیں یقین دلا دیا ہے کہ مجھے اب کے پھانسی ہو جائے گی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب میں زندہ ہی نہیں بچوں گا تو ان سے بدلہ کیا لے پاؤں گا۔''

شیر سنگھ نے اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا:

''مجھے بھی یہ لگتا ہے میرا خیال ہے کہ صرف اتنی سی تسلی مل جانے پر کوئی آدمی تمہارے خلاف گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا ضرور ہی انہیں چنن سنگھ نے کافی رشوت دی ہوگی۔''

''ہو سکتا ہے مگر ان گواہوں کا کھایا پیا تو میں ایک دن نکال ہی لوں گا۔''

شیر سنگھ نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے پوچھا: ''رام پیاری کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔''

پل بھر خاموش رہ کر شیر سنگھ نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

''تم مانو یا نہ مانو، مجھے تو اس میں بھی چنن سنگھ کی سازش نظر آتی ہے۔ تمہیں چاہے رام پیاری پر کوئی شک ہو یا نہ ہو مگر میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ اس نے بھی تمہارے خلاف سازش کر رکھی تھی۔''

بگا کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے شیر سنگھ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا:

''مجھے وشواس نہیں ہوتا۔''

''کسی بھی پریمی کے لیے اپنی پریمکا پر شک کرنا کٹھن ہوتا ہے۔ خود ہی سوچو کہ اگر رام پیاری کی محبت سچی ہوتی تو وہ تمہارا سہارا لے کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتی تھی۔''

''اس کی مجبوری بھی تو تھی۔ وہ بیاہتا عورت تھی، اسے بات کا ڈر تھا کہ اس کا پتی قانون کا سہارا لے کر اسے مجھ سے چھین سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔''

بگا سنگھ کی صورت دیکھ کر خود شیر سنگھ کو بھی ترس آ گیا۔ سچ مچ رام پیاری پر اندھے وشواس کی وجہ سے اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔

عدالت میں اس کیس پر وکیلوں نے خوب بحث کی۔ عدالت کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ آدمی بگا سنگھ کے ہاتھ سے ہی مارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ عدالت نے یہ بھی قبول کیا کہ بگا سنگھ کی اس شخص سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور اس نے جان بوجھ کر یہ جان نہیں لی تھی۔ اس لیے بگا سنگھ کو پانچ سال قید با مشقت کا ڈنڈ دیا گیا۔

سیشن کے بعد ہائیکورٹ میں اپیل نامنظور ہو گئی اور سزا برقرار رہی۔

پانچواں غلاف

وارث: غفلتاں وِچ نا بود جیہڑے، ایہناں اَکھ کی کھٹناں، وٹناں ایں
(وارث شاہ)

”اے وارث شاہ، جو لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں، بھلا انہیں کسی
بھی قسم کا فائدہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

ا

بگا سنگھ کا پانچ برس جیل میں کاٹنے پڑے۔

اپریل ماہ کے شروع میں ایک سہانی صبح کو وہ سینٹرل جیل لاہور کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

اس کا سواگت کرنے کے لیے اس کی بہن جھجو، کشن سنگھ، شیر سنگھ اور کچھ دوسرے لوگ موجود تھے۔

جب انکی نظریں بگا سنگھ پر پڑیں، تو ان کے من میں یہ وچار بھی تھا کہ اتنے برسوں کی قید بھگتنے کے بعد بگا سنگھ کی شکل اور طبیعت میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ جہاں تک شکل کا تعلق تھا، وہ اب بھی جوں کا توں صحت مند اور ہٹا کٹا نظر آ رہا تھا۔ بلکہ جسم میں ذرا سا بھاری پن تھا۔ اسے کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پہرے داروں سے سانٹھ گانٹھ کر کے وہ اپنے کھانے پینے کی من پسند چیزیں اور ضرورت کی چیزیں باہر سے منگوالیا کرتا تھا۔ جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی، اور اس کا اس کی صحت پر اچھا ہی اثر پڑا تھا۔

سب نے آگے بڑھ کر ہنسی خوشی اس کا سواگت کیا۔ رحیم اور حویلی رام نے تو اپنے مالک کے گھٹنوں کو ہاتھ سے چھوا بھی۔ بگے نے انہیں تھپکی دی۔ جب کبھی جھجو اسے ملنے آتی تھی تو بتایا کرتی تھی کہ رحیم اور حویلی رام بڑی محنت سے سارا کام کر رہے تھے۔ بگے نے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملایا اور ان کی خیر خیریت دریافت کی۔

کچھ ہی دیر بعد ان سب کو پتا چلا کہ بگا سنگھ کا ارادہ اب ہری پورہ جانے کا نہیں تھا۔ جھجو کو برا لگا اور اس نے پوچھا:

''اب تم گھر نہیں چلو گے، تو کیا سنیاس لینے کا ارادہ ہے؟''

جھجو نے یہ بات کچھ مذاق اور کچھ گمبھیرتا سے پوچھی تھی۔ وہاں کھڑے سب لوگ ہنس پڑے۔ بگے کو ہنسی نہیں آئی۔ وہ تھوڑا سا مسکرا کر رہ گیا اور بولا:

''اب میں چک پیراں کو جاؤں گا۔''

جھجو نے پوچھا:

''کیوں، اپنے گھر میں رہنے کی بجائے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

بگے نے مضبوط اور دھیمی آواز میں جواب دیا:

''ہاں جھجو! اب میرا ارادہ سدا کے لیے ہی چک پیراں میں ہی رہنے کا ہے۔''

جھجو کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ کچھ پریشان سی ہو کر ولی:

''ہری پور والے کھیت اور مکان کیا کیا بنے گا؟''

بگا سنگھ کے چہرے کا رنگ گہرا پڑ گیا اور بولا:

''یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ کیا یہیں پر سب کچھ طے کرنا ضروری ہے۔''

اس کا یہ دوٹک جواب سن کر جھجو چپ رہ گئی اور دوسرے لوگوں نے اس موضوع پر کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد بگا سنگھ نے بتایا کہ پہلے وہ لاہور کے گوردوارے ڈیرہ صاحب میں جائے گا، کیونکہ اس نے منت مان رکھی تھی، جسے اب پورا کرنا ضروری تھا۔

تین تانگوں میں بیٹھ کر ساری ٹولی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کے قریب ہی گوردوارہ ڈیرہ صاحب پہنچی۔

وہاں کا کام ختم ہو گیا، تو جھجو نے بگے سے پوچھا:

''کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چک پیراں چلی چلوں، ویسے میں گھر کا کوئی خاص بندوبست کر کے نہیں آئی ہوں۔''

بگا سنگھ نے کہا:

''ابھی میں اپنے ساتھ لدھا سنگھ اور کرپال سنگھ کو لے جاؤں گا تم گھر کا سارا بندوبست کر کے صلاح مشورے کے لیے دو چار دن میں چک پیراں آ جانا۔''

اس طرح ایک ٹولی ہری پورہ جانے کے لیے تیار ہو گئی اور دوسری چک پیراں کو۔ وداع ہوتے وقت شیر سنگھ نے بگے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

''میں نے سوچا تھا کہ تم اپنے ہی گاؤں میں آؤ گے اور ایک بار پھر آپس میں اٹھنے بیٹھنے اور ہنسنے بولنے کے موقعے ملتے رہیں گے مگر تم تو چک پیراں جا رہے ہو۔''

بگے نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا:

''دل ایک دوسرے کے قریب ہونے چاہئیں۔ ہم ضرور ہی ملتے رہیں گے۔ کیا تم میری خاطر چک پیراں تک نہیں آ سکو گے؟''

شیر سنگھ نے اسی گرم جوشی سے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے جوب دیا:

''کیوں نہیں! تم بلاؤ گے تو بھی آئیں گے اور اگر نہیں بلاؤ گے تو بھی آئیں گے۔''

اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے وداع ہوئے۔ اپنے گاؤں کو لوٹتے وقت راستے میں جھجو نے شیر سنگھ سے کہا:

''میں نہیں جانتی کہ بگے کے من میں کیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اسے شادی پر راضی کر لوں

گی۔ آخر کب تک ڈنکڑے بجاتا رہے گا۔ اپنی ان ہی کرتوتوں کی وجہ سے تو اب تک وہ گھر نہیں بنا سکا۔ اب تو رشتہ ملنا اور بھی کٹھن ہو گا۔ میں سوچ رہی تھی کہ واہ گوروا کال پرکھ کا دیا سب کچھ ہے، اس لیے بھاگ دوڑ کرنے سے کوئی نہ کوئی رشتہ مل ہی جائے گا لیکن سب سے پہلے تو بگے کی رضامندی چاہیے۔''

شیر سنگھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

''بہن! تم پریشان کیوں ہوتی ہو، دو چار دن تک تم اس کے پاس جا رہی ہو۔ اس موضوع پر کھل کر بات چیت کر لینا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ زیادہ اڑیل پن نہیں کرے گا۔ آخر وہ بھی تو محسوس کرتا ہے کہ اس کی جوانی کچھ وقت تک ڈھلنے لگے گی اور اگر اب بھی اس نے گھر نہ بسایا تو اس کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔''

''میں تو اس کو کہوں گی ہی لیکن اگر اس کے دوست بھی اسے اس بات کا صلاح مشورہ دیں تو کام بن سکتا ہے۔''

''میری اس سے جب کبھی ملاقات ہو گی تو میں اس بات پر بل دوں گا۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ اس پر میرا زیادہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ تم کو چاہیے کہ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں سے کہو کہ وہ اسے شادی کرنے پر تیار کر لیں۔''

اس کے بعد شیر سنگھ نے کشن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''بھائی صاحب، اس کام کے لیے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی مل نہیں سکتا۔ آپ عقلمند ہیں اور آپ کا اس پر کافی اثر بھی ہے۔''

کشن سنگھ بولا:

''میں تو پانچ سال پہلے بھی اسے سمجھایا کرتا تھا۔ اب امید ہے کہ اتنے برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد اس کے دماغ کا فتور کم ہو گیا ہو گا۔ میں تم دونوں سے متفق ہوں اور میں اپنی طرف سے پورا پورا زور لگا دوں گا۔''

بھجو کو کچھ سوجھا، تو کشن سنگھ سے کہنے لگی:

''دو چار دنوں تک آپ بھی میرے ساتھ چک پیراں کو چلے چلیے نا۔ ہم دونوں مل کر اس پر زور ڈالیں گے۔''

اس گٹ میں یہ باتیں چل رہی تھیں اور دوسرا گٹ بالکل خاموشی سے لائلپور جانے والی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ بگے کو کھویا کھویا دیکھ کر اس کے دونوں ساتھی بھی چپ تھے۔

بگے کے دماغ میں ایک نیا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ وہ خاموش طوفان تھا۔ وہ اب بھی رام پیاری کو اپنے من سے نکال نہیں سکا تھا۔ یہ کہنا کہ اسے اب بھی رام پیاری سے عشق تھا، ٹھیک نہیں ہو گا۔ پھر بھی رام پیاری کسی نہ کسی

صورت میں اس کے من کی گہرائیوں میں بسی تھی۔ اتنے برسوں تک ایک بھی دن ایسا نہیں گیا، جس روز اس نے رام پیاری کے بارے میں نہ سوچا ہو۔

مقدمے کے بعد جب اس کو سزا ہو گئی تو اس نے سوچا کہ یہ خبر ضرور ہی رام پیاری کے کانوں تک پہنچے گی۔ وہ پریشان ہو اُٹھے گی۔ وہ اس سے ملے بنا نہیں رہ سکے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رام پیاری اسے اچانک ہی اسے طرح چھوڑ دے۔ اس نے رام پیاری کو اتنا پیار دیا تھا، جتنا کہ کوئی مرد عورت کو دے سکتا ہے۔ رام پیاری کی بھی ہر حرکت سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کا کتنا احسان مانتی تھی اور اسے سچے دل سے پیار کرتی تھی۔ بھلا ایسی عورت یکا یک اسے کیسے چھوڑ سکتی ہے؟

اپنے من کی گھٹن دُور کرنے کے لیے وہ جیل میں دو چار آدمیوں سے اس موضوع پر عموماً باتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا راز انہیں نہیں بتایا۔ وہ صرف عورت مرد کی محبت کے موضوع پر ہی ان سے بات چیت کرتا تھا۔ ان کے وچار بھی مختلف تھے۔ بگا جاننا چاہتا تھا کہ کیا کوئی بھی محبت کرنے والی عورت اچانک ہی پوری طرح سے اپنے پریمی سے ناطہ توڑ سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے ایک ساتھی کا کہنا یہ تھا کہ جب عورت اپنا ناطہ توڑتی ہے تو وہ مکمل صورت میں ہی ہوتا ہے۔ ایک بار عورت ناطہ توڑنے کو تیار ہو جائے، تو پھر اس میں وہ ڈانوا ں ڈول نہیں ہوتی۔

بگے کو یہ رائے پسند نہیں تھی۔ دوسرے ساتھی کا کہنا تھا کہ سچے دل سے پیار کرنے والی عورت کبھی اپنے پریمی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر وہ چھوڑ دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تھی۔

یہ سن بگا سنگھ کے من میں شبہ اُٹھتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ رام پیاری نے اس سے سچا پیار نہ کیا ہو، آخر اس کی کسوٹی کیا ہو سکتی تھی۔

ایک اور ساتھی کی رائے تھی کہ عورت کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھنا سمجھانا اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس میں عقل ہوتی ہے۔ عورت کی کھوپڑی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مرد کا برتاؤ یہ ہونا چاہیے کہ جس عورت سے جب تک نبھ سکے، نبھا لے، اور جب یہ محسوس کرے کہ عورت کا من ڈانواں ڈول ہو رہا ہے تو خود ہی پہل کر کے سے کراری ٹھوکر جما دے۔ جیون بھر ایک ہی عورت سے چپکے رہنا مورکھ آدمی کا کام ہے۔

بگے نے اپنی پریم کہانی کی مثال سامنے رکھنے کے لیے تصوراتی کردار گھڑ کر اپنے ان ساتھیوں کو پوری پریم کتھا سنا رکھی تھی۔ وہ اسی مثال کو سامنے رکھ کر یہ جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا، کہ اس کتھا کی نائیکہ کا اصلی روپ کیا تھا اور اس کے من میں کیا تھا۔

قید خانے میں ایک پُرانے بزرگ بھی موجود تھے، جن کی ڈاڑھی سفید تھی لیکن کالے کارناموں کی وجہ سے جیل کی ہوا کھا رہے تھے۔ جیون میں ان کو جو تجربات حاصل ہوئے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بگا سنگھ کو کہا:

''دیکھو سردار بہادر! جیسی عورت کا تُم ذکر کر رہے ہو، وہ بھلے گھر کی عورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

اس طرح بگا سنگھ نے قید کے پانچ برس کاٹ دیئے۔ کبھی کبھی خود اسے اپنے آپ پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ اپنے من سے رام پیاری کا خیال کیوں نہیں نکال پایا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ رام پیاری کے بارے میں کسی نظریے سے بھی نہ سوچے، لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ دل کا یہ گھاؤ دھیرے دھیرے ناسور بن گیا۔ آخر میں اس نے جیل کے ساتھیوں سے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دیا لیکن دل کی چوٹ پرانی ہونے پر بھی جوں کی توں ہی رہی۔

جیل سے چھوٹنے پر وہ ہری پورہ لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، جیسے ہری پور سے اس کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چنن سنگھ جیسے دشمنوں سے آنکھ نہیں ملا سکے گا۔ ان کے لیے اس کے من کی کڑواہٹ پھر کوئی بھیانک صورت اختیار کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اپنے من کی گہرائی میں وہ اپنی ہار قبول کر چکا تھا۔ چنن سنگھ سے تو دس بار ہار کر بھی وہ ہمت چھوڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن جو مات اس نے رام پیاری سے کھائی تھی، اس نے اس کی مانو کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

ریل گاڑی کی کھڑکی کے آگے بیٹھا وہ باہر کے میدانوں، کھیتوں، درختوں اور پودوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو بہت بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب بگا سنگھ پہلے والا شخص نہیں رہا تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اتنے دن جیل میں زندگی گزارنے کے بعد باہر کی دنیا سے اس کا تعلق دھیرے دھیرے ہی قائم ہو پائے گا۔ اس لیے وہ بھی خاموش رہے۔

گاڑی لائلپور کے اسٹیشن پر رُکی، تو وہ تینوں اُتر گئے۔ چک پیراں کا فاصلہ انہوں نے پیدل چل کر طے کیا۔ اونچے ٹیلے پر بنا ہوا یہ گاؤں کافی دُور ہی سے دکھائی دینے لگا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو بگا سنگھ رُک گیا اور گاؤں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کے من میں بیسیوں خیال اُبھر رہے تھے، جنہیں وہ ایک دوسرے سے نہ تو الگ کر رہا تھا اور نہ انہیں سمجھ پا رہا تھا لیکن ایک بات تو واضح تھی کہ اب اس نے اپنے جیون کے باقی دن اسی گاؤں میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا کچھ دیر ساکت کھڑا بگا سنگھ گاؤں کے ماحول کا چپ چاپ جائزہ لیتا رہا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی دو قدم پیچھے خاموش کھڑے تھے۔ آخر بگے نے قدم اُٹھایا اور آگے کو بڑھا۔

ان کا اپنا مکان لگ بھگ گاؤں کے سرے پر ہی تھا۔ جگیر سنگھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ بگا سنگھ جیل سے چھوٹنے والا ہے۔ اسے بگا سنگھ کے آنے کا پتا چل گیا اور جلدی سے باہر نکل کر ڈھلان پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی عورت بھی تھی۔ جگیر سنگھ کے حُلیے میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اس کی ڈاڑھی کے بے تحاشا بڑھے ہوئے بال اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے اور سر کے بچے کھچے بالوں کا چھوٹا سا جوڑا کالے دھاگے سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے مٹمیلے کچھرے (جانگیے) میں سے اس کی چوڑی ٹانگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں دائیں بائیں نکلے ہوئے تھے اور گندہ سا آزار بند ٹانگوں کے بیچ میں جھول رہا تھا۔ اس تنگ سی آدھی بازو والی کُرتی سی پہن رکھی تھی، جس میں سے پیٹ کی ناف جھانک رہی تھی۔

بگا سنگھ ڈھلان سے اوپر کو آ رہا تھا اور یہ پتی پتنی اس کا سواگت کرنے کے لیے نیچے کی طرف بڑھے۔ جگیر سنگھ نے بڑی گرم جوشی سے اپنے ہاتھوں میں بگے کا ہاتھ لے کر دبایا اور اس کی خیر خیریت پوچھی۔ بگا سنگھ بولا:

''میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، تم اپنی کہو۔''

جگیر سنگھ اپنی بالشت بھر چوڑی چھاتی کو پھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

''دیکھ لو تمہارا یہ بوڑھا شیر اب بھی اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم ہری پورے کو جاؤ گے، اس لیے تمہیں اِدھر آتے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔''

بگے نے اس کے ننھے سے جوڑے کو اپنی موٹی انگلی سے دباتے ہوئے جواب دیا:

''جگیر سنگھ اب میں یہیں پر رہوں گا۔''

جگیر سنگھ بڑا خوش ہوا۔ اس کی پتنی نے بھی بڑھ کر بگا سنگھ کی بلائیں لیں...... اتنے میں ہی بگا سنگھ کچھ چونک پڑا۔ چند قدموں کے فاصلے پر اُنیس بیس برس کا ایک لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا سینہ بڑے سوپ کی طرح پھیلا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں سانچے میں ڈھلے ہوئے فولاد کے بنے ہوئے لگ رہے تھے۔ چہرے پر چھدری کائی کی طرح بہت چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ رنگ دھواں کھایا ہوا سا لگتا تھا اور اس کی روکھی سوکھی بھنوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

بگے نے جگیر سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا:

''یہ کون ہے؟''

اس پر جگیر سنگھ کا منہ پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا:

''ارے! اسے بھی نہیں پہچانتے؟''

''نہیں۔''

''یہ اپنا جسا سنگھ ہے......''

جسا سنگھ کا نام سن کر بگا سنگھ کو اپنے دماغ میں کئی بگولے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ تو جسو کو بھول ہی گیا تھا۔ چودہ برس کے کھونٹا نما اس گندے سے لڑکے نے یہ کیسا روپ اختیار کر لیا تھا۔

بگا سنگھ کے ماتھ پر دو بل پڑ گئے اور وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر خود جسا سنگھ کی طرف بڑھا۔ یہ وشواس کرنا کتنا کٹھن ہو رہا تھا کہ یہ وہ ہی جسو تھا۔ جسے ہر صبح وہ دو چار تھپڑوں کا پرساد دیا کرتا تھا۔

جسے نے نہ تو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا، نہ اپنے چاچا کو دیکھ کر مسکرایا...... وہ صرف ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

جب بگا جسے کے برابر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ اس کا بھتیجا اس سے بھی چار اُنگل اونچا ہو چکا تھا۔ اس کا قد اور اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر بگا دل ہی دل میں کھول اٹھا۔ جس اینٹھ سے جسا کھڑا تھا، اس کی وجہ سے تو بگے کے ماتھ کے بل دو سے بڑھ کر ایک درجن ہو گئے۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بگا ایک قدم پیچھے ہٹا اور اپنے بھاری بھرکم ہاتھ کا تھپڑ جسے کے چہرے پر دے مارا...... لیکن یہ ہاتھ جسے کے چہرے کو نہیں چھو سکا۔ جسے نے اس کے ہاتھ کو اپنے بائیں بازو پر روکا اور دائیں ہاتھ کا

اُلٹا جھانپڑا اتنی زور سے رسید کیا کہ بگا سنگھ کو محسوس ہوا، جیسے اس کی گردن، کان، کنپٹی اور جبڑے پر کوئی بھاری شہتیر آن گرا ہے۔ بگے کے پاؤں اُکھڑ گئے، جوتے ہوا میں اُڑ گئے اور وہ خود بل کھا کر جو گرا تو ڈھلان پر کچھ قدموں تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی پگڑی نے بھی اس کے سر کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ لڑھکتی ہوئی بگے سے بھی کئی قدم آگے نکل گئی۔

سب کے لیے یہ بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ بکے بکے رہ گئے۔ صرف جگیر سنگھ کے چہرے پر فخر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے لدھا سنگھ اور کرپال سنگھ سے فخریہ لہجے میں کہا:

''اپنا پٹھا بڑی تیاری میں ہے۔''

یہ کہتے کہتے جگیر سنگھ کی ٹانگیں اور چوڑی ہو گئیں۔ جب سے جسا آیا تھا، جگیر سنگھ ایک بھینس کا دودھ تو صبح شام اسی کو پلا دیتا تھا گھی اور شکر میں گندھی ہوئی گرما گرم روٹی کی چوری اسے الگ سے کھلائی جاتی تھی۔ مکھن، دہی، لسی وغیرہ الگ سے کھلائی پلائی جاتی تھی۔ جگیر سنگھ کو محسوس ہوا کہ آج جسے نے اپنا کھایا پیا حلال کر دیا ہے۔

اس ہڑبونگ میں کسی نے بگے کو اُٹھنے کے لیے سہارا نہیں دیا۔ وہ خود ہی اُٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ تب اس کے ساتھیوں میں سے ایک اس کی پگڑی اُٹھا لایا اور ایک جوتے۔

پگڑی چاہے لڑھک گئی تھی، مگر اب بھی جوں کی توں بندھی ہوئی تھی۔ بگے نے اسے سر پر رکھ لیا اور پاؤں جوتوں میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ جسا جہاں کا وہاں کھڑا رہا، اور وہ چھوٹی سی ٹولی اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔

بگے کے ایک مسوڑھے سے خون رس رہا تھا۔ صحن میں پہنچ کر اس نے انگوچھے سے منہ پر لگے خون کو پونچھا اور جگیر سے پھسپھسا کر کہا:

''چھورا (لونڈا) جوان ہو گیا ہے۔''

جگیر نے فخر سے اپنی ٹانگیں اور بھی چوڑی کر کے جواب دیا:

''کیسے نہ ہوتا، تمہاری امانت سمجھ کر میں نے اسے کھانے پینے کی کبھی کوئی کمی نہیں رہنے دی۔''

بگا سنگھ صحن کے کچے فرش پر مسوڑھوں سے نکلا خون تھوک رہا تھا تو جگیر کی بوڑھیا بولی:

''میں جلدی سے کھانا تیار کر لوں۔''

وہ کوٹھڑی کے بھیتر چلی گئی اور جگیر بگا سنگھ سے کہنے لگا:

''میں نے جسّو کو تمہارا بیٹا سمجھ کر پالا ہے۔ کہاوت ہے کہ بیٹے کو دیکھو شیر کی نظر سے لیکن کھلاؤ اسے داماد سمجھ کر۔''

لدھا سنگھ نے دیوار سے لگی ہوئی بڑی سی چار پائی کو صحن میں ڈال دیا اور بگا سنگھ کے بیٹھنے کے لیے اس پر دُھلا ہوا کھیس بچھا دیا۔

بگا بیٹھنے نہیں پایا تھا کہ جسا آرام سے چلتا ہوا صحن میں آیا۔ بگے نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

لدھے اور کرپال نے سمجھا، ممکن ہے، پھر جھپٹا جھپٹی ہوگی کیونکہ بگّے کے چہرے کی کٹھور تاجوں کی توں موجود تھی۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے دو چار پل ایک دوسرے کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔ پھر بگا غرا کر بولا:

''ویکھ! بزرگاں دی اِجت کھراب نئیں کری دی (بزرگوں کی بے عزتی نہیں کیا کرتے)۔''

جسا جوں کا توں پتھر بنا کھڑا رہا۔

بگا پھر بولا:

''سمجھے؟''

اب کے جسّو نے اپنے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ سے ہٹا کر دوسری ٹانگ پر ڈالتے ہوئے غرا کر جواب دیا:

''ہاں چاچا!''

۲

بُھجو جب ہری پورے پہنچی، تو اس کے گھر میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ سب بگا سنگھ سے ملنے آئے تھے۔ اسے وہاں نہ پا کر سب ہی کو بڑا تعجب ہوا اور ہر کوئی اپنے اپنے ڈھنگ سے شبہ ظاہر کرنے لگا۔ خاص طور پر عورتیں تو خوب کرید کرید کر باتیں پوچھ رہی تھیں۔ ایک باتونی عورت نے آ کر بُھجو سے کہا:

''بہن، سنا ہے کہ بے چارہ ابھی تک جیل میں بند ہے اور اسے چھوڑا نہیں گیا۔''

بُھجو کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

''بہن، منہ سنبھال کر بولو۔ ہمارے شریکوں نے جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر میرے اکلوتے وِیر (بھیا) کو پانچ برس تک جیل کی سیر کرائی۔ کیا اب بھی تمہارا من نہیں بھرا؟''

یہ طعنہ سن کر اس عورت نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولی:

''بگا سنگھ سے میری کوئی دشمنی تھوڑی ہے۔ خبر مشہور تھی کہ آج وہ رہا ہو کر گھر لوٹ رہا ہے مگر اس کے واپس نہ آنے پر گاؤں میں کئی طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔''

مردوں کا طرزِ فکر عورتوں سے مختلف تھا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ بگا سنگھ قید سے چھوٹ گیا تھا اور اس کے گھر نہ لوٹنے کی وجہ سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ شام کے وقت لالہ جی کی ٹولی اس موضوع پر بڑی گھمبیرتا سے وچار کر رہی تھی۔ ایک نے کہا:

''لگتا ہے کہ بگا سنگھ کچھ سہم گیا ہے۔''

دوسرے نے کہا:

''اس کا مطلب ہے کہ تم بگا سنگھ کو نہیں جانتے، وہ خوفزدہ ہونا نہیں جانتا۔''

تیسرا بولا:

''اس میں کوئی شک نہیں، مگر اس کے نہ لوٹنے کی وجہ بھی معلوم ہونی چاہیے۔''

لالہ جی نے رائے دی:

''اگر وہ یک دم سیدھا اپنے گھر کو نہیں لوٹا تو اس کا یہ مطلب نہیں لگانا چاہیے کہ وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔''

لالہ جی کی رائے گٹ کے دوسرے لوگوں کو کچھ ٹھیک ہی لگی۔ ایک نے متفق ہوتے ہوئے کہا:

''ممکن ہے، اس وقت بگے کو جھینپ لگ رہی ہو۔ جب وہ یہاں تھا تو عورت کے عشق کی گرما گرمی کی وجہ سے ڈٹا رہا۔ اب پانچ برس تک جیل میں رہنے کی وجہ سے اس کے خیالات اور نظریہ میں کچھ کچھ تو تبدیلی ہوئی ہوگی۔''

ایک اور نے رائے دی:

''ممکن ہے کہ کچھ وقت کے بعد بگا کبھی کبھی یہاں کا چکر لگانے آ جایا کرے اور پھر یہاں سدا ہی کی طرح رہنے لگے۔''

چنن سنگھ کے ٹولے میں بڑی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ دیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ پانچ برس پہلے جب بگے کو قید کی سزا سنائی گئی، تب بھی انہوں نے زوردار جشن منایا تھا۔ اب جب کہ بگا سنگھ ہری پورہ لوٹنے کی بجائے چک پیراں چلا گیا تھا، ان کے لیے ایک نئی خوشی کا موقع تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بگا سنگھ میدان سے بھاگ گیا ہے اور اس کو ہار ہوئی ہے واپس نہ آ کر گویا اس نے اپنی ہار قبول کر لی ہے۔

آج تین چار مرغوں کا جھٹکا کیا گیا تھا۔ شراب کے بعد مرغوں کے مہاپرساد کے ساتھ دعوت کا پروگرام تھا۔

چنن سنگھ شراب کا گلہڑ ہاتھ میں اٹھائے لہک لہک کر بڑھا نک رہا تھا:

''دیکھا تم نے کیسا داؤ مارا، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اگر بگے کی ہری پورہ سے جڑ تک نہ اُکھاڑ دوں، تو میرا نام چنن سنگھ نہیں۔ اب بگا سنگھ ہری پورہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔''

بال سنگھ نے قہقہہ لگا کر پوچھا:

''ارے بھئی! پیارے بگا سنگھ کی رام پیاری کہاں ہے...... کس حال میں ہے؟......''

بدھ سنگھ اس کی پیٹھ پر دھول جما کر بولا:

''اوئے ماں دے............! چنن سنگھ نے بتا تو دیا تھا کہ رام پیاری اب اطمینان سے بنارس کے رنڈی بازار میں کوٹھے پر بیٹھی دھندہ کر رہی ہے۔ چنن سنگھ نے اس شُبھ کام کے لیے اس کی مٹھی اچھی طرح گرم کر دی تھی۔ اب وہ بیٹھی موج لے رہی ہے۔''

بگا سنگھ کے واپس نہ آنے کی وجہ کو کسی حد تک شیر سنگھ ہی سمجھ پایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کی بیوفائی نے بگے کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جس ہری پورے میں رام پیاری نہ ہو، وہاں بگا سنگھ رہ کر کیا کرے گا۔ اسے یہاں کی ہر چیز رام پیاری کی یاد دلائے گی۔ اب وہ یہاں خوش نہیں رہ سکتا تھا۔

شیر سنگھ کو بگے سے ہمدردی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ چنن چالاک ہے اور اس نے بگے کی مورکھتا کا فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی میں عمر بھر کے لیے زہر گھول دیا ہے۔ اب شیر سنگھ کو بھی رام پیاری کی حقیقت کا پکا پتا چل گیا تھا مگر اس نے بگا سنگھ کو رام پیاری کا پتا بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ ایسا کر دیتا تو اس کے دو ہی نتائج نکل سکتے تھے۔ یا تو بگا سنگھ بنارس پہنچ کر رام پیاری کو قتل کر ڈالتا، یا وہیں پر رام پیاری کے چرنوں میں رہ کر اپنی ساری زندگی برباد کر لیتا۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں تھیں۔ شیر سنگھ کو آشا تھی کہ ممکن ہے کچھ اور وقت بیت جانے پر بگے کو رام پیاری کا پتا مل بھی گیا تو وہ اس بارے میں کوئی بھی قدم نہیں اُٹھائے گا۔ وہ یہ جان کر رام پیاری تو صرف بازاری رنڈی تھی اور چنن سنگھ یہ داؤ کھیلنے کے لیے اسے یہاں لایا تھا، بگے کا دل اور بھی بجھ کر رہ جائے گا۔

یہ کہنا کٹھن تھا کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، لیکن پھر بھی شیر سنگھ کی خواہش یہی تھی، کہ اب بگا سنگھ گھر بسا لے اور اپنی زندگی کو سدھارنے کی کوشش کرے۔ اسی لیے اس نے گاؤں میں کسی کو نہیں بتایا کہ بگا سنگھ کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے بھجو کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ کسی سے بھی یہ نہ کہے کہ بگا سنگھ ہری پور کبھی نہیں آئے گا۔

سارا دن آنے جانے والوں کے ساتھ سر کھپانے کے بعد رات کے وقت بھجو کو کچھ سکون ملا۔ اس وقت وہ احاطے کے طویلے میں بیٹھی تھی۔ رحیم اور حویلی رام کے علاوہ بگا سنگھ کے کچھ ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بگا سنگھ کا سواگت کرنے کے لیے بھجو کے ساتھ تو نہیں گئے تھے، البتہ انہوں نے بگے کے لوٹنے پر جشن منانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ بات سب ہی کو پریشان کیے ہوئے تھی کہ بگا سنگھ جیل سے نکل کر چک پیراں کیوں چلا گیا۔

بھجو نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ پہلے وہاں کیوں چلا گیا لیکن اس میں چنتا کی کیا بات ہے...... اسے گھر تو آنا ہی پڑے گا۔ نہ جانے اس بڑھاپے میں کب میرا دم نکل جائے...... اب چاہے وہ کچھ بھی کہے میں جلد سے جلد اس کی شادی کر ڈالوں گی۔ مرنے سے پہلے بھتیجے بھتیجیوں کا منہ تو دیکھ لوں۔"

انہیں سنانے کے لیے بھجو یہ سب کچھ کہہ تو رہی تھی لیکن بھیتر ہی بھیتر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اپنے اڑیل بھائی کو راستے پر لانا، اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ من ہی من میں شریکوں کو ہزاروں گالیاں دے رہی تھی، جنہوں نے اس کے بھائی کو نہ گھر کا رکھا نہ گھاٹ کا۔

بات چیت کے بعد بگا سنگھ کے ساتھی چلے گئے۔ بھجو نے حویلی رام کو بھی کھیتوں والے طویلے میں بھیج دیا۔ رحیم بالکل گھر کا آدمی تھا اور وہ موجودہ حالت کو بہت حد تک سمجھ بھی رہا تھا۔

بھجو نے اس کے سامنے اپنے دل کا حال کھولتے ہوئے کہا:

"میرے من کو بار بار یہی وچار ستا رہا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔"

رحیم نے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا:

"بے بے! چنتا کرنے کا کیا فائدہ، وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا، میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار جی کے جیل سے لوٹ آنے سے گھر کی ایک بہت بھاری مصیبت ختم ہوگئی۔ اب دو تین دن تک چک

پیراں جا ہی رہی ہیں...... سردار کشن سنگھ کو اپنے ساتھ لے کر ہی جایئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں مل کر سردار جی کو شادی کے لیے راضی کر لیں گے۔"

"لیکن رحیم، پہلے بگا یہاں تو آئے، اس نے گھر لوٹنے سے بالکل انکار کر دیا ہے۔"

"یہ انکار اب ساری عمر تو نہیں چلے گا۔ آپ ہمت کیوں ہار رہی ہیں۔ ایک بار کوشش کر کے تو دیکھیے۔"

جھجو گہری سانس بھرتے ہوئے بولی:

"ہاں کوشش تو میں ضرور کروں گی۔ مجھے شاید وہاں چار چھ دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں گھر کی دیکھ بھال اچھی طرح کرتے رہنا۔ دہی جمانے، بلونے کے لیے میں انتظام کر دوں گی، اوپر کا کام تم دیکھ لینا۔"

"ہاں بے بے، اب آپ جلدی سے جلدی واہ گورو کا نام لے کر وہاں پہنچ جایئے۔ جانے سے پہلے سردار کشن سنگھ سے بھی صلاح مشورہ کر لیجیے۔ اس بات کا فیصلہ کر کے جایئے کہ آپ اپنے بھیا کو شادی کے لیے راضی کر کے چھوڑیں گی۔"

"ایسا ہی ہوگا...... کشن سنگھ کو تو میں ساتھ ہی لے جاؤں گی۔"

اس بات چیت کے تیسرے دن جھجو گاڑی پر سوار ہوگئی۔ اس کے ساتھ کشن سنگھ بھی تھا۔ وہ دونوں راستے بھر بگا سنگھ کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ جھجو کو اتنی پریشانی میں دیکھ کر کشن سنگھ بار بار تسلی دے رہا تھا۔ جھجو بھی بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی:

"آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے اپنے اکلوتے بھائی کی کتنی چنتا ہے۔ برسوں سے میں اسی انتظار میں ہوں کہ وہ سدھر جائے اور عام لوگوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنے لگے۔ اب مجھ میں صبر نہیں رہا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ میں اور کس کا منہ دیکھوں۔"

اس کی حالت دیکھ کر کشن سنگھ نے من میں پکا فیصلہ کر لیا کہ وہ جس طرح بن پڑے گا، بگے کو ٹھیک راستے پر لانے کی کوشش کرے گا۔

چک پیراں پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔ گاؤں کے مکانوں کے اوپر ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے صحن میں قدم رکھا تو جسا سنگھ کے علاوہ باقی سب لوگ وہاں موجود تھے۔ جگیر سنگھ اور اس کی پتنی نے جھجو کا صدقِ دل سے سواگت کیا کیونکہ وہ وہاں کافی عرصے کے بعد آئی تھی۔

اس رات تو بگا سنگھ کو واپس لے جانے کے بارے کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ موضوع جھگڑے کا تھا اور اسی لیے کشن سنگھ نے جھجو کو منع کر دیا تھا کہ جاتے ہی ایسا کوئی جھگڑا نہیں کھڑا کرنا چاہیے۔

جسا سنگھ کھیت والے طویلے میں گیا ہوا تھا۔ اسے جھجو کے آنے کی اطلاع بھیج دی گئی، اور وہ رات کے بھوجن کے وقت گھر پہنچ گیا۔ رات بھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہی ہوتی رہیں۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ٔجھجو نے کشن سنگھ کو اشارہ کیا کہ اب وہ موضوع شروع ہوجانا چاہیے۔ رات بھر میں کشن سنگھ نے نیا منصوبہ بنالیا تھا۔ اس نے ٔجھجو کے کان میں پھسپھسا کر کہا:

''یہ موضوع بہت نازک ہے، میں سوچتا ہوں کہ اگر کھلم کھلا یہ بات اُٹھائی گئی تو، بگا سنگھ اُکھڑ جائے گا۔ اگر اسے غصہ آ گیا تو پھر اسے سمجھانا بجھانا اور بھی کٹھن ہوجائے گا۔''

ٔجھجو کے من میں شبہ اُٹھا اور اس نے پوچھا:

''آپ کا مطلب ہے کہ جس کام کے لیے میں آپ کو اتنی دور سے لائی ہوں اس کا ذکر تک نہ کیا جائے؟''

''میرا مطلب یہ نہیں ہے میں نے طے کیا ہے کہ میں خود اکیلے میں بگا سنگھ سے بات کروں گا۔ میرے خیال میں یہ مالا جلد سلجھ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تو چاہتی ہوں کہ وہ ہماری بات مان جائے...... چاہے، وہ جس طرح سے بھی مانے۔''

کشن سنگھ نے بگے سے کہا:

''آؤ ذرا کھیتوں تک ہو آئیں۔''

بگا سنگھ اس کے ساتھ چل دیا۔ گاؤں کے باہر نکل کر کشن سنگھ نے کہا:

''تمہیں مالوم ہے کہ ٔجھجو مجھے خاص طور پر یہاں کیوں لائی ہے؟''

''ہاں میں جانتا ہوں...... میں تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ ٔجھجو کا دماغ سٹھیا گیا ہے۔''

''ایسے کام نہیں چلے گا۔ میں اس مالے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں تو ٔجھجو کی ہی طرفداری کروں گا۔ اگر میں اس کے وچاروں سے متفق نہ ہوتا تو اس کے ساتھ یہاں کبھی نہ آتا۔''

بگا سنگھ بولا:

''ٔجھجو دو باتیں چاہتی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں ہری پورہ لوٹ چلوں، اور دوسری یہ کہ میں شادی کر لوں۔ میں ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کروں گا۔''

کشن سنگھ نے بگڑ کر کہا:

''جب تم ٹٹو کی طرح اڑیل بن جاتے ہو تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اب تمہاری ایسی عمر نہیں رہی کہ تم اڑیل پن کی باتیں کرو۔''

''میں نے اپنے من کی بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اڑیل پن دکھا رہا ہوں۔''

''تمہیں اپنے انکار کی کوئی وجہ بھی تو بتانی چاہیے۔''

''ہری پورے لوٹنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اس لیے میں وہاں نہیں جاؤں گا۔''

''ارے بھئی! انسان کی زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم یہاں ٹکے رہو گے تو

تمہارے دشمنوں کو بڑ ہانکنے کا موقع مل جائے گا۔"
"میں نے ان تمام باتوں کو اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میرے دشمن جو چاہیں سوچیں میں واپس نہیں جاؤں گا۔"
چلتے چلتے کشن سنگھ ایک دم رُک گیا۔ اس نے بگا سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور دوسرا داؤ چلایا:
"چلو، تمہاری ایک بات ہم مان لیتے ہیں اور ایک بات ہماری تم مان لو۔"
"کیا مطلب؟"
"میں جھجنو کو سمجھا بجھا لوں گا اور وہ تمہارے واپس چلنے پر زیادہ زور نہیں دے گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم شادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"
"نہیں، اب میری شادی اس زندگی میں تو ہو نہیں سکتی۔"
"پھر وہی بیوقوفی کی بات...... عورتیں انسان کی زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تم تو بالکل رانجھے بن گئے ہو۔ رانجھے کو تو پھر بھی ایک بھلے گھر کی لڑکی سے محبت ہوئی تھی، اور تمہاری تو نہ جانے کون تھی، افواہیں اڑ رہی ہیں کہ وہ کوئی بازاری عورت تھی۔"
"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ شادی کروں گا تو اس سے ہی کروں گا ورنہ کسی سے نہیں کروں گا۔"
اب تو ان دونوں کی بڑی گرما گرمی ہو گئی۔ آخر کشن سنگھ نے پوچھا:
"شادی سے انکار کرنا بڑی ہی غلط بات ہے۔ اس کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔"
بگے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا:
"وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے عورت ذات ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب چاہے رام پیاری بھی میرے پاؤں پر ناک رگڑے، میں اس سے شادی بھی نہیں کروں گا۔ بس تم میری اس بات سے ہی سمجھ جاؤ کہ مجھے عورت ذات سے کیسی سخت نفرت ہو گئی ہے۔ میری یہ نفرت مرتے دم تک رہے گی۔"
بگا سنگھ نے یہ الفاظ اتنے زوردار لہجے میں کہے، کہ کشن سنگھ بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ جتنا زور لگا سکتا تھا۔ لگا چکا۔ آخر میں اس نے بڑی دھیمی آواز میں سمجھایا:
"میں یہ مانتا ہوں کہ اس معاملے میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم بہن کے بارے میں سوچو۔ اس کی مجبوری کو سمجھو، اس کے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔ بڑی بہن تو ماں کی طرح ہوتی ہے اور ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے، کہ اس کا بیٹا دولہا بنے۔ دلہن کو بیاہ کر کے گھر لائے اور پھلے پھولے۔ میں یہ سب کچھ صرف جھجنو کی خاطر کہہ رہا ہوں۔"
بگا سنگھ اپنا ایک ہاتھ کمر پر جما کر بولا:
"اگر یہی بات ہے تو جھجنو جسو کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتی؟"

یکا یک کشن سنگھ کے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ ایسے حالات میں یہ سجھاؤ سب سے اچھا تھا۔ بگا سنگھ سے وہ مایوس ہو چکا تھا لیکن جسا کے بارے میں یہ سجھاؤ ایسا تھا جو جھجو کو بھی پسند آ سکتا تھا۔

کشن سنگھ نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور دھیرے سے بولا:

''اچھا، جب تم نہیں مانتے، تو میں جھجو سے جسے کے بارے میں بات کروں گا۔''

وہ گھر کو لوٹ آئے۔ جھجو بڑی بے چینی سے ان کے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی..... کشن سنگھ نے اسے زیادہ انتظار کرانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جھجو کو مکان کے پچھواڑے والی کوٹھڑی میں لے گیا اور بولا:

''سنو جھجو! اس اڑیل ٹٹو کو سمجھانا ناممکن ہے، کہاوت ہے کہ کہنے سے کمہارن گدھے پر نہیں چڑھتی۔ یہ حال بگے کا ہے۔ اسے جتنا سمجھائیں گے، اتنا ہی وہ اپنی ضد پر پکا ہوتا جائے گا۔''

یہ سن کر جھجو کے آنسو بہنے لگے۔ کشن سنگھ نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''جھجو! دنیا میں بعض باتیں ناممکن ہوتی ہیں، ان کی خاطر آنسو بہانا مورکھتا کی بات ہے۔''

جھجو نے روتے روتے پوچھا:

''اب آپ ہی کہیے نا کہ میں کیا کروں؟''

''اب اگر تم بھی بھائی کی طرح ضد نہ کرو تو میں تم سے ایک بات کہوں۔''

جھجو نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے کشن سنگھ کی طرف دیکھا بولی: ''کہیے۔''

''میری رائے یہ ہے کہ تم جسے کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے تم بیٹے کی طرح چاہتی ہو وہ بھی تمہیں بہت چاہتا ہے۔ وہ نوجوان ہے، شادی سے انکار نہیں کرے گا۔ آخر بھتیجا بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اگر نالائق بھائی نے تمہارے چاؤ پورے نہیں کیے تو تمہارا بھتیجا کرے گا۔''

''لیکن بگے کا کیا بنے گا؟''

''تم بگے کا معاملہ واہ گورو اکال پُرکھ پر چھوڑ دو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کچھ وقت گزر جانے کے بعد وہ خود ہی شادی پر راضی ہو جائے۔''

''ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں، دھیرے دھیرے سبھی زخم بھر جاتے ہیں۔ چاہے وہ جسمانی ہوں، یا دل کے لیکن ابھی تم جسے کو ہی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ وہ تمہیں بڑا خوش رکھے گا۔''

یہ بات تو جھجو کے من کو بھی بھا گئی۔ ایک شبے نے من میں سر اُٹھایا تو بولی:

''اگر اس نے بھی واپس جانے سے انکار کر دیا تو؟''

''وہ انکار کیوں کرنے لگا؟''

''آپ نہیں جانتے کہ وہ بھی بڑا ضدی ہے۔ جب بچپن میں اسے مار کر بگے نے یہاں ہری پورے سے بھجوایا تھا، تو اس نے بھی قسم اٹھائی تھی کہ وہ بھی کبھی ہرے پورے واپس نہیں لوٹے

گا۔ پچھلے چھ برسوں میں وہ ایک بار بھی ہری پورے نہیں گیا۔ میں ہی سال چھ مہینے میں اسے یہاں ملنے آ جاتی ہوں۔ اگر میں کبھی اسے واپس چلنے کو کہتی تو وہ چاچے کی طرح اڑیل پن سے انکار کر دیتا تھا۔"

"پہلے سے ہی اُلٹی سیدھی باتیں مت سوچو۔ بھوجن کے وقت تک جسا کھیتوں سے لوٹ آئے گا۔ تب ہم اس موضوع کو چلائیں گے۔"

دن کے بھوجن کے وقت جسے سمیت سب لوگ گھر میں موجود تھے۔ کشن سنگھ نے من میں طے کر رکھا تھا کہ بھوجن ختم ہوتے ہی وہ اس موضوع کو چھیڑے گا۔ اس نے ٹھجو پر یہ بات بھی نہیں ظاہر ہونے دی کہ یہ سجھاؤ اس میں بگے نے ہی دیا تھا، کیونکہ اس طرح ٹھجو کے بھڑک جانے کا ڈر تھا۔

بھوجن کے بعد جب سب کلّا وغیرہ کر چکے تو کشن سنگھ نے بگے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ایک بات مجھے سوجھی ہے، جس کا ذکر میں ٹھجو سے کر چکا ہوں۔ اگر اس پر سب متفق ہو جائیں، تو ہمارا یہ پیچیدہ مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے۔ ویسے کچھ دیر پہلے میں ٹھجو کو اپنی یہ تجویز بتا چکا ہوں۔ اس نے میرا کہنا مان لیا ہے......"

بگا تو اصلی بات کو سمجھتا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا:

"کشن سنگھ اگر ٹھجو کو تم نے کسی بات پر راضی کر لیا ہے تو بھلا مجھ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی میری بات تو سن لو۔"

"کہو۔"

"میں نے ٹھجو بہن کو سجھاؤ دیا ہے کہ اگر تم ہری پورے جانے کو تیار نہیں ہو تو وہ جسے کو اپنے ساتھ لے جائے۔"

بگا جلدی سے بولا:

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے بارے میں میری جو مجبوری تھی، سو میں نے سنا دی۔ لیکن اگر کسی اور ڈھنگ سے میری بہن خوش ہو سکتی ہے تو میں اسے پورا تعاون دوں گا۔ جسا اب سمجھ دار ہو گیا ہے اور مجھے وشواس ہے کہ وہ ہری پورے کا کام کاج سنبھال لے گا۔"

ٹھجو بولی:

"اس میں اڑچن یہ ہے کہ جسا بھی تو ہرے پورے جانے کو تیار نہیں ہے۔ جب تم جیل میں تھے تو نہ جانے کتنی بار میں نے اس سے ہری پورے چلنے کو کہا، مگر اس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔"

بگے نے پوچھا:

"آخر اسے ہری پورے جانے میں کیا اعتراض ہے؟"

بگے کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹھجو نے کہا:

''یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے اسے مار پیٹ کر جب ہری پورے سے نکالا تھا، تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔''

بگا بولا:

''اگر جسے کو یہی ضد ہے تو اس کا علاج بہت ہی آسان ہے۔ بے شک میں نے اس وقت منع کر دیا تھا لیکن اب میں کہتا ہوں کہ اسے منع کر کے میں نے جھک ماری۔ وہ بے شک ہری پورے چلا جائے۔ لیکن اگر میرے منع کر دینے کی وجہ سے اسے وہاں جانے پر اعتراض ہے، تو اب میرے کہنے سے واپس جا بھی تو سکتا ہے۔''

کشن سنگھ جسے کی طرف دیکھ کر بولا:

''لو جسے، اب تو تمہارا چاچا کہہ رہا ہے کہ میں نے جسے کو واپس آنے سے منع کر کے جھک ماری۔ میرے خیال میں اب تمہیں بُوا کے ساتھ واپس لوٹ جانا چاہیے۔ اسی میں بُوا کی خوشی ہے اور اسی میں میری اور تمہارے چاچا کی خوشی ہے۔''

جسے کا چہرہ جوں کا توں کٹھور بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ من ہی من کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بگا اب چک پیراں میں ہی رہے گا اور وہ خود چاچا کے ساتھ رہنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔ بُوا کے ساتھ رہنا کہیں بہتر تھا۔ جس چاچے نے منع کیا تھا، آج وہی کہہ رہا تھا، کہ اس نے جھک ماری۔ اب اگر وہ لوٹ بھی جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا............ اسے اس طرح چپ دیکھ کر کشن سنگھ بولا:

''کچھ تو کہو بیٹا! تم بھی چاچے کی طرح ضد مت کرنا۔ اس مسئلہ کا آخر کچھ تو حل ہونا ہی چاہیے۔''

اب جسے نے دھیمے اور بھاری آواز میں کہا:

''میں بُوا کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔''

اس کی یہ بات سن کر سب لوگوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خاص کر جھنو بہت خوش ہوئی۔ اس نے جسے کے قریب پہنچ کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:

''تُو تو میرا بڑا اچھا بیٹا ہے...... ہم کل صبح ہی یہاں سے چل دیں گے۔ تُو اپنا سامان آج ہی اکٹھا کر لے۔''

''اچھا بُوا!''

کشن سنگھ نے کہا:

''واہ بھئی واہ! بڑی مشکل سے یہ مسئلہ حل ہوا۔''

اس رات جسے کو بڑی دیر سے نیند آئی۔ وہ ہری پورے کے بارے میں سوچ رہا، جسے چھوڑے ہوئے اس کو لگ بھگ چھ برس ہو چکے تھے۔ وہ وہاں کے گلی کوچوں، کھیتوں اور رہٹوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ پھر نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ ایک پہر رات ابھی باقی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا، جیسے کسی نے

اسے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔

آنکھوں سے نیند دُور ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بُوا اس کے قریب کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی:

''بیٹے جسے، اب اٹھو! ہمیں جلدی جلدی ناشتہ کر کے یہاں سے چل دینا ہے۔ پراٹھے بن رہے ہیں تم بھی کپڑے وپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔''

اتنا کہہ کر بُوا چلی گئی۔ جسا پاؤں نیچے لٹکا کر بستر پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے اپنی بانہیں پھیلا کر لمبی انگڑائی لی۔

اتنے میں ہی اسے نے چاچا کو بھیتر قدم رکھتے دیکھا۔ اسے ذرا عجیب سا لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے چاچا اس سے کوئی بات کرنے آیا ہے۔

اس کا یہ خیال ٹھیک نکلا۔ چاچے نے ہری پورہ کی زمین، وہاں کی پیداوار اور اپنے شریکوں کے بارے میں اسے سارا اُونچ نیچ سمجھا دیا۔

باتیں ختم ہو گئیں، تو جسا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر جانے لگا تو چاچے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ رُک گیا تو چاچا بولا:

''تم سے ایک بات اور بھی کہنی ہے۔''

جسا خاموش رہا۔

بگے نے کہنا شروع کیا:

''اب تم جوان ہو گئے ہو...... اس عمر میں انسان کے دماغ میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ میں تم سے اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تم کسی مصیبت میں نہ پڑنا۔''

جسّے کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ چاچے کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چاچا پھر بولا:

''میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ عورت کی محبت کے جال میں پھنسنے سے زیادہ اور کوئی بیوقوفی ہو ہی نہیں سکتی۔ تمہارا جو جی چاہے سو کرنا، لیکن عشق وِشق کے چکر میں نہ پھنسنا، سمجھے؟ میری بات یاد رہے گی؟''

''ہاں چاچا!''

۳

کشن سنگھ اور ٗجھجو ریل گاڑ میں بیٹھ کر اُسی دن ہری پورے پہنچ گئے۔ مگر جسا ان کے ساتھ نہیں آیا۔ جسّے نے گاڑی پر سفر کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا ایک بہت ہی پیارا اور طاقتور گھوڑا تھا، جسے وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ طے کیا کہ وہ گھوڑے پر ہی سفر کرے گا۔ پہلے وہ لائلپور سے لاہور جائے گا، ایک رات لاہور میں کاٹے گا اور دوسرے دن لاہور سے شیخوپورے اور شیخوپورے سے اپنے گاؤں ہرے پورے پہنچ جائے گا۔

جسّے کو گھوڑے اس لمبی یاترا میں بڑا مزہ آیا۔ اب وہ ایسے ہری پورے میں جا رہا تھا، جہاں اس کے سر پر چاچے کا جوتا نہیں ہوگا۔ وہ وہاں کے سیاہ سفید کا مالک ہوگا اور اپنی مرضی کا بھی مالک ہوگا۔

چاچے نے جو اسے اُونچ نیچ سمجھایا تھا وہ سب اسے یاد تھا۔ ناری پریم کے تعلق میں چاچے کی آخری نصیحت بھی اسے یاد تھی......لیکن اس نے فیصلہ کر رکھا کہ ہری پورے پہنچنے پر سب سے پہلے وہ اپنے چاچا کی آخری نصیحت کی خلاف ورزی کرے گا۔

وہ دیپی کو بھولا نہیں تھا۔ اسے وشواس تھا کہ وہ بھی اسے نہیں بھولی ہوگی......اور اگر وہ بھول بھی گئی ہوگی تو وہ اس کی چٹیا کھینچ کر سب کچھ یاد دِلا دے گا اور اگر دیپی نے اس کے ساتھ وہ سلوک کرنے کی کوشش کی، جو رام پیاری نے اس کے چاچا کے ساتھ کیا تھا، تو وہ دیپی کا خوبصورت سا گلا کاٹ کر اس کا سر نہر میں پھینک آئے گا اور دھڑ کسی ایسی سنسان جگہ پر چھوڑ آئے گا، جہاں چیل، کوّے اور گدھ اس کے جسم کی سندر سندر بوٹیاں کاٹ کر کھا سکیں۔

وہ آکاش میں اُڑتے ہوئے باز کی سی تیزی کے ساتھ پنجاب کے ہرے بھرے میدانوں میں گھوڑا دوڑاتا ہوا رات کے وقت لاہور جا دھمکا۔ حالانکہ آدھی رات بیت چکی تھی۔ وہ سیدھا گوردوارہ ڈیرہ صاحب میں جا کر رُکا۔ وہاں کے ایک سیوادار کو کچھ پیسے دے کر اس نے گھوڑے کے دانے پانی کا انتظام کر دیا۔ گوردوارے کے لنگر سے بچی کھچی روٹیاں اور چنے کی ارد کی دال کھا کر کچھ گھنٹوں کے لیے سو گیا۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی جاگ اُٹھا۔ نہا دھو کر شری گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ کچھ دیر تک اس نے پوتر وانی کا پاٹھ سنا۔ یہ وانی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن گورو کی وانی کو پوتر مان کر وہ بڑے ادب احترام سے اسے سن لیا کرتا تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ راوی ندی کے پل کے اس پار ایک سڑک گوجرانوالے کو جاتی تھی اور دوسری شیخوپورے کو جاتی تھی۔ وہ لگام کو ہلکا سا جھٹکا دے کر شیخوپورے والی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ دوپہر ہونے تک اس نے بیس میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ شیخوپورے کے ایک ڈھابے میں اس نے بھوجن کیا۔

ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور ابھی سورج اُفق سے ایک ڈیڑھ ہاتھ اُونچا ہی تھا، جب اسے گاؤں کی ادھر والی نہر کی پٹڑی دکھائی دینے لگی۔

ایک بار تو وہ بالکل ٹھٹھک کر رہ گیا......اور پھر بہت دھیرے دھیرے نہر کی طرف بڑھا۔

پٹڑی پر پہنچا تو ساری نہر کو خالی دیکھ کر اسے کچھ بھی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس وقت تک عورتیں کپڑے دھو اور سکھا کر واپس چلی جاتی تھیں۔ اس نے نہر پر گھوڑے کو پانی پلایا، ایک کپڑے سے اس کی چاروں ٹانگوں کی دھول پونچھ ڈالی۔ اس نے خود بھی منہ اور ہاتھ پاؤں دھو ڈالے، کپڑے بدلے اور ٹین کے چوکھٹے والا چھوٹا سا شیشہ سامنے رکھ کر کلف لگی پگڑی سر پر باندھی۔

اس طرح تیار ہو کر اس نے پیدل ہی نہر کا پُل پار کیا۔ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ اب گاؤں تک پیدل ہی جانے کا ارادہ تھا۔ اس طرح وہ جانی پہچانی جگہوں کا مزہ لے سکتا تھا۔

کچھ دُوری پر ایک لڑکی کھیتوں کی منڈیروں پر سے سوکھے کپڑے اُٹھا کر اب ان کی تہہ جما رہی تھی۔ شاید وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی کیونکہ وہ کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ جسّے کی ٹانگیں لمبی ہونے کی وجہ سے اس کے قدم بھی بڑے بڑے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس لڑکے سر پر پہنچ گیا۔ نہ جانے لڑکی بھی کیوں رُک گئی۔ پل بھر کو جسّے کے دماغ میں یہ وچار بجلی کی طرح کوند گیا کہ کہیں وہ دیپی تو نہیں۔ جب قریب سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو جسّے کو وشواس ہو گیا کہ وہ دیپی نہیں ہو سکتی۔ دیپی تو بچپن میں ہی بڑی خوب صورت تھی اور اب تو اس نے بھر پور جوانی اور نیا روپ نکالا ہو گا۔

اس نے لڑکی کے قریب سے چپ چاپ آگے بڑھ جانا چاہا لیکن لڑکی نے خود ہی پہل کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا تم جسا سنگھ ہو؟''

جسّے کے قدم رُک گئے، وہ پل دو پل لڑکی کو گھورتا رہا، پھر بھی اسے نہیں پہچان پایا، تو بولا: ''ہاں!''

لڑکی ہنس دی:

''میں پہچان گئی نا تمہیں۔''

''تم کون ہو؟''

''میرا نام اللہ دِتی ہے۔ میں عبداللہ ارائیں کی بیٹی ہوں۔''

جسّے کو اب بھی کچھ یاد نہ آیا۔ بولا:

''تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟''

''تمہاری بُوا نے چک پیراں سے لوٹ کر گاؤں بھر میں یہ بات مشہور کر دی ہے، کہ تم آج یہاں پہنچنے والے ہو، تمہاری شکل اور ڈیل ڈول سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم ضرور ہی جسا سنگھ ہو۔ تمہیں یاد تو نہیں ہو گا کہ ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔''

جسا سنگھ اللہ دِتی کو پہچان نہیں پا رہا تھا اور نہ اسے یہ یاد آ سکا کہ بچپن میں وہ اس کے کھیلا کرتا تھا۔

اسے الجھن میں دیکھ کر اللہ دِتی نے کہا:

''ہمارے ساتھ دیپی بھی ہوا کرتی تھی۔ تم کتوں کے ساتھ خرگوشوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ ہم لوگ نہر پر نہانے بھی جایا کرتے تھے۔''

اپنی بات بیچ میں ہی توڑ کر اللہ دِتی نے سر گھمایا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے نہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہاں ایک بار دیپی کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا، اور تم نے ایک لمبے سے کانٹے سے چبھے ہوئے کانٹے کو نکال دیا تھا.....''

یہ سب باتیں تو اسے یاد آ گئیں، لیکن اللہ دتی کی بچپن کی صورت یاد نہ آ سکی۔ جسّے نے محسوس کیا کہ اللہ دتی کو پہچاننے سے انکار کرنے میں اس کا اپنا نقصان تھا۔ وہ دیپی کی بے تکلف سہیلی تھی اور وہ اسی کے ذریعے دیپی کو پیغام بھیج سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے پینترہ بدل کر کہا:

''ہاں اللہ دتی! اب مجھے یاد آ گیا کہ ہم لوگ کیسے کیسے کھیل کرتے تھے..... آج کل دیپی کہاں ہے؟''

وہ جانتا تھا کہ دیپی گاؤں میں ہی تھی لیکن بات چیت چالو کرنے کے لیے اس نے پوچھا:

''گاؤں میں ہی رہتی ہے۔''

''اب تو اس کی شکل بھی بالکل بدل گئی ہوگی۔ جیسے میں تمہیں نہیں پہچان پایا، اسی طرح اسے بھی نہیں پہچان پاؤں گا۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ اب تو وہ خوب لمبی اور جوان ہو گئی ہے۔ اس کا مکھڑا بالکل چاند سا لگتا ہے۔ اس کی سندرتا اور جوانی کی تو دھوم مچی ہوئی ہے۔ علاقے بھر کے نوجوان ہتھیلی پر دل رکھ کر اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔''

جسّے کو یہ بات اچھی نہیں لگی، ماتھے پر بل ڈال کر بولا:

''کون لوگ ہیں؟''

اللہ دتی اب ماشاء اللہ خود بھی جوان تھی۔ جسّے کے من کی حالت سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ بولی:

''کوئی ایک آدھ ہو تو نام بھی بتاؤں..... مگر ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔''

جسا جاننا چاہتا تھا کہ کیا دیپی بھی کسی کو پسند کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ سوال کرنے میں اسے تردّد تھا۔ اس نے اس بات کو دوسرے ڈھنگ سے پوچھا:

''اللہ دتی! تم نے تو مجھے فوراً پہچان لیا، کیا دیپی بھی مجھے پہچان جائے گی؟''

''جب وہ تمہیں بھولی ہی نہیں، تو پہچانے گی کیوں نہیں؟''

یہ سن کر جسّے کا دل زور سے اُچھل پڑا۔ وہ اللہ دتی سے بڑا خوش ہوا۔

اللہ دتی کافی چالاک لڑکی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے ایک اُچٹتی ہوئی نظر جسّے کے چہرے پر ڈالی اور پھر دبی آواز میں بولی:

''دیدی تمہارے بارے میں بہت سی باتیں بتایا کرتی ہے۔''

''کیا باتیں؟''

''یہی کہ تم چھٹپن میں اسے گود میں بٹھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی اس سے چپک جاتے تھے اور اس کے گالوں پر ہونٹ رکھ دیتے تھے..... کیا تم نے یہ باتیں اپنے چاچا سے سیکھی تھیں؟''

اللہ دتی نے جسّے کے ساتھ ہی اُس کے چاچا کی پوزیشن بھی خراب کر دی تھی۔ ہر بڑاہٹ میں اس کے منہ

سے نکل گیا۔ ''چاچا؟''

''یہ بات تو اب تک یہاں مشہور ہے کہ تمہارے چاچا کی رام پیاری نامی عورت سے یاری تھی، اسی کے پیچھے اسے پانچ برس کی قید ہوئی.....''

جسّے نے ٹالتے ہوئے کہا:

''چھوڑو ان باتوں کو..... میں تو ان دنوں چھوٹا تھا، میں کبھی ان باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔''

اللہ دتی نے اپنی پتلی سی اُنگلی اوپر کو اُٹھا کر آنکھیں نچاتے ہوئے کہا:

''لیکن تم دیپی کی طرف تو دھیان دیتے تھے۔ اب بھی اسے چاہتے ہونا..... دیکھو، ہم سے جھوٹ مت بولنا..... ہاں۔''

جسّے کی طبیعت میں چنچلتا نہیں تھی، لیکن اس وقت اس کا واسطہ چنچل لڑکی سے ہی پڑا تھا۔ وہ اتنا کھلم کھلا یہ قبول نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی دیپی سے پریم کرتا تھا۔

اس نے بھی بات گھماتے ہوئے کہا:

''یہ باتیں جو تم مجھ سے پوچھ رہی ہو، کیا کبھی اپنی سہیلی دیپی سے بھی پوچھا ہے؟''

''اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ اس کے من کا حال تو میں بھلی بھانت جانتی ہوں۔ جس کی خاطر تمہاری اتنی پٹائی ہوئی، بھلا وہ تمہیں کیسے بھول سکتی ہے۔''

اللہ دتی کا پٹائی والی بات یاد دلانا جسّے کو اچھا نہیں لگا۔ اللہ دتی تو مزہ لینے پر تُلی ہوئی تھی۔ بولی:

''آخر تمہارے چاچا نے تم لوگوں کو کیا کرتے دیکھا تھا؟''

''عجیب لڑکی ہو، ہم اس وقت بہت چھوٹے تھے، آخر چاچا ہمیں کیا کرتے دیکھ سکتا تھا؟''

اللہ دتی نے شرارت سے پوچھا: ''بتاؤں؟''

جسّے نے بُرے دل سے کہا: ''بتاؤ نا۔''

''تم.....''

اللہ دتی کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ دوہری ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار تو جسّے کا جی چاہا کہ اس بدتمیز لڑکی کو اُٹھا کر نہر میں پھینک دے لیکن وہ بڑے کام کی لڑکی تھی۔ ایک طرح اس کی راز دار بھی تھی۔ جسے نے بدمزاجی ظاہر کرنے کی بجائے ذرا مسکرا کر کہا:

''تم تو جانتی ہی ہو کہ اس عمر میں عقل کچی ہوتی ہے..... کئی بیوقوفی کی حرکتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ بیتی باتوں کو کُریدنے کا کیا فائدہ۔''

''ٹھیک ہے، چھوڑ و بیتی باتوں کو.....مگر دیکھو، اب کوئی ایسی ویسی حرکت مت کر بیٹھنا۔''

''ہم دونوں کی ملاقات تک ہوئی نہیں اور تمہیں پشو بھی پڑ گئے۔''

''ملاقات بھی ہو جائے گی، گھبراتے کیوں ہو؟''

''نہیں میں گھبرا نہیں رہا ہوں.....مگر تم اسے اتنا تو بتادو گی کہ میں گاؤں میں آ گیا ہوں۔''

''اسے یہ تو معلوم ہے کہ آج تم گاؤں پہنچ رہے ہو۔''

''مالوم ہے کیسے؟''

''بتایا نا تمہاری بُوا نے سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔''

''تو پھر اب تم اسے کہہ دینا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔''

''بتادیں گے۔''

''یہ بھی کہنا کہ میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ارے بھئی، ملاقات بھی کرادیں گے.....اور بول!''

''لیکن ہم کہاں مل پائیں گے؟''

''کل گوردوارے میں تہوار ہوگا، وہاں ملاقات کر لینا۔''

''وہاں تو بہت لوگ ہوں گے.....گوردوارے سے کہیں باہر ملاقات نہیں ہو سکتی؟''

''کیوں نہیں.....لیکن جگہ بھی تو بتاؤ۔''

''قبرستان کے پاس وہ ایک بوڑھا نالہ تھا نا.....''

''ہاں، وہ تو اب بھی ہے۔''

''بس تم دیپی کو وہاں بھیج دینا۔''

''کس وقت؟''

''کل بھور کا تارہ نکلنے سے پہلے ہی میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ وہ اسی وقت آئے تو اچھا ہے۔ اندھیرے میں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اپنے آزار بند کو گانٹھ لگالو.....تاکہ کہیں بھول نہ جاؤ۔''

''اجی، یہاں تو دل میں گانٹھ لگ گئی ہے، بھولنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔''

جسّے نے سوچا، کہ گاؤں تک کا باقی راستہ اسے اللہ دِتی کے ساتھ طے نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اللہ دِتی سے وِداع ہو کر گھوڑے پر بیٹھ گیا اور ایڑ لگا کر اس سے بہت آگے نکل گیا۔

گاؤں کے سامنے والے میدان میں لڑکوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ ان میں سے کچھ کبڈی کھیل رہے تھے اور کچھ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ جسا ان کے قریب پہنچا تو وہ کھیل روک کر اس نئے گھوڑ سوار کو دیکھنے لگے۔

جسا اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ اسے کچھ نوجوان بھی دکھائی دیئے۔ اس نے سوچا کہ ان میں وہ بھی ہوں گے جو اس کے زمانے میں صرف لڑکے تھے اور اب ان کے جوان ہو جانے پر انہیں پہچان بھی نہیں پا رہا تھا۔

وہ اَحاطے کے چوڑے اور اونچے دروازے میں سے گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا بھیتر گھس گیا۔ اَحاطے کی پَرلی دیوار کے قریب اسے رحیم دکھائی دیا، جو بھینسوں کے لیے سانی کر رہا تھا۔ ان چھ برسوں میں رحیم دو چار بار نُھجو کے ساتھ جا کر چک پیراں میں اس سے مل چکا تھا۔ لیکن آج وہ ایک ڈیڑھ سال بعد مل رہے تھے۔ رحیم کو نُھجو کی زبانی جسّے کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اب جسا سنگھ گھر کے مالک کی حیثیت سے آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے جسّے کو گھوڑے اُترتے دیکھا تو لپک کر گھوڑے کی لگام تھامنے کو بڑھا اور بولا:

''ست سری اکال سردار بہادر!''

''ست سری اکال...... ٹھیک ہو؟''

جسّے کی آواز سپاٹ تھی لیکن رحیم کو اس کی آواز بڑی رُعب دار لگی۔ جسّے کی طرف دیکھا تو اس کا منہ سختی سے بند تھا۔ رحیم کو کچھ اور کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے کو لے کر کھونٹے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ پلوں کے لیے جسا جہاں کا وہاں کھڑا رہا۔ بیتی باتیں جیسے زبردستی اس کے دماغ میں گھس آئی تھیں۔ اسے اس جگہ کو دیکھ کر اپنے جیون کا دُکھی باب یاد آ گیا۔

اس نے دھیرے دھیرے مکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اب اسے دروازے میں سے جھک کر بھیتر گھسنا پڑا۔ نُھجو صحن والے چولہے کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھی اور بولی:

''ارے آ گئے جسّے۔''

جسّے نے بُوا کے پاؤں چھوئے تو نہیں، صرف ذرا جُھک کر اس کی طرف دونوں ہاتھوں سے جیسے اشارہ کر دیا۔ بُوا نے اسے یوں آشیرواد دیا، جیسے وہ برسوں کے بعد ملے ہوں۔ بولی:

''میں یہاں چلی تو آئی، مگر من میں یہی دھڑکا لگا رہا کہ دیکھیں تُو یہاں آتا ہے یا نہیں۔''

''اس میں شک کی کیا بات تھی بُوا؟ میں نے کہہ تو دیا تھا کہ میں گھوڑے پر آؤں گا۔''

''سو تو ٹھیک ہے پھر بھی میرا خوف تو بنا رہا کہ نہ جانے کب اپنے چاچا کی طرح تیری نیت بدل جائے۔''

''تو کیا میں چاچے کی طرح ہوں؟''

''ہاں، اسی کی طرح لمبا چوڑا اور اڑیل مزاج کا ہے تُو۔''

''لیکن بُوا، جب میں کسی سے کوئی وعدہ کر لیتا ہوں تو اسے پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تُو اپنے چاچے والی عادتیں اپنا لے۔''

جسا اطمینان سے رسوئی کی چوڑی منڈیر پر بیٹھتے ہوئے بولا:

''چاچے کی کوئی خاص، عادت ہے، جو تمہیں پسند نہیں؟''

''اس میں اچھی عادت ہی کون سی ہے...... اور یہ عورتوں والا جھنجٹ تو بڑا ہی خراب ہے۔ نہ جانے اس طرح کے مردوں کی عقل میں کون سا کیڑا گھس جاتا ہے۔ مَیں کہتی ہوں کہ مرد سیدھے سیدھے شادی کر کے گھر کیوں نہیں بسا لیتے...... بجائے اس کے کہ عورتوں سے یاری گانٹھتے پھریں......۔''

بُوا کی اس بات پر جسّے کے من میں گدگدی پیدا ہوئی۔ اسے دیپی کا خیال آ گیا۔ بُوا اس کے چُپ رہنے پر ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ یک دم چونک کر بولا:

''بُوا ٹھیک ہی تو کہتی ہو۔''

بُوا ہنس دی،.......... اور پھر بولی:

''ارے! میں تو بھول ہی گئی...... تجھے بھوک لگی ہوگی۔ روٹی پکانے میں دیر ہے، تھوڑا دودھ ہی پی لے۔''

''لاؤ۔''

دھرتی کی سطح کے نیچے بنی ہوئی انگیٹھی کا گول مٹمیلا ڈھکن اُٹھا کر جھجو نے بھیتر رکھی مٹی کی ہانڈی کو باہر نکالا۔ اُپلوں کے ہلکے سینک کی وجہ سے دودھ مزے کا گرم تھا۔ صبح کا رکھا ہوا یہ دودھ پک پک کر بھورے رنگ کا ہو چکا تھا اور اس کے اوپر ملائی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ تین پاؤ کا چھنا (کٹورہ) جھجو نے لبالب بھر دیا اور لکڑی کی کڑچھی سے دو تین چھٹانک ملائی اُٹھا کر اس پر ڈال دی۔ پھر وہ بھیتر کو چلی۔

جسّے نے دونوں ہاتھوں سے چھنا اُٹھا لیا۔ جھجو بولی:

''بھیتر سے شکر اُٹھا لاؤں۔''

رہنے دو بُوا! مجھے کڑھا ہوا دودھ بنا شکر کے ہی اچھا لگتا ہے۔''

جھجو واپس لوٹ آئی اور پھر اَحاطے والے دروازے میں جا کر زور زور سے چلانے لگی:

''رحیما؟.......... وے رحیما......!''

دُور سے رحیم کی آواز سنائی دی اور پھر وہ اَحاطے میں دکھائی دیا۔ جھجو بولی:

''آج رات کو روٹی یہاں کھانا، جسا آیا ہے کچھ گپ شپ رہے گی۔''

رحیم کو یہ بات پسند آئی، کیونکہ اسے جھجو کے بنے ہوئے پراٹھے بہت اچھے لگتے تھے، اور کڑاہ (حلوہ) تو اسے اور بھی مزیدار لگتا تھا۔ زور سے چلّا کر بولا:

''ضرور کھاؤں گا...... لیکن بے بے، کڑاہ ضرور بنانا۔''
جھجو انگوٹھا دکھا کر بولی:
''ٹھینگا!...... کڑاہ پر کیسی رال ٹپکتی ہے تیری۔''
رحیم بغلیں بجاتا ہوا بھینسوں کی طرف بھاگ گیا۔
وہ لوٹی، تو جسا دودھ ختم کر کے مونچھیں پونچھ رہا تھا۔ جھجو کہنے لگی:
''آج تُو آیا ہے نا، اس رحیم کو وشواس ہے کہ کڑاہ ضرور بنے گا۔''
جسا رسوئی کی منڈیر سے اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا:
''بُوا! تم کنجوسی نہ کیا کرو۔''
''ہاں رے، میں نے ایسی کون سی کنجوسی کی ہے۔ تُو تو اُلٹی ہی بات ہی کہہ رہا ہے۔ تیرا چاچا کہا کرتا تھا کہ میرا ہاتھ بہت کھلا ہے...... اور تُو مجھے کنجوس بتاتا ہے۔''
''میں چاہتا ہوں کہ تُو رحیم کو پیٹ بھر کر کڑاہ کھلا دے۔''
''وہ جب کھاتا ہے، پیٹ بھر کر ہی کھاتا ہے۔ کڑاہ کھانے میں وہ بالکل کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔''
''تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اتنا کڑاہ کھا کر بھی اس کا من نہیں بھرے گا۔''
''ارے چھورے (چھوکرا)! تُو یہ کیوں نہیں مانتا کہ میرا بنایا ہوا کڑاہ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ اسے کھا کر کسی کا جی بھر سکتا ہی نہیں۔''
رات بھوجن کے بعد تینوں کی محفل جمی، جھجو خوش ہو کر بولی:
''گھر کتنا سُونا رہتا تھا۔ آج جسے کے آجانے سے گھر بھرا بھرا لگتا ہے۔''
رحیم کے منہ میں اب بھی کڑاہ کا ذائقہ آرہا تھا۔ اس لیے وہ بھی خوش تھا۔ بولا:
''بے بے، رونق تو تب ہو گی، جب جسے کی دُلہن آئے گی، اور کچھ ہی برسوں میں کئی بھوجنگی (بچے) سارے گھر میں ہڑدنگ مچاتے پھریں گے۔''
یہ سُن کر تو جھجو بالکل ہی مخمور ہو گئی۔ کہنے لگی:
''تیرے منہ میں گھی شکر، میں تو یہی چاہتی ہوں، اب آگے جسے کے ہاتھ میں ہے۔''
رحیم بولا:
''جسے کے ہاتھ میں کیا ہے؟ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جسا تو فرمانبردار بیٹا ہے۔ جو آپ کہیں گی، سو ہی کرے گا۔''
''فرمانبردار تو بگّے کو بھی ہونا چاہیے تھا۔ چھوٹا بھائی بیٹا ہی تو ہوتا ہے مگر اس کے کارنامے تو تُم نے دیکھ لیے۔ اسی لیے تو جسے سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ شادی سے انکار نہ کر دے۔''
رحیم نے جواب دیا:

''اب آپ اگر اس سے زبردستی انکار کروانا چاہتی ہیں، تو الگ بات ہے..... ورنہ اسے کوئی اعتراض ہوتا، تو چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا۔''

جسا خاموش رہا۔

بھجو بولی:

''بیٹا! کچھ تو بولو!''

جسے نے اپنے کسے ہوئے جوڑے کو ذرا ڈھیلا کر کے کہا:

''میرے بارے میں بیکار کی چنتا مت کرو بُوا!.....لیکن ابھی تو کام کاج سنبھالنا ہے۔ یہ سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے، تو دُوسری باتوں کو بھی سوچا جائے گا۔''

رحیم نے ہاں میں ہاں ملائی:

''چھوٹے سردار کی اس بات سے تو مَیں بھی متفق ہوں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ چھوٹے سردار کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔''

بھجو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو آپس میں پھنسا کر بولی:

''کیوں رے رحیم! کیا اب تُو جسے کو چھوٹا سردار کہا کرے گا؟''

''کیوں نہیں، بڑے سردار جی تو چک پیراں جا پہنچے اور اب یہی تو ہمارے مالک ہیں۔''

بھجو جسے سے کہنے لگی:

''بیٹا! رحیم کو تُو چاچا ہی کہنا۔ آخر تجھ سے بڑا ہے اور ہم نے بھی کبھی اسے نوکر کی طرح نہیں مانا ہے۔''

جسے کے ہونٹوں پر بہت ہی ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''اچھا تو رحیم چاچا، اب گاؤں والوں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اتنے برسوں میں لڑکے جوان ہو گئے ہوں گے اور کچھ لوگ جو اس زمانے میں جوانی کی آخری حد پر تھے، اب ادھیڑ ہو چکے ہوں گے۔''

''ہاں چھوٹے سردار، اب تو آپ کو گاؤں کا پورا نقشہ سمجھانا پڑے گا۔ پہلے تو اس شخص کے بارے میں سُنو، جو آپ کے خاندان کا سب سے بڑا دُشمن ہے۔''

جسا فوراً ہی بول اُٹھا:

''تمہارا اشارہ چنن سنگھ کی طرف ہے؟''

''ہاں! اب تو دُنیا جان گئی ہے کہ ہمارے بڑے سردار کے بھولے پن اور چنن سنگھ کی چالاکی کی وجہ سے اس گھر پر کتنی بڑی مصیبت آئی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے، چھوٹے سردار کہ چنن سنگھ آپ کو دیکھ کر ذرا خوش نہیں ہوگا۔ اس کے سینے پر تو سانپ لوٹ جائے گا۔''

''اس کے کچھ لڑکے بھی تو تھے؟''

''جی ہاں، اس کا بڑا لڑکا تو عمر میں ڈیڑھ پونے دو سال زیادہ ہوگا۔ اس سے چھوٹا آپ کی عمر کا ہو گا۔ بڑے کا نام لکھن سنگھ اور چھوٹے کا نام دلیر سنگھ ہے۔ ان دو بھائیوں کے بعد دو لڑکیاں ہیں، جو جلد ہی شادی کے قابل ہو جائیں گی۔ ان دو لڑکیوں سے بھی چھوٹا ایک اور لڑکا ہے، جس کا نام سندر سنگھ ہے اور عمر دس سال ہے۔''

''یہاں پر ایک سردار شیر سنگھ بھی تو رہتے ہیں؟''

''ہاں، وہ بھلے آدمی ہیں۔ ان کے بھی دو لڑکے ہیں۔ لیکن ابھی بڑا والا پندرہ سال کا ہی ہے۔ سب سے بڑی لڑکی ہے جس کا نام دلجیت کور ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے، اور اب بیاہ کے لائق ہے۔''

جسے نے پوچھا:

''ہمارے گاؤں میں تکڑے اور دھاکڑ جوان کون کون سے ہیں؟''

''شیر سنگھ کے بیٹے جوان ہو کر سچ مچ شیر نظر آئیں گے لیکن آج کل تو چنن کے دونوں بیٹوں کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ہی تکڑے جوان ہیں لیکن چھوٹا زیادہ طاقتور اور بدمعاش ہے۔ ان سب میں بدمعاش ٹھنا ہے۔ وہ چنن سنگھ کا بھانجا ہے۔ ٹھنا پورا الٹھ ہے، بے حد منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ بھی ہے۔ ماما اپنے اس بھانجے یعنی ٹھنے کو دل سے چاہتا ہے، کیونکہ ہر بدمعاشی کے کام میں وہ ٹھنے کو آگے کر دیتا ہے۔ ٹھنے کا اپنے ممیرے بھائیوں سے دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا ہے، گھر میں گوروا کال پُرکھ کا دیا سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود سنا ہے کہ وہ شوقیہ کبھی کبھی ڈاکے بھی مار لیتے ہیں۔''

جسا پورے گاؤں، بلکہ علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

''تو رحیم چاچا، ان کے علاوہ بھی تو ہمارے گاؤں میں پٹھے ہوئے جوان ہیں۔''

''کیوں نہیں، بہت سے ایسے ہیں، جو کھیل کود کے میدان میں اپنی طاقت کی پہچان دیتے ہیں لیکن چھوٹے سردار، میری نظر میں اس گاؤں کا جو سب سے زیادہ طاقتور جوان ہے، اس کا نام تو میں نے ابھی تک بتایا ہی نہیں۔''

جسے نے چونکنے ہو کر پوچھا:

''وہ کون ہے؟''

''اس کا نام سردار جسا سنگھ ہے۔''

بھجنو چلا اُٹھی:

''ہٹ رے رحیم! میرے بیٹے کو نظر مت لگانا۔''

کچھ دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر جسّے نے پوچھا:

''آس پاس کے دیہات میں، کبھی کچھ لڑکے میرے تھوڑے بہت یار دوست بن گئے تھے نا جانے ان کا کیا ہے؟ سوچتا ہوں، تو ان کی شکلیں آنکھوں کے آگے گھومنے لگتی ہیں۔''

''انہیں تو مَیں پہچانتا نہیں۔''

جسا سنگھ نے کہا:

''ان میں سے پورن سنگھ کو تو تم پہچانتے ہی ہو گے۔''

''ہاں یاد آیا، وہ عمر میں آپ سے کچھ بڑا اور دیکھنے میں کچھ خوبصورت سا تھا۔''

''ہاں، ہاں، وہی۔''

''وہ تو پڑھ لکھ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے۔ اس کے باپ کی کافی پہنچ تھی اور وہ چھوٹا موٹا افسر بن گیا۔ پانچ چھ مہینے پہلے میں نے اسے دُور سے دیکھا تھا۔ بہت ہی اچھا جوان نکلا ہے۔ سیکڑوں میں ایک...... وردی میں تو وہ اور بھی سجتا ہے۔''

''تو تُم نے اسے پہچان لیا؟''

''اسے پہچاننا زیادہ کٹھن نہیں ہے۔ جس نے اسے آج سے چھ سال پہلے دیکھا تھا، وہ آج بھی اسے پہچان سکتا ہے۔ یاد ہے، اس کی بائیں آنکھ کے نیچے گال پر چھوٹا سا مَسّا بھی ہے۔ وہ اس کی پکی نشانی ہے۔''

اس طرح باتیں کرتے کرتے ان تینوں کو جمائیاں آنے لگیں۔ محفل برخواست ہو گئی اور وہ سونے کے لیے اپنے اپنے بستر پر جا پہنچے۔ رحیم طویلے والی کوٹھڑی میں چلا گیا، اور بُوا اور بھتیجا باہر والے پسار میں اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔

بستر پر پڑے پڑے جھجو نے پوچھا:

''میں تو رات کے تیسرے پہر جاگ پڑوں گی، اور گوردوارے جا کر لنگر کی سیوا کروں گی۔ دن چڑھنے تک مجھے دہی بلونے کے لیے لوٹ کر آنا ہو گا۔''

''ٹھیک ہے بُوا! جانے سے پہلے مجھے جگا دینا۔ میں بھی گوردوارے متھا ٹیکنے جاؤں گا۔''

''بہت اچھا۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گئے۔ جسّے کو نیند تو یک دم آ گئی لیکن وہ جھجو سے پہلے جاگ اُٹھا۔ رات ہی سے وہ بے قرار تھا کیونکہ اسے دہی سے ملنا تھا، بُوا سے وہ جانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔

جھجو جاگی۔ اس نے صحن میں لگے دستی نل کے نیچے بیٹھ کر جلدی جلدی سنان کیا اور پھر جب کپڑے پہن کر تیار ہو گئی، تو جاتے جاتے جسّے کو بھی آواز دے دی۔

جسا بولا:

''ہاں بُوا! میں جاگ گیا۔''

''جاگ تو گئے، کہیں پھر اُونگھ نہ جانا، گوردوارے میں ضرور آنا، وہاں کئی لوگوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

بھجو کا چِنا کرنا بیکار تھا، کیونکہ جسا تو اس سے بھی زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ بھجو گھر سے باہر نکلی تو جسا یک دم اُچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی دستی نل کے نیچے اَشنان کیا کپڑے بدلے، سر پر پگڑی باندھی اور اس کے دو طُرّے نیچے اور اوپر کو چھوڑے، مونچھوں کو گھی سے چُپڑا اور اس طرح تیار ہو کر وہ گھر سے چل کھڑا ہوا۔ اس نے گوردوارے کو جانے کی بجائے دوسرا راستہ ہی اپنا لیا۔ کھیتوں کی منڈیروں پر سے قدم بڑھاتا ہوا وہ قبرستان کی طرف بڑھتا گیا۔ قبرستان کے اس طرف ایک چھوٹا سا پرانا نالہ تھا، جسے بُڈھا نالہ کہا کرتے تھے۔ جسا سیدھے بُڈھے نالے پر پہنچا۔ نالہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس نے لاٹھی بیچ میں ٹکائی اور اُچھل کر نالے کو پار کر گیا۔ نالے کے دوسری طرف وہ ایک اونچی سی جگہ پر جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اس کے ایک طرف قبرستان تھا، اور دوسری طرف گوردوارہ۔ گوردوارے میں بجنے والے لمبے، چمٹوں، ڈھولک اور گانے والوں کا مِلا جُلا ہلکا سا شور اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

وہ یک ٹک گوردوارے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ بار بار من میں یہ وچار اُبھرتا، کہ کیا دیپی آئے گی بھی، یا نہیں۔ چھ برس کا وقت چھ صدیوں کے برابر لگ رہا تھا...... دُبلی پتلی پیاری سی دیپی اب کیسی لگتی ہو گی۔ یہ دیکھنے کے لیے وہ بے حد بے چین ہو رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اب گوردوارے کی طرف سے کوئی بھی آتا دکھائی نہیں دیا۔ تو وہ مایوس ہو گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ ابھی تو کافی اندھیرا ہے۔ دیپی کو اتنے اندھیرے میں اِدھر آنے سے ڈر لگ رہا ہو گا..........۔

وہ اپنے وچاروں میں کھو گیا اور وہ لاٹھی کے سرے سے دھرتی کو کریدنے لگا۔ یکا یک ہی اس کے کانوں میں ہلکا سا شور سنائی دیا۔

سر اُٹھایا تو کچھ دوری پر ایک لڑکی دکھائی دی۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ جھاڑی کی اوٹ کی وجہ سے وہ جسّے کو دیکھ نہیں پائی۔ اس پر نظر پڑتے ہی جسا تو ششدر رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی یا جوانی کا بھڑکتا ہوا شعلہ...... کیا اس میلی کچیلی، دُبلی پتلی، سہمی سہمی چھوٹی سی لڑکی نے اب یہ رُوپ اختیار کر لیا تھا۔

پھر اسے محسوس ہوا کہ لڑکی کچھ مایوس ہو گئی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ نا امید ہو کر لوٹ نہ جائے۔ جسا اُٹھ کھڑا ہوا۔

تب لڑکی کی نظر اس پر پڑی۔ بھلا اتنے لمبے چوڑے جوان پر اس کی نظر پڑے بنا کیسے رہ سکتی تھی۔

جیون میں پہلی بار جسّے نے اپنے آپ کو بالکل بے بس سا محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو لڑکی بھی حیران رہ گئی۔ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ سہمی ہوئی سی بھی لگتی تھی۔

اتنے برسوں میں اس کے چُھٹپن کے ساتھی کا بھی تو حلیہ بہت بدل گیا تھا۔ وہ بھی حیران تھی کہ کیا وہ وہی جسّو تھا۔ جو ان دنوں بالکل یتیم سا لگتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچے۔ جسّے کے دل و دماغ پر حُسن کا جادو کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ان دونوں کی آپس میں کیا بات چیت ہوئی۔ جب کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے دہپی نے واپس لوٹنے کی بات کہی تو جسا چونکا۔ وہ اتنی جلدی اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دہپی اس کی تھی اور اب کوئی دہپی کو اس سے الگ نہیں کر سکتا تھا اور اسی جذبے کے زیرِ اثر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کوئی اِدھر آ نکلا تو وہ اسے جان سے مار دے گا.......... جلد ہی اسے اپنی بھول کا احساس ہو گیا۔ دہپی ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے اسے لوٹ جانا چاہیے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو نیا بوال جاگ اُٹھے گا۔ ایسا ہونا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنے چاچے کی طرح بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے سے زیادہ اسے دہپی کی بدنامی کا خوف تھا۔ بدنامی کا سب سے بُرا نتیجہ یہ نکل سکتا تھا کہ دُنیا ان کے راستے میں نت نئی اڑچن پیدا کرنے لگے گی...... نہیں وہ بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھے گا۔ ضرورت پڑنے پر جان کی بازی بھی لگا دے گا۔ لیکن وہ خواہ مخواہ خود کو اور دہپی کو مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔ وہ دہپی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے اسے بہت ہی خبردار رہنا پڑے گا۔

یہ سب باتیں سوچ کر وہ دھیرے سے بولا:

''دہپی! تُم سے الگ ہونے کو جی تو نہیں چاہتا، لیکن اگر تم جانا چاہتی ہو، تو میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔''

کالے بالوں میں دہپی کا چہرہ دَمک رہا تھا۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بولی:

''جب تک تُم اپنی خوشی سے مجھے واپس جانے کو نہیں کہو گے، تب تک میں نہیں جاؤں گی۔''

دہپی کی یہ بات سُن کر جسّے کے من کی اُمنگ کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ دہپی بھی اس کو اپنا سمجھتی تھی۔ اب وہ ایک ہو چکے تھے۔ اس اطمینان کے بعد جسا کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اس نے کھیت کی منڈیر پر رکھے ہوئے دہپی کے گورے، گول مٹول اور کومل ہاتھ کو کنکھیوں سے دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ہاتھ کے اس لمس سے ہزاروں بجلیاں جسّے کے جسم میں دوڑ گئیں۔ جہاں تک دہپی کا تعلق تھا، وہ پل بھر بعد اُٹھی، لپک کر آگے بڑھی اور اس نے جسّے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کا سارا جسم ہری بھری بیل کی طرح جسّے کے جسم سے لپٹ گیا تھا۔ کچھ پل اسی طرح گزر گئے۔ جسّے نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس کے کان میں پھسپھسا کر کہا:

''نہ چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں واپس بھیجنے پر مجبور ہوں، ہم دونوں کے لیے یہی اچھا ہے۔''

اسی حالت میں دہپی نے پوچھا: ''اب ہم پھر کب ملیں گے؟''

''میں اللہ دِتی کے ذریعے ہی تمہیں پیغام بھجواؤں گا۔ میری یہ بات یاد رکھو کہ ہمیں ہر وقت خبردار

رہنے کی ضرورت ہے۔ ذرا سی جلد بازی سے ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے اور سارا کام بگڑ سکتا ہے۔"

وہ دونوں دھیرے دھیرے الگ ہو گئے۔ دیپی رُک رُک کر پیچھے کو ہٹی۔ کچھ دوری پر پہنچ کر اس نے ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے مدھر آواز میں پوچھا: "تو میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جب تک تم گوردوارے میں نہیں پہنچ جاؤ گی، تب تک میری نظر تم پر ہی ٹکی رہے گی۔"

۴

دیپی چلی گئی اور جسا جہاں کا وہاں بیٹھا رہا۔ اس کی تیز نگاہ تیزی سے چلتی ہوئی دیپی پر اس وقت تک جمی رہی، جب تک وہ گوردوارے کے پچھواڑے والی پھلواری میں پہنچ کر غائب نہیں ہو گئی۔ وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا بھی کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ حقیقت میں کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پُرسکون تھا۔ دیپی سے ملاقات ہونے سے پہلے اس کے من میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دیپی کے لیے اس کے من میں کئی اُمنگیں بھی تھیں اور ان اُمنگوں پر انجانے خوف اور مایوسی کی کالی گھٹا بھی چھائی ہوئی تھی، لیکن اب دیپی کی خوب صورتی اور اپنے متعلق اس کے برتاؤ کو دیکھ کر اس کے من کو خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ اگر اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو نہ جانے جسے کے من کا کیا ردِ عمل ہوتا۔ ممکن ہے وہ تباہی کی ڈگر پر چل نکلتا۔ ان باتوں کا اب کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔ اسے اپنا راستہ بہت ہی صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ بڑے اچھے انداز سے اپنے مستقبل کا پروگرام بنا سکتا تھا۔ اسے پاگلوں کی سی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے جیون کے نئے باب کا شُبھ آغاز ہو چکا تھا۔

اُجالا پھیلنے لگا اور سورج نے اپنی کرنیں دھرتی پر پھینکیں، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بُوا کو دیا ہوا وچن اسے یاد تھا۔ وہ ضرور گوردوارے میں اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر وہ گوردوارے کی طرف چل دیا۔

دیپی گوردوارے کے پچھواڑے والے دروازے سے گئی تھی لیکن اسے سامنے والے بڑے دروازے کی طرف سے ہو کر جانا تھا۔ وہ اس کچی چوڑی سڑک پر ہولیا، جو گوردوارے کے قریب سے گزرتی تھی۔ اب وہ اس جگہ تک پہنچا جہاں گوردوارے سے آنے والا راستہ سڑک سے آ کر ملتا تھا، تو وہاں اس نے کچھ لوگوں کھڑے پایا۔ ان میں سے چنن سنگھ کو تو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور نوجوان تھے۔ پکی اینٹوں کے بنے ہوئے اس راستے کے کنارے کنارے ببول اور دھریک کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان نوجوان میں سے ایک ہاتھ میں بہت لمبے دستے کی کلہاڑی لیے ببول کی کومل شاخوں کو کاٹ رہا تھا اور دوسرا چاقو سے ان کومل شاخوں کے کانٹے کاٹ کاٹ کر داتن بنا رہا تھا۔ دو تین نوجوان اور بھی تھے جو آس پاس منڈلا رہے تھے۔ جوں جوں داتن تیار ہوتے

گئے، توں توں ہر کوئی اپنے منہ میں داتن دبا تا گیا۔ جسّے کے وہاں پہنچنے تک داتنوں کی ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔

داتن منہ میں دبائے لوگوں نے دُور سے ہی ایک لمبے چوڑے جوان کو آتے دیکھا، تو آپس میں پوچھ تاچھ کرنے لگے کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔ انکے کانوں تک جسّے کے لوٹنے کی خبر نہیں پہنچی تھی، نہ ہی انہوں نے اپنے گاؤں یا آس پاس کے دیہات میں اتنا تگڑا جوان دیکھا تھا۔ انہیں اس وقت اور زیادہ حیرانگی ہوئی جب اس ناواقف نوجوان نے آ کر چنن سنگھ سے کہا: ''چاچا، ست سری اکال۔''

چنن سنگھ کا منہ ہلتے ہلتے رُک گیا اور اس نے داتن باہر نکال کر کہا:

''ست سری اکال، میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔''

''میں جسا سنگھ ہوں، تم مجھے کیسے پہچانتے، میں لگ بھگ چھ برسوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔''

جب جسا سنگھ گاؤں میں تھا، تو ان دنوں چنن سنگھ نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ جسّے کی بات سُن کر اس کی آنکھوں کے سامنے پل بھر کو ایک گندے مور کھ اور اناتھ سے لڑکے کی شکل گھوم گئی اس نے داتن کو قریب والے درخت کے پتلے تنے پر دو تین بار مارا تا کہ میں سے فالتو ریشے جھڑ جائیں اور پھر بولا:

''اوئے تم بگا سنگھ کے بھتیجے ہو؟''

''ہاں!''

یہ جان کر کہ حقیقت میں وہ کون تھا، آس پاس کھڑے نوجوانوں کے چہرے کچھ کٹھور پڑ گئے۔ چنن سنگھ کا دل بھی کچھ بجھ سا گیا۔ اس نے داتن کے اشارے سے قریب کھڑے لوگوں کا باری باری تعارف کرایا:

''یہ میرا بڑا لڑکا لکھا سنگھ ہے اور وہ چھوٹا لڑکا دلیر سنگھ، اور ادھر میرا بھانجا تُھنا کھڑا ہے۔''

خاص دو آدمیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''یہ بھی اپنے ہی گاؤں کے آدمی ہیں۔ اچھا تو تمہارا چاچا اب چک پیراں میں ہی رہے گا۔ ایسا میں نے سُنا ہے۔''

''ہاں، چاچا نے سدا کے لیے وہاں ڈیرہ جما لیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں کا کام دیکھنے کے لیے کبھی کبھی آ جایا کرو گے۔''

چنن سنگھ نے یہ بات جان بوجھ کر کہی تھی کیونکہ وہ جسّے کا ارادہ جاننا چاہتا تھا۔ جسا بولا:

''میں اب یہیں پر رہوں گا۔''

یہ سن کر چنن سنگھ کو اچھا نہیں لگا، لیکن وہ من کی بات دباتے ہوئے بولا:

''کب پہنچے تم یہاں؟''

''کل شام۔''

''ٹھیک ہے، میں شیخو پورے گیا ہوا تھا۔ رات دیر سے لوٹا، اسی لیے تمہارے آنے کی خبر نہیں

ملی۔"
اب چنن سنگھ باتیں کر رہا تھا، تو جسا آنکھوں ہی آنکھوں میں لکھا سنگھ، دلیر سنگھ اور ٹھُنے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہری پورے میں رہ کر ان لوگوں سے اس کی ٹکر لازمی تھی۔ سچ مچ دلیر سنگھ اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ جوان تھا۔ ٹھُنا سور کی طرح پلا ہوا تھا۔ وہ ناک کی بجائے منہ سے سانس لے رہا تھا اور شکل سے بالکل گھامڑ لگتا تھا۔

چنن سنگھ نے پوچھا: "گوردوارے متھا ٹیکنے آئے ہو؟"

"ہاں!"

"اتفاق کی بات کہ ہم یہاں کھڑے تھے، جبھی تو ملاقات ہو گئی۔"

جسا دھیرے سے مسکرایا اور اس نے گوردوارے کی طرف قدم بڑھا دیا۔

چنن نے پھر کہا: "ہمیں ملنے کے لیے آتے رہنا جسے...... آخر وہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" گردن گھما کر جسے نے دھیرے سے یہ بات کہی اور گوردوارے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ سب اسے ٹکٹکی باندھ دیکھ رہے تھے۔ لکھا سنگھ بڑا سا منہ بنا کر بولا:

"حرامجادے چاچا سے پیچھا چھوٹا تھا، اب یہ دوسرا حرامجادہ آ گیا ہے۔"

لکھا سنگھ نے یہ بات دھیمی آواز میں نہیں کہی تھی کہ جسے کا کانوں تک نہ پہنچ پاتی لیکن جسے نے سنا اَن سنا کر دیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا، کیونکہ یہ بات سیدھے اس کے منہ پر نہیں کہی گئی تھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جلد بازی میں کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ دبپی کے پیار نے اس کے من میں یہ توازن پیدا کر دیا تھا۔ یہ کہنا کٹھن تھا کہ چنن سنگھ کے بیٹوں کا رویہ اسی طرح کا رہنے پر وہ کب تک اپنے اس توازن کو بنائے رکھے گا۔

چنن سنگھ کے لیے بھی جسے کا وہاں آ نا دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی ڈاڑھی کے بال، مٹھی میں دباتے ہوئے بولا: "یہ اچانک کیسے آ دھمکا۔"

قریب کھڑے گاؤں کے دوسرے آدمی نے کہا:

"چنن سنگھ، یہ بات تو بھجو نے پرسوں سے ہی پھیلا رکھی ہے کہ اس کا بھتیجا آنے والا ہے۔"

دلیر سنگھ زور سے زمین پر تھوکتے ہوئے بولا:

"یہ تو میں نے بھی سنا تھا۔ میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا، سوچا کہ ہوگا کوئی چرکٹ۔"

گاؤں کا دوسرا آدمی بول اُٹھا:

"دلیرا! اسے چرکٹ سمجھنا بہت بھاری بھول ہوگی۔"

ٹھُنا کڑوے پن سے دانت دکھاتے ہوئے بولا:

"تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو...... اور یہ بھی دیکھو کہ یہ کب تک یہاں ٹکتا ہے۔ جب اس

کے چاچا کی جڑیں اُکھڑ گئیں، تو بھلا یہ کس کھیت کی مولی ہے۔"

دوسرے شخص نے کہا:

"ٹھنے! میں بگے کے گٹ کا آدمی تو نہیں ہوں، نہ مجھے ان کے خاندان سے کوئی ہمدردی ہے، لیکن بزرگوں کا قول یاد رکھو، کہ دشمن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔"

ٹھنا گردن اکڑا کر بولا:

"اجی تم دیکھتے جاؤ، ہم نے اس کی ہگنی موتنی نہ بند کر دی تو ہمارا نام بدل دینا۔"

ٹھنے کے منہ سے نکلی ہوئی بات کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ دوسرا آدمی اتنے میں ہی چپ ہو گیا۔

جسا ٹوٹی پھوٹی دیوار میں بنے ہوئے پھاٹک نما دروازے سے گزر کر گوردوارے کے دالان میں پہنچا تو ایک طرف سے بھجو لپکتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور بولی: "آ گئے تم؟"

"ہاں بُوا! کیا میرے آنے میں کوئی شُبہ تھا؟"

"شُبہ تو نہیں تھا لیکن کبھی یہ ڈر من میں ضرور اُٹھتا ہے کہ آخر تو بگے کا ہی بھتیجا ہے نا۔ نہ جانے من پر کون سی دُھن سوار ہو جائے۔"

جسے نے دانت دکھا دیے اور بولا:

"بُوا! تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں صرف چاچا کا ہی نہیں، تمہارا بھی بھتیجا ہوں۔"

بھجو کی باچھیں کھل گئیں......

"ہاں، سو تو ہے لیکن تُو نے بہت دیر لگا دی رے۔ میں اس انتظار میں رہی کہ تجھے یہاں دیکھ لوں، تو گھر کو چلوں۔ گھر پر دہی بلونے کو پڑی ہے۔ اچھا تو میں چلی......اور جب تک میں لوٹ کر گوردوارے میں نہ آؤں، تو یہیں پر رہنا۔ کچھ وقت گورو کے چرنوں میں بھی گزارنا چاہیے...... سمجھے؟"

"ہاں بُوا!" جسے نے اُکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اتنے میں شیر سنگھ بھجو کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے جسے پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالی، اور بھجو سے پوچھا:

"یہ تیرا بھتیجا جسا ہے نا؟"

بھجو نے بڑے فخر سے جواب دیا:

"ہاں، یہ وہی لڑکا ہے جو چھ برس پہلے ہمارے یہاں رہتا تھا......جسے! یہ بھی تمہارے چاچا ہیں، ان کا نام شیر سنگھ ہے۔"

جسا سنگھ کو شیر سنگھ کی شکل بھی یاد نہیں آ رہی تھی، کیونکہ لڑکپن کے زمانے میں شیر سنگھ سے اس کا پالا نہیں پڑا تھا۔ پھر بھی اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر شیر سنگھ سے ست سری اکال کہہ دی۔ شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دی۔

جسا دالان میں سے ہوتا ہوا گوردوارے کے بھیتر کی طرف بڑھا اور شیر سنگھ نے ٹھجو سے کہا:
''واہ بھئی واہ! تیرا بھتیجا تو واقعی دیکھنے کے قابل جوان نکلا ہے۔''
''بیٹا کہو بیٹا! میں اسے بھتیجا نہیں بیٹا مانتی ہوں۔''
''ہاں بیٹا تو ہے ہی...... اب تم کہاں کو چلیں؟''
''میں واپس گاؤں جا رہی ہوں، دہی بلونے کو پڑی ہے۔ میں جسّے کا انتظار کرتی رہی، ورنہ اور جلدی لوٹ جاتی۔''
''تو چلو میں بھی گاؤں کو جا رہا ہوں۔ ایک سے دو بھلے۔ راستے میں گپ شپ ہوتی رہے گی۔''
''چلو۔''
شیر سنگھ نے دیوار کے قریب پڑے اَن گنت جوتوں میں سے اپنے جوتے کھوج کر پہنے اور ٹھجو کے ساتھ بڑے دروازے میں سے باہر نکل آیا۔
وہ اینٹوں کے بنے راستے پر چل رہے تھے کہ انہیں چنن سنگھ اپنے بیٹوں سمیت کچی سڑک کے نزدیک کھڑا دکھائی دیا۔
بگا سنگھ کو پانچ برس کی قید ہو جانے کے بعد کافی عرصے تک ٹھجو نے چنن سنگھ سے بات بھی نہیں کی۔ اب تھوڑی بہت بول چال ہو جاتی تھی۔ اس میں بھی عموماً چنن سنگھ ہی پہل کرتا تھا۔ شیر سنگھ سے تو اس کی ملاقات گوردوارے میں ہو چکی تھی، لیکن ابھی ٹھجو سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ جونہی یہ قریب پہنچے، تو چنن سنگھ اُونچی آواز میں بولا:
''پیریں پیناں...... بہن ٹھجو!''
ٹھجو کو بھی کہنا پڑا ''جیتے رہو۔''
چنن سنگھ پھر بولا: ''بدھائی ہووے، تمہارا بھتیجا تمہارے پاس آ گیا ہے۔''
ٹھجو نے بدھائی قبول کرتے ہوئے پوچھا: ''تم نے اسے کب دیکھا؟''
''دیکھا ہی نہیں، بات چیت بھی ہوئی، ابھی وہ ادھر سے ہو کر تو گوردوارے میں گیا تھا۔ میں نے اس کا اس کے بھائیوں سے بھی تعارف کرا دیا تھا۔''
چنن کا اشارہ اپنے بیٹوں کی طرف تھا۔
ٹھجو بولی: ''یہ بھی اچھا کیا۔ آخر سب بھائیوں کو ایک ساتھ ہی رہنا ہے۔''
''کیوں نہیں بہن! دُنیا میں اُونچ نیچ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر آپس میں ایک بار کچھ رنجش بھی ہو جائے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری عمر کے لیے انسان ایک دوسرے کا دُشمن بن جائے...... اور پھر خون کا رشتہ تو کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔''
اس طرح ایک دو باتیں اور ہوئیں، پھر یہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

کچھ دُوری پر پہنچ کر شیر سنگھ بولا:

''بہن، ان کے جھانسے میں مت آنا۔ چنن بڑا ہی مکار آدمی ہے۔ اس کا وہی حال ہے کہ بغل میں چھری اور منہ میں رام۔''

''ہاں شیر یا! میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میرے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔''

''ذرا جسّے کو بھی سمجھا دینا کہیں وہ ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آ جائے۔ ان کا بس یہی طریقہ ہے کہ پہلے تو لچھے دار باتوں سے دوسروں کو اپناتے ہیں اور پھر اسے ایسے گہرے گڑھے میں گرا دیتے ہیں، جہاں سے وہ کبھی باہر نہ نکل پائے۔''

''ہاں میں جسّے کو سمجھا دوں گی، ویسے مجھے وشواس ہے کہ جسا اتنا بدھو نہیں ہے، جتنا کہ وہ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میں اسے خبردار کر دوں گی۔''

شیر سنگھ کسی سے کم دھاکڑ یا بدمعاش نہیں تھا، لیکن وہ مکار بالکل نہیں تھا۔ اس کی لڑائی سیدھی لڑائی ہوتی تھی۔ بداعتمادی اس نے کبھی کی نہیں تھی۔ مکار سے مکاری کرنے سے وہ چُوکتا بھی نہیں تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر جب وہ اپنے اپنے گھر کو جانے لگے، تو وداع ہونے سے پہلے مجھو بولی:

''مجھے اس بات کا قیاس تو ہے کہ جسا بھیڑیوں میں گھرا رہے گا۔ چنن اور اس کے بیٹے کبھی پسند نہیں کریں گے کہ جسا یہاں اطمینان سے رہ سکے۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ جس طرح انہوں نے چاچا کو بھگا دیا ہے۔ اسی طرح بھتیجے کو بھی بھگا دیں۔ مجھے جسّے کے یہاں آنے کی خوشی بھی ہے اور اس کے ساتھ ان بھیڑیوں کا خوف بھی لگا ہوا ہے۔''

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ جسّے کے سر پر تمہارے جیسے تجربہ کار چاچا کا ہاتھ رہنا چاہیے۔''

''اری! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میرا ہاتھ تو اس کے سر پر رہے گا ہی۔ چنن سنگھ کو میں دو کوڑی کا آدمی سمجھتا ہوں۔ میں اب تک چنن سنگھ کا دماغ ٹھیک کر دیتا، لیکن گھر گرہستی والا ہو جانے کی وجہ سے میں خاںخواہ کوئی جھگڑا نہیں اُٹھانا چاہتا۔ دیکھو نا، ایک بیٹی تو اَب بالکل شادی کرنے کے لائق ہے۔ اگر میں بیکار میں جھگڑے میں پڑ گیا تو میں ساری ذمہ داریاں کون نبھائے گا۔''

''ٹھیک ہے بھئی، میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ تم خواہ مخواہ جسّے کی خاطر فوجداری میں پڑو۔ میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اس کے بُرے بھلے کا خیال رکھنا اور چنن کی مکاریوں سے اسے پہلے ہی خبردار کر دینا۔''

''چِنتا مت کرو...... ایسا ہی ہوگا۔''

وہ دونوں اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔ ادھر جب جسا گوردوارے میں گھسا اور اس نے آگے بڑھ کر گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا اور پھر ایک طرف ہٹ کر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا، تو اس دوران کچھ لوگوں کی آنکھیں اس پر جمی رہیں۔ آخر یہ گاؤں تھا۔ گاؤں کے لوگ نئے شخص کو بڑی تجسس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مردوں سے بھی زیادہ دلچسپی کچھ لڑکیوں نے دکھائی۔ خاص طور سے ان لڑکیوں نے جوجسّے اور دیپی کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں۔

عورتوں کے بیٹھنے کا حصہ الگ تھا۔ وہاں سے کبھی ایک لڑکی اُچک کر ذرا اُوپر کو اُٹھ جاتی کبھی دوسری۔ وہ جسّے کو دیکھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ اُنگلیوں سے اشارے بھی ہو رہے تھے۔

کچھ بڑی بوڑھیوں نے لڑکیوں کو ٹوکا، تو وہ بتانے لگیں:

''آج یہاں جھجو بے بے کا بھتیجا آیا ہے۔''

جسا سنگھ چھپی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ من ہی من وہ پریشان تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لڑکیاں ایسی حرکتیں بھی کریں گی۔

جسا جان بوجھ کر آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔ جب ارداس (دُعا) کے لیے سب لوگ کھڑے ہوئے تو کچھ لڑکیاں بھیتر ہی بھیتر کھسک کر آگے بڑھ آئیں تاکہ جسّے کو قریب سے اچھی طرح دیکھ سکیں۔

ارداس کے بعد کڑاہ پرساد بانٹا گیا۔ پرساد کے بعد لوگ بکھرنے لگتے ہیں۔ جسا بھی باہر دالان میں آ کھڑا ہوا۔ وہ کسی سے واقف نہیں تھا۔ لڑکیاں تھیں کہ اب بھی باز نہیں آرہی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ان میں دیپی موجود نہیں تھی۔ شاید وہ جان بوجھ کر لنگر میں جا بیٹھی تھی۔

اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے جسّے کو اپنے چاچا کے پُرانے جاننے والے آ آ کر ملنے لگے۔ پہلے کے اس کے ہم عمر لڑکے اب جوان ہو چکے تھے، وہ بھی اس سے ملے۔ اس طرح دھیرے دھیرے اس کی جان پہچان بڑھ گئی۔

جسا سنگھ کو لگا کہ اگر لڑکیاں اسی طرح ہڑبونگ مچاتی رہیں، تو دیپی والا بھید کھل جائے گا اور اگر ایک بار یہ بھید کھل گیا، تو پھر لمبا لفجا شروع ہو جائے گا۔ وہ فوراً گھر کو لوٹ جانا چاہتا تھا تاکہ اس جھنجھٹ سے اس کی جان چھوٹ جائے مگر وہ گھر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ آج گھر پر کھانا نہیں پکنے والا تھا، اسے لنگر میں ہی بھوجن کرنا تھا دوسرے بُوا کا ڈر تھا جو اَب گاؤں سے لوٹنے ہی والی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بُوا آ گئی تو وہ بولا:

''بُوا، مجھے تو لنگر سے چار چھ روٹیاں لا دو۔ میں کہیں الگ بیٹھ کر کھا لوں گا۔''

''کیوں؟''

''نہ جانے کون لڑکیاں ہیں، کھامکھا (خامخاہ) تنگ کررہی ہیں۔ میں انہیں جانتا بھی نہیں۔''

''ارے تو لڑکیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ اچھا تو نہیں لگے گا کہ میں تمہیں الگ سے روٹیاں لا دوں۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ سب کے ساتھ لنگر میں بیٹھنا ہی مناسب ہے۔''

مجبوراً جسّے کو رُکنا پڑا۔

چھٹا غلاف

رانجھا آکھدا ایہہ جہان سُفنا............

(وارث شاہ)

"رانجھا کہتا ہے کہ یہ سنسار صرف ایک سپنا ہے۔"

۱

چنن سنگھ کے لڑکوں نے اپنا ایک اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ شہر گوجرانوالہ کے نظام نامی ایک مسلمان پہلوان کو چنن سنگھ نے اپنے یہاں رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں نظام کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ کشتی میں اس نے بڑا نام کمایا۔ اب وہ چالیس برس سے اُوپر کا ہو چکا تھا۔ اس لیے لنگوٹ بھی کھول چکا تھا۔ ویسے وہ خوب صحت مند تھا۔ اس عمر میں بھی وہ نئے لونڈے لپاڑوں کو کشتی کے داؤ پیچ خوب اچھی طرح سکھا سکتا تھا۔ چنن سنگھ کے یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نظام کو اچھی خوراک کے علاوہ سیر بھر دودھ، بادام اور دوسرے میوے بھی کھانے کو ملتے تھے۔ وہ کسی کے بُرے بھلے میں نہیں تھا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ صبح شام وہ چنن سنگھ کے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کو اکھاڑے میں زور کرا دیا کرتا تھا۔

جس صبح چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں کی جسا سنگھ سے ملاقات ہوئی، اسی شام اکھاڑے میں جسے کا ذکر بھی چلا۔ چنن سنگھ خود اکھاڑے میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھار آتا بھی تو نوجوانوں کو داؤ پیچ لگاتے دیکھ کر خوش ہوتا اور تھوڑی دیر بعد چلا جاتا۔ خود چنن سنگھ جسے کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے یہی سوچ رکھا تھا کہ اگر جسے نے اپنی طرف سے کوئی شرارت کی، تو اس سے اس کے لڑکے، گھنا اور ان کے دوسرے ساتھی بڑی آسانی سے نپٹ لیں گے۔ جہاں تک چنن کے بیٹوں کا تعلق تھا وہ جسے کو دیکھتے ہی غُرّا اُٹھے۔ انہیں یہ تو علم ہی تھا کہ ان کے باپ نے کس طرح جسے کے چاچا کو پھانسا، جیل کی ہوا کھلائی اور اسے گاؤں سے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ جسے کو دیکھ کر انہوں نے خواہ مخواہ ہی یہ مان لیا کہ چاچے کے بھتیجے کو خاک چٹانا اور اگر ہو سکے تو گاؤں سے بھگا دینا ان کا فرض تھا۔

وہ اس بات کو جاننے کا انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جسے کے من میں ان کے ساتھ اُلجھنے کی خواہش بھی ہے یا نہیں۔ برسوں سے ڈنڈ بیل کر وہ بھرپور جوان بنے تھے اور اب اپنی جوانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ جب تک اُستاد نظام زور کراتے رہے، تب تک وہ کچھ نہیں بولے، لیکن جب اُستاد واپس چلے گئے، تو وہ سب اکھاڑے کے کنارے پر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور جسے کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔ پہل گھنے نے کی...... وہ جانتا بھی تھا کہ چنن سنگھ کے دونوں لڑکے خود بھی اس موضوع پر ہی بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ گھنا بولا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ چاچا کے بعد بھتیجا یہاں کیوں آ گیا۔''

انہیں کے ایک دوست جگت سنگھ نے کہا:

''بھئی ان کا یہاں پر گھر ہے، زمین ہے، مویشی ہیں......ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھی تو کسی نہ کسی کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔''

ٹھمنے نے اعتراض اُٹھایا:

''مگر اس کام کو تو رحیم خوش اسلوبی سے کر رہا تھا۔''

جگت سنگھ بولا:

''نوکر اور مالک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب تک بگا سنگھ جیل میں تھا، تب تک مجبوراً یہ کام رحیم کرتا رہا، لیکن جب وہ جیل سے باہر آ گیا، تو اس نے بھتیجے کو یہاں بھیج دیا۔''

لکھا سنگھ نے کہا:

''بگا سنگھ جیل میں تھا، لیکن جسا تو جیل میں نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی یہاں کیوں نہ آ گیا۔''

یہ بات تو پتے کی تھی لیکن اس کا راز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جسا اتنے برسوں تک چک پیراں میں کیوں ٹِکا رہا۔ دلیر سنگھ بولا:

''اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ہمارے بدمعاش چاچا نے جان بوجھ کر اپنے بھتیجے کو ہم سے ٹکر لینے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔''

ٹھمنا ہوا میں ہاتھ لہرا کر بولا:

''اجی چھوڑو، وہ ہم سے کیا ٹکر لے گا۔''

لکھا سنگھ نے کہا:

''ہم تو یہاں پانچ چھ جنے ہیں۔ اگر اس نے ہم سے بھڑنے کی کوشش کی تو اس کا وہی حال ہوگا، جو اس کے چاچا کا ہوا تھا۔''

ان کے ایک دوسرے ساتھی عجائب سنگھ نے رائے دی:

''مجھے جسا اپنے چاچا سے زیادہ گھٹا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ میں کسی کی طرف داری کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن بلاشبہ جسے جیسا جوان دُور دُور تک ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔''

یہی تو ایک بات تھی، جو ہر ایک کے من کی گہرائی میں کھٹک رہی تھی۔ وہ کھلم کھلا یہ حقیقت قبول کرنا نہیں چاہتے تھے کہ جسا ان سے زیادہ طاقتور تھا۔ لکھا بولا:

''یہ تو ماننا پڑے گا کہ دیکھنے میں وہ جی بھر کر جوان ہے لیکن یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ اس کے جسم میں سچ مچ کچھ بل ہے بھی یا وہ صرف دکھاوے کا جوان ہے۔''

ٹھمنا بولا:

''اس کا ڈیل ڈول ضرور جہاز کی طرح ہے لیکن مجھے وشواس ہے کہ وہ اگر اکھاڑے میں اُترے تو میں اس سے دو دو ہاتھ کر سکتا ہوں۔''

''ہاں، یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔'' دلیر سنگھ نے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔

عجائب سنگھ نے انہیں گرمانے کے لیے کہا:

''ایک دفعہ بہت سے چوہوں نے مل کر یہ رائے کی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے تا کہ جب بھی وہ ان کا شکار کرنے کے لئے آئے تو وہ گھنٹی کی آواز سن کر اپنے بلوں میں گھس جائیں۔ یہ تجویز تو منظور ہو گئی لیکن اب سوال یہ اُٹھا کہ کون سا چوہا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا۔ بس یہی بات یہاں بھی ہو رہی ہے۔''

یہ سنتے ہی باقی سب لوگ بپھر اُٹھے۔ دلیر سنگھ نے کہا:

''کیوں بے عجائب! کیا جسّو کے سامنے ہم سب چوہے نظر آتے ہیں؟''

عجائب نے دانت دکھاتے ہوئے جواب دیا:

''بھئی دیکھنے میں تو نظر نہیں آتے۔''

لکھا بولا:

''دیکھنے میں نظر نہیں آتے تو پھر جب ہم دو دو ہاتھ کریں گے، تب تم مان جاؤ گے کہ دراصل ہم اسے نیچا دکھا سکتے ہیں۔''

عجائب بدمعاش اور شرارتی لڑکا تھا، لیکن جگت سنگھ اس سے کچھ بھلا تھا۔ اس نے رائے دی:

''میرے خیال میں خامخواہ تاؤ کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ابھی کچھ دن اطمینان سے جسے کے رنگ ڈھنگ دیکھنے چاہئیں۔ اگر وہ بھلے مانس کی طرح یہاں رہنے کے لیے آیا ہے، تو ٹھیک ہے، ورنہ اس سے نپٹ لیا جائے گا۔''

ٹُھنّا اکڑ کر بولا:

''چھوڑ جگتیا! کیا زنخوں والی باتیں کرتے ہو، یہاں تو ہمیں اس بات پر بھی اعتراض ہے، کہ گاؤں میں کوئی اور نو جوان ہماری طرح مونچھوں کو تاؤ دے کر اور سینہ تان کر چلے۔ اگر جسے کو یہاں ٹکنا ہے تو اسے ہمارے سامنے ناک رگڑ کر رہنا پڑے گا۔ اگر وہ کسی اور وہم میں ہے تو ہم اس کا وہم بھی توڑ دیں گے اور اس کی ہیکڑی بھی چکنا چور کر کے رکھ دیں گے۔''

دلیر سنگھ نے ٹُھنّے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے جگت سنگھ سے کہا:

''جس طرح عجائب اور تم کو جسا ہم سے زیادہ تگڑا نظر آتا ہے، اسی طرح گاؤں کے دوسرے لوگ بھی سوچ سکتے ہیں، کہ جسا ہم پر بھاری پڑے گا۔ ہری پورے میں تو ہمارا ہی راج ہے۔ باقی کے لوگوں کو ہماری رعایا بن کر رہنا پڑے گا۔''

جگت سنگھ نے پوچھا:

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم لاٹھیاں لے کر اس کے گھر پر چڑھ دوڑو گے یا کہیں راستے میں آتے جاتے سب کے سب اس پر پل پڑو گے۔''

لکّھا سنگھ بولا:

''ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری تو اس سے صرف چھیڑ چھاڑ ہی رہے گی۔ جہاں ملے گا، وہیں اس کا مذاق اُڑایا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی ایسی چھوٹی موٹی بات کہہ دی جائے گی، جس سے اس کی بے عزتی ہو۔ یہ بے عزتی سب لوگوں کے سامنے ہی کی جائے گی۔ یا تو سارا گاؤں جان جائے گا کہ جسا ڈر کے مارے ہماری ہر بات برداشت کرنے پر مجبور ہے یا کسی نہ کسی روز جسا بھڑک اُٹھے گا جہاں کہیں وہ بھڑکا ہم نے اُٹھا کر دھر پٹکا۔''

یہ سن کر سب لوگ مارے ہنسی کے دوہرے ہو گئے۔ ٹھُمّنا تو جان بوجھ کر اکھاڑے میں لوٹتا ہوا دُور تک چلا گیا۔ پھر وہ یکا یک اکھاڑے کی نرم مٹی میں چوتڑ دھانس کر اور دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر بولا:

''واہ لکّھیا سیاں! کیا ترکیب نکالی ہے۔ جسّے کی وہی حالت ہو جائے گی، جو منہ میں چھپکلی لیے ہوئے سانپ کی ہوتی ہے، کھائے کوڑھی، چھوڑے تو اندھا۔''

عجائب بولا: ''لیکن بات تو وہیں کی وہیں رہی۔''

دلیر سنگھ نے پوچھا ''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ جسّے سے چھیڑ چھاڑ کرے گا کون؟ باگڑ بلّے کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟''

اب کے ٹھُمنّے نے اُچھل کر اکھاڑے کی نرم مٹی میں دونوں گھٹنے گاڑ دیئے اور اپنے سینے کو گھونسے سے بجاتے ہوئے بولا:

''گھبراتے کیوں ہو، یہ کام تو میں ہی کر دوں گا۔''

عجائب نے چوٹ لگائی......

''میں اس بات سے منع تو نہیں کرتا لیکن چھیڑ چھاڑ کرنے سے پہلے ہم سب کو بتا دینا۔ ہم پاس رہیں گے، تو گڑبڑ ہونے کی صورت میں بیچ بچاؤ کرا دیں گے۔''

یہ سُن کر ٹھُمنا بڑے تاؤ میں آ گیا۔ وہ دھرتی سے اُٹھ کر عجائب کی طرف لپکا۔ عجائب زور زور سے ہنستا ہوا دوڑ پڑا۔ وہ لوگ اسی طرح پورے احاطے میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ ٹھُمنا طاقتور ضرور تھا، لیکن بوجھل ہونے کی وجہ سے عجائب کے برابر دوڑ نہیں سکتا تھا۔ عجائب بھی جانتا تھا کہ اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس کے کانوں پر ایک دو کرارے گھسے دے دے گا...... لکھا نے آواز لگائی:

''ارے چھوڑو بھئی، یہ تماشا۔ آؤ بیٹھو، یہ ماملا ہاکا پھاکا نہیں بلکہ گھمبیر ہے۔ اس پر گھمبیرتا سے وچار ہونا چاہیے۔''

دراصل مسئلہ گھمبیر نہیں تھا لیکن وہ لوگ سیدھی سادی حالت کو گھمبیر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ کھانے کمانے کی چنتا نہیں تھی، نسوں میں جوانی کا خون لہریں لے رہا تھا۔ اس لیے ان کے من میں بھڑنے کی خواہش مضبوط ہو رہی تھی۔ مل جُل کر یہی طے پایا کہ جسّے سے چھیڑ چھاڑ ہر دم، جاری رکھی جائے، اسے طعنے دیتے اور اس کا مذاق اُڑانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

اپنی طرف سے جسا بچ کر رہنے کی سوچ رہا تھا لیکن حالات اس کے حق میں بگڑتے جا رہے تھے۔ ایک طرف چنن سنگھ کے بیٹے اپنے یار دوستوں سمیت گرمی کھا رہے تھے، اور اُدھر دیپی کے من میں عشق کا شعلہ بہت بُری طرح بھڑک رہا تھا۔ گوردوارے کی ملاقات کے دوسرے ہی دن اللہ دِتی کا پیغام لے کر جسّے کے پاس پہنچی۔ اس وقت جسا اپنے مکان والے طویلے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا، جہاں پہلے کسی زمانے میں اس کا چاچا محفلیں جمایا کرتا تھا۔ اللہ دِتی کو دیکھ کر جسا چونکا۔ وہ یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں اس طرح کھلم کھلا اس کے گھر آنے جانے لگیں۔ ممکن ہے اس کی اس گھبراہٹ کو بھانپ کر اللہ دِتی بولی:

''مجھے دیپی نے بھیجا ہے۔''

جسّے نے اُٹھ کر کمرے کے دروازے میں سے باہر کی طرف جھانکا۔ رحیم گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا جسّے نے پلٹ کر اللہ دِتی سے کہا:

''تم یہاں مت آیا کرو۔ اب بھی موقع ہے، تم چپ چاپ یہاں سے کھسک جاؤ۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ رحیم تمہیں دیکھنے نہ پائے۔''

اللہ دِتی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ اس کا سواگت ایسے ڈھنگ سے کیا جائے گا۔ آخر وہ اس کی محبوبہ کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اسی بہانے وہ بھی تھوڑا نخرہ ٹخرہ دکھائے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی گڑبڑا گیا۔ وہ کچھ غصے میں آ کر اپنے کندھوں کو جھٹکتے ہوئے بولی:

''اچھا تو ہم جاتے ہیں۔''

جسّے نے سمجھایا: ''تم سیدھی کھیتوں والے طویلے میں پہنچ جاؤ۔''

اللہ دِتی سر کو جھٹکا دے کر اپنی ایک موٹی سی زُلف پیچھے کو پھینکتے ہوئے بولی:

''نہیں ہم وہاں نہیں جائیں گے۔''

جسا ڈانٹ کر کہنا چاہتا تھا کہ لڑکیاں بڑی اُڑب ہوتی ہیں مگر اس کی اتنی ہمت نہیں ہو پائی۔ اللہ دِتی کے گال کو ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے اس نے کہا:

''تم سمجھتی کیوں نہیں، غصہ تھوک دو۔ فوراً وہیں پہنچ جاؤ۔ میں دوسرے راستے سے آتا ہوں۔ وہاں بڑے اطمینان سے ساری بات چیت ہوگی۔''

اللہ دِتی کے رُوٹھے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ جسّے کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی:

''ارے، تو ہمارے گال کو کاہے چھو رہے ہو...... ہمیں بھی کیا دیپی سمجھ لیا ہے۔''

جسّے نے فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اللہ دِتی کامیابی سے وہاں سے کھسک آئی...... یعنی رحیم کی نظر اس پر نہیں پڑی۔

جسّے نے جلدی سے اپنے تہمد کو کسا، ایک لمبا سا انگوچھا کندھے اور بغل کے آر پار ڈال، جوتے پہنے، بندھی بندھائی پگڑی کو سر پر رکھا اور گدی پر گرے ہوئے بالوں کو اُنگلیوں سے پگڑی کے بھیتر ٹھونستا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے آواز دے کر کہا:

''رحیم چاچا! میں ذرا کھیتوں تک جا رہا ہوں۔''

رحیم نے اب پلٹ کر دیکھا اور پوچھا:

''گھوڑے پر کاٹھی ڈال دوں۔''

''نہیں پیدل ہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے زیادہ دُور تک نہیں جانا ہے۔''

جب جسا لمبا سا چکر کاٹتا ہوا کھیتوں والے طویلے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اللہ دِتی رہٹ والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی تھی۔ جسّے سے آنکھیں ملیں تو اس نے جھٹ سے منہ کو پھولا لیا۔

جسّے نے سر کے اشارے سے طویلے کے بھیتر آنے کو کہا اور خود طویلے کے دالان میں جا پہنچا۔

اللہ دِتی دروازے میں ہی اٹک گئی اور اس نے شری کرشن کی طرح کچھ اس طرح صورت بنائی، جیسے وہ مرلی بجانے جا رہی ہو۔ جسے نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولا: ''بھیتر چلی آؤ۔''

''نہ بابا! کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا، میں ٹھہری کنواری لڑکی...... اور تم......''

''تم کیا؟''

''تم بگا سنگھ کے بھتیجے۔''

جسّے نے دانت دکھا دیئے: ''تو میرے چاچا کی مشہوری تمہارے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے؟''

اللہ دِتی اٹھلاتی ہوئی بھیتر چلی گئی اور جسّے کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گئی۔ جسّے نے پوچھا: ''اب بتاؤ، کیا پیغام لائی ہو؟''

''اِتّی سے بات وہاں پر نہیں سُن سکتے تھے۔''

''تم نہیں جانتی کہ یہ اِتّی سی بات نہیں ہے، تم اس معاملے کے اونچ نیچ کو نہیں سمجھتی ہو۔''

''اور لو! ہم آئے تھے بھلا کرنے تُم بُرا سمجھے۔''

''میں بُرا کچھ نہیں سمجھا، تم جلدی سے کہہ ڈالو، دیپی نے کیا کہا تھا۔''

''وہ ملنا چاہتی ہے۔''

''مجھ سے؟'' جسّے کے منہ سے انجانے ہی نکل گیا۔

اللہ دِتی جان بوجھ کر ناک چڑھا کر بولی: ''تم سے نہیں، مجھ سے۔''

''بُرا نہ مانو، میں بوکھلا گیا ہوں۔ آخر ملنے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

یہ سن کر اللہ دِتی اُلٹے قدموں سے لوٹ پڑی۔ جسّے نے آواز دے کر پوچھا:

''تم کہاں کو چلیں؟''

''جواب مل تو گیا۔ دیپی سے کہہ دوں گی کہ ابھی جلدی ہی کیا ہے۔''

''مورکھ کہیں کی، یہ تو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اس سے ایسی کوئی بات نہ کہنا۔''

اللہ دِتی اپنا پاؤں زور سے دھرتی پر مارتے ہوئے بولی:

''آخر بتاؤ بھی...... میں اس سے کیا کہوں؟''

''اس نے کس جگہ ملنے کے لیے کہا ہے؟''

اب اللہ دِتی کی آنکھیں ناچنے لگیں۔ بھویں تھر تھرا کر رازدارانہ انداز سے بولی: ''بس وہیں۔''

''بھئی کہاں؟''

''اسی کنوئیں پر...... جہاں تم کتوں سے شکار کھیلا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کی خوب دھما چوکڑی مچتی تھی۔''

''کب؟''

''کل۔''

''کس وقت؟''

''دوپہر کو۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ دن دیہاڑے......''

''اَجی رانجھا صاحب، جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو پھر دھماکوں سے ڈرتے ہو۔''

''کوئی دیکھ لے گا۔''

''واہ رے سردار بہادر! جو کوئی دیکھے گا تو کیا وہ صرف آپ ہی کو دیکھے گا؟ ہم لوگوں کو بھی تو دیکھے گا کیا تم لڑکیوں سے بھی گئے گزرے ہو؟''

جسّے نے اپنی پوزیشن سمجھانے کی کوشش کی تو اللہ دِتی نے رشی مُنیوں کی طرح ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر جیسے شراپ (بددُعا) دیتے ہوئے کہا:

''اَجی جاؤ، تم سے عشق وِشق نہیں ہونے کا۔''

جسّے نے محسوس کیا کہ اس نٹ کھٹ لڑکی کو سمجھانا بیکار ہے۔ اس لیے خود دیپی کو ہی سمجھانا مناسب ہوگا۔ بولا:

''تم دیپی سے کہہ دینا کہ میں کھانا وانا کھا کر دوپہر کے وقت اسی جگہ پہنچ جاؤں گا۔''

''اچھا، میں یہ بات دیپی سے کہہ دوں گی اور یہ بھی سمجھا دوں گی کہ تم دیکھنے میں ہی شیر نظر آتے ہو، تم دوکوڑی کے بھی پریمی نہیں ہو۔ آگا شیر کا پیچھا گیدڑ کا۔ ہم چلے......اور اب دیپی کا پیغام لے کر کبھی نہیں آئیں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''کیا پیغام لائیں، ایک زنخے ٹائپ پریمی کے لیے...... تمہاری باتیں سن کر تو میرا جی متلانے لگا۔ نہ جانے دیپی کو تم میں کیا نظر آ گیا۔ جس گھوڑے کے منہ پر توبڑا چڑھا ہوتا ہے، وہ بھی تم سے اچھا نظر آتا ہے۔''

اللہ دِتی ہنس ہنس کر یہ پُھلجڑیاں چھوڑ رہی تھی۔ جسّے نے کہا:

''دُڑ جایئے۔ اب دفع ہو جاؤ، تو دیپی کا پیغام نہ لائی ہوتی تو جانتی ہے، اس دُڑ دُڑ کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا؟''

اللہ دِتی اپنے پاؤں پر ہچکولے لیتی ہوئی اور ایک اُنگلی پر چٹیا گھماتے ہوئے بولی: ''کیا ہوتا؟''

''تمہاری یہ چٹیا دیوار کی کھونٹی سے باندھ دیتا۔ چمگادڑ کی طرح لٹکتی رہتی۔''

''ٹھینگا۔''

اللہ دِتی سو سو بل کھاتی وہاں سے چل دی۔

دوپہر کے وقت مقررہ جگہ پر پہنچ کر جسا سنگھ نے دیکھا کہ ابھی تک وہاں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔ ہر پُرانی جگہ کو دیکھ کر اسے بھولی بسری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ پہلے کبھی وہ اپنے چاچا کے ڈر سے وہ اس خاموش ماحول میں آ جایا کرتا تھا۔ پہلے پہل کنوں کے بیچ اکیلے بیٹھ کر اس کے من کو کتنا اطمینان ملتا تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنے چاچا کے گھر میں اناتھ کا سا جیون گزار رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہر ایک چیز سے کٹا کٹا سا محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنی عمر کے لڑکوں سے بھی گہری یاری کے تعلقات قائم نہیں کر پایا۔ دوسرے لڑکوں کے لیے بھی وہ اپنی طرح کا ہی ایک نمونہ تھا۔ اندھے کنوئیں کے آس پاس کا ماحول پہلے ہی کی طرح سنسان تھا۔ اندھا کنواں منہ کھولے بھیانک سا لگ رہا تھا۔ آس پاس اونچے اونچے درخت تھے، جن میں بیٹھے طوطوں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور ان کے آگے دُور دُور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اپنے خیالوں میں کھوئے کھوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس جگہ سے کبھی باہر گیا ہی نہیں تھا...... جیسے جادو کے زور سے وہ اتنا بڑا ہو گیا۔ اب وہ چاچا والے گھر میں مالک کی طرح رہ رہا تھا۔ چاچا بھی اپنے ہی ڈھنگ کا شخص تھا۔ اس کی ساری زندگی کبڈی کھیلتے ہی گزر گئی۔ نہ وہ کبھی خود اطمینان سے بیٹھا اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیا۔ بے چاری بُوا کی چلاہٹ بالکل فضول نہیں تھی......

وہ درختوں کے نیچے سرگشتی کرتا رہا۔ اتنے میں اس کے سر سے کوئی ہلکی سی چیز ٹکرائی۔ اس وقت وہ برگد کے پیڑ کے نیچے تھا۔ نظر اوپر اُٹھا کر دیکھا، سوچا کہ طوطے گولر کھا رہے ہوں گے اور انہیں کی چونچ سے ایک آدھ گولر ٹوٹ کر اس کے سر سے آ ٹکرایا......

طوطوں کی ٹائیں ٹائیں میں کچھ ہنسی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دبی دبی ہنسی کا یہ سنگیت چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ جو چیز اس کے سر پر لگی تھی، وہ گولر نہیں بلکہ کسی لڑکی کی پھینکی ہوئی

کوئی چیز تھی۔ وہ اونچی آواز میں بولا:

''مجھے تمہاری اصلیت کا پتا چل گیا ہے۔ چھپے چھپے کھی کھی کرنے کا کیا فائدہ۔''

تب اللہ دِتی کی شکل دکھائی دی۔ اس کے پیچھے تین لڑکیاں اور آ گئیں۔ سب ہی جوان تھیں اور چنچل...... لیکن ان میں دیپی نہیں تھی۔

جسا اللہ دِتی کے قریب چلا گیا۔ اللہ دِتی نے اپنی ساتھی لڑکیوں کا تعارف کرایا۔ جسّے نے ان سب کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اس چڑھتی جوانی میں انہیں پہچاننا بڑا مشکل تھا۔ جسّے کو انہیں پہچاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دیپی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اللہ دِتی نے کہا:

''جسے تمہاری آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں، وہ نہیں آ سکی۔ اس کی ماں نے اسے کام پر جُٹا رکھا ہے۔''

یہ سُن کر جسّے کو بڑی مایوسی ہوئی۔

اللہ دِتی پھر بولی:

''دیپی چاہتی تھی کہ میں تمہیں یہاں آ کر بتا دوں کہ میں نہیں آ سکتی، مگر میں نے انکار کر دیا۔ بھلا میں یہاں اکیلی کیسے آ سکتی تھی۔''

جسّے نے کہا: ''اکیلی آنے میں کیا ڈر تھا۔ میں ہَوّا تو نہیں تھا کہ تمہیں کھا جاتا۔''

''تمہیں ہَوّا بننے میں کوئی دیر تو نہیں لگتی۔ جب میں تمہیں آ کر بتاتی کہ دیپی تم سے نہیں مل پائے گی تو تم ضرور ہی مارے غصے کے ہَوّا بن جاتے۔ اس لیے میں کچھ سہیلیوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔''

جسّے کو مایوسی تو ہوئی، پھر بھی اس نے اُمید کا سہارا لینے کے لیے پوچھا:

''تو کیا دیپی کچھ دیر بعد آئے گی؟''

''نہیں، اب اس کے آنے کی اُمید بیکار ہے۔ یہ کہنا بھی کٹھن ہے کہ آئندہ کب تک ملاقات ہو سکے گی۔''

جسا خاموش رہ گیا۔ اللہ دِتی نے پھر کہا: ''اچھا تو ہم چلتے ہیں۔''

وہ چل دی، کچھ دُوری پر پہنچ کر اس نے گردن گھمائی اور جسّے کو انگوٹھا دکھا دیا۔ اس کی یہ شرارت دیکھ کر جسّے کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ جب تک وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہو گئیں۔ وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

تب وہ مُڑا تو دیکھا کہ دیپی اس کے سامنے کھڑی تھی اور کھوئے کھوئے انداز سے ہنس رہی تھی۔

جسّے کے چہرے پر پھر سے رونق آ گئی۔ بھاری آواز میں بولا:

''مجھے شک تو ہو رہا تھا کہ اس میں ضرور تم لوگوں کی شرارت ہے۔''

دیپی نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے پوچھا:

''کیا تمہیں ان کی باتوں پر وشواس آ گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اور سب تو آئیں صرف میں ہی نہ

آؤں۔"

جسّے نے اونچی سی جگہ پر اپنا انگوچھا بچھا دیا تا کہ دیپی اس پر بیٹھ سکے۔

دیپی کی سہیلیاں بھی کہیں گئی نہیں تھیں۔ وہ آس پاس ہی چھپی تھیں اور پھر جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئیں۔ وہ کچھ دُوری پر بیٹھ کر بولیں:

"ہاں بھئی! تم دونوں پریم کی باتیں کرو ہم دُور ہی دُور سے تماشا دیکھیں گے۔"

اس وقت گاؤں کا دُرلبھ سنگھ اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ ادھر سے گزر رہا تھا۔ ان دونوں نے اس سنسان جگہ پر زنانہ ہنسی کی آواز سُنی تو وہ ادھر کو ہی پلٹ پڑے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں یہ انوکھا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ پل دو پل کے بعد وہ پیچھے کو ہٹے اور اپنے راستے پر چل دیئے۔

دُرلبھ سنگھ نے اپنے بھائی سے کہا:

"دیکھا تُم نے؟"

"ہاں دیکھا۔"

"انہیں پہچانے؟"

"اپنے گاؤں کی ہی لڑکیاں لگتی تھیں۔ بیچ میں جسا بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی پہچانی نہیں گئی، جو جسّے کے بالکل قریب بیٹھی تھی، کیونکہ اس کی میری طرف پیٹھ تھی۔"

"تم مجھ سے چھوٹے ہو، پھر بھی تمہاری نظر مجھ سے کمزور ہے۔ ارے بھئی، وہ سجن سنگھ کی لڑکی دیپی تھی۔"

چھوٹا بھائی دھن سنگھ اُچھل پڑا۔ دُرلبھ سنگھ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا:

"آج کی بات کسی کو بتانا نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنے بیٹے کے لیے سجن سنگھ سے دیپی کا ہاتھ مانگا تھا، تو اس نے مجھے ٹال دیا۔ غصہ تو بڑا آیا، مگر میں خاموش رہا۔ آخر ہم اس سے کس بات میں کم ہیں؟ وہ بھی شریف، ہم بھی شریف، وہ بھی خاندانی، ہم بھی خاندانی، نہ وہ بہت امیر ہے نہ ہم زیادہ امیر ہیں۔ پھر نہ جانے اس کا دماغ ہوا میں کیوں اُڑتا رہتا ہے...... واہ گوروا کال پُرکھ گھمنڈی کا سر نیچا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ میں پھر تاکید کرتا ہوں، کہ کسی کچھ کہنا نہیں۔ میرے وِچار میں ابھی ان کی پریم کہانی کی شروعات ہی ہے۔ سجن سنگھ کو پتا چل گیا تو وہ معاملہ یہیں پر ٹھپ کر دے گا۔ یہ کھچڑی بھیتر ہی بھیتر پکنے دو۔ ایک روز جسّے سے اس لونڈیا کا عشق رنگ لائے گا اور سجن سنگھ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔"

"بھیا یہ تو سچ مچ بڑا اچھا ہوا۔ چاچے نے تو وہ نام کمایا کہ اس گاؤں میں اس کا رہنا ہی ناممکن ہو گیا اور اب اس کا بھتیجا بھی اسی ڈگر پر چل رہا ہے۔ یہ تماشا تو واقعی دیکھنے کے قابل ہو گا۔"

۲

اگلے ایک ہفتے میں ہی جسّے کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ گاؤں کا ماحول کتنا بدل گیا تھا یا یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ اب کا ہری پورہ اس کے بچپن والے ہری پورے سے بہت بدل چکا تھا۔ اس کے چاچا کے دوست جو گاؤں میں موجود تھے، وہ جسّے سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن عمر کے فرق ہونے کی وجہ سے جسّے اور ان کی یاری نہیں ہو سکتی تھی، نہ جسا ان کے ساتھ بیٹھک بازی کر سکتا تھا۔ جہاں تک جسّے کی اپنی عمر کے جوانوں کا سوال تھا، وہ یا تو اپنی اپنی لگن میں مگن تھے، یا اُن کی ہمدردی چنن سنگھ کے کنبے کے ساتھ تھی۔ چنن سنگھ کے بیٹوں نے کبھی سیدھے سیدھے جسّے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی لیکن ان کے ساتھ ٹُھنّا اور کچھ دوسرے نوجوان آوازیں کستے رہتے تھے۔ جسا گاؤں میں کہیں کو بھی نکل جاتا تو اس کے کانوں میں کسی نہ کسی کی معنی خیز انداز سے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی............ اس کے ساتھ ہی ہنسنے یا قہقہے لگانے کا شور بھی سنائی دے جاتا۔ جسّے کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایسا عجیب نمونہ تھا کہ اسے دیکھ کر لوگوں کو خواہ مخواہ ہنسی آنے لگتی تھی۔ جب جسا گاؤں کو لوٹا تھا، تو اسے اس بات کی بالکل بھی اُمید نہیں تھی کہ گاؤں کے کچھ نوجوان اتنے گھٹیا انداز سے اس کا مذاق اڑائیں گے اور للکارنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک طرح سے اسے دو دو ہاتھ کرنے پر اُبھار رہے تھے۔ جسّے نے تو سوچا تھا کہ گاؤں میں جا کر پہلے تو اطمینان سے کچھ وقت گزارے گا، دھیرے دھیرے اپنا گُٹ بنائے گا اور صرف مجبوری کی حالت میں ٹکر بھی لے لے گا۔

شرارتی لڑکوں کے گُٹ کے علاوہ دوسرے لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب گاؤں میں کوئی بہت بڑا ہنگامہ ہونے جا رہا ہے۔ جسّے کے من کی بات کا تو کسی کو علم نہیں تھا لیکن وہ شکل سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ہر بات کو چپ چاپ برداشت کر لے گا۔ بلکہ دس بارہ دن گزر جانے پر بھی جب کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تو لوگوں کو اس پر تعجب ضرور ہوا۔

ایک روز دِن ڈھلے جب اپنے گھر کو لوٹا تو اس کے چہرے پر پریشانی اور غصے کی علامات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ گھوڑے پر کھیتوں کا چکر لگا کر لوٹ رہا تھا، تو اس نے بہت دُور سے دیکھا کہ ٹُھنّا گاؤں کی چاردیواری کے قریب کھڑا وہاں پر کھیلنے والے لڑکوں کو چپ چاپ کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب جسا گاؤں کے قریب پہنچا تو وہ لڑکے ڈھول کی مٹھیاں بھر بھر کر اس کی طرف پھینکنے لگے۔ بچوں کو اس کے بہت قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس لیے ڈھول اس سے پَرے پَرے ہی رہی۔ بچوں کی یہ حرکت بالکل عام سی تھی، جس پر ممکن ہے، وہ دھیان بھی نہ دیتا لیکن اسے افسوس اور غصہ اس بات پر آیا کہ خود ٹُھنّا کچھ دُوری پر کھڑا منہ پھاڑ کر قہقہے لگا رہا تھا..... جیسے یہ کوئی بڑی ہنسی کی بات تھی۔

وہاں سے گزرتے وقت جسّے نے ٹُھنّے پر ایک نظر تک نہیں ڈالی، لیکن اس کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے چلے آنے کے بعد گاؤں کے کچھ بزرگ یہ تماشا دیکھ کر ٹُھنّے کے قریب پہنچے۔

ان میں لالہ بالمکند بھی تھے۔ لالہ جی نے اس سے کہا:

''ٹھنا! بچوں کو سکھا کر ان کے ہاتھوں جسّے پر ڈھول پھینکوانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ گاؤں میں سب کو مل جل کر رہنے کا حق ہے۔ مانا کہ جسّے کا چاچا یہاں پر ہڑدھنگ بازی کرتا رہا لیکن لگتا ہے کہ جسا یہاں پر پُرامن رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمارے وِچار میں تمہاری بھی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ گاؤں کا سکون خواہ مخواہ خراب نہ ہونے پائے۔''

ٹُھنا اسی خوش مزاجی سے لالہ جی کے سامنے آ کر بولا:

''آپ بالکل اطمینان رکھیے لالہ جی! ہم سب تو ایک ہی عمر کے ہیں۔ جسا بھی ہماری عمر کا ہے۔ ہماری اس طرح کی چھیڑ چھاڑ سے لڑائی دنگے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ خود جسا ہی سب سے کٹا کٹا رہتا ہے۔ اس لیے یہ چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی ہے۔ وہ بھی اپنے عمر ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہے، تو سب ٹھیک ہو جائے۔''

لالہ جی نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''بیٹا جو جیسے رہنا چاہتا ہے، اسے ویسے ہی رہنے دو۔ ابھی تو جسا نیا نیا آیا ہے۔ وقت گزرنے پر وہ آہستہ آہستہ تم لوگوں سے گھل مل جائے گا۔''

''بس یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں۔ آپ چِنتا مت کیجیے لڑائی بھڑائی کرنے کا ہمارا ارادہ نہیں ہے۔''

لالہ جی کو اطمینان ہو گیا۔ آخر وہ ٹُھنے کے من میں گھس کر اس کے وِچار تو نہیں جان سکتے تھے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ اگر وہ لڑنے بھڑنے پر اُتر ہی آتے تو انہیں روکنا لالہ جی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس رات جسّے نے کھانا بھی کھوئے کھوئے انداز میں کھایا۔ بُوا نے اس کے من کی اس کیفیت کی وجہ جاننے کی کوشش کی، لیکن جسّے نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ بھوجن کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں والے طویلے کی طرف چل دیا۔ طویلے کے نزدیک پہنچ کر جب وہ گھوڑے سے اُترا، تو حویلی رام نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''آپ سے کوئی ملنے آیا بیٹھا ہے۔''

''یہاں طویلے میں؟''

''ہاں! اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے مالک یہیں پر سوتے ہیں۔ جب میں نے ہاں میں جواب دیا تو وہ بھیتر جا کر بیٹھ گیا۔''

''لیکن وہ ہے کون؟''

''خود ہی دیکھ لیجیے۔''

جسّے کو حویلی رام کی آواز کچھ پُراسراری لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید چنن سنگھ یا اس کا کوئی بیٹا یا ٹُھنا اس سے ملنے آیا ہو گا مگر جب وہ بھیتر پہنچا تو دیپی کے باپ کو وہاں پا کر حیران رہ گیا۔

سجن سنگھ چارپائی کے بالکل کنارے پر بیٹھا تھا۔ اسے وہاں پا کر جسّے کو شک ہوا، ممکن ہے، باپ کو بیٹی کے عشق والی بات کا پتا چل گیا ہے لیکن سجن سنگھ کے چہرے پر غصے کی ایک بھی علامت نہیں تھی۔ وہ اپنی شرافت کے لیے گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ گاؤں بھر میں وہی ایک شخص تھا جو صبح شام گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے جاتا تھا اور پوتر وانی کا پاٹھ کیا کرتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر جھگڑے سے دُور رہتا تھا۔ اس کا چہرہ سدا کی طرح اب بھی پُرسکون تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے بیل گاڑی کے ایک اونچے پہیئے پر کہنی رکھ کر جسّے نے آہستہ آواز میں پوچھا:

''آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟''

سجن سنگھ نے آہستہ آواز میں جواب دیا:

''ہاں، میں تمہیں سے ملنے آیا ہوں۔''

بڑے سے بڑے دھاکڑ کے سامنے بھی جسّے کو اس کے رُعب کا احساس ہوا نہیں تھا لیکن آج اسے لگا کہ شرافت میں دھاکڑ پن سے بھی زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس کی آج تک سجن سنگھ سے بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے آتے جاتے کئی باران کی نظریں ایک دوسرے پر پڑ چکی تھیں۔

جسا بولا: ''میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتایئے۔''

''ہاں بیٹا! تمہارے لائق سیوا ہے..... اور مجھے اس بات کا وشواس بھی ہے کہ تم میری اس چھوٹی سی بات کو ضرور مان جاؤ گے۔''

سجن سنگھ کی آواز میں جیسے شہد گھلا ہوا تھا۔ اس کی آواز نے جسّے کے دل پر بالکل ایسا ہی اثر ڈالا جیسے کہ دہکتے ہوئے انگارے پر پانی کے ٹھنڈے چھینٹے ڈالتے ہیں۔ وہ دھیرے سے بولا: ''کہیے!''

''اب تم مجھے جانتے ہی ہو، تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں دیپی کا باپ ہوں۔''

''جی ہاں!''

سجن سنگھ کی شکل دیکھتے ہی جسا سنگھ چوکنا ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب نیا جھنجٹ اُٹھنے والا ہے۔ تھوڑی سی اُمید کی کرن یہی تھی کہ شاید سجن سنگھ اپنی بیٹی کی وجہ سے نہ آیا ہو لیکن اس نے چھوٹتے ہی اس نے اپنی بیٹی کا نام لیا، تو جسّے کو محسوس ہوا کہ کسی نہ کسی طرح سے اس کے تعلقات کی خبر باپ کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اب وہ یہاں کس نیت سے آیا تھا۔

سجن سنگھ نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں کہا:

''میں یہاں تم سے لڑنے نہیں آیا۔''

جسا اس سے اس کی اس بات پر بھی شک نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر سجن سنگھ کا لڑنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اکیلا وہاں نہ آتا۔

سجن سنگھ نے پھر کہنا شروع کیا:

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے پاس جھگڑا کرنے کی وجہ نہیں ہے، وجہ تو ہے لیکن میں تم سے لڑ نہیں سکتا۔''

جسا بڑی تیزی سے سوچنے کا جتن کر رہا تھا کہ اُسے اس بات کا کیا جواب دینا چاہیے۔ جب اس نے محسوس کیا کہ سجن سنگھ اپنی بات کے جواب کا انتظار کر رہا ہے تو وہ بولا:

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ سے جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

سجن سنگھ نے کچھ دھیان سے اس کی طرف دیکھا، جیسے وہ جسے کے دل کے بھیتر تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا:

''میں نے جو کچھ سنا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔''

''آپ نے کیا سنا؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ دیپی کا اور تمہارا آپس میں میل جول ہے۔''

جسے کے منہ سے بے ارادہ ہی جھوٹ بات نکل گئی، جلدی سے بولا:

''یہ بات غلط ہے کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکانے کے لیے ایسا کہا ہوگا۔''

جسا سوچنے لگا کہ کہیں خود سجن سنگھ نے ہی تو ان دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ لیا؟ لگتا تھا کہ سجن سنگھ بات چیت میں ہیرا پھیری کرنا نہیں جانتا تھا۔ بولا:

''مجھے دُرلبھ سنگھ کے چچیرے بھائی دھن سنگھ نے بتائی تھی۔''

جسا دُرلبھ سنگھ اور دھن سنگھ کو نہیں جانتا تھا۔ فوراً بولا:

''میں تو اس آدمی کو جانتا بھی نہیں۔''

''تم نہیں جانتے لیکن ممکن ہے کہ وہ تمہیں جانتا ہو۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''اس نے بتایا کہ اندھے کنوئیں کے قریب اپنے بڑے بھائی سمیت اس نے تم کو دیپی کے ساتھ دیکھا۔ دُرلبھ سنگھ نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ یہ بات کسی سے نہ کہے۔ شاید اس لیے کہ اگر بات پھیل گئی تو میری بدنامی ہو جائے گی، مگر دھن سنگھ سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھے خبردار کر دیا۔''

یہ تو ٹھیک تھا کہ جسا سنگھ دیپی کو اندھے کنوئیں کے قریب دو تین بار مل چکا تھا۔ گویا دھن سنگھ نے ان کے ملنے کی جگہ تو بالکل ٹھیک بتائی۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلا کہ ضرور اس نے کچھ دیکھا ہوگا، تبھی سجن سنگھ کے پاس اس بات کی خبر دی۔

جسا اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا:

''اب آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

''تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر تم باپ ہوتے اور تمہیں پتا چلتا کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کسی

جوان کا میل جول ہے تو ایسے موقعے پر تم کیا کرتے؟"

جسے نے محسوس کیا کہ بڈھے نے اسے الٹا داؤ مارا ہے۔ یہ جھینپ کر کچھ مسکرایا اور بولا:

"جب تک میں باپ نہ بن جاؤں، تب تک میں اس کو کیسے سمجھ سکتا ہوں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے تو پھر میں اپنی طرف سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تم دونوں کا میل جول پسند نہیں ہے لیکن تم تو اس بات سے بالکل انکار کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔"

جسا چپ رہا۔

سجن سنگھ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

"جسا سنگھ، دو باتوں میں سے ایک تو ضرور ہے یا تو تمہارا دیپی سے میل جول ہے، یا پھر دھن سنگھ اور اس کے بھائی کو کچھ غلطی لگی ہے۔ اگر تو ان کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے تب میں تم سے کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو تم خود بھی اس کا اقرار کر سکتے ہو...... تم چپ ہو...... میں تمہیں اقرار کے لیے مجبور بھی نہیں کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کے لیے تم دیپی سے ملنا چھوڑ دو۔"

یہ کہہ کر سجن سنگھ نے جسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جسا بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اب نہ وہ انکار کر رہا تھا، نہ اقرار۔

سجن سنگھ نے پھر کہنا شروع کیا:

"میں بیٹی کے معاملے میں کسی طرح کا لڑائی جھگڑا نہیں اُٹھانا چاہتا۔ اس لیے کہ ایک تو میں لڑنے بھڑنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے خاندان کی بدنامی ہو۔ ایک بیٹی کی بدنامی کا اثر دوسرے بچوں کے مستقبل پر پڑے گا۔ تمہارے رویے سے لگتا ہے کہ تم خواہ مخواہ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے یہ بھی قبول نہیں کیا کہ دیپی سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔ ایسی حالت میں تم آسانی سے مجھ سے کہہ سکتے ہو کہ مستقبل میں تم دیپی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔"

جسا پھر بھی خاموش رہا۔

سجن سنگھ پھر بولا:

"اگر دال میں کچھ کالا ہے تو میں تمہیں ایک اور طریقہ بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم مجھے ختم کر دو۔ اگر تم چاہو تو یہاں بھی میری جان لے سکتے ہو۔ اگر تم چاہو تو کسی بھی دن کسی ایسی جگہ چل سکتے ہیں جہاں اور کوئی نہ ہو۔ تم وہیں پر میرا کام تمام کر کے لوٹ آنا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ہمارا یہ علاقہ تو ایسا ہے کہ کئی قتل دن دیہاڑے ہو جاتے ہیں، پولیس قاتلوں کو جانتے ہوئے بھی انہیں گرفتار نہیں کر

سکتی۔ پولیس کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی گواہی دینے کو تیار نہیں ہوگا اور بغیر ثبوت وہ گواہی کے ان کا مقدمہ خارج ہو جائے گا۔''

سجن سنگھ کی اتنی باتوں کے باوجود جسا کچھ نہیں بولا۔

سجن سنگھ نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا:

''میری نظر میں تمہاری خاموشی کا یہ مطلب ہے کہ تم آئندہ دہپی سے کوئی واسطہ نہیں رکھو گے۔''

سجن سنگھ نے ایک بار پھر موٹی چادر کو اپنے جسم پر لپیٹا اور دروازے کے باہر چلا گیا۔ سجن سنگھ کے وِداع ہونے کے کچھ ہی پلوں کے بعد جسا طویلے کے باہر نکل آیا۔ کچھ دوری پر سجن سنگھ کھیتوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا پیدل گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا۔ دُور دُور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کھیتوں میں نہر کے کنارے کھڑے درخت بالکل دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ صاف ستھرے آکاش میں ستارے اَن گنت ننھے ننھے دیپوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

جسا سنگھ کے من کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دل کا سونا پن بڑھ گیا تھا۔ اتنے میں کسی پرندے کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ وسیع گگن میں اسے ایک پنچھی دکھائی دیا جو پھڑ پھڑاتا ہوا اکیلا ہی اُڑا جا رہا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ شاید اسے اپنے گھونسلے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

جسا کھوئی نظروں سے اس پنچھی کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن جسا صبح ہی صبح گاؤں کو لوٹ گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ گاؤں کے اس کونے کی طرف چل دیا، جہاں اللہ دِتی رہتی تھی۔ اتفاق سے اللہ دِتی اپنے مکان کے باہر بکری کو چارہ ڈال رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو جسے نے دُور سے ہی اسے آنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

اللہ دِتی نے بھی من کی تسلی کر لی کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ پھر وہ ہرنی کی طرح سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دیوار کی اوٹ میں جسے کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے گیلے ہاتھ اوڑھنی کے پلو سے پونچھ کر چہک کر بولی: ''کیا ہے؟''

جسا بولا: ''اس میں غُرانے کی کیا بات ہے؟''

''غُراؤں نہیں تو کیا کروں، کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ میرا بھی نام جوڑ دیں گے۔''

''چنتا مت کرو۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''اب کام کی بات کہو......کوئی دیکھ نہ لے۔''

''دہپی سے کہنا کہ آج شام پرانی جگہ پر مل لے۔''

''اگر وہ نہ آسکی تو؟''

''تم اتنی دھونس کیوں گانٹھ رہی ہو؟ اس سے آنے کو کہہ دینا۔''

''بابا ہم اس کے آنے کا ذمہ نہیں لیتے۔''

جسے نے محسوس کیا کہ اللہ دتی جان بوجھ کر بات کو گھسیٹے جا رہی تھی۔ اسے چھیڑ چھاڑ میں مزہ آتا تھا۔ اب کے جسے نے غُرّا کر کہا:

''آتے ہی تم نے اتنی جلدی مچادی تھی اور اب خود ہی اتنی دیر کر رہی ہو۔ میری بات تو ختم ہو چکی ہے۔''

اتنا کہہ کر جسا وہاں سے لوٹ پڑا۔

شام کو دہی اللہ دتی کو ساتھ لے کر جسے سے ملنے کو چلی آئی۔ جسا پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ قریب پہنچ کر دہی کو لگا کہ جسے کے تیور آج کچھ بدلے ہوئے تھے۔ اس خیال سے اسے بھی کچھ پریشانی کا احساس ہوا۔ اللہ دتی کی عادت تھی کہ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ کر خود پرے چلی جاتی تھی تا کہ وہ آپس میں کھل کر بات چیت کر سکیں لیکن آج جسے نے اسے پرے جانے سے روک دیا۔ پھر وہ دہی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''دیکھو دہی، مَیں تمہیں سمجھاتا رہا کہ ہمیں ایک دوسرے سے پرے پرے رہنا چاہیے مگر تم نہیں سمجھیں۔ آخر اس کا نتیجہ نکل ہی آیا۔''

دہی نے اپنی بائیں آنکھ پر گری بالوں کی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا: ''کیوں، کیا ہوا؟''

''تمہارے پتارات مجھ سے ملنے آئے تھے۔''

یہ سن کر دہی پہلے تو کچھ ٹھٹکی اور پھر پوچھا: ''کیا باتیں ہوئیں؟''

''انہیں تمہارا میرا پتا چل گیا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ہم دونوں کا یہ تعلق بنا رہے۔''

''تو کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ اس بات کا پتا لگنے پر وہ تمہارے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دیں گے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اتنی جلدی ہمارا یہ بھید کھل جائے اگر تم اتنی گرما گرمی نہ دکھاتیں تو یہ حالت بھی پیدا نہ ہوتی۔''

''کمال کرتے ہو، اتنے میں ہی تمہاری پدّی بول گئی۔ عشق پریم کے راستے کو کیا تم اتنا ہی آسان سمجھتے تھے۔''

''مگر اس جلد بازی کا فائدہ کیا؟''

''تم صاف کہہ دیتے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''اور اگر وہ نہ مانتے............تو؟''

''تو پھر ہم کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈ لیتے۔''

''دوسرے راستے سے تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں سے بھاگ جاتے۔''

''ضرورت پڑتی تو ہم وہ بھی کر سکتے تھے......تم تو مجھے بڑی آسانی سے چک پیراں بھی لے جا سکتے تھے۔''

''مگر دیپی میں ہری پورے سے جانا نہیں چاہتا۔ میں یہیں پڑا رہوں گا۔''

''تو مجھ سے پریم صرف مزہ اُڑانے کے لیے ہی کیا تم نے؟''

''تمھیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تمہارے پتا بہت ہی بھلے آدمی ہیں۔ ایسے بھلے انسان کے خاندان کو بدنام کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے امید تھی کہ مناسب موقع آنے پر میں ان سے تمہارا ہاتھ مانگ سکتا تھا مگر تمہاری جلد بازی نے کام خراب کر دیا۔''

دیپی بھڑک اُٹھی:

''اپنی کاہلی کو ایسے لچھے دار باتوں میں چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ دیکھنے میں تو بھالو کے بھالو نظر آتے ہو لیکن اتنی سے بات سے دم پھول گیا۔''

''دیپی، تمہارے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے۔ میں تمھیں سچے دل سے پریم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے پریم کو بھوت بنا کر اپنے سر پر سوار نہیں کیا۔ تم جوش میں آ کر بھاگ جانے کی باتیں کہہ رہی ہو لیکن تمھیں بھاگ جانے کی بجائے شادی کی بات سوچنی چاہیے۔ تم سجن سنگھ کی بیٹی ہو اس لیے میں تمھیں بھگا لے جانے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ ہاں اگر کہیں تم چنن سنگھ کی بیٹی ہوتیں تو میں تمھیں ضرور ہی بھگا کر چک پیراں لے جاتا۔''

''اوہو! اب اصلی بات کا پتا چلا، تمہاری نظر چنن سنگھ کی بیٹی پر ہے اور میں تو صرف تفریح کے لیے ہوں۔''

دیپی کی مورکھتا اور ہٹ دھرمی پر جسّے کو یکا یک ہی اتنا غصہ آیا کہ اس نے گھسیٹ کر دیپی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

وہ لڑکھڑا کر پرے جا گری۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب وہ اُٹھی، کپڑے جھاڑے اور ایک دم آنسو پی کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے قدر بھری نظروں سے جسّے کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے وہاں سے چل دی۔

اللہ دِتی نے لپک کر ایک ہاتھ دیپی کے کندھے پر رکھ دیا اور پھر مڑ کر جسّے کی طرف دیکھتے ہوئے بُڑبڑائی:

''بھالو کہیں کا۔''

۳

کچھ دنوں کے بھیتر ہی جسّے کی دُنیا میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ نہ تو گاؤں کے بدتمیز نوجوان اسے چین لینے دیتے تھے اور نہ دیپی سے اس کا پریم چھپا رہ سکا۔ گویا ایک دم ہی ہڑبونگ مچ گئی۔ آج تک جو اس نے سوچا تھا وہ مٹی میں مل گیا۔ اب حالات کا نیا جائزہ لینے کی ضرورت تھی...... اور یہ کام جسّے کے لیے کافی کٹھن تھا۔ ابھی تو وہ ایسی

اُلجھن میں پھنس کر رہ گیا تھا۔جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھتا تھا۔

تنگ آ کر جسّے نے گاؤں کی گلیوں میں گھومنا پھرنا چھوڑ دیا۔ وہ گھر سے نکلتا،تو اپنے کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ وہاں کا کام ختم ہو جاتا،تو گھر لوٹ آتا،وہ عموماً راتیں بھی کھیتوں والے طویلے میں اکیلے ہی کاٹ دیتا۔لکّھا سنگھ، دلیر سنگھ اور ٹھمنے نے بھانپ لیا کہ اب جسا ان سے بچ بچ کر رہتا تھا۔وہ آپس میں بیٹھ کر اس کا خوب مذاق اُڑاتے تھے۔انہیں اس بات کی امید بالکل نہیں تھی کہ جسا اتنی آسانی سے ہار مان جائے گا۔اب تو وہ جسّے کو دُور سے بھی دیکھ لیتے تو ٹھٹھا کے مرکر ہنسنے لگتے۔یہ حالت دیکھ کر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی محسوس کرنے لگے کہ جسّے نے سچ مچ ہی لید کر دی۔انہیں وشواس نہیں ہوتا تھا،کہ ایسے دھاکڑ چاچا کا بھتیجا اتنا ڈبُو اور ڈرپوک بھی ہو سکتا تھا۔

جسّے کو جب بھی موقع ملتا،وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کوسوں نکل جاتا۔وہ واقعی ایک دلکش جوان تھا اور اپنے چاچا کی طرح گھوڑ سواری میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔جسّے کی،نظروں میں اپنے گاؤں کی حیثیت اناتھ آشرم سے زیادہ نہیں رہی تھی۔خاص کر دیپی سے ناطہ ٹوٹ جانے پر اس کی طبیعت بالکل ہی اُوب گئی تھی۔گاؤں میں پہنچ کر جو مسائل اُٹھتے تھے،وہ ہر پل اسے بے چین رکھتے تھے۔گھوڑ سواری کے موقع پر بھی اس کے دماغ میں یہی ادھیڑ بُن چلتی رہتی تھی۔

ایک دن جب کہ اپنے گاؤں سے کئی کوس دُور وہ گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا تو اسے یکایک ہی جڑ کے درختوں کے جھنڈ میں سے ایک اور سوار نکلتا دکھائی دیا۔دوسرا سوار وردی پہنے پولیس کا کوئی افسر تھا۔وہ جسّے سے آگے آگے جا رہا تھا اور اس کے گھوڑے کا رُخ......دھمّی والا گاؤں کی طرف تھا۔

جسّے کو نئے گھوڑ سوار کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر کچھ شک ہوا کہ کہیں وہ اس کے بچپن کا دوست پورن سنگھ تو نہیں تھا،جس کے بارے میں رحیم نے بتایا تھا کہ وہ پولیس میں افسر بن گیا تھا۔

یہ شک ہو جانے پر جسّے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی رفتار تیز کی تاکہ نئے گھوڑ سوار کے برابر پہنچ سکے اسے وشواس تھا کہ قریب سے دیکھنے پر وہ اس کو ضرور ہی پہچان لے گا۔

اگلے گھوڑ سوار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور جسّے کو اس کے برابر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔پولیس افسر کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ جسّے کو نہیں پہچان سکا اور ادھر جسّے کو وشواس ہو گیا کہ وہ اس کا پُرانا دوست ہی تھا کیونکہ وہ خوب صورت تھا خوب لمبا چوڑا جوان تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر مسّہ بھی تھا۔جسّے نے پوچھ ہی لیا:

''کیا تم پورن سنگھ ہو؟''

پولیس افسر اپنے ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔جسّے کا سوال سُن کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور رُک گیا۔اسے من میں تھوڑا سا تعجب بھی ہو رہا تھا کہ یہ کون شخص تھا جو اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔اس نے جسّے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا:

''ہاں میں پورن سنگھ ہوں۔''

''جسے نے فوراً ہی کہا: ''میں جسا سنگھ ہوں۔''

پولیس افسر کے چہرے پر جذبات کی کئی جھلکیاں پل بھر میں دکھائی دے گئیں۔ اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ اس دُھندلاہٹ میں جسّو نامی لڑکے کی شکل اُبھری۔ مگر اس زمانے کے جسّو اور آج کے جسا سنگھ میں کتنا فرق تھا...... کیا اس گندے سے لڑکے نے ایسے بھرپور جوان کا رُوپ اختیار کر لیا تھا؟

پورن سنگھ کا چہرہ ایک دم ہی کھل اُٹھا۔ چاہے وہ پولیس افسر بن گیا تھا لیکن اپنے بچپن کے یار کو کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے فوراً گھوڑے کو جسے کے گھوڑے کے قریب لے جا کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ جسے نے بھی اسی گرم جوشی سے اپنا پنجہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، دونوں دوستوں میں بیتے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں، جن کی نہ اُس وقت کوئی اہمیت تھی اور نہ اب۔ لیکن ان سب کو یاد کر کے وہ کتنے خوش ہو رہے تھے، ہنس بول رہے تھے اور بیچ بیچ میں قہقہے بھی لگا رہے تھے۔ جسا بولا:

''چھ برس کے بعد جب میں ہری پورے لوٹا، تو میں نے رحیم سے اپنے بچپن کے دوستوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تھی، اس نے تمہارے بارے میں خاص طور پر بتایا تھا کہ تُم پولیس کے اُفسر بن گئے ہو۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ ملنے کو بہت جی چاہتا تھا مگر اتا پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ملاقات ہونے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ آج اتفاق سے میل ہو ہی گیا۔''

''اچھا تو تُم اتنے برسوں میں کہاں کہاں رہے؟''

''مجھے چاچا نے چک پیراں بھیج دیا تھا۔ وہاں بھی چاچا کی زمین ہے اور کچا مکان ہے۔ اتنے برسوں تک میں وہیں رہا۔''

''مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ تم بہت ہی شاندار جوان نکلے ہو۔ تمہارے جیسے جوان سارے پنجاب میں بس گنے چُنے ہی ہوں گے۔''

جسا اپنی تعریف سن کر صرف انکساری سے مُسکرا کر رہ گیا۔ اس کے دوست نے پوچھا:

''تو اب تم سدا ہری پورے میں اپنے چاچا کے پاس ہی رہو گے؟''

جسے نے محسوس کیا، یا تو اس کے دوست کو چاچا کے جیل جانے کا کچھ پتا نہیں تھا، یا اس نے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جسے نے بھی خواہ مخواہ کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی، صرف اتنا ہی کہا:

''بات یہ ہے کہ اب چاچا نے چک پیراں میں اپنا پکا ڈیرا جما لیا ہے۔ یہاں کی زمین کی دیکھ بھال کرنے کے لیے مجھے بھیج دیا ہے۔ ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ اب مجھے ہری پورے میں ہی رہنا پڑے گا۔ میرا من تو نہیں لگ رہا لیکن مجھے یہاں رہنا ہی ہوگا۔''

جسا اپنے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے بھول کی تھی کہ گاؤں میں اس کا من نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا دوست من نہ لگنے کی وجہ بھی پوچھے گا مگر پورن سنگھ نے اس بارے میں

کوئی کرید نہیں کی یا تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا یا اس نے بات کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی۔ جسّے نے پوچھا:

''اس وقت کہاں جا رہے ہو؟''

''میں دَھمّی والا تک جا رہا ہوں۔''

''ڈیوٹی سے۔''

''ہاں...... مجھے پتا چلا تھا کہ صورت سنگھ نامی ایک نوجوان دھمّی والا میں موجود ہے۔ پولیس کو کافی دنوں سے اس کی تلاش تھی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے ہی وہاں جا رہا ہوں۔''

''اکیلے ہی؟''

پورن سنگھ نے اپنے چوڑے کندھوں کو ذرا سا ہلا کر جواب دیا:

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''میں نے صورت سنگھ کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔''

''وہ تمہارے علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ میرے علاقے کا بھی نہیں ہے۔ دوسرے علاقے سے یہاں آیا ہے۔''

''کیا وہ بڑا خطرناک آدمی ہے؟''

''میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ خوب صورت ہے اور بہت اچھا جوان ہے۔ ابھی تک اس نے بڑا کوئی خطرناک کام نہیں کیا۔ مار پیٹ کی چھوٹی موٹی کارروائیاں ہی کی ہیں۔ اس نے کسی ڈاکے میں بھی حصہ نہیں لیا، صرف معمولی چوریوں کے سلسلے میں اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ میں اسے پکڑ کر اسی کے علاقے کی پولیس کو سونپ دوں گا۔''

اب وہ دونوں گھوڑ سوار دُلکی چال سے چلے جا رہے تھے۔ پورن سنگھ نے پوچھا: ''تمہارا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''میں واپس اپنے گاؤں جا رہا ہوں لیکن میرا راستہ دھمّی والا سے ہو کر ہی گزرے گا۔''

''چلو، یہ بھی ٹھیک ہے، وقت اچھی طرح کٹ جائے گا۔''

جسّے نے سوچا تھا کہ اگر پورن سنگھ اس موقع پر اس کا ساتھ پسند نہیں کرے گا تو دھمّی والا میں رُکے بنا ہی اپنے گاؤں کو بڑھ جائے گا۔ جب پورن سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا، تو جسّے کو اطمینان ہو گیا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ دھمّی والا کی طرف بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دور سے گاؤں دکھائی دینے لگا۔ ابھی وہ آدھ میل ادھر ہی تھے کہ گاؤں کی طرف سے ایک آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ پورن سنگھ دھیرے سے بولا:

''یہ گاؤں کے نمبردار کا چھوٹا بھائی ہے۔ نہ جانے کیوں لپکتا ہوا اِدھر ہی کو آ رہا ہے۔ آج صبح

سویرے نمبردار خود صورت سنگھ کے بارے میں مجھے خبر دینے کے لیے آیا تھا۔"
وہ آدمی اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو سنبھالتے ہوئے قریب پہنچا تو ان دونوں نے لگامیں کھینچ کر گھوڑوں کو روک لیا۔ پورن سنگھ نے پوچھا:
"کوئی خاص بات ہے کیا؟"
اس آدمی نے جواب دیا:
"آپ ہی کا انتظار تھا صورت سنگھ یہاں سے کھسکنے کو ہے۔ میں نے ابھی ابھی اسے پرسنی کے ساتھ گلی میں کھڑے دیکھا تھا۔"
پورن سنگھ نے ٹھٹھک کر پوچھا: "پرسنی کون؟"
پرسنی کے بارے میں کیا میرے بھائی نے کچھ نہیں بتایا۔ اسی لڑکی سے ملنے کے لیے ہی تو صورت سنگھ یہاں آیا ہوا ہے۔ پرسنی پچھلے دنوں سے اپنی موسی کے گھر ٹکی ہوئی تھی۔ صورت سنگھ کو خبر مل گئی ہوگی۔ تبھی تو وہ کل رات یہاں آ پہنچا۔"
جسّے نے دیکھا کہ پورن سنگھ کے چہرے کا رنگ کچھ گہرا سا پڑ گیا ہے اور اس کی بھوؤں کے بیچ میں دو بل اُبھر آئے تھے۔ اس نے اس آدمی سے کہا:
"تو کیا تمہارے خیال میں اب تک صورت سنگھ گاؤں سے باہر نکل گیا ہوگا؟"
"ایسی اُمید تو نہیں، لیکن وہ گاؤں کی دوسری طرف سے ہی نکلے گا، کیونکہ ادھر کھیتوں کے آس پاس کافی جھاڑیاں ہیں اور کھیت پار کر لینے کے بعد بالکل جنگل سا ہے۔ صورت سنگھ کھلے میدان میں جانے کی بجائے جنگل والے راستے سے جانا بہتر سمجھے گا۔"
"اچھا تو ہم اسے گاؤں کی دوسری طرف جا کر ہی پکڑیں گے۔"
یہ کہہ کر پورن سنگھ نے ایک نظر جسّے پر ڈالی اور پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ دے کر اسے پوری طاقت سے دوڑا دیا۔ جسا بھی گھوڑا دوڑاتا ہوا پیچھے پیچھے ہولیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گھاس کے ننھے ننھے پودے اُکھڑ کر ادھر اُدھر اڑنے لگے۔ کچھ کتے بھی محض تفریح کے لیے بھونکتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ جب وہ گاؤں کی دوسری طرف پہنچ کر رُک گئے تو کتے بھی بڑی بے فکری سے چپ چاپ ادھر اُدھر بکھر گئے۔
ان دونوں کی نظر فوراً ہی صورت سنگھ پر جا ٹکی۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ ارُوڑی، یعنی کوڑے کرکٹ کے اُونچے ڈھیر پر کھڑے تھے۔
دونوں سواروں کے گھوڑوں کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور وہ رُک جانے پر بھی مچل رہے تھے۔
جسّے نے سوچا کہ ممکن ہے اسی کا نام پرسنی ہے۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی بھولی بھی لگتی تھی۔ پورن سنگھ کی شکل دیکھتے ہی صورت سنگھ اپنی محبوبہ سے وِداع ہو کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس پر پورن سنگھ نے پھر گھوڑے کو ایڑ دی اور پل بھر میں فرار ہوتے ہوئے جوان کو جا پکڑا......گھوڑا اس کے آگے روک کر

بولا:

''تم صورت سنگھ ہی ہو نا؟''

''آہو۔'' صورت سنگھ نے حامی بھری۔

کچھ دُوری پر رُکا جسا صورت سنگھ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نئی نئی ڈاڑھی کے بال بھورے اور نرم لگ رہے تھے۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں اور اس کے سینے پر سونے کا کنٹھا لٹک رہا تھا۔ اس زمانے کے بانکوں کی طرح اس کی پگڑی کے بیچ میں سے بالوں کا جوڑا باہر کو اُٹھا ہوا تھا اور اس پر کس کر بندھی ہوئی جالی کے رنگین پھند نے اس کے بائیں کان کے قریب جھول رہے تھے۔ صورت سنگھ بلاشبہ خوب صورت تھا لیکن وہ مکار اور اور چالاک دکھائی دے رہا تھا۔

پورن سنگھ نے سپاٹ آواز میں صورت سنگھ سے کہا:

''تمھیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔''

اتنی دیر میں لڑکی بھی ان کے قریب پہنچ گئی ممکن ہے پورن سنگھ کے آنے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی ہو۔ تبھی تو کئی لوگ تماشا دیکھنے کے لیے ارُوڑیوں پر آ کھڑے ہوئے تھے۔

صورت سنگھ کے چہرے پر ڈر کی ایک بھی علامت نہیں اُبھری۔ پورن سنگھ کی بات سن کر اس کے منہ کا کونا ایک طرف کو کھنچ گیا اور وہ پورن سنگھ کو دیکھتے ہوئے بولا:

''وَت تھانیدارا! ایہہ کوئی گل تاں نہ ہوئی..... ٹُردے بندے نُوں تُو گھوڑا نسا کے پھڑ لیا اے۔''

(اے تھانیدار! یہ کوئی بات تو نہ بنی...... پیدل چلتے ہوئے آدمی کو تُو نے گھوڑا دوڑا کر پکڑ لیا ہے۔)

اس لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ فخر نے لے لی تھی۔ جسا جوں کا توں اپنے گھوڑے پر بیٹھا من ہی من اس حالت پر مسکرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

پورن سنگھ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ مانا کہ صورت سنگھ قد آور نوجوان تھا لیکن پورن سنگھ کا قد اس سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ جہاں صورت سنگھ کا جسم کچھ نازک تھا، وہاں پورن سنگھ کا جسم کمایا ہوا تھا۔ عاشق معشوق کے دیکھتے دیکھتے پورن سنگھ نے گھوڑے کی لگام قریب کے ببول کی شاخ پر اٹکا دی اور خود کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر بھاری بھرکم بوٹوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولا:

''صورت سنگھ! اب تم دوڑ پڑو۔ میرے اور اپنے بیچ جتنا فاصلہ چاہے ڈال لو، ایک کھیت، دو کھیت کے بعد، یا جہاں سے جی چاہے مجھے آواز دے دینا۔''

جسّے کو لگا کہ پورن سنگھ بڑا گھمبیر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آواز میں نہ غصہ تھا نہ طنز۔ پورن سنگھ کی بات سُن کر صورت سنگھ کو پہلے تو تعجب ہوا پھر مارے خوشی کے اس کا چہرہ دمک اُٹھا...... اس نے پرسنّی کی طرف پھرتیلیں کے انداز سے نظر ڈالی اور کھیتوں کی طرف چل نکلا۔

اس بیچ پورن سنگھ اور پرسنّی کی آنکھیں پل بھر کو بھی نہیں ملیں۔

دو کھیت پار کر جانے کے بعد صورت سنگھ نے زور سے آواز دی:

''آجا تھانیدار!''

پورن سنگھ ننگے پاؤں تیار کھڑا تھا۔ صورت کی آواز سنتے ہی بھی دوڑ پڑا۔ گاؤں والوں کے یہ تماشا انوکھا اور قابلِ دید تھا۔ ملزم اور تھانیدار آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ صورت سنگھ کو اپنی تیز رفتاری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ من ہی من وہ اس بات پر چہک رہا تھا کہ تھانیدار کے فرشتے بھی اس کی دھول تک کو نہیں پہنچ سکیں گے۔

کچھ دیر تک یہ دوڑ برابر کی چلتی رہی۔ دھیرے دھیرے صورت سنگھ کو محسوس ہونے لگا کہ تھانیدار انسان نہیں بھوت تھا۔ ان دونوں کے بیچ کا فاصلہ پل پر پل کم ہوتا جا رہا تھا۔ صورت سنگھ کے من میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

پورن سنگھ ریل کے انجن کی طرح بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس کا جسم بہت بھرپور تھا۔ اس سے اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ دوڑ میں صورت سنگھ کو ہرا دے گا...... اپنی پوری طاقت سے دوڑتے ہوئے صورت سنگھ نے کنکھیوں سے دیکھا کہ تھانیدار ایک فرّاٹے کے ساتھ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس سے چالیس پچاس قدم کی دُوری پر پہنچ کر پلٹ پڑا۔ صورت سنگھ رُک گیا۔ پورن سنگھ نے قریب آ کر گھمبیرتا سے پوچھا:

''وَت صورت سیاں! ہُن تاں ٹھیک اے ناں؟''

صورت سنگھ دم سادھ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

پورن سنگھ نے پھر کہا:

''اچھا تو اب تم چلے آؤ...... میں جا کر موزے اور بوٹ پہن لوں۔''

صورت کو جہاں کا وہاں چھوڑ کر پورن سنگھ گاؤں کی طرف دوڑنے لگا۔ صورت سنگھ کے من میں شک کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی اور اسے وشواس ہو گیا تھا کہ تھانیدار کے چنگل سے بچ کر فرار ہونا ناممکن تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی جگہ پر رُکا رہا، پھر گاؤں کی طرف چل دیا۔

پورن سنگھ واپس لوٹا، تو پرسنّی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ کہنا کٹھن تھا کہ پورن سنگھ کو بھی پرسنّی کی اس حرکت کا احساس تھا یا نہیں، لیکن اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ اس نے موزے چڑھا کر بوٹ پہنے اور ان کے تسمے کس دیئے۔ جب پورن سنگھ نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی، تب بھی پرسنّی اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

جسّے کو شُبہ ہوا کہ اس میں بھی کوئی راز ہے۔ پرسنّی کی شخصیت میں رانیوں جیسی شان تھی اور اس کی پورن سنگھ پر ٹکی ہوئی نظر بھید سے خالی نہیں تھی۔

اتنے میں صورت سنگھ بھی پہنچ گیا۔ اس نے پرسنّی کی طرف دبی نظروں سے دیکھا لیکن اب کے اس کی نگاہ

میں عجیب مایوسی اور جھینپ تھی۔

پورن سنگھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے پاؤں رکابوں میں جما کر لگام سنبھالتے ہوئے کہا:

''صورت سنگھ! اب تم کو میرے ساتھ تھانے چلنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ کبھی میرے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔''

قریب ہی اتنے لوگ کھڑے ہوئے تھے پھر بھی سارے ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پورن سنگھ کا گھوڑا جسّے کے قریب سے ہو کر کچھ آگے بڑھ گیا۔ جسّا اب بھی صورت سنگھ اور پرسنّی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پورن سنگھ کی بات سُن کر صورت سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے پرسنّی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا لیکن پرسنّی نے جھٹ سے ہاتھ چھڑا لیا اور تند لیکن چھری کی سی تیز آواز میں بولی:

''چھوڑو میرا ہاتھ۔''

پورن سنگھ کئی گز آگے نکل گیا تو اسے محسوس ہوا کہ جسّا ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ اس نے مڑ کر دوست کی طرف دیکھا اور آواز دے کر بولا:

''آؤ بھئی جسّے۔''

جسّا دھیرے دھیرے پورن سنگھ کی طرف بڑھا۔ جب وہ پہلو بہ پہلو ہو گئے تو دونوں نے گھوڑوں کو زور سے ایڑ دی اور گھوڑے سٹپٹا کر ایک ہی چھلانگ میں آگے بڑھے اور سرپٹ دوڑنے لگے۔

کچھ مست کتے جو اب تک اِدھر اُدھر کوڑ کرکٹ سونگھ رہے تھے، ایک دم چونکے اور ان سواروں کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑوں کی دھول تک نہیں پہنچ سکے۔

دونوں سوار چپ چاپ گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ شاید وہ دونوں ہی اپنے اپنے وچاروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کھیتوں، چھوٹے چھوٹے ٹیلوں، ننھے مُنّے پانی کے نالوں سے گزرتے ہوئے وہ بڑھتے ہی چلے گئے۔

اس طرح لگ بھگ ایک کوس تک ان کا ساتھ رہا۔ ببول کے پیڑوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچ کر وہ رُک گئے۔ جسّا بولا:

''یہاں سے ہمارے راستے الگ الگ ہو جائیں گے۔''

پورن سنگھ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور وہ بولا:

''راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن بچپن کے دوستوں کے دل تو الگ نہیں ہو سکتے۔''

جسّے کے اُداس من پر اپنے لڑکپن کے دوست کی اس بات کا بہت اچھا اثر پڑا، بولا: ''بے شک!''

پورن سنگھ کا گھوڑا اچھل رہا تھا۔ اس نے جانور کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''آج کا دن بڑا اچھا رہا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم ضرور آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔''

''تم سے ملنے سے پہلے میں کچھ وجوہات سے اُداس تھا، مگر اس سہانی ملاقات سے دل کی ساری

اُداسی دُور ہو گئی ہے۔ جب بھی موقع ملا میں تمہارے پاس آؤں گا۔''

''ضرور آنا............ یوں تو میں بھی تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں، لیکن آ نہیں سکوں گا۔ اس کی وجہ پھر کبھی بتاؤں گا۔''

اب ایک دوسرے سے وداع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ چلنے سے پہلے جسا بولا:

''پورن سنگھ، مجھے تجسّس تو بہت ہو رہا ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اس لڑکی ...... میرا مطلب ہے پرسنّی سے پریم کرتے ہو؟''

اس پر پورن سنگھ نے اپنے گھوڑے کو زور سے ایڑ دی۔ گھوڑے نے آگے کو چھلانگ لگائی اور تیزی سے دوڑتے ہوئے سوار نے جواب دیا: ''ہاں!''

جسا گھر پہنچا تو جب وہ ہانپتے ہوئے گھوڑے کو رحیم کے حوالے کر رہا تھا، تو اس نے کہا:

''اَب آپ گھر سے باہر جانے سے پہلے بے بے جی سے مل لیجیے گا۔ وہ کافی دیر سے آپ کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔''

جسّے نے رحیم کو کوئی جواب نہیں دیا اور وہ سیدھا گھر میں جا گھسا۔ بُوا اسے بھی کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ خود ہی بول اُٹھی:

''ارے چھوکرے، کہاں تھا تُو صبح سے؟''

''دوسرے گاؤں میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔''

''اب تو تو اکثر ہی گاؤں سے باہر نکل جاتا ہے اور گھنٹوں غائب رہتا ہے نہ جانے کیا بات ہے؟''

''بُوا خواہ مخواہ نہ تو خود پریشان ہوا کرو اور نہ مجھے کیا کرو۔ اب میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں...... مجھے بعض کاموں کے سلسلے میں اِدھر اُدھر جانا پڑتا ہے۔ اب لوٹا، تو رحیم چاچا نے بتایا کہ تم مجھے ڈھونڈ رہی ہو...... کیا کوئی خاص بات ہے یا یوں ہی......۔''

''یہ تو میں نہیں جانتی لیکن تمہارے چاچا نے تمہیں فوراً ہی بلایا ہے۔''

چاچا کے بارے میں سن کر جسا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بولا:

''چاچا نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''اب یہ مجھے کیا مالوم۔''

''کوئی خط آیا ہے؟''

''نہیں تمہارے چاچا کا دوست لدھا سنگھ چک پیراں گیا ہوا تھا۔ آج ہی لوٹا ہے، اور اسی نے یہ پیغام دیا ہے۔''

''تم نے پوچھا نہیں، کہ چاچا کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

بھجو کچھ اُکھڑ کر بولی:

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ آخر وہ تمہارے چاچا ہیں...... بلایا ہوگا کسی کام سے۔''

جسا ماتھے پر بل ڈال کر بولا:

''میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے اس سے پوچھا کہ نہیں پوچھا؟''

''نہیں پوچھا تو اپنے چاچا سے گھبراتا کیوں ہے وہ تجھے نگل تو نہیں جائے گا۔''

''اچھا اچھا! کل صبح میں چل دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تیرے کپڑے تیار کر دوں گی۔''

جسے کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ بات تو صاف تھی کہ نہ چاچے کو بھتیجے سے اور نہ بھتیجے کو چاچے سے کوئی پیار تھا۔ آخر اتنی جلدی چاچے نے اسے کیوں بلا بھیجا۔

دوسرے دن ایک چھوٹی سی گٹھڑی میں کپڑے باندھ کر جسا ریل گاڑی پر سوار ہو گیا۔ راستے بھر بار بار اس کے من میں یہی وچار اُٹھتا تھا کہ آخر چاچا نے اسے اتنی جلدی کیوں بلا بھیجا۔

گاڑی کا سفر ختم ہونے کے بعد جسے کو چک پیراں تک پیدل جانا تھا۔ اس نے لاٹھی کے سرے پر گٹھڑی پھنسا دی اور کندھے پر رکھ کر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔

چک پیراں کے آس پاس کا علاقہ جسے کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا لڑکپن وہیں پر تو گزرا تھا۔ وہ گاؤں اسے ہری پورے سے کہیں زیادہ پیارا تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے سے اسے محبت تھی۔ ہری پورے کی ایک ہر ایک یاد اس کے لیے تلخ تھی۔ وہاں لے کر دے کر دیپی تھی لیکن ابھی تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی۔ اسے وشواس نہیں ہوتا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا۔ کاش! چاچا اسے ہری پورے نہ بھیجتا۔ بچپن سے اس کے من میں دیپی کی ہلکی سی تصویر بنی ہوئی تھی...... وہ بھی دھیرے دھیرے سدا کے لیے مٹ جاتی۔

ہری پورے میں جانے سے ہی وہ محبت پھر سے تازہ ہو گئی۔ دیپی کے بچپنے اور جلد بازی نے ان کی پول کھول دی۔ ہری پورے میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا، کوئی اسے اپنانے کو تیار نہیں تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ گھنا اور چنن سنگھ کے بیٹے اسے پل بھر کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور اس سے ٹکر لینے پر تلے ہوئے تھے۔

جب جسے نے مکان کے صحن میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر جگیر سنگھ پر پڑی جو اپنی آڑی ٹانگوں کے بیچ میں بڑا سا کونڈا رکھے ایک لمبے موٹے ڈنڈے سے بھنگ گھوٹ رہا تھا۔

جسے کے لیے یہ منظر انوکھا نہیں تھا۔ ادھر جگیر سنگھ نے اس کی طرف دیکھا تو اسے جسے کو پہچاننے میں پل دو پل لگ گئے لیکن جوں ہی اس نے جسے کو پہچانا تو وہ پٹاک سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سدا کی طرح اس کی دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے بیچ میں اس کے کچھے کا میلا آزار بند جھول رہا تھا۔ مارے خوشی کے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ اونچی آواز میں بولا:

''لو، آ گیا اپنا بیٹا جسا۔''

اس کی بوڑھی عورت کوٹھری کے بھیتر سے صحن میں آ گئی اور اس نے جسے کو آشیرواد دیا۔ ان کی اتنی اپنائیت کو

دیکھ کر جسّے کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے اصلی گھر میں لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ چاچا کہاں تھا۔

جگیر سنگھ نے خود ہی بتایا:

''تمہارا چاچا لال پری لینے گیا ہے۔''

جسّے کو معلوم تھا کہ گاؤں میں ایک پرانا پاپی سوداگر سنگھ اپنے گھر میں ہی شراب تیار کیا کرتا تھا۔ وہ لوہے کے کنستر میں نہ جانے کیا کیا ملا کر اروڑی میں دبا دیا کرتا تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس کا کنستر کہاں دبا ہوا ہے۔ مقررہ دِنوں کے بعد وہ اپنا کنستر نکالتا اور خاص خاص دوستوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا۔ کہتے ہیں کہ کئی مرغے اُبال کر ان کے سوپ میں یہ شراب تیار کرتا تھا۔ اس لیے اس شراب کا ایک گھونٹ پینے والے کے نس نس میں بجلی دوڑ جاتی تھی۔

جسّا اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا اس کے کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھا کر بھیتر چلی گئی۔ جب وہ لوٹی تو جگیر سنگھ نے پوپلے منہ سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''عجیب عورت ہو تم۔''

بڑھیا منہ پھلا کر بولی:

''او ہائے! کیا کیا میں نے۔ ہر وقت مجھ پر برستے رہتے ہو۔ تمہارا داؤ لگے تو میری ہڈیاں بھی چبا کر کھا جاؤ۔''

ان کی اس نوک جھانک سے جسّے کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی وہ لڑکپن سے اس کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بڈھے بڈھی کا آپس میں کتنا پریم تھا۔ یہ نوک جھونک بھی اسی چاہت کا ایک رُوپ تھا۔

جگیر سنگھ نے ماتھے پر کئی بل ڈال کر کہا:

''اے بڑھیا! تیرے کھوپڑے میں تو نرا بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ اپنا بیٹا آیا ہے۔ اسے کچھ کھلائے پلائے گی نہیں۔ روٹی تو رات کو پکے گی لیکن ایک چھنّا بھر دودھ تو اب بھی پلا سکتی ہو۔''

بڑھیا کو کھلانے پلانے کا اور بھی زیادہ شوق تھا۔ جسّے کو تو وہ برسوں تک بیٹے کی طرح کھلا پلا چکی تھی۔ وہ فوراً ہی جسّے کے لیے دُودھ کا کٹورہ لے آئی۔

دودھ ختم کر کے جسّا اپنی مونچھیں پونچھ ہی رہا تھا کہ وسیع صحن کے دوسرے سرے سے اسے چاچا آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ جسّے پر اس کی نظر تو پڑی، لیکن اس کے پاس سے یوں گزر گیا، جیسے نہ تو وہ اسے پہچانتا ہے اور نہ ہی اسے نے اپنے بھتیجے کو بلایا ہے۔

جسّے نے بھی چاچے کی اس حرکت کا بُرا نہیں مانا۔ شروع ہی سے ان دونوں میں اسی قسم کا رشتہ چلا آ رہا تھا۔

صحن کے پرلے کونے میں ایک چبوترا کھپریل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور کھپریل کا ڈھانچہ لکڑی کے دو بے ڈول ستونوں پر لکا ہوا تھا۔ شاید جگے کے بیٹھنے کے لیے بڑھیا نے پہلے سے چبوترے پر کھیس بچھا رکھا تھا۔ وہاں چاندی کا گلاس بھی رکھا تھا اور بڑھیا اس کے لیے پکوڑے تلنے جا رہی تھی۔

جسا چپ چاپ چاچا کی طرف دیکھتا رہا۔ چاچے کے من کا حال تو واہ گورو جانے، لیکن دیکھنے میں وہ پہلے ہی کی طرح ہٹا کٹا تھا اور اس کے چہرے پر لالی کی جھلک تھی۔

بگا چبوترے پر بیٹھ گیا۔ بوتل میں کس کر ٹھنسے ہوئے کارک کو اس نے دانتوں سے پکڑ کر ایک دم باہر کھینچا تو اس میں سے پک کی آواز نکلی۔ بگے نے چاندی کے گلاس میں شراب ڈالی اور گلاس میں ہاتھ میں اُٹھایا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ شراب کے ہر گھونٹ کے بعد وہ اپنی مونچھوں کے اوپر ہاتھ رکھ کر انہیں نیچے کی طرف دباتا اور مونچھوں کے سرے پر لگی شراب کو چوس لیتا۔

صحن میں بیٹھے بیٹھے گاؤں کے باہر بہت دُور تک نظر دوڑائی جا سکتی تھی۔ اپنے دِچاروں میں کھویا ہوا بگا دُور تک پھیلے کھیتوں اور درختوں کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ گرم گرم پکوڑے آئے تو اس نے شراب کے ساتھ ساتھ پکوڑے کھانے شروع کر دیئے۔

اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی بگے نے بھتیجے سے کوئی بات نہیں کی۔ جسے کو شک ہونے لگا کہ چاچا نے اسے بلایا بھی تھا یا کسی نے غلط پیغام دیا۔ پیغام غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جسا بھی مگن بیٹھا رہا۔ اس نے سوچا کہ اگر چاچا نے کوئی بات نہ کی تو وہ دوسرے دن واپس ہری پورے کو چل دے گا۔

اندھیر چھانے لگا تو دُور سے آواز سنائی دی:

دما دم مست قلندر
علی دم دم دے اندر

یہ آواز دُور گلی سے آ رہی تھی لیکن اسے سنتے ہی جیسے بگے کے کان کھڑے ہو گئے۔ آواز قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مسلمان سائیں بابا خانے دار تہمد باندھے اور اس پر ہرے رنگ کا چوغہ پہنے صحن کے دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ انہیں دیکھا تو بگا چہک کر بولا: ''آؤ سائیں جی............ جلیے آؤ نا۔''

ان سائیں بابا کو جسے نے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں چکر لگایا کرتے تھے۔ گلے میں چھوٹے بڑے منکوں والی کئی مالائیں، آنکھوں میں سرمہ، کندھے تک لٹکی ہوئی زُلفوں پر بندھا ہوا ہرے رنگ کا رومال، کانوں میں مُندرے، داہنی کلائی پر لوہے کے کئی کڑے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا...... اسی ڈنڈے سے وہ کڑوں کو بجاتے ہوئے بھیتر چلے آئے۔ اب ان کی ڈاڑھی میں سفید بال زیادہ دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ اسی شان اور زوردار آواز سے ''دمادم مست قلندر، علم دم دم دے اندر'' گاتے ہوئے بگے کے پاس آ پہنچے۔ بگے نے بڑی عزت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور بولا:

''سائیں جی! معاف کرنا، بُرا کام کر رہا ہوں، ایسی چیز پی رہا ہوں جو آپ کو پیش نہیں کر سکتا۔''

سائیں جی نے جیسے آشیرواد دینے کے انداز سے ڈنڈے والا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور کہا:

''پی ہم نے بھی رکھی ہے...... لیکن وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے۔ ہم اللہ کے پلائے ہیں، ہمارا نشہ دوسرا ہے۔''

''سوتو میں جانتا ہوں سائیں جی...... لیکن آپ پکوڑے تو کھا سکتے ہیں۔''
سائیں جی نے ایک پکوڑا اُٹھایا اور جسے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:
''یہ جوان کون ہے؟''
بگا بھاری آواز میں بولا:
''یہ میرا بھتیجا جسا ہے۔''
اب جگیر سنگھ بول اُٹھا:
''سائیں جی، یہ تو اپنا ہی بیٹا ہے کچھ ہی عرصے سے ہری پورے میں ہے۔ اس سے پہلے تو یہیں رہا کرتا تھا۔ آپ بھی تو گاؤں کا چکر لگایا کرتے تھے۔''
''ہاں!'' سائیں جی نے کہا: ''کبھی دھیان نہیں دیا ہوگا اس کی طرف۔ ہم چلتے ہیں ہماری کھلی آنکھیں باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف دیکھتی ہیں۔''
جسے نے سائیں جی کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ سائیں جی نے بھی، جہیں کا وہیں بیٹھے ہاتھ اوپر کو اُٹھا کر کہا:
''اللہ مہر کرے گا بچہ!''
اس کے بعد بگے اور سائیں جی کی گیان دھیان کے موضوع پر بات چیت شروع ہوگئی۔ بگا ایک آدھ بات پوچھ لیتا اور سائیں جی خوب لمبا چوڑا بھاشن دے دیتے...... آخر بات چیت نے دوسرا رُخ اپنایا...... موضوع یہ تھا کہ گیان دھیان کے راستہ میں عورت ذات کتنی بڑی رکاوٹ ثابت ہوسکتی ہے۔ یہیں سے یہ راجہ بھرت ہری کا ذکر شروع ہوگیا کہ اپنی بدچلن رانی پنگلا کی وجہ سے اس نے اپنا راج پاٹ تیاگ کر سنیاس لے لیا اور خود کو ایشور کے پریم میں کھو دیا۔
بگے نے کہا:
''سائیں جی، اپنی زبان مبارک سے بھرت ہری کے دو چار بول بھی سنا دیں۔''
سائیں جی کا گلا واقعی بڑا سُریلا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کیسے اپنی رانی پنگلا کی بیوفائی کا پتا لگنے پر راجہ بھرت ہری اپنے محل میں جاتا ہے اور رانی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اک اپنا نام بدنام کیتو، دِتی نال میری لاج روڑ چنڈی
ہُندی مینوں خبر ہُشیار ہیں تُوں، تیری رکھدا بھُل نہ لوڑ چنڈی
تیرے پچھے میں اپنی عمر گالی، میرے دل ارمان کروڑ چنڈی

''یعنی، اے چنڈال! ایک تو تُو نے اپنی بدنامی کرائی اور اس کے ساتھ ہی میری لُٹیا بھی ڈبو دی۔ اے چنڈال! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تُو بدچلن ہے تو میرے مَن میں کبھی تیری طلب ہی نہ پیدا ہوتی۔ اے چنڈال! تیرے پیچھے میں نے اپنا جیون تباہ کرلیا، میرے دل میں کروڑوں ارمان

تھے......"

یہ سُن کر بگا سنگھ سر دُھننے لگا اور زور سے پکار اُٹھا:

"واہ جی واہ! کتنی سچی بات کہی ہے کروڑوں ارمانوں کا خون کر دیا رانی پنگلا نے......"

سائیں جی نے پھر بتایا کہ وہ یہ بول مشہور سنت دھرم داس کے گرنتھ سے سنا رہے ہیں۔ سائیں جی نے کچھ اور بول شروع کر دیئے:

بار بار دِھکار نالے دُرشٹ پاپی نچ کام تائیں!!
بُرا بھلا نہ نفع نقصان سوچے، نیں ویکھدا اے خاص عام تائیں
دھرم داس ہُن چل کے جوگ لیئے، چھوڑ کوڑ کمام تمام تائیں

"یعنی تم پر بار بار دِھکار ہے اور اس کام پر بھی دِھکار، جس نے مجھے اتنا نیچ بنا دیا۔ شہوت کا جذبہ بُرے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نقصان نیز نفع کو بھی نہیں سمجھتا، یہ جذبہ معمولی سے معمولی انسان سے لے کر اونچے سے اونچے انسان تک کو بے بس کر دیتا ہے۔ اے دھرم داس! اس جھوٹ اور مایا کے سنسار کا تیاگ کر کے اب سنیاس لے لینے میں ہی نجات ہے۔"

یہ سُریلے بول سُن کر بگے کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز بولا:

"سائیں جی، آپ کا جواب نہیں ہے۔ آپ تو من کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔"

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر جگیر سنگھ بھی بھنگ کے نشے میں دُھت ہو کر جسے کے پاس آ بیٹھا اور طنزیہ انداز میں پھسپھسا کر بولا:

"جدتوں رام پیاری نے تیرے چاچے دی تُو اُتے لت ماری ہے تدتوں تیرے چاچے دی من دیاں اکھاں کھل گئیاں نیں۔"

(جب سے رام پیاری نے تیرے چاچے کے چوتڑوں پر لات جمائی ہے، تب سے تیرے چاچے کے من کی آنکھیں کھل گئیں ہیں۔)

جگیر سنگھ بنا دانتوں والے منہ سے کھی کھی کر ہنسنے لگا۔ اس کی اس بات پر جسا بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے اپنے چاچا پر ترس سا آنے لگا۔

راجہ بھرت ہری سے رانی پنگلا کی بیوفائی کی بات سُن کر بگا سنگھ کے من پر بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔ اسے ہر بار اپنے جیون کا وہ دُکھی واقعہ یاد آ جاتا۔ جب کبھی سائیں جی چک پیراں کا چکر لگاتے، تو بگے کو ملنے کے لیے ضرور آتے تھے۔ ان سے بات چیت کر کے بگے کو انوکھا سکون کا احساس ہوتا تھا۔

بگے کا شراب کا دور چلتا رہا۔ اب بھوجن کا وقت آیا، تو سائیں جی اُٹھ کر چل دیئے۔ بھوجن کے بعد بھی چاچے بھتیجے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب جسا چک پیراں میں رہا کرتا تھا تو اس نے سونے کے لیے ایک الگ کوٹھڑی میں بندوبست کر رکھا تھا۔ آج بھی وہ اسی کوٹھڑی میں جا کر سویا۔ اس نے بھیتر سے دروازہ بند کر لیا اور بستر

پر لیٹ گیا۔ کوٹھڑی کے کونے میں سرسوں کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی پھڑ پھڑاتی روشنی میں وہ چھت پر لگے مکڑی کے جالے کو وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھید اب بھی بنا ہوا تھا کہ چاچا نے اسے بلایا کیوں۔ اگر بلا ہی لیا تو اب تک کوئی بات چیت کیوں نہیں کی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چاچے نے نشے کی جھونک میں پیغام بھیج دیا ہو...... اس طرح سوچتے سوچتے اس کا دھیان ہری پورے کی طرف چلا گیا۔ چنن سنگھ کے بیٹوں سے لے کر دیپی تک کے چہرے اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔ اس کا دماغ عجیب سے تناؤ میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ خود اپنے کو مکڑی کے جالے میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا......

دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

جسے نے چونک کر پوچھا: ''کون؟''

''دروازہ کھولو......سو گیا کیا؟''

چاچے کی آواز سن کر جسا اُٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اتنی شراب پی کر بھی بگا ڈانواں ڈول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھی کی طرح چلتا ہوا جسے کے بستر پر بیٹھ گیا۔ جسے کو چاچا سے دور دور رہنے کی عادت تھی۔ وہ چار پائی پر نہیں بیٹھا بلکہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

بگے کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے تھے اور اس کی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئیں تھیں اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہی ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا۔ جسا چپ چاپ کھڑا چاچے کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر بگے نے کہا:

''جسے میں سوچتا ہوں کہ ہری پورے والا مکان اور زمین بیچ ڈالوں۔''

یہ بات اتنی انوکھی تھی کہ جسے کے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا: ''کیوں؟''

اب کے بگے نے جسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''اس زمین کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

چاچے کی یہ بات سن کر جسے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے پر زور کا گھونسہ لگا ہو۔ اس نے سوچا کہ چاچا کے کانوں تک سب باتیں پہنچ چکی ہیں۔ کیا وہ جانتا ہے کہ چنن سنگھ کے لڑکوں نے اس کے بھتیجے کا نام میں دم کر رکھا ہے؟ کیا اسے یہ بھی معلوم ہے ہو چکا ہے کہ اس کا بھتیجا دیپی سے پریم کرنے لگا ہے۔

بات جو کچھ بھی ہو، جسا کہے بنا نہیں رہ سکا:

''میں جو ہوں......میں وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔''

بگا چار پائی سے اُٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا پھر یکا یک رُک کر اس نے پوچھا:

''تم ہری پورے میں قدم جما سکو گے؟''

جسا سوچنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ چاچا اسے صاف طور پر کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ لیکن اس وقت جیسے وہ اسے للکار رہا تھا...... چیلنج کر رہا تھا۔

جسے کے کان گرم ہو گئے۔ بگا پھر بولا:

"وہاں کی زمین بیچ کر تم بھی یہاں رہ سکو گے۔"

جسا مضبوط آواز میں بولا:

"نہیں چاچا! میں ہری پورے میں ہی رہوں گا۔"

"سوچ لو...... تمہارا چاچا تو وہاں نہیں رہ سکا۔"

اتنا کہہ کر بگے نے منہ پھیرا اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا پرے چلا گیا۔

شاید چاچے اور بھتیجے دونوں کے دماغ میں زوردار جدوجہد چل رہی تھی۔ جسے کے دانت بھنچ گئے تھے۔ اندر ہی اندر نہ جانے اسے کیا ہوا۔ چاچے نے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا۔ جسا سپاٹ آواز میں بولا:

"میں کل ہری پرے لوٹ جاؤں گا۔"

بگا سنگھ گھوم کر اس کے قریب چلا آیا، اس کے بالکل سامنے کچھ پلوں تک سیدھا کھڑا رہا، پھر دروازے کی باہر نکل کر دروازے کے دونوں تختوں کو اس نے بہت دھیرے دھیرے بند کر دیا۔

جب پھر جسا لوٹا تو دُور سے ہی ہری پورے کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اگلے چند دنوں میں اس گاؤں میں کچھ اہم واقعات رونما ہونے جا رہے تھے۔

ساتواں غلاف

جیہڑیاں لین اُڈاریاں نال بازاں، اوہ بُلبلاں تھک مریندیاں نیں

(وارث شاہ)

”جو بلبلیں بازوں کے ساتھ اُڑنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ آخر کار تھک کر مرجاتی ہیں۔“

۱

ہری پورے لوٹ آنے کے بعد جسّے نے پہلا کام یہ کیا کہ فرصت کے وقت گھڑسواری کرنے کی بجائے اس نے گاؤں میں بےفکری سے گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ خوفزدہ نہ وہ پہلے تھا، نہ اب تھا لیکن اس یکا یک ہونے والی تبدیلی کے لیے اس کا ذہن تیار نہیں تھا۔ دیپی سے ناطہ ٹوٹ جانے کا بھی اسے بہت دُکھ تھا۔ سجن سنگھ سے ملاقات کے بعد بھلا وہ کسی بات کی اُمید رکھ سکتا تھا.......... لیکن چک پیراں کا چکر لگانے پر اسے اس بات کا بھی احساس ہو گیا کہ اب وہ ایسی منزل پر تھا، جہاں سے قدم ہٹانا اس کے لیے ناممکن تھا..... آخر پیچھے ہٹ کر بھی اس کے لیے کیا رکھا تھا۔

اس نے مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ اسے صرف اس بات کا اشارہ ہو گیا کہ اپنی مشکلات سے منہ چھپانے کی بجائے اسے ان سے ٹکر لینی پڑے گی۔ اس ٹکر کا روپ کیا ہوگا اور یہ کس طرح کی ٹکر ہوگی، اس بات کا اسے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ گاؤں میں اس کا کوئی ایسا بےتکلف یار دوست نہیں تھا، جس سے وہ صلاح مشورہ کر سکے۔

چنن سنگھ کے بیٹوں اور اس کے ساتھیوں نے پھر جہاں وہاں جسّے کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا۔ جسا ہاتھی کی سی بے پرواہی کے ساتھ گھومتا رہتا تھا، جیسے وہ سب ایسے کتے تھے جن کے بھونکنے کا اس کے من پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا تا کہ سب گاؤں والے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور کانوں سے سُن لیں کہ اس کے چچیرے بھائی وغیرہ کیا کیا حرکتیں کر رہے ہیں اور کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔

جسّے کا یہ منصوبہ غلط نہیں تھا۔ گاؤں والے کافی عرصے سے دیکھ رہے تھے کہ چنن سنگھ کے بیٹے جسّے کو خواہ مخواہ بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے پہل جسّے کی قوتِ برداشت کو دیکھ کر گاؤں والوں کو تعجب ہوا کہ آخر بگا سنگھ کا بھتیجا یہ سب حرکتیں کیسے سہہ لیتا ہے۔ اس کے بعد حیرانگی کی جگہ تعریف نے لے لی۔ لوگوں میں یہ عام خیال تھا کہ جسا طاقتور ہونے کے باوجود کسی قسم کا جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے چنن سنگھ کو بھی جا کر بار بار سمجھایا کہ وہ اپنے لڑکوں کو روک لے ورنہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

چنن سنگھ نے سب کو ہنس کر ٹال دیا۔ حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی وہ کہتا کہ وہ سب بچے ہیں اور

اس عمر میں ہنسی مذاق چلتا ہی رہتا ہے۔
کچھ دن اور بیت گئے تو لکھا سنگھ، دلیر سنگھ، ٹھمنا وغیرہ کی ہلڑ بازی پر گاؤں والے بُری طرح بوکھلا اُٹھے۔ انہیں جسّے پر بھی غصہ آنے لگا، آخر قوتِ برداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ جسا ان کا اتنا لحاظ کیوں کرتا تھا؟...... یا کیا وہ ان سے دبتا اور ڈرتا تھا؟

انجانے ہی جسا گاؤں والوں کی نظر میں ایک ایسا ہیرو بن چکا تھا جو ہر طرح کی زیادتی ہونے کے باوجود پُرسکون رہتا تھا لیکن اب تو گاؤں کا بچہ بچہ یہ چاہنے لگا تھا کہ جسا ان بدمعاشوں کو منہ توڑ جواب دے۔
آخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی۔

گاؤں میں ایک دُکاندار نے کچھ عرصے سے سوڈا بھرنے کی مشین لگائی تھی۔ وہ دستی مشین تھی اور ایک بار میں شیشے کی گولی والی صرف دو بوتلیں تیار کرتی تھی۔ دُکان کے ایک حصے میں تمام گاہکوں کے سامنے دستی مشین گھما گھما کر بوتلیں تیار کی جاتی تھیں۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن کے تیسرے پہر جسا سوڈے کی میٹھی بوتل پینے کے لیے اس دُکان پر پہنچا۔ وہاں پانچ چھ گاہک پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان میں سے کچھ بوتل پی چکے تھے اور ایک دو کے ہاتھ میں بوتلیں موجود تھیں۔ دو بوتلیں مشین میں گھمائی جارہی تھیں۔ جسّے کو دیکھ کر لوگوں نے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ کچے چبوترے پر بورا بچھا ہوا تھا۔ جسا پاؤں گلی میں لٹکا کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اب وہ کافی مقبول ہو چکا تھا۔ گاؤں والوں کو اس پر فخر محسوس ہوتا تھا کیونکہ سب ہی یہ قبول کرتے تھے کہ علاقے بھر میں ان کے گاؤں کے اس جوان کے مقابلے کا اور کوئی جوان نہیں تھا۔ اس کی قوتِ برداشت سے وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

اتنے میں دو میٹھی بوتلیں تیار ہو گئیں۔ بوتل کے منہ سے شیشے کی گولی دو طریقوں سے ہٹائی جاتی تھی۔ ایک تو لکڑی کی کپی سے، جسے اُلٹا کر کے بوتل کے منہ پر جما دیا جاتا تھا اور اس پر زور سے ہاتھ مارا جاتا، تو گولی سٹک کر نیچے گر جاتی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بھی آدمی بوتل کے منہ میں گولی کے اُوپر اپنا انگوٹھا ٹکا دیتا اور انگوٹھے کے اوپر ایک گھونسہ کس کر مارتا تو گولی پٹاک سے نیچے لڑھک جاتی۔ ایسا کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی مگر جسّے کا طریقہ سب سے الگ تھا۔ وہ اپنے لمبے چوڑے ہاتھ سے بوتل کی گردن تھام کر اسی ہاتھ کا انگوٹھا گولی پر جما دیتا اور انگوٹھے سے گولی کو اتنی طاقت سے دباتا کہ وہ نیچے کو سٹک جاتی۔ ایک ہی ہاتھ سے یہ سارا کام کرنا دوسروں کے لیے ناممکن تھا۔ اسی لیے جسا جب بھی بوتل پینے جاتا، تو وہاں بیٹھے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے رُکے رہتے۔ دُکاندار بوتل میں اتنے زور کا سوڈا بھرتا تھا کہ گولی کو صرف ایک ہاتھ کے زور پر انگوٹھے سے نیچے کو سٹکانا، ناممکن تھا...... دوسرے کئی لوگ کوشش کر چکے تھے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہو پائے۔

اب بوتلیں تیار ہو گئیں، تو وہاں پر بیٹھے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے ہوشیار ہو گئے۔ دکاندار نے مسکراتے ہوئے جسّے کی طرف دیکھا۔ جسا ایک کے بعد ایک کر کے کم از کم چار پانچ بوتلیں پیا کرتا تھا۔ اسے دو بوتلیں دے کر

دُکاندار جلدی جلدی دو بوتلیں اور تیار کرنے لگتا تا کہ وہ بوتلیں ختم ہونے پر نئی بوتلیں تیار ہو جائیں۔

جوں ہی دُکاندار نے بوتل آگے بڑھائی اور جسّے کی اُنگلیوں نے اسے چھوا تو یکا یک ہی ایک تیسرے ہاتھ نے بڑھ کر بوتل کو جھپٹ لیا۔

جسّے نے دیکھا کہ یہ حرکت کرنے والا شخص ٹھنا تھا۔

دونوں کی آنکھیں ملیں تو ٹھنے کی گھنی بھویں خاص انداز میں اوپر کو اُٹھیں اور پھر نیچے گر گئیں۔ آنکھوں میں ٹھنڈے پن کی چمک دکھائی دی۔ ایسی چمک اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں بھی تھی۔ چنن سنگھ کے دونوں بیٹے اس کے ساتھی تھے، یعنی لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی گھس پیٹھی کر کے بڑے اطمینان سے سامنے والے چبوترے پر بچھے بورے پر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنی اپنی ٹانگیں اکڑا کر پھیلا دیں۔

ٹھنے کا منہ چوڑے تھیلے کی طرح پھیل گیا، جس میں سے اس کے اُبڑ کھبڑ دانت منحوس انداز سے دکھائی دینے لگے۔ اس نے جسّے کے ہاتھ سے چھینی ہوئی بوتل کو جھنڈے کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

''جسا سنگھ، جوان کی طاقت کا ایک ہی ثبوت ہے۔ یہاں آتا ہے، بوتل کی گولی کو صرف انگوٹھے سے دبا کر دیکھنے والوں کے من میں اپنی طاقت کا سکہ جماتا ہے۔ دُنیا سمجھتی ہے کہ یہ بہت بڑا تیر مارتا ہے۔ آج میں دکھا دوں گا کہ جو کام یہ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے کرتا ہے وہ کام میں بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے کر سکتا ہوں۔''

یوں دیکھنے کو تو یہ معمولی ہنسی مذاق کی بات تھی مگر وہاں بیٹھے سب لوگ جانتے تھے کہ ہنسی مذاق کے پردے کے پیچھے کیسی بھیانک نفرت چھپی ہوئی تھی۔ اس نفرت کو چھپانے کی بھی کوئی خاص کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔

سب جانتے تھے کہ ٹھنا کتنا طاقتور ہے۔ پھر بھی دونوں بھائیوں کے علاوہ دوسرے لوگ جسّے کو ٹھنے سے اُنیس نہیں، بیس ہی مانتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ جسّے نے کبھی اپنی جسمانی طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

بایاں ہاتھ اُوپر کو اُٹھا کر ٹھنے نے اپنا انگوٹھا بوتل کی گولی پر رکھا، اسے پوری طاقت سے دبایا، مگر گولی اپنی جگہ سے بال برابر بھی نہیں دبی۔ کچھ کھسیا کر اس نے بوتل داہنے ہاتھ میں پکڑ لی اور گولی پر انگوٹھا جما کر اسے دبانے کا بھرپور جتن کرنے لگا۔

گاؤں کے دوسرے لوگ خاموش بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہنا چاہیے کہ ٹھنا اپنی شکست کا ثبوت اپنے ہاتھوں سے ہی دے رہا تھا۔

تب جسّے نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ٹھنے نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس کے من میں یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ اس بوتل میں اتنی زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خود جسا بھی اسے دبا نہیں سکے گا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ دونوں اُٹے پٹے ہو جائیں گے۔ سب کی آنکھیں جسّے کے انگوٹھے پر جمی ہوئی تھیں۔ انگوٹھا پل بھر کو گولی پر ٹکا، اور گولی، سٹاک، سے نیچے آ گری، یعنی بوتل کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ جسا گٹا گٹ بوتل کو اپنے گلے میں اُنڈیل

کر بوتل والے سے بولا:

''مشو بھائی! ایک بوتل میں بس اتنی ہی گیس بھرو، جس کی گولی کو ٹھمنا اپنے انگوٹھے سے دبانے میں کامیاب ہو جائے۔''

یہ سُن کر ٹھمنا آگ بگولا ہو گیا۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اِدھر جسا اپنی عادت کے مطابق بوتل پر بوتل پیتا چلا گیا۔ اپنا کوٹہ پورا کر چکا تو اس نے اُٹھ کر تہمد کے پلو کو کھولا اور پیسے نکال کر دُکاندار کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

جسا وہاں سے جانے کو تیار ہوا تھا کہ ٹھمنے نے اس کا راستہ روک لیا۔ جسا اتنا لمبا تھا، ٹھمنا مشکل سے اس کے کندھے تک پہنچتا تھا۔ لیکن اس کا جسم اتنا ٹھوس تھا کہ جیسے جسا سنگھ کے راستے میں انسان نہیں چٹان کھڑی تھی۔

ٹھمنا پل دو پل اپنی دہکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جسے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ پھر منہ سے تھوک کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے بولا:

''جسا تو دُنیا کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جو کچھ تو کر سکتا ہے، ٹھمنا نہیں کر سکتا مگر دیکھ میرا انگوٹھا کتنا موٹا ہے...... اتنا موٹا کہ وہ بوتل کے منہ میں گھس نہیں سکتا۔ اسی لیے بوتل کی گولی پر میری پوری طاقت کا دباؤ پڑ نہیں پایا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گولی لمحہ بھر میں نیچے کو سٹک جاتی۔''

جسا نہ مسکرایا اور نہ اس کے چہرے پر کوئی طنزیہ ملامت نمودار ہوئی۔ اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ دوستانہ ڈھنگ سے ٹھمنے کے کندھے پر رکھتے ہوئے سپاٹ بھاری آواز میں کہا: ''میں تم سے متفق ہوں۔''

ٹھمنے نے پنجہ اُٹھا کر ایک ہی جھٹکے میں جسے کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا بولا: ''ٹھمنے کو چھونے سے پہلے تمہیں دس بار سوچ لینا چاہیے۔''

ٹھمنے کے اس تاؤ اور للکار کو دیکھ لکّھا سنگھ اور دلیر سنگھ دونوں ہی بڑے خوش ہو رہے تھے۔ وہ نتھنے پھلا کر طنزیہ انداز سے بناوٹی ہنسی ہنس رہے تھے۔ ہے! ہے! ہے! ہے۔

گاؤں کے دوسرے لوگ یہ دیکھ کر من ہی من تاؤ کھا رہے تھے۔ اس وشواس کے باوجود کہ جسا ٹھمنے سے کمزور نہیں تھا، وہ اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ جسا اتنی بے عزتی کیوں برداشت کیے جا رہا تھا۔

جسے نے جانے کے لیے قدم بڑھایا تو ٹھمنے نے جھٹ سے اپنی ٹانگ آگے اڑا دی۔ جسے نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے صرف اُنگلی رکھتے ہوئے کہا:

''اب جانے دو مجھے، مجھے کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔''

ٹھمنا اب اتنا بپھر چکا تھا کہ اس کے لیے اب پھر سے نارمل ہونا آسان نہیں تھا۔ وہ ناگ کی طرح پھنکار کر بولا:

''پہلے یہاں کا کام تو نپٹا لو، پھر دوسرے کام نپٹانا۔''

جسا پل دو پل ٹکٹکی باندھ کر ٹھمنے کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر بولا:

''ٹھنیا! یہاں مجھے کون سا کام کرنا ہے؟''

''تم مونچھوں کو تاؤ دیے گاؤں بھر میں گھومتے پھرتے ہو۔ تمہیں اپنی طاقت کا ثبوت دینا ہوگا۔''

''میں یہ ثبوت کس کو دوں؟''

''مجھ کو۔''

''مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے......۔''

''وہ کیا؟'' ٹھنے نے بات کاٹ کر کتے کی طرح بھونکتے ہوئے پوچھا۔

''خرابی یہ ہے کہ جب میں اپنی طاقت کا ثبوت دے چکوں گا تو تم یہاں موجود نہیں ہوگے۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس وقت تک تم واہگوروا کال پُرکھ کے چرنوں میں پہنچ چکے ہوگے۔ خود ہی سوچو کہ ایسا ثبوت دینے کا کیا فائدہ، جسے ثبوت کا خواہشمند دیکھ نہ پائے۔''

یہ کہہ کر جسّے نے اپنا ہاتھ ٹھنے کے سینے پر جمایا اور اسے اس کے ساتھیوں کی طرف دھکیلنے لگا۔

ٹھنا سینہ پُھلا کر اَڑ گیا اور غُرّا کر بولا:

''ہاں بیٹا! جتنا ماں کا دودھ پیا ہے اتنا ہی زور لگاؤ۔ میں بھی بچپن سے کھاڑوں میں زور آزمائی کرتا رہا ہوں۔ آج تک کوئی بھی مائی کا لال ٹھنے کو اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکا۔''

لیکن جسّے کی ہتھیلی کے دباؤ کے آگے وہ اُنگل پر اُنگل پیچھے ہٹنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ تین چار قدم کی تو بات ہی تھی۔ جب وہ لکھا اور دلیر کے قریب پہنچا تو جسّے نے ریل کے انجن کی طرح ہاتھ کو ذرا سا پیچھے ہٹا کر پھر بھرپور طاقت سے آگے کو دھکیلا تو ٹھنا لڑکھڑا کر ان دونوں بھائیوں کے بازوؤں میں یوں جا پھنسا، جیسے تِتیا مکڑی کے جالے میں جا پھنستا ہے۔

گاؤں کے دوسرے لوگ من ہی من گدگد ہو اُٹھے۔ وہ اُچھل پڑے اگرچہ وہ کھلم کھلا جسّے کی طرف داری کرنے سے ڈرتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا۔ یا تو فوراً ہی یا ایک آدھ دن میں کوئی زبردست واقعہ رونما ہو کر رہے گا۔

ٹھنا توہین پر توہین کو سہہ نہیں سکا۔ اس کے ساتھیوں کی بھی دِلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھنا بھڑک جائے۔ خود ٹھنا طیش میں آنے پر تُلا ہوا تھا۔ جسا وہاں سے چل چکا تھا۔ ٹھنا بھاری بدن کے باوجود سپرنگ کی طرح اچھلا اور سانڈ کی طرح سر جھکا کر جسّے کو ٹکر مارنے کے لیے پوری طاقت سے آگے جھپٹا۔

بلاشبہ یہ ٹکر جسّے کو لگ جاتی تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر اس کی تیز آنکھیں پہلے سے ہی بھانپ چکی تھیں کہ ٹھنا کیا کرنے جا رہا تھا۔ وہ صرف اس کے راستے سے ایک طرف کو سرک گیا۔ کہنا چاہیے کہ ٹھنے کے سر اور جسّے کے جسم کے بیچ صرف دو اُنگل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اپنی ہی طاقت سے آگے کو جھپٹا ہوا ٹھنا کوئی روک نہ پاکر لڑکھڑا گیا اور اوندھے منہ بھوسہ اور گوبر ملی دھول میں دھنس گیا۔

جسّے کے انداز سے لگتا تھا کہ اگر اب بھی ٹُھمنا اُٹھ کر واپس چلا جائے، یا جہاں کا وہاں ہی کھڑا رہے تو جسا اسے کچھ اور کہے بنا وہاں سے وِداع ہو جاتا۔

مگر ٹُھمنے کی آنکھیں خون میں نہا گئی تھیں اور اسے ہر طرف خون کا سا گرد کھائی دے رہا تھا۔ وہ سنبھلا، اُٹھا اور تیزی سے اپنا پنجہ جسّے کی گردن کی طرف بڑھا دیا۔ جسّے نے اپنے داہنے ہاتھ میں اس کی موٹی سی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر دوسرا ہاتھ اس کی کہنی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ایک ہی گھماؤ دے کر اس کی کہنی پر گھٹنا مارا تو اس کی کلائی، کہنی اور کندھے کے جوڑ چٹک گئے۔ ٹُھمنے کا داہنا بازو بیکار کر کے جسّے نے یہی کارروائی بائیں بازو پر کی۔ ٹُھمنے کے دونوں بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح نیچے کو لٹک گئے۔ تب جسّے نے ایک قدم پیچھے ہٹا کر بڑے زور سے اس کے پیٹ میں لات جمائی۔ ٹُھمنا اوندھے منہ آگے کو گرا۔ جسا رُکا نہیں، اس نے پہلے ٹُھمنے کا داہنا ٹخنہ اپنے پنجے میں پکڑا اور اس کے گھٹنے کے پیچھے پاؤں جما کر ایسا گھمایا کہ گھٹنا ٹوٹ گیا۔ یہی حال بائیں ٹانگ کا ہوا۔

پل بھر میں ٹُھمنا بازو اور ٹانگیں تڑوا کر گوبر کے ڈھیر کی طرح دُھول میں پڑا تھا۔ شدید درد کی وجہ سے اس کے چہرے کا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ برسوں کی دبی ہوئی جسّے کے من کی نفرت اور غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پائے۔ وہ اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے آخر میں اس نے ٹُھمنے کی پیٹھ کی طرف سے اس کی گردن کو اپنے داہنے بازو میں جکڑ لیا اور پھر اپنی کہنی اور دوسرے ہاتھ کے زور سے ایسا جھٹکا دیا کہ ٹُھمنے کی گردن کے سارے منکے ٹوٹ گئے۔

تب جسّے نے ٹُھمنے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ ٹُھمنے کا جسم گدھے کی لید کی طرح گندی دُھول میں اَٹا پڑا تھا۔

اس نے جسّے کی طاقت کا ثبوت مانگا تھا سو مل گیا مگر جسّے کے کہنے کے مطابق اس ثبوت کو دیکھنے کے لیے وہ اس سنسار میں موجود نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ کر پتھرا گئی تھیں۔ آنکھوں کی آگ اب راکھ بن چکی تھی۔ شاید خود اس کی آتما اپنے تیاگے ہوئے جسم کی یہ حالت دیکھ رہی ہو گی۔

نہ گولی چلی، نہ کرپان، نہ کسی نے لاٹھی اُٹھائی، نہ چھرے کا وار ہوا۔ تماشائیوں نے اپنے جیون میں لوگوں کو لڑائیوں میں مرتے دیکھا تھا مگر کسی اس ڈھنگ سے اتنی بے رحمی سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔ لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ پل بھر کو بالکل سُن سے ہو کر رہ گئے۔ اگر کسی اور طرح لڑائی ہوتی تو شاید وہ بھی لاٹھیاں گھماتے ہوئے میدان میں ٹوٹ پڑتے۔ انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ٹُھمنے جیسا آدمی یوں مارا جا سکتا تھا، جیسے پیاز کو مٹھی کی ایک چوٹ سے کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قاتل کی درندگی بڑی بھیانک تھی۔ ٹُھمنا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ دو چار جوانوں کے بس میں بھی آنے والا نہیں تھا مگر وہ ان کی آنکھوں کے سامنے گندی مکھی کی طرح مسلا ہوا پڑا تھا۔ ہلنا جلنا تو ایک طرف وہ دونوں بھائی اُنگلی تک ہلانے کی طاقت کھو بیٹھے تھے۔ یکا یک ہی دہاڑتے ہوئے ٹُھمنے کا اس طرح دھول میں لوٹ پوٹ ہونا ایک ایسا حادثہ تھا، جسے وہ ابھی تک اچھی طرح سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس انوکھی، کٹھور اور ظالمانہ قتل نے گاؤں کے دوسرے لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا مگر ان کے من میں جسا سنگھ کے لیے کسی طرح کی نفرت کا جذبہ نہیں اُٹھا۔ بلکہ جو اُمیدیں اُنہوں نے اپنے ہیرو سے لگا

رکھی تھیں وہ آج پوری ہو گئیں۔ اس سے انہیں عجیب طرح کی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔

ان سب نے دیکھا کہ جسا سنگھ ٹھنے کی لاش کو اس کے ٹخنے سے پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا، کھیتوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ کسی کو جسے کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ لکھا اور دلیر بھی آنکھ بچا کر ادھر اُدھر کھسک گئے۔ وہ اپنے باپ تک یہ خبر پہچانا چاہتے تھے، اور اس سے صلاح مشورہ کرنا چاہتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔

ایک کھیت میں پہنچ کر جسے نے لاش کا ٹخنہ چھوڑ دیا اور وہاں کام کرنے والے ایک شخص کے ہاتھ سے پھاوڑا لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ دھرتی نرم تھی۔ اس نے جلد ہی اتنا بڑا گڑھا کھود لیا، جس میں ٹھنے کی لاش سما سکتی تھی۔ پھاوڑا پرے پھینک کر جسے نے ٹھنے کی لاش کو گردن اور گھٹنوں کے نیچے سے پکڑ کر اس کی گٹھڑی سی بنائی اور گٹھڑی گڑھے میں پھینک دی۔ تب پھاوڑا اُٹھا کر گڑھے کو مٹی سے بھر دیا۔ ایک چھڑی کو ٹھنے کی قبر میں گاڑ کر جسے نے چھڑی کی نوک پر ٹھنے کے دونوں جوتوں کو اٹکا دیا۔

گاؤں کے بہت سے لوگ دُور کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

جسے نے ان پر ایک نظر ڈالی اور بولا:

''خبردار کوئی اس گڑھے کے نزدیک نہ آئے اور نہ کوئی اس چھڑی کو چھوئے اور نہ جوتوں کو چھوئے۔''

اتنا کہہ کر جسا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

جسا جس کام کو آج تک ٹالے جا رہا تھا، وہ تو اب ہو ہی گیا۔ گھر لوٹتے وقت وہ سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا۔

جلد ہی رات کا اندھیرا چھا گیا۔ گھر گھر میں اس واقعہ کی چرچا تھی۔ اپنے اپنے مکانوں میں گھسے ہوئے لوگ بھی اونچی آواز میں بات نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ صرف پھسپھسا رہے تھے۔ وہ من میں خوش تھے۔ چنن سنگھ اس کے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں نے سارے گاؤں میں اُدھم مچا رکھا تھا اور ایسا گندہ ماحول بنا دیا تھا کہ لوگوں کو سانس لینا کٹھن محسوس ہوتا تھا۔

جسے نے اپنے گھر تک کا فاصلہ بہت دھیرے دھیرے طے کیا۔ اب اسے محسوس ہوا، کہ اس کے جیون کا نقشہ آج کے واقعہ سے بالکل اُلٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا۔ اس کے قانونی رُخ کو دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کے ڈھانچے کا بدل جانا ایک عام حقیقت تھی۔ اس حقیقت کے رُخ دھیرے دھیرے اُبھر کر اس کے من کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ سب سے اہم رُخ دیپی سے اس کے تعلق کا تھا۔ وہ پھانسی پا جائے تو ان کی پریم کہانی کا اختتام سمجھنا چاہیے۔ اگر اسے عمر قید ہو جائے، تو بھی دیپی اس کے ساتھ اپنا مستقبل نہیں جوڑ سکتی تھی۔

نہ تو اسے اس بات کا پچھتاوا تھا کہ اس نے ٹھنے کا قتل کر ڈالا اور نہ وہ اس وِچار سے خوفزدہ تھا کہ اسے پھانسی ہو سکتی تھی مگر دیپی سے بچھڑ جانے کا خیال اسے بنا موت ہی مارے جا رہا تھا۔

راستے میں ہر آٹھ دس قدم کے بعد وہ تھوڑا ٹھٹھک کر رہ جاتا۔ آخر کار اِدھر اُدھر کا چکر لگاتا ہوا وہ گھر پہنچا تو

اس کی بُوا دہلیز پر کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے لوٹنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جسا سمجھ گیا کہ اس واقعہ کی خبر بُوا تک پہنچ چکی تھی۔ سدا کی طرح اس نے اپنے اونچے قد کی وجہ سے دروازے میں سے گزرتے وقت اسے ذرا سا جھکنا پڑا۔ وہ چپ چاپ بھیتر والے کمرے میں پہنچ گیا۔ مُجھو بھی دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر مُجھو بولی:

''اب کیا ہوگا؟''

جسے نے مُڑ کر بُوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مُجھو نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی، ہاں وہ کچھ پریشان ضرور دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاری آواز میں بولا:

''جو ہونے والا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

مُجھو نے محسوس کیا کہ جسا ٹھیک ہی ڈھنگ پر سوچ رہا تھا۔ اسے بھی یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگی۔ دھیرے سے بولی:

''تم رات کے اندھیرے میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

جسا بھی یہی سوچ رہا تھا، مگر بُوا کے منہ سے یہ سجھاؤ سُن کر اس نے بے اختیار ہی پوچھا: ''مگر کہاں کو؟''

''چک پیراں چلے جاؤ۔''

''پولیس وہاں بھی میرا پیچھا کرے گی۔''

''وہاں ٹکنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اگر وہاں ٹکنا نہیں ہے تو اُدھر کا رُخ کرنے کی ہی کیا ضرورت ہے؟''

''وہاں جانا ضروری ہے۔ چاچا سے ملو۔ اسے ساری بات بتاؤ، وہ تم سے ناراض نہیں ہوگا بلکہ خوش ہوگا۔ اس نے بھی دنیا کا بہت اونچ نیچ دیکھا ہے۔ وہ ضرور ہی تمہیں کوئی اچھا سجھاؤ دے گا۔''

جسے کو بُوا کی بات بھلی لگی۔ مُجھو پھر بول اُٹھی:

''بگا بھی تمہیں چک پیراں میں نہیں رہنے دے گا۔ وہ تمہیں کسی ایسی جگہ پر بھیج دے گا، جہاں کوئی بھی تمہیں ڈھونڈ نہیں پائے گا۔''

وہ دونوں اس پر متفق ہو گئے۔ یہ طے پایا کہ جسا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو لے۔ جب ہر طرف خاموشی چھا جائے، تو وہ چپکے سے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے کھسک جائے۔

۲

شیر سنگھ بالکل اکیلا، دبے پاؤں چلتا ہوا بگا سنگھ کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت چوڑ گلیارا پڑتا تھا، جس کے دونوں طرف بگا سنگھ کے ہی طویلے تھے گلیارے کے آخر میں جانا پہچانا بہت بڑا دروازہ

تھا، جس میں سے ہووے سمیت ہاتھ گزر سکتا تھا۔ اسے شک اس بات کا تھا کہ دروازہ بند ہوگا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ چر چرا کر بالشت بھر کھل گیا۔ شیر سنگھ نے اسے اور زیادہ دھکیلا اور پھر بھیتر والے طویلے کے والان میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ جسا گھوڑے پر زین کس رہا ہے اور بُھجّو اس کے پاس کھڑی ہے۔ اسی وقت جسّے اور بُھجّو نے بڑے دروازے کے چر چرانے اور اس کے بھیتر تک لمبی پرچھائیں کو سرکتے دیکھا۔ آپس کا فاصلہ کم ہوا تو انہوں نے شیر سنگھ کو پہچان لیا۔

شیر سنگھ نے باری باری ان دونوں پر نظر ڈالی اور پھر یوں بولا جیسے اس کی آواز مٹکے میں سے نکل رہی ہو:

''وہی ہو رہا ہے جس کا مجھے خطرہ تھا۔''

بُوا اور بھتیجے نے سوالیہ انداز سے شیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ پھر بولا:

''جسا! تم یہاں سے فرار ہو رہے ہو نا؟''

جسا کچھ جھینپ سا گیا، جیسے اس پر بزدلی کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس نے شیر سنگھ سے آنکھیں ملائے بنا کہا:

''ہاں!''

بھتیجے کا ساتھ دینے کے لئے بُھجّو نے اختصار سے پوری تجویز بتا دی۔

سب کچھ سن کر شیر سنگھ چپ چاپ آگے بڑھا اور اس نے جسّے کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام دھیرے سے کھینچتے ہوئے کہا:

''تم کہیں نہیں جا رہے ہو، سارے گاؤں کے سامنے دن دیہاڑے ایک آدمی کا قتل کر کے تم جا کہاں سکو گے؟ ساری عمر پاگل کُتے کی طرح مارے مارے پھرو گے۔ تمہاری وہ حالت پھانسی پانے یا عمر قید سے بھی بدتر ہوگی۔''

جسّے نے شیر سنگھ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے لگام چھوڑ دی اور ایک کہنی گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ بُھجّو کو شیر سنگھ کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شیر سنگھ نہ ان کا دشمن تھا اور نہ ان کا بُرا چاہتا تھا۔ پھر بھی جس وقت جو حرکت یہ کر رہا تھا، اس سے جسا بھاری مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ وہ تھوڑ تنک کر بولی:

''یہاں سے بھاگ جانے کے سوا اور جسّے کے پاس چارہ ہی کیا ہے؟''

شیر سنگھ نے بُھجّو پر نظر جما کر گھمبیرتا سے کہا:

''یہاں سے فرار ہونا بہت بھاری مول رکھتا ہے۔''

بُھجّو ذرا تیز آواز میں بولی:

''کل صبح پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔''

''ہاں!''

چنن سنگھ اور اس کے بیٹے نیز ان کے دوسرے ساتھی پولیس کو بتا دیں گے، کہ کیسے جسا سنگھ نے ٹُھنّے کا قتل کیا

ہے۔

''ٹھیک کہتی ہو۔''

''پھر جسا گرفتار ہو جائے گا۔ قتل کے معاملے میں ضمانت بھی نہیں ہو گی۔''

''وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

''تم پر چھوڑ دیں؟'' بھجو بھڑک کر بولی۔

''ہاں!'' شیر سنگھ آہستہ سے بولا۔

''مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ تمہارا کیا منصوبہ ہے؟''

''ابھی ان باتوں کو چھوڑ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ جسا گاؤں سے باہر قدم رکھے۔''

بھجو آپے سے باہر ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، جسے نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا اور کہا:

''بُوا! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم شیر سنگھ سے جھگڑا مت کرو۔ وہ ہمارا ہمدرد ہے، ہمارا دُشمن نہیں ہے۔''

بھجو نے بھتیجے کی طرف دیکھا۔ اس کے چڑھے ہوئے تیور دھیمے پڑ گئے اور بولی:

''یہ سب میں مانتی ہوں لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ شیر سنگھ کیا کرنے جا رہا ہے۔''

جسا بولا:

''وہ جو بھی کرنے جا رہا ہے، اسے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔''

دور سے گاؤں کے باہر کچھ کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔

شیر سنگھ نے جسے کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ شیر سنگھ بولا:

''اچھا، تو میں چلتا ہوں، میں چھپتا چھپاتا یہاں آیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم گاؤں سے نکل بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ وہی ہونے جا رہا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔''

جب شیر سنگھ نے پیٹھ موڑی، تو جسا سنگھ نے دھیمی مگر مضبوط آواز سے کہا:

''مطمئن رہو، میں گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

شیر سنگھ بڑے دروازے کے باہر نکل گیا تو انہوں نے کنڈا چڑھا دیا، جو اصل میں جسا سنگھ کے جانے کے لیے ہی کھولا گیا تھا۔ جسے نے گھوڑے سے زین اُتاری، اُسے تھان پر باندھا اور وہ دونوں چپ چاپ گھر کے بھیتر چلے گئے۔

بھجو اب بھی بے تاب ہو رہی تھی۔ کچھ چڑچڑے انداز میں بولی:

''تم نے شیر سنگھ کا کہنا مان کر اچھا نہیں کیا۔ ایک بار تم پولیس کے چنگل میں پھنس گئے تو پھر یا تو پھانسی پاؤ گے یا اپنا جیون برباد کر بیٹھو گے۔''

''مگر بُوا، یہاں سے بھاگ جانے پر بھی میں محفوظ نہیں رہ سکتا، فرار ہو جانے والا قاتل پل بھر کو بھی چین کی نیند نہیں سو سکتا۔''

''تم قاتل نہیں ہو، تم نے اپنے بچاؤ کے لیے گھنے کا مقابلہ کیا۔ تمہارے پاس قتل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تم اس دُکان پر گھنے کو مارنے کی نیت سے نہیں گئے تھے۔ چنن سنگھ کے بیٹوں کے علاوہ دُکان پر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی تو موجود تھے، وہ پولیس کو صحیح طور سے بتائیں گے کہ یہ واقعہ کیسے رُونما ہوا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قانون کی نظر میں میرے بچاؤ کی کوئی دلیل تو ہے۔ لیکن فرار ہو جانے میں بہت بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے شیر سنگھ نے مجھے یہ قدم اُٹھانے سے منع کر دیا ہے۔ اگر گاؤں والوں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہمارا وکیل یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ میری یہ کارروائی ظالمانہ نہیں تھی، بلکہ اپنے بچاؤ کے لیے تھی، تو عدالت مجھے بری بھی کر سکتی ہے یا کم سزا دے سکتی ہے۔''

بھجنو بے بس ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے بستر پر جا لیٹی اور جسا اپنے بستر پر کافی دیر تک وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔

وہ سو نہیں پائے۔ کبھی کبھی تھوڑا بہت اُونگھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح سویرے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ گاؤں سے باہر کو ہانکے جا رہے تھے۔ لوگ منہ میں داتن دبائے گلیوں میں کھانستے پھر رہے تھے۔ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔

جسا اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ بھجنو نے لیٹے لیٹے اپنی رائے دی:

''تم اکیلے گاؤں سے باہر مت نکلنا میں گوردوارے کو جا رہی ہوں۔ میرے لوٹنے تک تم یہیں رہنا۔''

جسے کو کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ بُوا کے وِداع ہو جانے پر وہ اندرونی طویلے میں چلا گیا۔ رحیم اور ان کے دو چار دوسرے کارندے وہاں موجود تھے۔ آج وہ اپنے مالک کو نئی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ہیرو بن چکا تھا۔ انہیں من ہی من فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جوان مالک نے گاؤں کے سب سے بڑے بدمعاش کو کھٹمل کی طرح مسل کر رکھ دیا تھا۔

جسے نے بھی اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ آہستہ سے چھوٹے موٹے کام کرتا رہا اور وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پچھلے دن کے واقعہ کے بارے میں کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔

جب بھجنو گوردوارے سے لوٹ کر بڑے دروازے میں دکھائی دی، تو جسے کی آنکھیں اس سے ملیں۔ اس نے بھوؤں سے اشارہ کر کے بھتیجے کو بھیتر چلنے کے لیے کہا اور جسا بُوا کے پیچھے پیچھے گھر کے بھیتر چلا گیا۔

بھجنو نے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''گاؤں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی کہ صبح سویرے ہی چنن سنگھ کے دونوں بیٹے اور ان کے کچھ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر تھانے کو گئے ہیں۔ ان کا مقصد تمہارے خلاف رپورٹ کرنے کے سوار اور کیا ہوسکتا ہے۔''

''سو تو ہوگی ہی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کچھ دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔''

''تو اس میں کون سی انوکھی بات ہے۔ ایک آدمی مارا گیا ہے، پولیس تو آئے گی ہی۔''

''بیٹا! پولیس اور قانون کا چنگل بہت برا ہوتا ہے۔ کاش! میرا کہنا مان کر رات تم بھاگ جاتے، تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''نہیں، تم بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ شیر سنگھ بھی پرانا گھاگ ہے۔ وہ چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی مجھے گاؤں سے جانے نہیں دیا۔''

''تم بھی بڑے بھولے ہو مانا کہ شیر سنگھ ہمارا بھلا چاہتا ہے، مگر اس نے بتایا تو نہیں کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اس نے بچاؤ کا کون سا راستہ نکالا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ شیر سنگھ کی چال جو ہمیں نہیں مالوم، ناکام رہی تو پھانسی کے پھندنے میں گردن کس کی پھنسے گی۔''

''میری...... تمہاری نہیں۔''

''واہ بیٹا!'' بھجو نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

''ارے اگر تیری بجائے میری گردن پھانسی کے پھندے میں پھنس جائے، تو اس سے زیادہ سُندر بات کیا ہوسکتی ہے۔ میں موت کے کنارے کھڑی بڑھیا...... مگر تو ابھی بچہ ہے۔ سارا مستقبل تیرے آگے ہے۔ میرا مستقبل پیچھے رہ گیا ہے۔ میں آج نہیں تو کل مر جاؤں گی۔''

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیشہ کی طرح بھجو نے مکھن لگے پراٹھے بنائے، جنہیں جسّے نے بُورا کھانڈ ملی دہی کے ساتھ کھایا۔ لسی پی اور مونچھوں کو انگوچھے سے پونچھ کر دو تین بھاری بھر کم ڈکار لیے۔

سورج آکاش کے اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ اُجلے پرکاش میں جسّے کو ہر چیز عام لگ رہی تھی۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ کسی کی جان گئی تھی نہ کسی نے جان لی تھی۔

اتنے میں رحیم بھیتری طویلے سے اندر صحن میں آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ گھمبیر تھا۔ مونچھیں نیچے کو لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے نپے تُلے قدموں کے ساتھ بُوا اور بھتیجے کے قریب پہنچا...... منہ سے کچھ نہیں بولا۔

جسا سنگھ دھیرے دھیرے اُٹھا۔ انگوچھا کندھے سے اُتار کر کمر پر لپیٹا اور پھر اسے خوب کستے ہوئے اس نے رحیم کی طرف ٹھنڈی سی نظر ڈال کر اپنی مخصوص بھاری آواز میں پوچھا: ''پولیس آ گئی؟''

رحیم کی بھویں ہلکے سے حیرت کے ساتھ ایک دم اوپر کو اُٹھ گئیں۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا:

''ہاں!''

باہر طویلے کے صحن میں مسلمان داروغہ لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ بھاری ڈیل ڈول والا شخص تھا اور کرسی اس کے نیچے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں ہی بیٹھا تھا۔ کبوتر کے پروں کی طرح بھیتر سے بیٹھی اور سرے پر سے اُٹھی مونچھوں میں سے صرف اس کا نچلا ہونٹ دکھائی دے رہا تھا۔ مونچھوں کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ آنکھوں کے اُوپر اس کی چوڑی بھویں ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی تھیں۔ سر پر کلف لگی پگڑی تھی، جس میں کُلا دکھائی دے رہا تھا۔ کُلّے سے بھی اُوپر ایک فٹ اونچا شملہ لہرا رہا تھا۔ چنن سنگھ کے دونوں بیٹے قریب کھڑے تھے۔ کچھ سپاہی تھے۔ سپاہیوں سے بھی پیچھے شیر سنگھ دیوار سے کندھا لگائے کھڑا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگ اور زیادہ دُوری پر دیواروں کے ساتھ دبکے ہوئے تھے۔ ان انسانوں میں کچھ کتے بھی شامل تھے۔

جب جسا مکان کے صحن والے دروازے سے نکل کر اندرونی طویلے میں پہنچا، تو داروغہ کی آنکھیں اوپر اُٹھیں۔ ان آنکھوں نے تیزی سے جسا سنگھ کا اُوپر سے نیچے تک جائزہ لیا، اور اس کی نظر سجیلے جوان پر ٹکی رہ گئی۔

جسا داروغہ سے کچھ قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر سلام کیا۔ تھانیدار اس کے ڈیل ڈول سے متاثر ہوا۔ اس زمانے میں علاقے کے غیر معمولی جوانوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر ایک پنجابی کے لیے یہ ایک قدرتی بات تھی۔ چاہے وہ داروغہ ہی کیوں نہ ہو، ان دنوں داروغہ بھی معمولی ہستی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب داروغہ کسی گاؤں میں پہنچتا تھا۔ تو لوگوں میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔

اب داروغہ اُٹھا اور سیدھے کھڑے ہو کر جسّے کی طرف بڑھا۔ ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا، تو وہ رُکا۔ داروغہ بھی قد آور آدمی تھا، مگر اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے سامنے کھڑا بیس سالہ جوان اس سے تین چار اُنگل اُونچا ہی تھا۔ گھاگ داروغہ نے اپنی عادت کے مطابق پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں جسّے کی شخصیت کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی، لیکن اس نوجوان کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس میں عاجزی تھی اور نہ شیخی، نہ خوف اور نہ غرور، وہ مجرم بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر بلاشبہ وہ عام جوانوں سے مختلف تھا۔

داروغہ نے اپنا بھاری پنجہ اُٹھایا اور دھیرے سے اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اسی وقت جسّے نے داروغہ کے کندھے پر سے پیچھے کی طرف کچھ دُوری پر کھڑے شیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو شیر سنگھ نے بڑی چالاکی سے ایک اُنگلی اُٹھا کر اسے انکار کے طور پر ہلا دیا اور پھر اسی اُنگلی سے اپنی داڑھی کھجلانے لگا۔ جسا فوراً ہی اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ شیر سنگھ اسے کل کے جُرم سے انکار کرنے کو کہہ رہا تھا۔

داروغہ جسّے کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے اسے ایک طرف کو لے گیا اور گلے میں پھنسی بلغم کی وجہ سے کھر کھراتی آواز میں کہنا شروع کیا: ''تم ہی جسا سنگھ ہو؟''

''جی!''

''تم جانتے ہو کہ تمہارے خلاف کیا رپورٹ لکھائی گئی ہے؟''

''جی نہیں۔''

لکھایا گیا ہے کہ تم نے دن دیہاڑے گاؤں کے ٹھنتا نامی شخص کو جان سے مار دیا ہے۔''
یہ سُن کر جسا سنگھ کے چہرے پر کسی قسم کے جذبہ کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی۔ داروغہ کی آنکھیں ایسی ہی کسی علامت کی تلاش میں تھیں۔ بولا: ''یہ غلط ہے۔''
یہ کہتے ہوئے جسا من ہی من ہنسا۔ اس قدر سفید جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ تھا۔ ابھی گڑھے میں سے لاش نکال لی جائے گی تو اس کی گردن پر پھانسی کا پھندہ کسنا شروع ہو جائے گا:
گھاگ ہوتے ہوئے بھی داروغہ جسّے کے تیوروں سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ پھر بولا:
''کسی کو کیا ضرورت پڑی کہ بیکار میں تم پر قتل کا الزام لگائے۔ یہی نہیں بلکہ رپورٹ لکھانے والوں کا کہنا ہے کہ موقعہ واردات پر کئی اور لوگ بھی کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔''
''صاب! اسی گاؤں میں ہمارے شریک رہتے ہیں۔ انہوں نے پہلے میرے چاچا بگا سنگھ کو جھوٹے مقدمے میں پھنسایا اور اسے پانچ سال جیل کاٹنی پڑی۔ چک پیراں میں اس کی زمین ہے، جہاں بچپن سے میں رہ رہا تھا۔ ان شریکوں سے تنگ آ کر اس نے مجھے یہاں بھیج دیا اور خود وہاں رہنے لگا۔ ہمارے شریک یہ بھی نہیں چاہتے کہ میں یہاں رہ کر چاچا کی زمین کی دیکھ بھال کروں۔''
''تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''
''میں بچپن سے ہی اناتھ ہوں۔ چاچانے ہی مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔''
''ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تم گاؤں کے مانے ہوئے غنڈے ہو، بدمعاش ہو اور آس پاس کے علاقے میں بہت بدنام ہو۔''
''صاب! اگر میں اپنے آپ کو اچھا کہوں، تو اس سے میں اچھا نہیں بن جاؤں گا۔ اگر میں غنڈہ، لُچا، بدمعاش ہوں تو گاؤں کا ہر ایک شخص جانتا ہوگا۔ سرکار، ان سے پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ مجھے بُرا کہیں، تو مجھے سزا ملنی ہی چاہیے۔''
اِتنے میں ہی بغل سے دلیر سنگھ کی آواز سنائی دی: ''یہ بکواس کرتا ہے صاب۔''
داروغہ کو حیرانگی ہوئی کہ اس کارروائی کے بیچ میں اچانک یہ کون بول پڑا۔ اس نے پلٹ کر دلیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں لال ہو گئیں۔ اس نے بغل میں سے چھوٹا سا ڈنڈا نکال کر اس کا اگلا سرا دلیر سنگھ کی چھاتی پر بجاتے ہوئے کہا:
''تم دیکھ رہے ہو کہ میں اُس کو سب سے الگ لے آیا ہوں۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تم یہاں گھس آئے۔ تم بڑے منہ پھٹ دکھائی دیتے ہو۔ اگر تم نے اب پھر اپنا منہ پھاڑا تو تمہارا جبڑا چیر کر رکھ دوں گا...... پیچھے ہٹو۔''
داروغہ کی کڑک کے پیچھے سرکار کی پوری طاقت کی دھمکی موجود تھی۔ اُکھڑ دلیر سنگھ کی آنکھوں میں بھی خوف

کی چھایا دکھائی دینے لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

داروغہ کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس کی گرجدار آواز پھر گونجی:

''بدتمیز! سور کی اولاد!''

چنن سنگھ کھاتا پیتا شخص تھا۔ اس کے بیٹے کو سُور کی اولاد کہنا بہت بڑی بات تھی۔ مگر سب جانتے تھے کہ ابھی تو داروغہ نے سور کی اولاد ہی کہا تھا، اگر اس کا موڈ اور بگڑ گیا تو وہ سچ مچ ہی دلیر سنگھ کو مار مار کر سور بنا دے گا۔ لکھا سنگھ نے چھوٹے بھائی کے کان تک منہ لے جا کر پھسپھساتے ہوئے کہا: ''بیوقوف!''

اس کی پھسپھساہٹ داروغہ نے بھی سنی اور آس پاس کے دوسرے لوگوں نے بھی۔

داروغہ اب بھی ٹکٹکی باندھے ان دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دھمکاتے ہوئے پوچھا: ''وہ لاش کہاں ہے؟''

دونوں بھائی بول اُٹھے۔ لکھا سنگھ نے بڑی انکساری سے ایک ہاتھ آگے کو بڑھا کر راستہ دکھانے کے انداز سے کہا: ''تشریف لائیے۔''

داروغہ اس کھیت کے کنارے تک تشریف لے گیا۔ گاؤں کے لوگ کافی دُور پر ہی رُک گئے۔ لمبی لمبی لاٹھیوں والے باوردی سپاہی داروغہ سے دو قدم پیچھے کھڑے تھے۔ سامنے کھیت میں قبر کی طرح گڑھا تھا۔ اس میں چھڑی گھسی ہوئی تھی اور چھڑی کے اوپر دو جوتے موجود تھے......

''یہ جوتے۔ لکھا سنگھ نے کہنا شروع کیا: ''یہ جوتے ٹھنا سنگھ کے ہی ہیں۔''

داروغہ کا منہ ان جوتوں کو دیکھ کر انجانے ہی بہتر ہو گیا۔ اپنا ایک بھاری بھرکم بوٹ کھیت کی دو بالشت اونچی منڈیر پر رکھ دیا اور آہستہ سے مسکرا کر بولا: ''گویا ٹھنا زمین کے بھیتر اور اس کے جوتے زمین کے باہر۔''

ایسے گھمبیر موقع پر بھی داروغہ کی بات سن کر کچھ لوگوں نے مارے خوشامد کے کھیسیں نکال دیں۔

ایک آدمی پھاوڑے سے قبر کھودنے لگا۔ تازی تازی مٹی تھی، اسے ہٹانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جوں جوں مٹی باہر نکلتی جا رہی تھی، دونوں بھائی گردن بڑھا کر بھیتر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ساری مٹی کا ڈھیر باہر لگ گیا اور گڑھا خالی تھا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

داروغہ کے پھولے ہوئے نتھنے اور بھی پھول گئے۔ اس کی مونچھیں پھڑ پھڑائیں اور اس نے سپاہیوں، دونوں بھائیوں اور دُور کھڑے سب لوگوں پر پھیلتی ہوئی نظر ڈالی، اور کہا: ''یہ کیا مذاق ہے۔''

سب لوگ خاموش تھے۔''

داروغہ پل بھر خاموش رہا، پھر اس نے اونچی آواز میں پوچھا:

''ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا گیا، ان دو بھائیوں کے کہنے کے مطابق کئی اور لوگوں نے بھی جسا سنگھ کو ٹھنے کی جان لیتے دیکھا تھا۔ وہ لوگ کون ہیں؟''

اب تک گاؤں کی لگ بھگ آدھی آبادی وہاں اکٹھی ہو گئی تھی۔ ان میں سے کوئی نہ بولا۔ داروغہ نے

افسرانہ انداز سے اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرایا اور رُعب دار آواز میں کہا: ''جن لوگوں نے ٹھمنے کو قتل ہوتے دیکھا ہے، وہ آگے آئیں۔''

کسی نے ایک قدم تک آگے نہیں بڑھایا۔

دونوں بھائیوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔

اتنے میں چنن سنگھ بھی وہاں آ پہنچا۔ اس نے بڑے خوشامدانہ انداز سے پہلے تو داروغہ کو سلام کیا۔ پھر بہت ہی انکساری سے نرم آواز میں بولا:

''لوگوں کے دلوں پر جسے کا ڈر اتنا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ کسی کو گواہی دینے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔''

''اور لاش؟'' داروغہ نے جسا سنگھ کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

''سرکار! ہوسکتا ہے کہ لاش راتوں رات غائب کردی گئی ہو۔''

''ہوسکتا ہے کہ آپ ہی لوگوں نے ٹھمنے کو قتل کیا ہو اور الزام اس پر رکھ رہے ہوں، جسے آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔''

چنن سنگھ نے کھیسیں نکال کر جواب دیا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے سرکار!''

''نہ لاش ہے، نہ کوئی گواہ ہے، مٹی سے بھرا ہوا گڑھا، اس میں دھنسی ہوئی چھڑی، چھڑی کے سرے پر دو جوتے، یہ کیسا قتل ہے؟...... وہ ہتھیار کہاں ہے، جس سے قتل کیا گیا۔ کوئی لاٹھی، کوئی کرپان، کوئی گنڈاسہ، کوئی کلہاڑی...... کچھ تو ہونا چاہیے...... اور شاید جسا سنگھ کے گھر کی تلاشی لینے پر ہتھیار بھی مل جائے، جس سے قتل کیا گیا ہے۔''

لکّھا سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا:

''سرکار! اس کے گھر کی تلاشی بیکار ہے۔ کوئی ہتھیار نہیں ملے گا۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''قتل کسی لاٹھی یا ہتھیار سے نہیں کیا گیا۔''

''تو؟''

تب لکّھا سنگھ نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ٹھمنا سنگھ کا قتل کیسے ہوا۔

داروغہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی...... بولا:

''ٹھمنا جانا مانا بدمعاش تھا۔ آج سے لگ بھگ ایک سال پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ جس آدمی کو میں ایک بار دیکھ لوں، اس کا فوٹو میرے دل پر اُتر آتا ہے۔ مجھے ٹھمنے کا ڈیل ڈول اور شکل اَب تک یاد ہے۔ اگر ہاتھی بھی اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر نکل جاتا، تو وہ مرنے والا نہیں تھا۔ کیا وہ مرغ تھا یا کتے کا پلا جسے جسے نے گردن سے مروڑ کر پرے پھینک دیا......''

دونوں بھائی بیچ میں ہی بول اُٹھے: ''بالکل یہی ہوا سرکار!''
داروغہ نے ایک بار پھر ان لوگوں کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور کہا:
''تم دونوں کی لکھائی ہوئی رپورٹ کے مطابق کئی لوگوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوا...... ان لوگوں کو میرے سامنے پیش کرو۔''
لگّھا نے دُور کھڑے لوگوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:
''سب یہاں موجود ہیں لیکن انہیں بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔''
''......اور تم دونوں کی بولنے کی ضرورت سے زیادہ ہی ہمت ہو رہی ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ قانون ان ہوائی باتوں کو نہیں مانتا۔ پولیس کو کیس بنانے کے لیے ثبوت چاہے۔ سزا دینے کے لیے قانون بھی ثبوت مانگتا ہے۔ یہاں یہ عجیب تماشا ہو رہا ہے۔''
اتنے میں شیر سنگھ آگے بڑھا اور دھیرے سے بولا:
''میں الگ سے آپ کی خدمت میں ایک نیا پہلو پیش کرنا چاہتا ہوں۔''
داروغہ اسے چند قدم الگ پیڑ کے نیچے لے گیا۔ شیر سنگھ بولا:
''سرکار! بہتر یہ ہوگا کہ جن جن لوگوں کے بارے میں یہ دونوں بھائی کہتے ہیں کہ وہ موقعۂ واردات پر موجود تھے، آپ انہیں الگ سے تھانے میں بُلا کر یہی بات پوچھیں۔ میرے خیال میں وہ لوگ جسّے سے زیادہ چنن سنگھ کے لڑکوں اور ان کے ساتھیوں سے ڈرتے ہیں...... خیر! جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے کانوں میں یہ بات بھی پڑی ہے کہ کل تُھنّا اس گاؤں میں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ دو تین دنوں سے غائب ہے۔ خود میں نے بھی اسے نہیں دیکھا، ممکن ہے، کہ دوسرے کام کاج میں اُلجھا ہونے کی وجہ سے میری نظر اس پر نہ پڑی ہو لیکن آپ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے یہ بھی معلوم کریں کہ تُھنّا پچھلے دو یا تین دنوں سے گاؤں میں تھا، بھی یا نہیں۔''
داروغہ کا گھمبیر چہرہ اور زیادہ گھمبیر ہو گیا۔ اس نے کہا:
''اگر تمہاری بتائی ہوئی باتیں سچ نکلیں تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ سارا معاملہ دراصل چنن کے لڑکوں کی گہری چال کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''
''میں اس بارے واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو بات میں نے سُنی، یا مجھے سوجھی، وہی میں نے عرض کر دی۔ آپ بڑی آسانی سے پتا کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے یا درست۔ میری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ میں نے یہ باتیں کہی تھیں۔ یہ تو آپ بھی چاہیں گے کہ گناہگار کو سزا ملے اور یہ بے گناہ مصیبت سے بچا رہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا آپ کے لیے کٹھن نہیں ہے۔ میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ جلد ہی اپنی لڑکی کی شادی کرنے جا رہا

ہوں۔ میں ان سارے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ پھر بھی جہاں تک بن پڑے گا، میں قانون کی مدد کروں گا۔"

داروغہ نے ساری باتیں سُن لیں وہ جلدی سے کسی کے جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اصلیت کو جان کر رہے گا۔ اس نے شیر سنگھ کو بھی یقین دلایا کہ اس کا نام خواہ مخواہ کسی معاملے میں نہیں گھسیٹا جائے گا۔ اگرچہ پُرانی فائلوں کے مطالعہ سے داروغہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اگر اب نہیں تو کسی زمانے میں شیر سنگھ بھی دھاکڑ بازی میں کسی سے کم نہیں تھا۔

اب داروغہ نے لوگوں کے بیانات لیے۔ لکھا اور دلیر سنگھ کے سوا کسی نے اس بات کو قبول نہیں کیا ٹُھنّے کو قتل کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا تھا۔ وہ من ہی من حیران تھے کہ راتوں رات لاش کہاں غائب ہو گئی۔ کم سے کم اتنا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ سب گہرا چکر تھا۔ اس چکر میں پھنسنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گاؤں کے سب لوگ دراصل ٹُھنّے کے قتل اور چنن سنگھ کے لڑکوں کی اس شکست پر خوش تھے۔ اب ان کو اپنے گاؤں کی فضا میں توازن دکھائی دینے لگا۔ پہلے چنن سنگھ کے خاندان کے سامنے کبھی کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ چوں بھی کر سکے۔ مگر اب جسّے کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔

سارے بیانات ہو جانے کے بعد داروغہ نے جسّے اور چنن سنگھ کے دونوں لڑکوں کو حراست میں لے لیا۔ تھانے میں پہنچ کر ان تینوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اگلے دن سے داروغہ نے پھر تفتیش شروع کر دی مگر وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ دن گزرنے لگے مگر ٹھنّے کی لاش کا کچھ پتا نہ چلا۔ جن لوگوں نے اس کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا، انہیں اس بات کا وشواس نہیں تھا کہ ٹُھنّا مر گیا ہے۔ شیر سنگھ نے ایسے گواہ بھی بھگتا دیئے، جن کے بیان کے مطابق قتل کے روز ٹُھنّے کو دوسرے ہی گاؤں میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا تھا۔ داروغہ کو لکھا اور دلیر پر شبہ ہو رہا تھا کہ شاید اس رات انہوں نے ہی ٹھنّے کو قتل کر اس کی لاش انجانے مقام پر ٹھکانے لگا دی تھی۔

جسّے کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہ ملا۔ اس لیے اس کے خلاف کوئی بھی کیس نہیں بن پایا۔ آخر کار اسے حوالات سے آزاد کر دیا گیا۔ لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ جسّے کی ضمانت نہیں ہوئی کیونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جس روز جسّا حوالات سے چھوٹ کر آیا، اس دن جھجو کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے آس پاس میں بتاشے بانٹے اور گوردوارے میں جا کر اکھنڈ پاٹھ کا شُبھ ارمبھ کرا دیا۔ گوردوارے میں ہی اس کی ملاقات شیر سنگھ سے ہوئی۔ وہ شیر سنگھ کی بلائیں لیتے ہوئے بولی: "تم نے میرے جسّے کو بچا لیا۔"

شیر سنگھ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی سُن تو نہیں رہا۔ اس کو جھجو کا اس طرح چلا کر بولنا ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے دھیرے سے کہا:

"بچانے والا تو واہگورو اکال پُرکھ ہے...... اور پھر جو بے قصور ہے، اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔"

ٔ جھجو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے آنکھیں ذرا پھیلا کر شیر سنگھ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا:

''مگر گاؤں بھر میں تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جسّے نے ہی ٹھنّے کو......''

شیر سنگھ نے بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا:

''بیکار کی باتیں نہیں سوچا کرتے، تم بہت بوڑھی ہو گئی ہو۔ بڑھاپے میں انسان کا دماغ بھی تو ٹھکانے پر نہیں رہتا۔ اگر دُنیا جسّے پر جھوٹا الزام لگائے تو کیا تم بھی گلی گلی اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتی پھرو گی۔ میری صلاح مانو تو اس بارے کبھی کسی سے بات تک نہ کرو۔''

شیر سنگھ کے یہ لفظ ٔ جھجو کے دل کی گہرائی میں اُترتے چلے گئے۔ اسے بھی وشواس ہونے لگا کہ شاید جو الزام جسّے پر لگایا گیا تھا۔ وہ غلط تھا۔ جسّے کو وہ دل سے چاہتی تھی۔ اس نے بھی محسوس کیا کہ جسّے کے بارے میں لوگوں سے کچھ بھی کہنا اس کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ وہ دھیرے سے بولی:

''ٹھیک کہتے ہو شیر سنگھ کبھی کسی سے اس بارے میں بات نہیں کروں گی۔''

''مجھ سے بھی نہیں۔''

''ہاں، تم سے بھی نہیں۔''

شیر سنگھ دانت نکال کر بولا: ''ہاں، یہ ہوئی سمجھداری کی بات۔''

۳

اس واقعہ کو گزرے ہوئے بائیس دن بیت چکے تھے۔

دن ڈھل جانے کے بعد رات کا بھوجن ختم کر کے سجن سنگھ اور اس کی بیوی پھسپھساتے ہوئے ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔

سجن سنگھ نے سر سے پگڑی اُتار کر الگ رکھ دی تھی۔ اپنے ڈھیلے جوڑے کو کس کر باندھتے ہوئے اس نے پتنی کی طرف دیکھا۔

اسے اس حالت میں پا کر پتنی نے پوچھا:

''تم کس وچار میں ڈوبے ہوئے ہو؟''

''تم نہیں جانتی کیا؟''

پتنی جانتی تھی کہ اس کا پتی دیپی کے بارے میں فکر مند تھا۔ وہ اور کچھ بولی بھی نہیں تھی کہ سجن سنگھ نے پھر کہا:

''میں جسّے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''بھاڑ میں گیا جسّا تم کو اس کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پہلے کبھی اس کے بارے میں اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اب اس کے بارے میں سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' عورت کے ماتھے پر دو تین گہرے بَل اُبھر آئے۔

''جانتی ہو کہ صرف ہمارے گاؤں پر ہی نہیں، پورے علاقے پر جسّے کا رُعب چھایا ہوا ہے۔ جدھر سے سنو ادھر سے ہی سے چک پیراں کا جسّو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اپنے چاچا کی ضد کی وجہ سے چک پیراں گاؤں میں اپنے لڑکپن کے دن بسر کیے اور وہیں پر جوان ہوا۔ لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔''

''وجہ؟''

''بڑی مورکھ ہو تم...... ارے! جس نے دن دیہاڑے کُھنّے جیسے سانڈ کو مکھی کی طرح مسل کر پھینک دیا، کیا تم اسے کوئی معمولی آدمی سمجھتی ہو؟''

''لیکن قتل والی یہ بات تو غلط بتائی جاتی ہے۔''

''یہ غلط نہیں ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

سجن سنگھ نے پہلے تو احتیاط سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، پھر پھسپھسا کر بولا:

''میں دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا کہ کیسے جسّے نے کُھنّے کے بازو اور ٹانگیں توڑ کر رکھ دیں اور آخر میں اپنی کہنی میں کُھنّے کی گردن دبا کر ایک ہی جھٹکے سے اس کے منکے توڑ ڈالے۔ میں زندگی بھر کسی کو کسی کی جان لیتے نہیں دیکھا۔ یہ بہت ہی بھیانک منظر تھا۔''

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سجن سنگھ نے پتنی کو تاکید کرتے ہوئے کہا: ''اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ میں پھنس جاؤں گا۔''

''تم کیوں پھنسنے لگے؟''

''اس لیے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس جرم کو دیکھنے کے بعد بھی پولیس کے سامنے اس بات کو قبول نہیں کیا۔''

''لیکن پولیس نے تو تم سے پوچھا ہی نہیں۔''

''وہ اس لیے کہ میں بہت دُور کھڑا تھا۔ خود لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ کو بھی یہ معلوم نہیں کہ میں اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے داروغہ کے سامنے میرا نام نہیں لیا۔ لیکن قانون یہ کہتا ہے کہ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی جرم ہوتے دیکھا ہے، تو مجھے خود ہی اس بات کی رپورٹ پولیس میں دے دینی چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بال بچے دار آدمی خواہ مخواہ اس معاملے

میں ٹانگ کیوں اڑائے۔"
"تو تم نے جسے کو گڑھے میں تھنے کی لاش پھینکتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟"
"ہاں......لیکن بہت دُور سے۔ میں ڈر کے مارے نزدیک گیا ہی نہیں۔"
"تو پھر لاش گڑھے میں سے کہاں غائب ہو گئی؟"
"اس بات کا پتا کسی کو بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ ہمیشہ راز ہی رہے گا۔"
پتنی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی:
"چھوڑو جی، ہمیں اس سے کیا لینا ہے۔"
"وہی تو میں بھی کہتا ہوں۔"
"بیکار میں پریشان ہونے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔"
"میں صرف اپنی بیٹی کی خاطر پریشان ہوں۔"
"لیکن دیپی کا اس سے کیا تعلق؟"
سجن سنگھ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار اُبھر آئے اور بگڑ کر بولا:
"تم بڑی خردماغ عورت ہو۔ اپنی ناک کی لمبائی سے آگے نہیں سوچ سکتی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ ہماری بیٹی اور جسے کا آپس میں پریم چل رہا ہے۔"
"میں تو کہہ چکی ہوں کہ جلد سے جلد دیپی کے ہاتھ پیلے کر دو اور اسے اس کے پتی کے گھر بھیج دو۔"
یہ کہنا آسان ہے، کرنا کٹھن۔ پتی کا ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا شادی بچوں کا کھیل ہے۔ اس کے لیے پتی کیا کھیت میں پڑا مل جائے گا؟"
"اوں......ہوں......کوشش کرو گے تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔ شادی تو سنجوگ کی بات ہے۔ جہاں اس کا سنجوگ ہوگا۔ اس کی شادی ہو جائے گی۔ مگر اتنے نٹھلے ہو کہ کوشش بھی تو نہیں کرتے۔"
"تم کیا جانو، کہ میں کتنی کوشش کر رہا ہوں، لیکن یہ صرف میرا ہی فرض نہیں ہے کہ میں بَر کی تلاش کروں۔"
"کوشش تو میں بھی بہت کر رہی ہوں۔ جب واہگورو کو منظور ہوگا، تب ہی شادی ہوگی۔"
"کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بیچ کوئی اور ہی گُل کھل جائے۔"
"تمہارا اشارہ جسے کی طرف ہے نا؟"
"ہاں!"
"تم بھی پورے وہمی آدمی ہو۔ ایک بار جب تم اسے مل کر آئے تو اس کے بعد کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ شاید پھر وہ ایک دفعہ بھی نہیں ملے۔"
"اب حالات بدل گئے ہیں۔ اگر کبھی جسا ہمارے گھر میں گھس آئے اور دیپی کی کلائی پکڑ کر اسے

اپنے ساتھ لے جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جسّے کی اتنی دہشت پھیلی ہوئی ہے کہ گاؤں کا ایک بھی آدمی ہماری مدد کرنے کے آگے نہیں بڑھے گا۔"

پتنی نے پتی کی طرف حیرت زدہ نگاہ سے دیکھا، جیسے اس نے اَنہونی بات کہہ دی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی عورت ہونے کے ناطے وہ پتی کی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ نہ جانے کیوں ایک لحہ بھر کو ایک وِچار اس کے من میں بجلی کی طرح چمکا اور غائب ہو گیا۔ وہ وِچار یہ تھا کہ اگر جسّو سے اس کی بیٹی کی شادی ہی ہو جائے تو اس میں کیا بُرائی تھی۔ اپنے پتی کے چہرے پر اتنی گھمبیر اور خوف کی علامت دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ ضرور ہی اس رشتے میں کوئی بُرائی ہوگی، جو ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے بیٹی کا مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ وہ پتی کے من کو کیسے اس کے فکر سے آزاد کرے۔ اس کا حل ڈھونڈنے میں بھی اسے دیر نہ لگی۔ اپنی ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے بولی:

"میں کہتی ہوں کہ یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا علاج تو بہت ہی آسان ہے۔"

سجن سنگھ کے سیدھے سادے چہرے پر اُمید کی کرن چمکی، چہک کر بولا:

"بھاگوان، جلدی بتاؤ کہ تمہاری تجویز کیا ہے؟"

"ہم دیپی کو دوسرے گاؤں بھیج دیں گے۔"

"کہاں؟"

"رتو کے...... وہاں وہ اپنی ماسی کے پاس تین چار مہینے بھی ٹکی رہے تو کوئی حرج نہیں۔"

سجن سنگھ کی باچھیں کھل گئیں...... اسے سب سے زیادہ اپنی بدنامی کا ڈر تھا۔ اُچھل کر بولا:

"دیپی دی ماں، تمہارا جواب نہیں۔ نہ ہو بانس اور نہ بجے بانسری، جسّے کو پتا بھی نہیں چلنے کا کہ دیپی کہاں گئی......"

...... اور دیپی بستر پر لیٹی لیٹی چپ چاپ یہ سب کچھ سُن رہی تھی۔ ماں باپ کی تجویز معلوم ہوتے ہی وہ اُچھل پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے۔ مگر وہ آنکھیں بند کر کے یوں لیٹی رہی، جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کے باپ کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگے تو وہ وہاں سے چھوٹے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ سو گئے۔ وہ دبے پاؤں اُٹھی اور اس نے بستر پر تکیہ اور کچھ دوسرے کپڑے پھیلا کر انہیں چادر سے ڈھک دیا، تا کہ اگر کوئی اس کی چارپائی کو دیکھے، تو یہی سمجھے کہ وہ چادر اوڑھے سو رہی ہے۔

رات کے وقت کسی بھی لڑکی کا گاؤں میں اکیلے دُکیلے گھومنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اپنے دوپٹے کو پگڑی کی شکل میں سر پر باندھ لیا اور ایک چادر جسم پر لپیٹ لی۔ ایسی حالت میں کسی بھی راہگیر کو وہ مرد ہی دکھائی دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کسی سہیلی کا ساتھ مل جائے۔ مگر اتنی رات گئے کسی سکھی کے گھر جانا اور اسے جگانا کافی خطرناک کام تھا۔ اس نے اکیلے ہی جسّے کے گھر پہنچنے کی ٹھان لی۔ دروازے سے باہر نکلی تو ساری گلی سنسان

پڑی تھی۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ دَبے پاؤں بڑھتی چلی گئی۔ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک کھلی سی جگہ تھی، جہاں دھریک کے پیڑوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور اس جھنڈ کے نیچے پکی اینٹوں کے بنے ہوئے چبوترے والا کنواں تھا۔ کنوئیں کے سِرے پر اونچی بلیوں والا چرکھڑا تھا، جس میں موٹا رسّا بندھا ہوا تھا اور اس رسّے کے سِرے سے لوہے کا بہت بڑا ڈول بندھا پڑا تھا۔ دِن میں وہ بیسیوں بار ادھر سے گزری تھی۔ وہاں عموماً گہما گہمی رہتی۔ مگر اس وقت وہ جگہ بہت سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے میں ہی کوئی چیز کود کر ڈول پر چڑھی۔ وہ چونکی۔ غور سے دیکھا تو ایک موٹا تازہ بلاّ نظر آئی۔ دیپی کو تسلی ہوئی۔ بلاّ پیڑ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیپی نے آنکھ اُٹھائی، تو پیڑ کی شاخ پر ایک سفید بلّی نظر آئی۔

دیپی من ہی من کچھ سوچ کر مسکرائی۔ گویا وہ بلاّ اپنی بلّی کی تلاش میں تھا۔ یہاں وہ اپنے بِلّے کی تلاش میں جا رہی تھی۔ کنوئیں سے آگے نکلی، تو کہیں کہیں کسی دُکان کے چبوترے پر ایک دو آدمی سوئے دکھائی دیئے۔ وہ قریب سے گزر گئی، یا تو اسے کسی نے دیکھا نہیں، یا گاؤں کا ہی کوئی آدمی دیکھ کر خاموش رہے۔ راستے میں کچھ کتوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ غُرّائے بھونکے لیکن گاؤں کا ایسا کون سا کتا تھا جو دیپی کو نہیں پہچانتا تھا۔ ایک دو نے آگے بڑھ کر اسے سونگھا اور اس بات کا اطمینان کر لیا کہ وہ باہر سے آیا ہوا کوئی شخص نہیں تھا، بلکہ اپنی دیپی ہی تھی۔ آخر وہ جسّے کے بھیتر والے طویلے میں بڑے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بڑے دروازے کے ایک تختے میں ایک چھوٹا سا در بھی تھا۔ تھوڑا جھک کر اس میں گزرا جا سکتا تھا۔ اس در کی زنجیر والی کنڈی بھی بھیتر سے چڑھی ہوئی تھی۔ دیپی کو معلوم تھا کہ اس در کی کھلی دراڑ میں ہاتھ ڈال کر اس کی کنڈی کھولی جا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے اسی طریقے سے دروازہ کھول لیا۔

وہ سوچنے لگی کہ یہاں تک تو وہ کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی لیکن اگر جسا طویلے کے کمرے میں نہ ہوا تو اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جسا بھیتر مکان میں ہی سویا ہوا ہو۔ وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔

واہگورو کا نام لے کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلی ہی بار میں اندر سے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی۔ دیپی نے سوچا کہ ممکن ہے کہ بھیتر جسّے کے علاوہ دوسرا کوئی بھی سویا ہوا گر کسی دوسرے شخص نے دروازہ کھولا، تو بھی اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ دروازہ دھیرے دھیرے چرچرایا۔ دیپی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ تاروں کا مند پرکاش پھیلا ہوا تھا اور اس پرکاش میں جلدی سے کسی کو پہچاننا آسان نہیں تھا لیکن جسّے کو پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ کھلتے ہوئے دروازے میں جسّے کا لمبا تنگڑا حلیہ دکھائی دیا۔ دیپی نے تو اسے پہچان لیا مگر وہ اسے پگڑی اور بدن پر لپٹی ہوئی چادر کی وجہ سے پہچان نہیں سکا۔

''کون ہو تم؟'' جسّے نے دیپی کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

دیپی نے اُنگلی کے اشارے سے اسے ایک طرف چلنے کو کہا۔ جسا اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔ کھونٹوں سے بندھی بھینسوں کی اوٹ میں پہنچ کر دیپی نے جسم سے چادر اور سر پگڑی اتار دی۔ اس کے بال جھرنے کی لہروں کی طرح نیچے کی طرف گرے۔ جسا چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: ''تم؟''

دیپی بنا آواز نکالے ہنس دی۔ اس کے دانتوں کی چمک سے جیسے جسّے کی آنکھیں چندھیا گئیں۔
ان کی ملاقات کافی عرصے کے بعد ہو رہی تھی۔ دیپی بولی: ''تم نے تو مجھ سے ملنا جلنا ہی بند کر دیا؟''
''مجبوری تھی۔ خود تمہارے چاچا نے آ کر اس بارے میں مجھ سے بات کی تھی۔''
ان دنوں باپ کو چاچا بھی کہا جاتا تھا۔
دیپی نے اپنی ستواں سی ناک کو ذرا سکوڑ کر کہا:
''اگر میرے چاچا کا ہی حکم ماننا تھا تو مجھ سے پریم بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''میں تمہارے ساتھ پریم کا ناٹک نہیں کھیلنا چاہتا۔ میں تمہیں اپنی پتنی بنانا چاہتا ہوں۔''
''واہ، کیا کہنے، جس کو لڑکی کے باپ کی ایک ہی گھُرکی جھاگ کی طرح بٹھا سکتی ہے، اس سے کسی عورت کی تو کیا گائے بکری کی بھی شادی نہیں ہو سکتی۔''
''میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں دیپی..... مگر میں نے سوچا کہ تمہارے چاچا کی نظر سے گر گیا تو تم سے میری شادی کبھی نہیں ہو سکے گی۔''
''یہ نہیں سوچا کہ میری نظر سے گر گئے تو کیا ہو گا۔''
جسّے کو کوئی جواب نہیں سوجھا۔ وہ کسی بھاری بھرکم اُلو کی طرح آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔
دیپی نے پھر کہنا شروع کیا:
''یہ ٹھیک بات ہے میں تو یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ زنخے سے واسطہ پڑا تھا، جو پہلی ہی اڑچن پڑنے پر دُم دبا کر بھاگ گیا.......''
جسّے کو اس کی کڑوی کسیلی باتوں پر غصہ آنے لگا......
''لیکن جب میں نے سُنا کہ تم نے ٹھُنّے کو مچھر کی طرح مسل کر پھینک دیا ہے، تو پھر مجھے اطمینان ہوا کہ تم میں کچھ نہ کچھ مردانگی ابھی ہے۔ میں تمہارا انتظار کرنے لگی۔ دن گزرتے گئے، تم نہ آئے۔ ایک آدھ بار تو میں نے تمہیں پیغام بھی بھیجا۔ آخر خود مجھ ہی کو آنا پڑا۔''
جسّے نے دیپی کے دونوں کندھوں کو نرمی سے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا:
''تم نہیں جانتیں کہ ٹھُنّا سنگھ والے واقعہ کے بعد مجھے کن مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ حوالات میں بند رہا، سو الگ۔''
''اب تو تمہیں وشواس ہو گیا ہو گا کہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ نہ لاش ملی نہ گواہ، اور نہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت ہی ملا۔ اچھا کیا، جو ٹھُنّے کو ٹھکانے لگا دیا۔ آتے جاتے مجھ پر بھی آوازیں کسا کرتا تھا۔ اب تم اس واقعہ کو بھول کر بے فکر ہو جاؤ اور یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کا کیا بنے گا؟''
''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔''

''ایسا نہ ہو کہ تمہارے سوچتے سوچتے میں بوڑھی ہو جاؤں۔''
''تم بھی بڑی گھن چکر ہو تمہیں بوڑھا کون ہونے دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ سیدھی اُنگلیوں سے گھی نکل آئے اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر کوئی تکڑم لگائی جائے گی۔''
''لیکن وہ تکڑم تمہیں کب سوجھے گی؟''
''اس کے لیے وقت چاہیے۔ تم سے صلاح مشورہ کرنے کا موقع چاہیے۔''
پھر یکا یک جسے کو کچھ خیال آیا تو بولا: ''دیپی تمہیں اتنی رات گئے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔''
''جانتی ہوں، لیکن مجھے آنا پڑا۔''
''کیوں؟''
''میں یہاں سے جا رہی ہوں۔''
جسا گھبرا اُٹھا: ''کہاں جا رہی ہو؟''
''بہت دُور۔''
''پہیلیاں مت بجھاؤ، تم چلی جاؤ گی، تو ہمارا کام اور بھی کٹھن ہو جائے گا۔''
''وہ کیسے؟''
''میں رتّو کے جا رہی ہوں۔ میری ماسی اسی گاؤں میں رہتی ہے۔ تم چک پیراں جانے کے بہانے سے یہاں سے نکلو اور رتّو کے پہنچ جاؤ۔ وہاں ہماری ملاقاتیں۔ بڑی آسانی سے ہو جایا کریں گی۔''
''ایک اجنبی جگہ پر اگر ہم ملیں گے تو ساری دنیا کی نظر ہم پر پڑے گی۔''
''تم کیسے بدھو ہو، پریم کے میدان میں پاؤں رکھنے والے نڈر ہوتے ہیں۔ تم وہاں آنا تو۔ گاؤں سے باہر ایک تاریخی گوردوارہ ہے۔ وہاں میں اکثر جایا کروں گی۔ تم بھی آنا...... گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں ایسی تکڑم لگاؤں گی کہ ہمیں گاؤں کے لوگوں کا کوئی خوف نہیں رہے گا۔''
جسا ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ دیپی نے کچھ جھینپ کر کہا: ''کیا دیکھ رہے ہو؟''
''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں ایسی کون سی بات ہے، جس کی وجہ سے چُھٹپن سے تم میرے من کا دِیا بنی ہوئی ہو۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کسی کے ڈر سے تمہیں بھلا بھی سکتا ہوں۔ تمہارا تیاگ کر سکتا ہوں۔ یہ سب غلط ہے۔ اگر تم نہ ملیں تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ نہ ملنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ جیسے بھی ہوگا تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔''
اس کی باتیں سُن کر دیپی پر جیسے جادو سا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر سر سینے پر ٹکا دیا۔

کچھ پل اسی طرح گزر گئے۔ پھر یکا یک جسّے نے چونک کر کہا: ''دیپی اب تمھیں واپس گھر جانا چاہیے۔''
''نہیں، اب میں یہیں رہوں گی۔''
دیپی نے یہ بات صرف شرارت کے طور پر کہی تھی۔ جب جسّے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔ بولی: ''یہاں آنے کو تو میں آ گئی، مگر واپس جانے میں بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''
''ڈرنے کی کیا بات ہے؟ جیسے تم یہاں آئی تھی، ویسے واپس بھی جا سکتی ہو۔''
''ایک طریقہ اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔''
''کیا؟''
''تم مجھے اپنے کندھے پر اُٹھالو، اسی طرح گھر پہنچا آؤ۔''
''مورکھتا کی باتیں نہ کرو، کسی نے دیکھ لیا تو؟''
جسّے کو مشکل ہی سے پتا چلتا تھا کہ دیپی کب شرارت کر رہی ہے اور کب مذاق کر رہی ہے۔ وہ جان بوجھ کر گمبھیر ہو کر بولی:
''کوئی دیکھ بھی لے گا تو کیا ہوگا، بھلا کسی میں اتنی جرأت ہے کہ جسّے کو کچھ کہہ سکے۔ سب جانتے ہیں یہ چک پیراں کا جسّو ہی تھا، جس نے ہری پورہ کے ٹھُنّے کی ہڈی پسلی برابر کر دی اور چنن سنگھ کے منہ پھٹ لڑکے کھجلی مارے کتوں کی طرح دُم دبائے اِدھر اُدھر دبکتے پھرتے ہیں۔''
یہ کہتے کہتے دیپی نے پھر اپنے سر پر پھر دوپٹے کی پگڑی باندھنی شروع کر دی۔ چادر جسم پر لپیٹ کر بولی:
''اَب تم بیٹھو، تو میں تمہارے کندھے پر چڑھ جاؤں۔''
جسّا اس کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے وہ گمبھیرتا سے یہ سُجھاؤ دے رہی ہے۔ ایسی حالت میں دیپی خوب مزہ لیتی تھی۔ جسّے کے چہرے پر عجیب طرح کی اُلجھن دیکھ کر دیپی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کو جھک کر رانوں پر دبا لیے اور بچوں کی طرح کھِلکھِلا کر ہنسنے لگی۔ جسّے نے گھبرا کر جلدی جلدی اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔
دیپی نے کہا:
''اچھا اگر تم مجھے کندھوں پر نہیں بٹھانا چاہتے، تو میں آپ ہی چلی جاتی ہوں۔ تم کچھ فاصلہ دے کر میرے پیچھے پیچھے آنا۔ اگر راستے میں کوئی مصیبت پڑے تو بچا لینا۔ اگر میں خیریت سے اپنے گھر کے دروازے میں گھس گئی تو تم اُلٹے پاؤں لوٹ آنا۔''
اپنی بات ختم کر کے دیپی دروازے کی طرف چل دی۔ جسّے نے گھر تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے دروازے میں گھسی تو وہ لوٹ آیا۔ بھیتر پہنچ کر دیپی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو لگا کہ ہر چیز پہلے جیسی تھی اور کسی کو اس کے غائب ہونے کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے دانتوں تلے اپنی زبان کی نوک دبائی اور چپ چاپ بستر میں گھس گئی۔

۴

چک پیراں میں بیٹھے بگا سنگھ کو ہری پورے میں گزرے اتنے بڑے واقعہ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اخبار نہیں تھا کہ اس میں خبر چھپتی۔ ہری پورہ سے کسی نے خط نہیں لکھا، کہ اسے وہاں کے حالات کا پتا چلتا اور نہ ہری پورہ کا کوئی شخص بگے کو اس بارے میں بتانے کے لیے آیا لیکن جب اسے اس کی خبر ملی تو واقعی بڑے دھڑلے سے ملی۔

بڑا پُرسکون دن تھا۔ دیہاتوں پر عموماً سکون چھایا رہتا ہے۔ میلے یا کسی تہوار کے سوا وہاں کبھی چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ بگے والا مکان تو اور بھی پُرسکون تھا۔ نہ بچے تھے کہ چیختے چلاتے، نہ لڑکے لڑکیاں تھیں کہ ہنستے بولتے اور گیت گنگناتے۔ بھنگ کا رسیا جگیر سنگھ مکڑی کی طرح اپنی دونوں ٹانگوں میں بڑے سے کونڈے کو دبائے اس میں وہ بے ڈول ڈنڈے سے بھنگ پیس رہا تھا۔ ڈنڈے کے اوپری موٹے سرے پر بندھے، چھوٹے چھوٹے گھنگھرو چھنا چھن بول رہے تھے۔ اس کی پتنی رات کے بھوجن کے لیے مٹی کی ہانڈی میں دال پکانے جا رہی تھی۔ بگا چرچراتی چارپائی پر اِدھر اُدھر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ جگیر بھنگ کی گھوٹائی سے فرصت پالے تو اس کے لیے شام سنگھ سے تلی مچھلی لے آئے۔ شام سنگھ گاؤں کا بڑھئی تھا۔ اس نے دیہات کے جوہڑ سے کچھ مچھلیاں پکڑی تھیں، جنہیں ڈولے کہا جاتا تھا۔ جب وہ مچھلیاں پکڑ کر لوٹا تو راستے میں بگے سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اس نے بگے سے کہا کہ شام ہونے سے پہلے وہ شراب کے ساتھ کھانے کے لیے اس سے مچھلی منگوا لے۔ بگے کو شیر سنگھ کے ہاتھ کی تلی مچھلی بہت پسند تھی۔ اس لیے ٹکٹکی باندھے بے صبری سے جگیر سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جگیر سنگھ بھی بگے کے من کی پریشانی کو جانتا تھا، مگر وہ بھنگ کی گھوٹائی میں کوئی کمی نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ جب دونوں کی آنکھیں ملتیں تو جگیر اپنی چھوٹی اُنگلی اُٹھا دیتا۔ مطلب یہ کہ اب گھوٹائی کا کام ختم ہونے کو ہی تھا۔ آخر کسی طرح جگیر کا کام پورا ہوا تو کونڈے کو ایک موٹے سے گیلے جھاڑن سے ڈھانک کر وہ دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں میں درد رہتا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اسی لیے اس کی ٹیڑھی ٹانگوں کی چال بھی انوکھی ہوتی تھی اس نے اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے بگے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''جاؤں؟''

اس بات پر بگے کو بڑا تعجب ہوا۔ گلے میں پھنسی بلغم کی وجہ سے کھرکھراتی آواز میں بولا:

''اب بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ کیا مجھ سے سٹامپ لکھواؤ گے؟''

جگیر سنگھ خود نشے باز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب طلب لگی ہو تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھے کے لٹکتے ہوئے لمبے آزار بند کو اُٹھا کر اس نے نیفے میں ٹھونس لیا۔ اپنی عورت کو آواز دے کر بولا: ''بھاگیاوان، ایک کٹورا تو دینا۔''

جگیر سنگھ بوڑھا ہو چکا تھا۔ بگے کی بہت سی ذمہ داری عمر بھر وہی نبھاتا رہا۔ بگے کے میں میں اس کا لحاظ تھا، ورنہ اب تک اس پر برس چکا ہوتا۔ کٹورہ ہاتھ میں لے کر جگیر سنگھ اپنے خاص انداز سے دروازے کی طرف بڑھا۔

ابھی وہ صحن کے درمیان تک ہی پہنچا تھا کہ کھلے دروازے میں سے ایک اونچی سی للکار سنائی دی۔

ان دونوں نے دیکھا کہ دروازے میں ہری پورے کا رہنے والا چھتیس سالہ چینن لال کھڑا تھا۔ اس نے سفید پگڑی باندھ رکھی تھی، جس کا لمبا شملہ کندھے سے گر کر سینے سے اُترتا ہوا پیٹ کے نیچے تک پہنچ رہا تھا۔ لمبا کُرتہ، کھلی آستینیں، نیچے چارخانے کا تہمد۔ اچانک ہی وہ ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ لاٹھی کے سروں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے سر کے اوپر لے گیا اور ایک ہی ٹانگ پر بھنگڑا ناچ کرتا ہوا صحن میں گھس پڑا۔

جگیر سنگھ جہاں کا وہاں کھڑا ہو گیا۔ مزاج میں اب تک بچپنا تھا۔ ایک ٹانگ پر بھنگڑا اسے بڑا دلچسپ لگا۔ اس کی آنکھوں کے دونوں کونوں کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ منہ پھیل گیا۔ اگر اس میں طاقت ہوتی تو وہ خود بھی ایک ٹانگ پر بھنگڑا ناچنے لگتا۔ چینن لال نے جگیر کے پاس پہنچ کر ناچتے ہوئے پوچھا: ''کہاں جا رہے ہو چاچا؟''

جگیر نے بگّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے منہ پر بندھی ہوئی مٹھی رکھ دی۔ چینن لال سمجھ گیا کہ بگّا شراب پینے جا رہا تھا۔ وہ بولا: ''سو ٹھیک ہے چاچا، مگر تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مچھلی لینے۔''

''بھاڑ میں ڈالو مچھلی۔''

جگیر کچھ نہیں سمجھا۔ چینن لال ایک ٹانگ پر چک پھیریاں لیتا ہوا بگّے کے سامنے پہنچا اور ہانپتے ہوئے بولا:

''مرغا منگاؤ...... مچھلی بھول جاؤ۔''

بگّے نے بھویں سکیڑ کر پوچھا: ''کیوں خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''جسا حوالات میں پہنچ گیا۔''

بگّا یکایک ہی چارپائی سے یوں اُٹھا جیسے اسے بھڑ نے ڈنک مار دیا ہو۔

چینن لال نے پھر کہا: ''اور وہ چھوٹ کر باہر بھی نکل آیا۔''

''مگر وہ حوالات میں پہنچا کیسے؟'' بگّے نے بے صبری سے پوچھا۔

''ارے وہ شیر کا بچہ حوالات میں پہنچا تو کسی معمولی وجہ سے نہیں......''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ ایک آدمی کو ٹھکانے لگا کر حوالات کی ہوا کھائی۔''

بگّے کو یہ بات اَنہونی سی لگی۔ وہ سکتے میں آ گیا۔ اس کا گلا سوکھ سا گیا۔ ہکلا کر بولا: ''کسے ٹھکانے لگایا اس نے؟''

''تمہارے دُشمن کے ایک آدمی کو۔''

''میرا دُشمن؟''

''وہی چنن سنگھ۔''

بگا بے چین ہو اُٹھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کون آدمی مارا گیا، کیوں اور کیسے مارا گیا۔ اس کے من کی حالت کو بھانپ کر چین لال نے کہنا شروع کیا: ''ٹھنا یاد ہے؟''

بھلا بگے کو ٹھنا کیسے نہ یاد ہوتا۔ اسی کی شہ پر تو چنن سنگھ کے لڑکے سدا کودا کرتے تھے۔ مگر سانڈ نما ٹھنے کو ہوا کیا۔ اس کی جان لینے کے لیے تین چار آدمی بھی کافی نہیں تھے۔

''اسی ٹھنے کو دِن دیہاڑے جسّے نے گاؤں والوں کے سامنے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔''

بگا سنگھ کو وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ چلا کر بولا: ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔''

بگے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''بیٹھو، ذرا کھل کر بتاؤ۔''

''پہلے تم گانٹھ کھولو، تب میں ساری بات کھول کر سناؤں گا۔ جلدی سے ایک پلا ہوا مرغا منگواؤ۔ چاچا اسے کاٹ چھینٹ کر پکنے کے لیے رکھ دے گا۔ بوتل کھلے گی، پھر یہ ساری کتھا سناؤں گا۔''

جگیر سنگھ خود بھی مرغ کا بھی بڑا شوقین تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تب بگے نے پیسے دیے۔ اٹھنی میں اچھا پلا پلایا مرغا مل جاتا تھا۔ کٹورا کچے فرش پر پٹک کر جگیر سنگھ نے اٹھنی مٹھی میں دبائی اور باہر کی طرف لپکا۔

اچھا مرغا ہو تو اسے عموماً سبزی کے پکنے سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ بوتل کھل گئی۔ شراب کا دور چلنے لگا۔ لٹ پٹے مرغے کی ٹانگیں وہ چوڑ چوڑ کر کھانے لگے۔ اسی دوران چین لال نے شروع سے آخر تک پوری کتھا سنا دی۔

آخر میں وہ شراب کا گلاس ہوا میں لہرا کر بولا:

''بندوق نہیں چلی، کسی نے لاٹھی نہیں گھمائی، کرپان نہیں چمکی ...... وہ انوکھا قتل تھا۔ اس دن سارے گاؤں میں دہشت پھیل گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جسا صاف بچ گیا۔ لاش غائب، کوئی ثبوت نہیں، کوئی گواہ نہیں۔''

''کمال ہے؟'' بے اختیار بگے کے منہ سے نکل گیا۔

''چنن سنگھ کے بیٹوں نے اپنے ساتھیوں سمیت علاقے بھر میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ خاص کر اپنے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بھلا جسّے کے خلاف گواہی کون دیتا۔ لوگوں نے گھی کے دیے جلائے، گوردوارے میں پرساد چڑھائے، ہر کسی کا من ناچ اُٹھا۔ اب چنن سنگھ کے بیٹے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔ بگا! تیرے بھتیجے نے سب پُرانی باتیں دھو ڈالیں۔ اس نے تیرا نام اونچا کر دیا۔ اب وہ چک پیراں کا جسّو کہلاتا ہے۔''

جوش میں آ کر بگا چارپائی پر نہ بیٹھا رہ سکا۔ وہ اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر ہری پور پہنچ جائے مگر یہ مناسب نہیں تھا۔ اس کے دُشمن یہی خبر پھیلائیں گے، کہ پہلے تو وہ ڈر کے مارے ہری پورے سے بھاگ گیا اور اب جب کہ اس کے بھتیجے نے اس کے دشمنوں کو نیچا دکھا دیا ہے تو وہ واپس

لوٹ آیا ہے۔ یہ حقیقت بھی نہیں تھی۔ اس کا من اُچاٹ ہو گیا تھا۔ رام پیاری واقعہ کی وجہ سے اب وہ اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ جہاں اس نے ایسی خوب صورت عورت کے ساتھ پریم کی لیلا رچائی اور پھر اس کے چکمے نے اس کے من کی بستی کو اُجاڑ کر رکھ دیا...... بھلا اس کے دُشمن یہ بات کیوں سمجھنے لگے۔

چلتے چلتے بگا رُکا۔ اس نے پلٹ کر چینن لال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''مگر مجھے یہ خبر پہلے کیوں نہیں ملی۔ کم سے کم جھجو کو چاہیے تھا کہ مجھے ایک کارڈ ہی ڈال دیتی۔''

''شاید جسے نے ہی اس بات سے منع کر دیا ہوگا۔''

''کیوں؟''

''اس نے سوچا ہوگا کہ چاچے کو اتنی چھوٹی سی بات کے لیے پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تم اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو؟''

''میں نہیں سمجھتا، مگر تمہارا بھتیجا یہی سمجھتا ہے۔''

''مجھے پتا چل جاتا تو میں فوراً ہری پورے پہنچ جاتا۔''

''تمہارے پہنچے بنا ہی سارا کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔''

''میرا وچار ہے کہ اس کام کو اتنی آسانی سے نپٹانے میں شیر سنگھ کا ہی ہاتھ ہے۔''

''بالکل۔''

ان کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ دروازے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی۔ اس کی عمر بتیس تینتیس برس کی ہوگی۔ صندل کا سا رنگ تھا اس کا، آنکھیں جیسے بادام، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، ناک جیسے قلم، ایک نتھنے میں چمکتی ہوئی کیل۔ اس کی گردن میں مورنی کی سی لچک تھی۔ بدن ذرا سا بھاری ہونے کے باوجود لچکیلا اور پھرتیلا تھا۔ اس کی چال میں ہرنی کی سی چوکڑی سا سا انداز تھا۔ وہ صحن میں سے ہوتی ہوئی جگیر سنگھ کی پٹی کے پاس پہنچ گئی۔

ان کے قریب دیپک جل رہا تھا۔ دیپک کی کانپتی ہوئی لو سے پھیلنے والے پرکاش میں وہ عورت یوں دکھائی دیتی تھی، جیسے گنگا کے پانی پر بنی ہوئی رنگین تصویر۔

چینن لال نے سارس کی طرح گردن آگے بڑھا کر بگے کے کان میں کہا:

''کیا مال ہے؟''

''بکو مت''

''باپ رے، نشہ بھی بری بلا ہے کہیں مجھ سے بدتمیزی تو نہیں ہو گئی، تمہاری رشتے دار ہے کیا؟''

''نہیں۔'' بگے نے روکھی آواز میں جواب دیا۔

چینن لال نے بگے کی پسلی میں اپنی کہنی کا ٹہوکا دیتے ہوئے کہا:

''تمہاری طرف بڑی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔''

بگا پل دو پل ٹکٹکی باندھے چین لال کو گھورتا رہا۔ پھر اس کی کہنی تھام کر اسے اوپر اٹھا دیا۔ خود بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔

گاؤں کے باہر ریتلے میدان میں پہنچ کر بگا بولا: ''دیکھو چین، آج کے بعد تم ایسی بات کبھی نہ کہنا۔''

''کیوں نہ کہوں، مردوں کو ہی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں کیا تم مرد نہیں ہو؟''

''میں مرد ہوں یا نہیں، یہ بات تم بھلی بھانت جانتے ہو۔ اب میں عورت کے ساتھ نتھی ہونا نہیں چاہتا۔ جوان اور خوب صورت عورت کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔''

بگے کا چہرہ بڑا گمبھیر تھا۔ چین لال کو رام پیاری واقعہ یاد آ گیا۔ خود اس کے لیے بھولی بسری بات تھی۔ اس نے سوچا کہ لگتا ہے بگا سنگھ کے دل کا زخم ابھی تک ہرا ہے۔ اس نے اس بارے میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں بگے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: ''تم نے جسّے کے بارے میں ایسی ویسی بات تو نہیں سُنی؟''

''ایسی ویسی بات؟'' چین لال نے کچھ چکر میں آ کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ وہ کسی لڑکی وڑکی......''

''اوہ، میں سمجھا، نہیں بھئی، مجھے کسی ایسی ویسی بات کا پتا نہیں ہے۔''

بگا پھر اپنے وِچاروں میں ڈوب کر ٹہلنے لگا۔ چین لال نے پوچھا:

''کیوں ایسی کوئی لڑکی ہے یہاں؟''

بگا سنگھ چونکا:

''نہیں تو، میں نے یوں ہی تم سے پوچھ لیا کہ شاید تمہیں نے کوئی سنی ہو۔ آخر جسّے کی عمر ہی ایسی ہے۔''

''عمر تو ایسی ہے کہ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔''

''نہ کرائے تو اچھا ہے۔ گرہستی جنجال ہے، عورت ہر پاپ کی جڑ ہے۔ جسّے کو میں نے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ یہاں سے وِداع کرتے وقت بھی مَیں نے یہی صلاح دی تھی۔''

''تمہاری صلاح سے کیا ہو گا بگا، جوانی دیوانی ہوتی ہے۔''

''اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو مجھے بہت دُکھ ہو گا۔''

''اس میں دُکھ کی کیا بات ہے۔ جب سے دُنیا بنی ہے، یہی ہوتا آ رہا ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ اسے کون توڑ سکتا ہے، کون مٹا سکتا ہے، یہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔''

چین لال کی یہ بات سُن کر بگا اُداس ہو گیا۔ من ہی من وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا۔ دُور بہت دُور سے کتے بلا وجہ بھونکتے چلے جا رہے تھے۔

آٹھواں غلاف

وِیرا قاصدا ربّ دا واسطہ ای، آکھیں جا رانجھیٹے نُوں غم میرے
پَئی سہکدیاں مُکھ ویکھنے نُوں، آرے نے نک تے دَم میرے!

(وارث شاہ)

"اے بھیا خبر رساں! تجھے بھگوان کا واسطہ ہے، رانجھے کے پاس جا
کر اسے میرے دُکھ بتا دینا۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس
رہی ہوں، اور اب میرا ناک میں دم ہے یعنی مرنے کو ہوں۔"

ا

گاؤں سے لگ بھگ دو فرلانگ کی دُوری پر ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ دیہاتی تالاب جس کے کناروں پر اینٹیں نہیں لگی تھیں۔ اس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا تھا اور لوگوں کا وِچار تھا کہ اس کی تہہ میں ایسے دھارے بھی تھے جن میں سے بارہ مہینے پانی نکلتا رہتا تھا۔ یہ تالاب کبھی سوکھتا نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف شریہنہ، ببول، برگد اور دھریک کے کئی درخت تھے۔ ان کی پتیاں جھڑ جھڑ کر پانی میں تیرتی رہتی تھیں۔ کچھ دُوری پر ایک چھوٹا سا باغ تھا، جس کے بیچوں بیچ کسی پیر کی قبر تھی۔ گاؤں کی عورتیں گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر دوسرے اور تیسرے پہر وہاں کپڑے دھونے کے لیے آیا کرتی تھیں۔

ایک خوبصورت نوجوان لڑکی گیلے بال پھیلائے دُھلے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ رہی تھی، کہ اتنے میں تیس چالیس قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑ سوار یکا یک ہی درختوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ خوب لمبا تڑنگا تھا، چہرے کی رنگ گیہوں رنگ سے بھی کافی گہری تھی، ناک اونچی، بھویں تنی ہوئیں اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کے بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک اور وحشت تھی۔ کُل ملا کر اس کی شکل ایسی تھی کہ کوئی بھی عورت اکیلے میں اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ یہی حالت اس لڑکی کی بھی ہوئی۔

نوجوان گھوڑے سے اُترا اور اس لڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ لڑکی نے پلٹ کر تالاب کی طرف نگاہ ڈالی تو اس کے دُوسری طرف کچھ عورتیں کپڑے دھوتی دکھائی دیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ شور مچائے گی تو ان عورتوں تک اس کی آواز ضرور ہی پہنچ جائے گی۔

نوجوان نے پوچھا: ''کیوں یہ رَتّو کے ہی ہے؟''

یوں وہ لڑکی کافی چنچل اور تیز طبیعت کی تھی۔ من میں ڈر جانے کے باوجود وہ تڑاخ سے بولی: ''لڑکیوں سے بات کرنے کی تمہاری یہ ترکیب کوئی نئی نہیں ہے۔''

''تم سے بات کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اس گاؤں کا نام رَتّو کے ہے؟''

لڑکی نے پھر ہاں یا ناں میں جواب دینے کی بجائے کہا:

''اگر مجھ سے بات کرنا کا شوق نہیں ہے، تو تم مجھے اس طرح ٹکٹکی باندھ کر کیوں گھور رہے ہو؟......
اب تو یہ بھی کہہ دو گے کہ میں تمہیں گھور نہیں رہا۔''
''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ میں واقعی تمہیں گھور رہا تھا۔ اس کی وجہ بھی بتاؤں گا مگر
اس سے پہلے مجھے اس گاؤں کا نام معلوم کرنا ہے۔''
لڑکی تنک کر بولی:
''جاؤ جاؤ، اپنا راستہ پکڑو، گاؤں کا نام بتانے والے تُمہیں اور بہتیرے مل جائیں گے۔''
نوجوان نے اپنی دونوں کہنیاں گھوڑے کی پیٹھ پر ٹیکیں اور کاٹھی سے پیٹھ لگا کر بولا: ''نہیں، اب تو تمہیں
سے اس گاؤں کا نام پوچھ کر رہوں گا۔''
''بیکار کی دھونس مت جماؤ۔ میرے ذرا سے چلا دینے پر گاؤں کے آدمی بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ
جائیں گے۔''
نوجوان کی آنکھوں کی دمک پل بھر کو اور زیادہ بڑھ گئی، جیسے جلتی ہوئی لکڑی میں سے چنگاری چھوٹ جاتی
ہے۔ بولا:
''گاؤں کے لوگ جتنی تیزی سے یہاں بھاگتے ہوئے آئیں گے، اس سے بھی زیادہ تیزی سے وہ
اُلٹے پاؤں گاؤں کو بھاگ جائیں گے۔''
یہ سُن کر لڑکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بلاشبہ وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش تھا، یا جانا مانا ڈاکو ہو گا ورنہ اسے
اس طرح بدتمیزی سے باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اور زیادہ گھبرائی کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ وہ اُلٹے
پاؤں تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگ جانے پر رُک گئی۔ وہ جلدی جلدی سوچ رہی
تھی اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو بھاگ نہیں پائے گی۔ اس کی
وہی حالت ہو رہی تھی، جو ہرنی کی اپنے سامنے باگھ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں سُن ہو کر رہ گئیں۔
نوجوان سپاٹ آواز میں بولا:
''تم نے مجھے نہیں پہچانا، مگر میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔''
''جاؤ کسی اور کو بیوقوف بناؤ، نہ کبھی ملے، نہ دیکھا، پھر بھی مجھے پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہو۔''
نوجوان کا چہرہ اور بھی کٹھور ہو گیا۔ مگر آواز اور بھی سپاٹ ہو گئی:
''تم وہی لڑکی ہو، جسے ایک بار میں نے صورت سنگھ کے ساتھ دیکھا تھا۔''
اب لڑکی کی ایسی حالت ہو گئی، جیسے کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ آخر
یہ کون ہو سکتا ہے۔ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔
''تمہارا نام پرسنّی ہے۔''
لڑکی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اجنبی نوجوان اس کا نام تک جانتا تھا۔

نوجوان نے پھر کہا:

''جس روز داروغہ پورن سنگھ نے تمہارے صورت سنگھ کو کھیت میں دوڑا کر پکڑا تھا، اس روز میں داروغہ کے ساتھ ہی تھا۔''

اب پھر پرسنی نے اپنے دماغ کو ٹٹولا۔ دراصل اس روز وہ ایسی اُلجھنوں میں پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کسی اور کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اس دن کئی لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے، ممکن ہے وہ نوجوان بھی بھیڑ بھاڑ میں کھڑا ہوگا۔

پرسنی نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ من میں کئی سوال اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ نوجوان کون تھا۔ کیا یہ صورت سنگھ کو جانتا تھا؟ کیا یہ داروغہ کو پہچانتا ہے؟ کیا یہ بھی پولیس کا ہی کوئی آدمی ہے، جو عام کپڑوں میں اس علاقے کا دورہ کر رہا ہے؟ شاید اسی لیے اس نے کہا تھا کہ گاؤں کے لوگ جتنی تیزی تیزی سے بھاگتے ہوئے آئیں گے، اس سے بھی زیادہ تیزی سے لوٹ جائیں گے۔ پرسنی نے ایک بار اُچٹتی ہوئی نظر نوجوان پر ڈالی اور پھر آنکھیں جھکالیں۔ اس کی پلکیں دھیرے دھیرے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اس نے پوچھا: ''تم کون ہو؟''

''میرا نام جسا سنگھ ہے، لوگ مجھے چک پیراں کا جسّو کہتے ہیں۔''

پرسنی نے یہ نام کبھی نہیں سُنا تھا۔ اس لیے وہ نوجوان کے بارے میں اندھیرے میں رہی رہی۔ شاید جسا اس کے من کی اُلجھن کو سمجھ گیا بولا:

''داروغہ پورن سنگھ میرا بچپن کا دوست ہے۔''

پرسنی کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ سانس کے ساتھ ساتھ اس کے سینے کا اُتار چڑھاؤ واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ اس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا:

''تو کیا داروغہ پورن سنگھ نے تُم کو یہاں بھیجا ہے؟''

''اس بات کا جواب میں تب دوں گا جب تم میری بات کا جواب دے دوگی۔ میں اپنے سوال کو پھر دُہراتا ہوں، کیا اس گاؤں کا نام رَتّو کے ہے؟''

''ہاں!''

''اور یہ ہوئی نا بات۔''

''اور میرا سوال؟''

''تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے پورن سنگھ نے یہاں نہیں بھیجا۔''

یہ سُن کر پرسنی کا دل کچھ بجھ سا گیا۔ جسا سنگھ بھی بڑا گھاگ تھا۔ بولا:

''پورن سنگھ کا دوست ہونے کے ناطے میں تمہارے لیے بڑے کام کا آدمی ہوسکتا ہوں۔''

پرسنی خاموش رہی۔

جسے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''تمہاری خاموشی سے پتا چلتا ہے کہ تمہاری کوئی ایسی اُلجھن ضرور ہے، جس میں میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ مگر............''

''مگر کیا؟''

''مدد کرنے کا وعدہ کرو، تو بتاؤں۔''

''تمہارا کام میرے کرنے کے لائق ہوا تو ضرور ہی مدد کروں گی۔''

''یہاں ایک لڑکی رہتی ہے اس کا نام دیپی ہے۔ کیا تُم اسے جانتی ہو؟''

بے اختیار پرسنّی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں شرارت کی چمک پھیل گئی:

''اچھا، تو تم ہی دیپی کے وہ ہو...... ہاں، دیپی میری سکھی ہے۔ میں اِسے اچھی طرح جانتی ہوں۔''

جسا سنگھ اتنا خوش ہوا کہ اسے جلدی سے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پرسنّی سے کس طرح کی مدد مانگے۔ پرسنّی بھی کم کایاں نہیں تھی:

''تمہارا مسئلہ تو بس اتنا ہی ہوگا کہ تم دیپی سے کسی نہ کسی طرح ملنا چاہتے ہو۔ اس میں مَیں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

جسّے کو چپ دیکھ کر پرسنّی نے پھر کہا:

''تم دوسرے معاملوں میں بے شک دھاکڑ ہو گے، مگر پریم کے معاملوں میں نہیں ہو۔ اب تو یوں چپ ہو، جیسے اِنّی سی ہی گم ہو گئی۔ بتاؤ نا، مجھ سے کس طرح کی مدد چاہیے۔''

جسّے نے گردن کو دھیرے دھیرے کھجاتے ہوئے جواب دیا:

''لیکن یہ تو خود میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

''تو سنو سردار بہادر! عشق کے میدان میں بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تم کو یہاں کچھ دنوں کے لیے ڈیرہ جمانا پڑے گا۔''

''ڈیرہ، اس گاؤں میں مَیں کسی کو نہیں جانتا، نہ مَیں کسی کے گھر رہ سکتا ہوں، کون رکھے گا مجھے؟''

پرسنّی نے مہاتماؤں کی طرح اُنگلی اُٹھا کر آکاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا واہگورو اکال پُرکھ ہوتا ہے...... اب تم گوردوارے میں ٹک جاؤ۔ وہاں گھوڑے کو چارہ مل جائے گا اور تمہیں بھی گورو کے لنگر کی دال روٹی مل جائے گی۔ رات بھر آرام کرو، کل صبح میں تمہارے لیے اچھا سا ناشتہ لاؤں گی۔''

جسّے نے بھی ذرا بے تکلفی سے کہا:

''ناشتہ لاؤ یا نہ لاؤ، مگر دیپی سے ملاقات کی اچھی سی تجویز تیار کر کے ضرور لانا۔''

''ضرور۔''

''گوردوارہ کدھر کو ہے؟''

''چلو، میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آتی ہوں۔''

''جسّے نے گھوڑے کی لگام کلائی پر لپیٹ کر پیدل قدم بڑھاتے ہوئے کہا:

''اگر کسی نے دیکھ لیا تو نہ جانے تم کو کیا کہے۔ اپنی تو مجھے چنتا نہیں، کیوں یہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔''

''ارے! کچھ دیر پہلے تو تم غنڈوں کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ بس اتنی سی دیر میں بھیگی بلی بن گئے۔ میری چنتا مت کرو۔ مجھے کوئی کیا کہے گا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی تو میں بتادوں گی کہ ایک پردیسی کو گوردوارے تک پہچانے گئی تھی۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جسّے نے پوچھا:

''کیا دیپی نے تم سے کبھی ذکر کیا تھا؟''

''نہیں، تمہارا نام کبھی نہیں بتایا۔ میں خود ہی بھانپ گئی۔ پوچھا، تو پہلے وہ جھجکی، پھر مان گئی، نام کسی طرح بھی نہیں بتایا۔''

اس طرح وہ باتیں کرتے ہوئے وہ گوردوارے کے قریب پہنچ گئے۔ اس زمانے کے دیہات میں لگ بھگ ایک ہی طرح کے گوردوارے ہوا کرتے تھے۔ بڑی سی چار دیواری جس کے بھیتر جانے کے لیے اُونچا دروازہ ہوتا۔ بھیتر گورو گرنتھ صاحب کے لیے وسیع ہال، جس میں تہواروں کے موقعوں پر بہت لوگ سما سکتے تھے۔ چار دیواری کے دوسری طرف گرنتھی اور اس کے بال بچوں کے رہنے کے لیے ایک یا دو کچی اینٹوں کے کمرے ہوتے تھے۔ صرف بڑے ہال کی وہ دیوار پکّی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، جس میں جانے کے لیے دو دروازے ہوتے تھے۔ چار دیواری کے باہر چھوٹی سی پھلواری اور قریب ہی لکڑی کا بنا ہوا بھاری بھرکم رہٹ۔ یہی حال اس گوردوارے کا بھی تھا۔

گوردوارے کی حد تک جانے والے چوڑے کچے راستے کے دونوں طرف آڑھی پکّی اینٹیں دھرتی میں دھنسی ہوئی تھیں۔ جب وہ گوردوارے کی طرف جا رہے تھے، تو اُدھر سے ایک عورت آتی دکھائی دی......اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی، سر کے بیچوں بیچ سیدھی مانگ تھی اور بوجھل کالے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی شکل میں پیٹھ پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھیں جیسے شربت کے کٹورے تھے، ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تھے۔ داہنی کلائی پر لوہے کا کڑا۔ کانچ یا سونے کی کوئی چوڑی دکھائی نہیں دیتی تھے۔ گلے میں اُون کے منکوں کی مالا تھی، جو اس کے سفید کُرتے پر لٹک رہی تھی۔ شلوار بھی سفید کپڑے کی تھی۔

اس عورت نے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ گوردوارے کی طرف سے آ رہی تھی، اور ان کی بغل سے یوں گزر گئی جیسے اسے اس بات کا احساس تک نہ ہو کہ اس کے قریب سے دو انسان گوردوارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس عورت کے دُور نکل جانے کے بعد پرسنّی نے پوچھا:

''جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟''

''وہ؟''

''وہ عورت جو ابھی ہمارے پاس سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہی ہے۔''

''نہیں میں اسے نہیں جانتا۔''

چلتے چلتے پرسنی یک دم رُک گئی، اور اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا تیز آواز میں بولی:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اسے پہچانتے تک نہیں؟ کیا تم نے اسے قریب سے گزرتے نہیں دیکھا؟''

''دیکھا تو، مگر مجھے لگا کہ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا۔''

پرسنی جوں کی توں کھڑی ٹکٹکی باندھے اسے گھورتی رہی:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تو بھئی تم ہی بتا دو۔''

''میں کیا بتاؤں؟ تمہیں مالوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے۔''

''بیکار میں چھوٹی سی بات کو گھسیٹے جا رہی ہو۔ تم بتا دو گی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔''

پرسنی نے کولہوں سے ہاتھ ہٹا کر بانہیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور منہ سے لمبی سانس نکالتے ہوئے بولی: ''عجیب بات ہے۔''

''کیوں؟''

''یہ میں کل بتاؤں گی۔''

جسے کو اس کی یہ بات چیت بے تکی سی لگی۔ اس نے اس بارے میں اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔

گوردوارے کے دروازے پر لمبی ڈاڑھی والے گرنتھی جی گلے میں سفید صافہ ڈالے کھڑے تھے۔ وہ پرسنی کو پہچانتے تھے، اس لیے اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگے۔ پرسنی بولی:

''ست سری اکال مہاراج!''

''ست سری اکال، کہو کہاں کی سیر ہو رہی ہے؟''

''سیر کیسی؟'' پرسنی نے جسے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ پردیسی ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ کسی کو جانتا نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جس سے ملنے آیا تھا، وہ گاؤں میں ہے نہیں۔ یہ ایک رات گوردوارے میں ٹکنا چاہتا ہے۔ اسے یہاں کا راستہ معلوم نہیں تھا، میں چھوڑنے چلی آئی۔''

''یہ تو بڑا شُبھ کام ہے۔'' گرنتھی جی نرم آواز میں بولے۔

پرسنّی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جسّے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
''اچھا! تو میں چلی، تالاب پر میرے کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ انہیں اکٹھا کر کے گھر جانا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی۔ ماں سے ڈانٹ پڑے گی۔''
گرنتھی جی نے اشارے سے جسّے سے کو کہا:
''گھوڑا اندر ہی لے آؤ، کافی بڑا دالان ہے۔ ایک کونے میں اسے باندھ دیں گے۔''
یہ کہہ کر گرنتھی جی بڑے دالان کی طرف چلے گئے۔ وداع ہوتے وقت پرسنّی نے پھسپھسا کر جسّے سے کہا:
''میں کل صبح ناشتہ لے کر آؤں گی۔''
جسّے نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا:
''دہی سے بات چیت کب ہو سکے گی؟''
''کہانا اس بارے گہری سوچ بچار کی جائے گی کوئی نہ کوئی بڑھیا ترکیب نکل آئے گی۔ اچھا، اب کل باتیں ہوں گی۔''
پرسنّی جیسے چڑیا کی طرح پھر سے اُڑ گئی۔ یعنی وہ اتنی تیزی سے لوٹی کہ کچھ ہی پلوں میں درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔
گھوڑے کو دالان میں لے جا کر جسّے نے اسے گرنتھی جی کے بتائے ہوئے کھونٹے سے باندھ کر اس کی پیٹھ سے کاٹھی وغیرہ کا بوجھ اُتارا اور گردن سے لے کر دُم تک ہاتھ پھیرا۔
جسّے نے سب سے پہلے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پہنچ کر چاندی کا ایک روپیہ بھینٹ کیا اور ماتھا ٹیکا۔
گرنتھی جی نے چمکتے ہوئے روپے کو دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ روپیہ ان کی ہی جیب میں جانا تھا اور اس وقت ایک روپے کی بیس سیر گیہوں مل جاتی تھی۔
جسّے نے جان بوجھ کر ایک روپیہ بھینٹ کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گھوڑے کو اچھا دانہ پانی ملا، اور خود اسے گرنتھی جی نے صرف لنگر والی دال روٹی کی بجائے پتنی سے لذیذ کھانا تیار کروا کر کھلایا۔
تیل کے دیپک کے پرکاش میں نہ تو تو کوئی کام کر سکتے تھے اور نہ زیادہ دیر تک جاگنے کی خواہش ہوتی تھی۔ اس لیے گرنتھی جی سے تھوڑی سی گپ شپ کے بعد جسا گہری نیند سو گیا۔
وہ ایسا سویا کہ صبح اسے پرسنّی نے ہی آ کر جگایا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کے لیے گھی سے تر پراٹھے اور اچار تھا، نیز بالٹی میں لسّی تھی، جس میں مکھن کا گولا تیر رہا تھا۔
جسّے نے لمبے چوڑے گدھ کے پروں کی طرح اپنے بازو پھیلا دیئے اور جمائی لیتے ہوئے بولا:
''میں نے ابھی کُلّا بھی نہیں کیا اور تم چھاہ وِیلے (ناشتے) کا سامان لے کر پہنچ گئی۔''
''تو ٹھیک ہے، میں اسے یہاں چھوڑ جاتی ہوں۔ دن میں کسی وقت آ کر برتن لے جاؤں گی۔''
''تم کہاں چلیں؟ میں یہاں صرف تمہارے پراٹھے کھانے اور لسی پینے نہیں آیا ہوں۔''

''تو پھر؟'' پرسنّی نے شرارت سے پوچھا۔
''اتنی بھولی مت بنو، چلو ہم باہر نکلتے ہیں۔ میں ببول سے داتن کاٹ کر تھوڑی دیر تمہارے ساتھ ٹہلوں گا۔ اس دوران ہم باتیں بھی کر لیں گے۔''
''چلو!''
جسّے نے اپنی بکھری ہوئی پگڑی کو پھر سے سر پر لپیٹتے ہوئے دھیرے سے پوچھا:
''یہ تو بتاؤ کہ گرنتھی جی ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کچھ بولیں گے تو نہیں...... یا من میں ہی کچھ سوچیں......''
''اس بات کی چنتا مت کرو۔ ہمارے گرنتھی جی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ اس کے علاوہ تم تھوڑا بہت مال بھی انہیں چڑھاتے رہو، تاکہ ان کی پتنی بھی خوش رہے۔ تمہیں یہاں زیادہ دنوں تک ٹکنا پڑے گا۔ گرنتھی جی، خاص کر ان کی پتنی کو اپنی مٹھی میں رکھو۔ ان کے بچوں کو بھی ریوڑیاں کھانے کے لیے پیسے دے دیا کرو۔ سمجھے؟''
''سمجھا۔''
یہ کہہ کر جسا لمبے شہتیر کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں گوردوارے کے پچھواڑے کی طرف چلے گئے، جہاں جھاڑیاں تھیں اور ببول کے درخت تھے۔ جسا ایک لمبی سی کلہاڑی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ ببول کی کومل سی شاخ کو کاٹ کر نیچے گرایا اور اسے چھیل کر داتن بنالی۔ تب اس نے پرسنّی سے کہا: ''اب بتاؤ کیا کیا ہوا؟''
''کیا مطلب؟ تم سمجھتے تھے کہ تمہارے یہاں آنے سے کوئی بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''
''میرا مطلب ہے کہ دیپی سے تمہاری ملاقات ہوئی یا نہیں؟''
''کیسے نہ ہوتی۔ کوئی بڑا شہر تو ہے نہیں، چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس سے چاہو فوراً ملاقات ہو سکتی ہے۔''
''یقین نہیں آتا۔''
''کیوں؟''
''اس لیے کہ اگر دیپی کو میرے بارے میں پتا چل جاتا، تو وہ اس وقت مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آتی۔''
پرسنّی نے تالی بجائی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی:
''تو یہ بات ہے؟ سچ مچ تمہارا نام سنتے ہی وہ گوردوارے کی طرف بھاگ پڑی۔ مَیں نے پیچھے سے دوڑ کر اسے پکڑا، اُٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور اس طرح اسے واپس لے گئی۔''
جسّے نے سوچا کہ یہ لڑکی تو بہت تیز اور چلبلی ہے۔ اسے ہلکی سی جھینپ لگی۔ بولا:

''دیکھو پرسنّی! مَیں جس کام سے آیا ہوں، اس میں تم نے میری مدد کرنے کا وچن دیا تھا۔ یہ اچھی مدد ہے کہ مجھ ہی کو اُلّو بنا رہی ہو، جو بات کہتا ہوں، اسے ٹال دیتی ہو۔''

''میں نے تو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کیا ہی ہے مگر تمہیں بھی سوچنا ہوگا کہ مجھے کیسا تعاون دو گے۔''

''تمہارا مطلب پورن سنگھ سے ہے؟''

پرسنّی منہ دوسری طرف کو پھیر کر چپ رہی۔

جسا بولا:

''تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ وہ میرا گہرا دوست ہے۔ اگر وہ سیدھی طرح نہ مانا تو اسے زبردستی لا کر تمہاری گود میں بٹھا دُوں گا...... میرا مطلب ہے تمہارے پاؤں میں ڈال دُوں گا۔ اب تو کچھ بولو۔''

پرسنّی نے چہرہ جسّے کی طرف گھمایا تو اس کے گالوں پر لجا کی ہلکی سی سرخی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے تنکے کو اگلے دانتوں میں دبائے جا رہی تھی۔

جسّے نے پوچھا: ''اب تمہاری تسلی ہو گئی؟''

پرسنّی نے ہاں میں سر ہلا دیا پھر بولی:

''میں نے ہی دیپی کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ ہم دونوں کافی دیر تک اس مسئلہ پر سوچ بچار کرتے رہے۔ تب اس نتیجے پر پہنچے کہ تمہیں دیپی سے نہ ملایا جائے۔''

چلتے چلتے جسا رُک گیا اور اپنے منہ سے بناوٹی آہ چھوڑتے ہوئے بولا:

''واہ کیا اچھا نتیجہ نکالا ہے۔''

''تم تو یُونہی بے صبر ہو جاتے ہو، آگے بھی تو سُنو۔''

''بولو!''

''میری ترکیب یہ ہے کہ دیپی کی بجائے تمہاری ملاقات اس کی ماسی سے، کرائی جائے۔''

''ماسی؟'' جسا چلا کر بولا۔

''ہاں، ماسی...... اور پھر ماسی کے ذریعے تم دیپی کو یوں ملو، جیسے اسے پہلے کبھی جانتے ہی نہیں۔ یعنی پہلے دیپی کی ماسی کو تم سے پریم ہونا چاہیے...... اس کے بعد اس کی بھانجی کی باری آئے گی۔''

''اس بُڑھیا سے پریم کیسے کر پاؤں گا؟''

''پریم تم نہیں کرو گے، ماسی کرے گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟''

''کان کھول کر سُنو، کل تہوار کا دن ہے۔ اس تاریخی گوردوارے میں آس پاس کے دیہات سے

بہت لوگ آئیں گے، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے..... سبھی۔ دیپی اور اس کی ماسی بھی آئے گی۔ ماسی یوں تو ہٹی کٹی ہے، مگر اس کی ایک ٹانگ کمزور ہے۔ چلنے پھرنے میں اسے تھوڑا سہارا چاہیے۔ وہ عموماً لاٹھی کا سہارا لیتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ہم گھر پر اس کی لاٹھی ہی غائب کر دیں گے اور پھر کہیں گے کہ چلیے آپ کو سہارا دے کر گوردوارے پہنچا دیں گے۔ یہاں پہنچ کر سب لوگ رہٹ پر ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں۔ ماسی بھی رُکے گی۔ جب وہ ہاتھ پاؤں دھو رہی ہوگی، ہم اِدھر اُدھر بھیڑ میں کھو جائیں گی۔ تب تم آگے بڑھ کر اس کو سہارا دینا، اس طرح تمہارا اس سے تعارف ہو جائے گا۔ تم اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ بتانا کہ تم پردیسی ہو اور اس گاؤں میں تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ وہ بڑی حساس ہے، تمہیں گھر لے جائے گی۔ چاہے راتیں تمہیں گوردوارے میں ہی کاٹنی پڑیں مگر دن میں تمہارا ناشتہ اور کھانا گھر پر ہی ہوا کرے گا۔ ماسی کو اور زیادہ ہاتھوں پر ڈالنا تمہارا کام ہے۔ جب ایک بار پریما کے گھر میں گھس گئے تو راستہ ہموار ہو جائے گا۔ اس کے آگے کی بات بعد میں دیکھیں گے..... ٹھیک؟"

جسا منہ پھیلا کر بولا: "تمہارا جواب نہیں ہے۔"

"تو میں چلی، گاؤں کے کسی شخص نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو خوامخواہ میری بدنامی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ، میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میرا نہیں، ماسی کا۔"

اس پر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

پرسّی چلی گئی، تو گرنتھی جی اِدھر آ نکلے۔ جسا سنگھ جیسے یاتروں کو پا کر انہیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ واقعی بڑے بھولے بھالے اور سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ان کی پتنی نے ان کو سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی اس نوجوان کو کچھ دن روکے رہو، تو اس میں ہمارا بھلا ہو جائے گا۔ اسی لیے گرنتھی جی جسے کو دیکھتے ہی بولے:

"کہیے سردار جی! آپ کو رات کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں، بھلا آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ بہت گہری نیند آئی۔ رات بڑے چین سے کٹی۔"

گرنتھی جی نے دانت نکال دیئے، بولے:

"میری مانئے کچھ دن یہیں ٹکے رہیے۔"

جسا سنگھ گرنتھی جی کی بات کی تہہ میں پہنچ نہیں پایا۔ نہ جانے وہ طنز کر رہے تھے، یہ سمجھ کر پرسّی سے اس کا پریم وریم چل رہا ہے۔ یا اس میں کوئی اور راز ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ شاید گرنتھی جی کو پیسے دھیلے کا ہی لالچ ہو۔

اسے خاموش دیکھ کر گرنتھی جی نے پھر کہنا شروع کیا:

''کل یہاں تہوار شروع ہوگا۔ میلہ بھی لگے گا، جوک ۶ دن تک چلے گا۔ بڑی رونق بڑی گہما گہمی رہے گی۔ دُور دُور سے راگی، جتھے اور گیانی آئیں گے۔ شبد کیرتن کے ساتھ بہت اچھے بھاشن بھی ہوں گے۔''

جسّے نے گرنتھی جی کی بات کا جواب دینے کی بجائے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا:

''لیکن گرنتھی جی، مجھے یہاں میلے کی تو کوئی تیاری نظر آتی نہیں۔''

''آج ہی سے دُکانیں آنی شروع ہو جائیں گی۔ دو دِن کے بعد یہاں آپ کو دُکانیں ہی دُکانیں دکھائی دیں گی۔ ان کے علاوہ جھولوں والے، مداری، بازی گر وغیرہ کئی طرح کے لوگ آئیں گے۔''

''تب تو کافی موج میلہ رہے گا۔''

گرنتھی جی جلدی سے بولے:

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آپ کم سے کم آٹھ دس دن تک ضرور ٹکے رہیے۔ ویسے ہمارے بچے تو تھوڑے ہی وقت میں آپ سے اتنے ہل گئے ہیں کہ جی نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ آپ چاہیں مہینہ بھر یہاں ٹکے رہیں۔''

جسّے نے ایک بار تو گرنتھی جی کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اور پھر بڑے بھولے پن سے بولا:

''گرنتھی جی، آپ جیسے دیوتا انسان کے کہنے کو میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔''

گرنتھی جی کھیسیں نکالے جا رہے تھے اور دونوں ہاتھ ملتے جا رہے تھے۔ منمنا کر بولے:

''آپ ایسا سمجھتے ہیں، یہ تو آپ کی عظمت ہے۔''

گرنتھی جی واپس جانے لگے تو جسّے نے اپنے تہمد کے پہلو کو کھول کر مٹھی میں کچھ روپے نکالے اور گرنتھی جی کو روک کر اس کی ہتھیلی پر گن کر پانچ روپے رکھ دیئے اور کہا:

''تہوار کے موقع پر میری طرف سے ڈھائی روپے کا کڑاہ پرساد کرا دیں اور ڈھائی روپے گوردوارے کے لیے قبول کریں۔''

گرنتھی جی روپے پا کر آگے کو اتنا جھک گئے، جیسے روپوں کے بوجھ سے سیدھے کھڑے رہنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔ بولے:

''آپ جیسے دانیوں کی سخاوت سے دھرم کا جھنڈا اُونچا رہتا ہے۔ پنتھ پر جب جب بُحران آیا، تب آپ جیسی مہان شخصیتوں نے پنتھ کے بیڑے کو پار لگا دیا۔''

جسّے کو پنتھ کا بیڑا پار لگانے کی بجائے اپنا بیڑہ پار لگانے کی زیادہ فکر تھی لیکن اگر اپنا بیڑہ پار لگانے کے ساتھ ساتھ دھرم کا جھنڈا بھی خوب اونچا لہراتا ہے۔ تو اس اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

گرنتھی جی مَن ہی مَن پھولے نہیں سما رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ دھرم پتنی کو بتائیں گے کہ

انہوں نے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو نہ صرف کچھ دنوں کے لیے روک لیا ہے بلکہ پانچ روپے نقد دان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو ضرور ہی اس کی نظر میں ان کا درجہ بہت اُونچا ہو جائے گا۔

مگن ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ خیال آیا۔ پلٹے اور بولے:

''آپ جی کا شُبھ نام؟...... سنگت میں دانیوں کا نام گنوانا ضروری ہوتا ہے، اسی لیے پوچھ رہا تھا۔''

''جسا سنگھ۔''

''سردار جسا سنگھ جی۔''

۲

اس روز شام ہونے تک کئی دُکاندار وہاں پہنچ گئے اور دھرتی میں بانس گاڑ کر اپنی دُکانیں کھڑی کرنے لگے۔ دو جھولے والے اپنا سامان ساتھ لیے آ پہنچے۔ اسی طرح کئی قسم کی چیزیں بیچنے والے بیوپاری آتے گئے۔

اس رات گوردوارے کے باہر کافی گہما گہمی تھی۔ کچھ دُکانداروں نے گیسوں کے ہنڈے جلا رکھے، جن کے پرکاش سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ گوردوارے کے بڑے ہال میں لیٹے لیٹے جسا سنگھ باہر سے آنے والے شور و غل کو سُنتا رہا، پھر اپنے وچاروں میں کھو گیا۔ کب نیند آئی، اسے اس بات کا پتا ہی نہیں چلا۔

صبح سویرے وہ جاگ اُٹھا۔ پرسنّی کے پہنچنے سے پہلے پہلے چھوٹے موٹے کاموں سے فرصت پا کر اس نے اشنان کیا اور اُجلے کپڑے پہن کر، سر پر کلف لگی، رنگین پگڑی باندھ کر وہ بالکل تیار ہو بیٹھا۔

جب پرسنّی آئی تو وہ خوش ہو کر بولا:

''دیکھو، آج میں بالکل تیار ہوں، تمہارے سامنے ہی ناشتہ کروں گا۔''

پرسنّی بولی:

''تم تیار ہو، اس لیے میں رُک جاتی ہوں۔ برتن واپس لے جاؤں، تو ٹھیک رہے گا۔ جلدی کرو، مجھے گاؤں پہنچ کر پھر واپس آنا ہے۔''

جسّے نے پراٹھے کھانے شروع کرتے ہوئے پوچھا:

''یہ بتاؤ کہ دیپی نے مجھے یاد بھی کیا، یا نہیں۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ اُڑ کر میرے پاس پہنچ جائے گی۔''

پرسنّی نے بناوٹی غصے میں کہا:

''تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر ابھی سے بھانڈا پھوٹ گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ سچ سچ کے سوبیٹھا ہو، جلدی جلدی ناشتہ ختم کرو۔''

زیادہ باتیں نہیں ہو سکیں۔ پرسنّی نے برتن باہر لے جا کر رہٹ کے پانی سے دھوئے۔ جسا پاس ہی کھڑا تھا۔ پرسنّی اس کے من کی بے چینی کو بھلی بھانت سمجھتی تھی۔ جاتے جاتے کہنے لگی:

''ذرا رہٹ کے آس پاس ہی منڈلاتے رہنا۔ دہپی کی ماسی کو تو تم پہچان ہی جاؤ گے، کیونکہ ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں دھونے بیٹھے گی تو ہم اِدھر اُدھر سَرک جائیں گے۔ اس کے بعد سارا کام تُم ہی کو سنبھالنا ہوگا۔''

پرسنّی جانے کو لوٹی، تو جسا بولا:

''ہاں پرسنّی، ایک بات یاد آ گئی۔''

پرسنّی نے دھیرے سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

''تم ہماری ترکیب کامیاب نہیں ہونے دو گے...... بولو۔ کیا بات ہے؟''

''پرسوں جب ہم گوردوارے آئے تھے، تو ہمیں یہاں سے واپس لوٹتی ہوئی ایک عورت ملی تھی۔ مَیں اسے نہیں پہچانا۔ تم کو اس بات پر تعجب ہوا۔ پھر تم نے وچن دیا تھا کہ تم اس کے بارے میں بتاؤ گی۔''

''بتانا کیا ہے...... وہ تمہارے دوست کی بڑی بہن ہے۔''

''کون دوست............ پورن سنگھ؟''

''ہاں عجیب بات ہے نا کہ اس کے دوست ہو کر اس کی بڑی بہن کو نہیں پہچانتے۔''

''دراصل اس کی بڑی بہن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

''اچھا؟...... بیچاری کی بدقسمتی دیکھو، کہ اس چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہو گئی۔''

''ارے۔''

''اب میں چلی۔''

پرسنّی چلی گئی، تو جسا کچھ دیر جہاں کا وہاں کھڑا رہا۔ آخر وہ گوردوارے کو لوٹا۔ دالان میں گھس کر گوردوارے کے بڑے ہال میں جا پہنچا۔

کافی سنگت جمع ہو چکی تھی۔ جسا بھی گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیک کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی پورن سنگھ کی بیوہ بہن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس بیچاری پر ترس آ رہا تھا۔

شبد کیرتن کے دوران جسا اپنی ہی دُنیا میں گم رہا۔ اس کے من میں وچار اُٹھا، کہ اگر پورن سنگھ کی بہن میلے میں اسے کبھی مل گئی، تو وہ ضرور اس سے بات چیت کرے گا۔

جسا نہ جانے کتنی دیر تک اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ تب اچانک اسے خیال آیا کہ اب آدھے گھنٹے سے اوپر بیت چکا ہے اور اسے رہٹ کے قریب پہنچ جانا چاہیے۔

ہال بھرا ہوا تھا، جسا جان بوجھ کر سب سے پیچھے دروازے کے قریب بیٹھا تھا تاکہ جب اسے اُٹھ کر جانا

پڑے، تو اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ آخر وہ اُٹھا۔ وہیں سے گوروگرنتھ صاحب کو ماتھا ٹیکا اور ہال سے باہر نکل آیا۔ دالان سے باہر بھی گہما گہمی تھی اور چار دیواری کے باہر تو کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس نے رہٹ کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ دیپی کی ماسی کو تو نہیں پہچانتا تھا مگر پرسنی اور دیپی کو پہچاننے کے بعد ہی اسے علم ہو سکتا تھا کہ ماسی کون تھی۔

رہٹ کے اولو، یعنی جہاں پانی گرتا تھا کے آس پاس کافی لوگ ہاتھ پاؤں دھونے میں مصروف تھے۔ ان میں نہ تو اسے دیپی دکھائی دی اور نہ پرسنی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچیں تھیں۔ وہ بھیڑ بھاڑ اور دُکانوں کے بیچ میں سے گاؤں کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ گاؤں تک پہنچنے کا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دُور سے ان لوگوں کو آتے تو دیکھ ہی سکتا تھا۔ جس جگہ بھیڑ ذرا کم تھی، وہاں ایک پیڑ کے نیچے رُک کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کھیت تھے، جھاڑیاں تھیں، پگڈنڈیاں تھیں، چھوٹی سی نہر کے دو فٹ اُونچے کنارے دکھائی دے رہے تھے۔ جنہیں ہموار ہونے کی وجہ سے راستے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی پُلیا بھی دِکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں کو جانے کے لیے یا وہاں سے گوردوارے تک پہنچنے کے لیے اس پُلیا سے گزرنا ضروری تھا۔ اس وقت لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں چلے آرہے تھے۔ رتّو کے گاؤں سے بھی پرے دوسری بستیوں سے گوروگھر کے پریمی اسی پُلیا سے گزرتے تھے۔ دُور دُور تک مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیوں کا منظر عجیب سا لگتا تھا۔ عام دنوں میں وہاں اتنی گہما گہمی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ کوئی اِکّا دُکّا یاتری یا کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہی دِکھائی دیا کرتے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں ایسے بھی لوگ تھے، جو لکیوں والے بڑے بڑے چمٹے بجاتے اور ڈھولکیاں پیٹتے اُونچی آواز میں گوروانی میں سے شبد گاتے چلے آرہے تھے۔ کچھ اُداسی کے انداز سے۔ جسّا اس سارے منظر کو دیکھتا رہا۔ پُلیا پر جب کبھی لڑکیوں یا عورتوں کا کوئی جھنڈ نظر آتا تو اس کے من میں آشا کی کرن جگمگا اُٹھتی، مگر تھوڑی دیر میں آشا نراش کا روپ اختیار کر لیتی۔

آخر اس کی دلی خواہش پوری ہو گئی۔ اس نے ان لوگوں کو تب پہچانا، جب وہ پُلیا پار کر کے کافی قریب پہنچ چکی تھیں۔ اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ اس گہما گہمی میں ماسی کی نظر خواہ مخواہ اس پر ٹِک جائے گی۔ دیپی اور پرسنی تو اسے پہچانتی ہی تھیں اور ان کی ہی تو یہ سازش تھی۔ پھر بھی جسّا راستے سے کچھ قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیپی کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ چاہے وہ اسے کتنی دیر بھی دیکھے، اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔

دیپی نے ملے سونے کے سے رنگ والی چُنّی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ گلے میں دھاری دار قمیص تھی، جس میں باریک زنجیر والے چاندی کے بٹن تھے۔ شلوار بادامی رنگ کی تھی۔ ان عام کپڑوں کے باوجود اس کا حُسن پھوٹا پڑتا تھا۔ دوسری طرف پرسنی تھی اور ان کے بیچ ایک موٹی تازی بُڑھیا دکھائی دے رہی تھی، جس نے اپنے بازوؤں سے دونوں لڑکیوں کے کندھوں کا سہارا لے رکھا تھا۔ ایک ٹانگ میں خرابی ہونے کی وجہ سے وہ ذرا اٹک اٹک کر چلتی تھی۔ اس نے کتھئی رنگ کا گھگھرہ پہن رکھا تھا اور گلے میں لال بوٹیوں والی کُرتی تھی۔ بال زیادہ تر سفید ہو چکے تھے، پھر بھی وہ ہر طرح کے گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ رنگ گورا اور طبیعت کے لحاظ سے خوش مزاج معلوم ہوتی تھی۔ ہنستی دیتا چلتا کہ اس کے منہ میں پورے دانت بھی نہیں تھے۔

پل بھر کو جسّے کی نظریں دیپی اور پرسنّی سے ملیں۔ عاشق معشوق کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ پھر وہ تینوں گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اولُو کی طرف بڑھنے لگیں۔

اب ناٹک شروع ہو چکا تھا۔ جسا بھی آگے بڑھ کر کچھ دُوری پر رُک گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ وہ لڑکیاں وہاں سے سرکیں، تو پھر وہ اداکاری کرنے کے لیے وہاں پہنچے۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ماسی کو توجہ سے دیکھ رہا تھا، جو اس وقت کہنیوں تک اپنے ہاتھ اور پنڈلیوں تک پاؤں دھونے میں مصروف تھی۔ اس عمر میں بھی گوری پنڈلیوں پر بڑی سُندر چکناہٹ تھی۔

اتنے میں ہی ماسی نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا، تو کسی لڑکی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جسا دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماسی ذرا اور پریشان ہو لے، تو وہ اس کے قریب پہنچے۔ ٹھیک موقع پر وہ اولُو کے قریب گیا اور جُھک کر ماسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''ماتا جی، آپ کچھ پریشان دکھائی دیتی ہیں۔''

ماسی کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے جسّے کے چہرے کی طرف دیکھا، تو وہ بل دور ہو گئے۔ بولی:

''کیا کہوں بیٹا، لڑکیاں میرے ساتھ تھیں، اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔''

''اس میں زیادہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ماتا جی۔ یہاں اُن کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''خطرے کی بات نہیں بیٹا۔ اصل میں میری ٹانگ ذرا کمزور ہے، اور میں بنا کسی کے، یا لاٹھی کے سہارے کے ٹھیک سے چل نہیں سکتی۔ لڑکیاں تو خیر یہیں کہیں ہوں گی۔ انہیں اس بات کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا کہ کم سے کم مجھے گوردوارے کے بھیتر پہنچا دیتیں۔''

جسّے نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

''یہ بات ہے تو لایئے میں آپ کو وہاں تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ کی لڑکیاں خود ہی وہاں تک پہنچ جائیں گی۔''

بڑے پریم سے جسّے نے ایک ہاتھ میں ماسی کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرا اس کی بغل میں دے کر دھیرے دھیرے گوردوارے کی طرف بڑھا۔ ماسی کہہ رہی تھی:

''میری لاٹھی میرے پاس ہوتی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب ہم گھر سے چلے، تو نہ جانے لاٹھی کہاں کھو گئی۔ لڑکیاں کہنے لگیں کہ چلو ہم سہارا دے کر لے چلتی ہیں۔ لاٹھی بعد میں مل جائے گی۔''

''ہاں، ماتا جی! ایسا بھی ہو جاتا ہے۔''

ماسی نے پوچھا:

''بیٹا تُو کہاں سے آیا؟ ہمارے گاؤں کے تو ہو نہیں۔''

''آپ نے ٹھیک کہا۔''

جسّے کے منہ سے ہری پوری کا نام نکلنے کو تھا ہی، مگر عین موقعہ پر یاد آ گیا کہ دیپی بھی تو وہاں سے آئی تھی۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا مناسب نہیں ہوگا۔ بولا:

''مَیں چک پیراں سے آیا ہوں۔''

''چک پیراں..........؟ یہ نام کبھی سُنا نہیں۔ ہمارے علاقے سے دُور ہوگا۔''

''آپ نے ٹھیک کہا۔ یہاں سے کئی کوس کے فاصلے پر ہے۔ میں صبح کے وقت وہاں سے چلا تو کہیں تیسرے پہر یہاں پہنچا۔''

''یہاں کسی سے ملنے آئے ہو؟''

''یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، اور نہ میں کسی سے ملنے آیا ہوں۔ دراصل میں یہاں کے تاریخی گوردوارے کا یہ جوڑ میلہ دیکھنا چاہتا تھا۔ سُنا ہے یہاں بڑے بڑے گیانی، راگی، اور دھارمک نیتا (مذہبی لیڈر) وغیرہ آتے ہیں۔ مجھے ان باتوں کا شوق ہے۔''

''ارے بیٹا! یہ تو بہت ہی شُبھ بات ہے۔ تیری عمر کے لڑکوں کا دھیان تو دھرم کی طرف تو ہوتا ہی نہیں۔''

''مگر ماتا جی، میں ہر برس کسی نہ کسی نئے گوردوارے کا جوڑ میلہ دیکھتا ہوں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک سال میں دو تین جوڑ میلے دیکھ ہی لیتا ہوں۔''

اب وہ ہال کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ جسّے کے سہارے سے ہی ماسی گورو گرنتھ صاحب کے سامنے پہنچی اور نیچے دری پر ناک رگڑ کر ماتھا ٹھیکا۔ تب جسا اسے ادھر کو لے آیا جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

ماسی کو وہاں بٹھانے کے بعد باہر نکلنے سے پہلے جسا بولا:

''میں آس پاس ہی رہوں گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بُلا لیجیے گا۔''

''تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟''

''جسا سنگھ۔''

یہ کہہ کر جسا ہال سے باہر نکل آیا۔ چار دیواری کے بڑے دروازے کی طرف نظر ڈالی تو اس کے باہر دیپی اور پرسنّی کھڑی دکھائی دیں۔ وہ دونوں بڑی چُلبلاہٹ سے ہنس رہی تھیں۔ جسا سنگھ فوراً اُدھر کو ہی چل دیا۔ ان کے قریب پہنچا تو پرسنّی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھ جانے کو کہا۔

جسا میلے میں سے ہوتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ کچھ دُور جا کر اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، تو دونوں لڑکیاں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

دُور دُور تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے یاتری درختوں کی چھایا میں گٹ بنائے بیٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ پیچھے سے آواز آئی:

''اُونٹ کی طرح سے بے نکیل کدھر کو چلے جا رہے ہو؟ رُکنے کا نام بھی نہیں لیتے۔''

یہ پرسنّی کی آواز تھی۔

جسّے نے سوچا کہ یہ لڑکی بھی دوسرے کو اُلو بنانے میں اُستاد ہے۔ پہلے تو مجھے چلتا کیا، اور اب طنز کر رہی ہے۔

وہ رُک گیا دونوں لڑکیاں قریب پہنچیں۔ تھوڑی دیر تک پرسنّی کھلکھلاہٹ سے پُھدکتی رہی اور ان دونوں کا مذاق اُڑاتی رہی۔ آخر میں بولی: ''اچھا میں چلتی ہوں۔''

دیپی نے جھٹ سے اس کی قمیص کی آستین پکڑ کر کہا:

''کہاں جاتی ہو؟ ہم دونوں کو کسی جان پہچان والے نے دیکھ لیا، تو میری آفت آجائے گی۔''

''اِدھر تمہاری جان پہچان والا کوئی نہیں آئے گا۔ بھلا گاؤں والوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ یہاں آکر پیڑوں کی چھایا میں بیٹھیں۔ وہ تو تھوڑا شبد کیرتن سُنیں گے اور گھر کو لوٹ جائیں گے۔ یہ جگہ ان کے راستے میں بھی نہیں پڑتی۔''

دیپی نے پھر بھی آستین نہیں چھوڑی۔

پرسنّی نے جسّے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ذرا اپنے اس کو بھی تو دیکھو، تم رُکنے کو کہہ رہی ہو اور یہ بھیتر ہی منا رہے ہیں کہ میں جلد سے جلد یہاں سے چلتی بنوں۔ کیوں، ٹھیک ہے ناں؟''

آخری اشارہ واقعی جسا سنگھ کی طرف تھا۔ جسا سنگھ نے فوراً سر ہلا کر جواب دیا:

''ہاں میں تو یہی چاہتا ہوں۔''

اس پر وہ تینوں ہنس دیئے۔

تب پرسنّی نے دیپی کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''پگلو تم نہیں سمجھتی ہو، کہ دو پریمیوں کا سب سے الگ الگ بیٹھنا کتنا ضروری ہے۔ ارے بھئی، نہ جانے دُکھی دل کی کیسی کیسی باتیں ہوتی ہیں۔ جو من کے باہر آنے کو بے تاب ہوتی ہیں۔ ویسے میں سدا کے لیے نہیں جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گی۔ اتنے وقت میں تُم دونوں کو جو کچھ کرنا ہے، جلدی جلدی کرلو۔''

''دھت تیری کی۔'' دیپی نے اس کی پیٹھ پر دھول جماتے ہوئے کہا:

''بھلا ہمیں کیا کرنا ہے۔''

پرسنّی بولی:

''نہ جانے تم کیا سمجھ بیٹھی ہو۔ اتنے لوگوں کے بیچ دن دیہاڑے سوائے باتوں کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے............ میں چلی۔''

دیپی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا: ''جلدی سے لوٹ کر آنا۔''

دیپی اور جسے سے وِداع ہو کر پرسنی ایک طرف کو چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے۔ اس وقت گوردوارے میں پر وچن ہو رہے تھے، جو نہ تو اس کی سمجھ میں آتے تھے اور نہ اسے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس وقت خریداری کا موقعہ بھی نہیں تھا۔ چالاک گاہک خریداری اس وقت کرتے تھے، جب میلہ ختم ہونے کو ہوتا تھا، کیونکہ اس وقت دُکاندار اپنی چیزیں سستے داموں میں فروخت کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ پرسنی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ دُور تک پھیلے ہوئے میلے میں گھومتی رہے۔

دُکانیں تو ابھی لگ ہی رہی تھیں، مگر یاتریوں نے دُور دُور تک ڈیرے جما لیے تھے۔ پرسنی انہیں میں گھومتی پھرتی رہی۔ وہ من ہی من یہ اندازہ بھی لگا رہی تھی کہ دیپی اور اس کا پریمی کس طرح کی باتیں کر رہے ہوں گے۔

چلتے چلتے وہ ایک دم رُک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ٹھٹھک کر پلٹی، مگر پیچھے سے ایک نوجوان نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ نوجوان صورت سنگھ تھا۔

پرسنی نے بگڑ کر پوچھا:

''بھرے میلے میں میرا بازو تھامنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟''

''اگر تم اس طرح پلٹ کر مجھ سے دُور بھاگنے کی کوشش نہ کرتیں تو میں تمہارے بازو کو ہرگز نہ چھوتا۔''

''اب میں تم سے دُور ہی بھاگ جانا چاہتی ہوں۔''

''میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گا۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح زبردستی تم میرا پیار جیت لو گے؟''

''تمہارے دل میں میرے لیے پریم کا جذبہ پہلے سے ہی موجود ہے۔ زور زبردستی کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''یہ تمہارا وہم ہے کہ مَیں تم سے پریم کرتی ہوں۔''

''یہ میرا وہم نہیں ہے۔ تم خود قبول کر چکی ہو کہ تم مجھ سے پریم کرتی ہو۔ بولو، تم نے یہ کہا تھا کہ نہیں؟''

''کہا تھا...... لیکن وہ میری مورکھتا تھی۔''

''کون جانے کہ وہ مورکھتا تھی، یا جو کچھ اب کر رہی ہو یہ مورکھتا ہے۔''

''میں اس اُلجھن میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''میں تمہیں اس اُلجھن سے نکلنے نہیں دُوں گا۔''

''عورتوں کے سامنے شیخی بگھارتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ جب مرد سے سامنا ہوا تو جھک مار کر رہ گئے۔''

''جب دو مردوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو ایک نہ ایک ہار جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ہار جائے وہ مرد ہی نہیں رہا۔ میں تمہارا اشارہ خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم پولیس کے داروغہ والی بات یاد کرا رہی ہو۔ میں بیچ کھیت کے مانتا ہوں کہ دوڑ لگانے میں وہ مجھ سے بیس ہے اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ ہر مقابلے میں مجھے ہرا سکتا ہے، تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔''

''میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہاں بھرے میلے میں ہمارے گاؤں کے کئی لوگ گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔''

''عجیب بات ہے، آج تمہیں بدنامی کا اتنا ڈر ہے۔ اس روز تو تم نے میرے ہاتھ میں ہاتھ دے رکھا تھا، جب نہ جانے کہاں سے داروغہ آ ٹپکا۔''

''وہ دُوسرا گاؤں تھا، جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تم مجھے وہاں لے گئے تھے مگر یہ میرا اپنا گاؤں ہے۔ یہاں سب لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں۔''

''چلو یہ بات بھی مان لی لیکن اگر تم مجھ سے اس وقت بات نہیں کرنا چاہتیں، تو مجھے کتے کی طرح دھتکار کر تم پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتیں۔''

''سیدھی سی بات ہے کہ جس گاؤں جانا ہی نہیں، اس کا راستہ دیکھنے سے کیا۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی، تو پھر تم سے باتیں کرنے کا کیا فائدہ۔''

''یہی تو مَیں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا، جو تم نے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔''

''تم بیکار ہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ عورت ایک بار جس بات کا فیصلہ کر لے، اس سے اِدھر اُدھر کبھی نہیں ہوتی۔''

''یہ کہنے سے پہلے وہ زمانہ بھی یاد کرو، جب تم پورن سنگھ کو چھوڑ کر میری بغل گرم کرنے لگی تھیں۔ بھلا اس وقت عورت کا فیصلہ کہاں گیا تھا۔ آج تم اس فیصلے کا ڈھنڈورا پیٹو، تو بھلا مجھ پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔''

''اس میں بھی ایک بھید تھا۔''

''میں وہی بھید تو جاننا چاہتا ہوں۔''

''یہ سب کچھ بتانے کے لیے تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔ ابھی تم اس بات کو چھوڑ دو۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھ سے منہ کیوں پھیر لیا؟''

''اس لیے کہ اب مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ پورن سنگھ سے منہ پھیرنا میری بھول تھی۔''
''کیا وہ تمہاری اس بھول کو معاف کر دے گا؟''
''تمہیں اس سے مطلب؟''
''مجھے مطلب نہیں ہو گا تو اور کس کو ہو گا اگر تم سمجھے بیٹھی ہو کہ مرد کی حیثیت پاؤں کے جوتے سے زیادہ نہیں ہے کہ جب جی اُوبا اسے اُتار کر پھینک دیا اور دوسرا جوتا پہن لیا۔''
''تم صرف اپنی بات کرو، کسی اور سے تمہیں کیا مطلب؟''
''ہاں، ہاں! میں اپنی بات ہی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اور سے کچھ بھی مطلب نہیں۔''
پرسنی نے سوچا کہ صورت سنگھ کے ساتھ بحث کرنے کا مناسب مقام نہیں تھا۔ اس لیے اس وقت اس سے پیچھا چھڑا لینا ہی بہتر ہو گا۔ بولی:
''تو تمہاری ضد یہ ہے کہ اسی جگہ اور اسی وقت تم مجھ سے اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہو۔''
''نہیں، میری ایسی کوئی ضد نہیں ہے۔''
''تو بابا، میرا پیچھا چھوڑ دو نا۔''
''تمہارا پیچھا تو جیون بھر چھوڑنے کا ارادہ نہیں۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ لو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تم پھر کبھی ملنے کا وعدہ کرو تو میں اس وقت تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔''
پرسنی جلدی سے بولی:
''ہاں، مجھے یہ بات منظور ہے۔''
صورت سنگھ کے ہونٹوں پر طنزیہ مُسکان پیدا ہوئی اور وہ گردن آگے بڑھا کر دھیرے سے بولا:
''جس قدر جلدی سے تم نے میری یہ شرط منظور کر لی ہے۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں ہے اور تم مجھے ٹرخا رہی ہو۔''
''دیکھو! پرانی کہاوت ہے کہ شک اور وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ کہو تو سٹامپ پر لکھ کر دے دُوں؟''
''ہاں ہاں سٹامپ پر لکھ کر دے دو، تو میری تسلی ہو جائے گی۔''
پرسنی نے ہاتھ بڑھا کر کہا:
''لاؤ، سٹامپ والا کاغذ۔''
صورت سنگھ منہ پھاڑ کر ہنستے ہوئے بولا:
''چلو تمہاری بات مان لی میں نے۔ اب یہ کہو کہ ملو گی کب؟''
''میلے کے بعد۔''
''مجھے دِن بتاؤ۔''

''آج سے دس دن کے بعد منگل کے روز شام کے وقت اپنے گاؤں کے باہر اُونچے ٹیلے والے رہٹ پر ملاقات ہوگی...... کہو، اب تو پورا پروگرام بتا دیا میں نے۔''

''ٹھیک ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے غچہ دیا، تو میں تمھیں تمہارے گھر سے اُٹھا لے جاؤں گا۔''

پرسنی نے ہاتھ ہوا میں گھما کر کہا:

''مر گئے گھر سے اُٹھا کر لے جانے والے۔''

''بس، یہی تو تمہارے من کا دھوکہ ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ جب تم سیٹی بجاؤ گی تو میں کتے کی طرح دُم ہلاتا ہوا تمہارے پاس چلا جاؤں گا اور جب تم دھتکار کر مجھے ایک ٹھوکر لگاؤ گی، تو میں ٹیوں ٹیوں کرتا ہوا دُور بھاگ جاؤں گا۔''

''ایسے ہی ہوگا۔''

''دیکھیں گے۔''

''اچھا تم دیکھو...... میں چلی۔''

''اپنا وعدہ مت بھولنا۔''

''نہیں بھولوں گی۔''

جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی پرسنی وہاں سے چل دی۔ من ہی من بڑبڑا رہی تھی کہ اس صورت کی وجہ سے خواہ مخواہ اتنی دیر ہوگئی۔ سیدھی دیپی کے پاس پہنچی۔ جاتے ہی دھرتی پر پاؤں پٹک کر بولی:

''تم دونوں تو چونچ سے چونچ ملائے باتیں کر رہے ہو۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کتنی دیر ہوگئی ہے اور ماسی اُٹھنے والی ہی ہوگی۔ وہ زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔''

جسا بولا:

''پرسنی، دیر تم نے لگائی، ڈانٹ رہی ہو اس کو۔''

دیپی کی آنکھوں میں شرارت کی چمک دکھائی دی۔ کہنے لگی:

''ٹھیک سے کیوں نہیں بتاتی کہ کسی یار دوست سے بات چیت کرنے میں تجھے اتنی دیر ہوگئی۔''

جسے نے آنکھوں کی پتلیاں گھما کر حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''اوہو، تو یہ بات بھی ہے۔''

پرسنی نے کہا:

''یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ سردار بہادر، چلو ماسی کو سہارا دو۔ میری جانچ پڑتال کرتے کرتے کہیں اپنا کام نہ بگاڑ لینا۔''

جسا اُٹھ کر چلنے کو تیار ہوا تو پرسنی پھر بولی:

''جا تو رہے ہو یہ بھی معلوم ہے کہ اب ہمارا منصوبہ کیا ہے؟''

جسا ٹھٹھک کر رُک گیا۔

''منصوبہ وہی ہے جو پہلے طے ہوا تھا؟ یا اس میں پھر کوئی اَدلی بدلی ہوئی ہے؟''

''ہوئی ہے..... جب تم ماسی کو اُٹھا کر بڑے دروازے تک آؤ گے تو اس کے جوتے نہیں ملیں گے۔ ہم ان جوتوں کو غائب کر دیں گے۔ تم اسے وہیں پر بٹھا کر کہنا کہ مَیں ابھی جوتے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ گوردوارے کے پچھواڑے ہم تمہیں اس کے جوتے دے دیں گے۔ تمہارے ہاتھ میں اپنے جوتے دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوگی۔ تمہیں آشیرواد ملے گا اور اسی آشیرواد کی وجہ سے تمہیں یہ بیر بہوٹی ملے گی۔''

جسا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑے ہال کے سامنے پہنچا تو دروازے میں سے دیکھا، کہ ماسی بڑی بے چینی سے باہر کی طرف نظر دوڑا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا پڑی۔ بھیتر جا کر جسے نے آہستہ سے پوچھا:

''آپ کی لڑکیاں مل گئیں؟''

''نہیں تو، بڑی نٹ کھٹ لڑکیاں ہیں۔ کیا وہ سمجھتی ہیں کہ مَیں شام تک یہیں پر بیٹھی رہوں گی۔ گھر پہنچ کر مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ چلو تو دیکھیں، کہیں آس پاس اُچھل کود کر رہی ہوں گی۔''

جسا ماسی کو سہارا دے کر ہال سے باہر لے آیا۔ ماسی نے سارے دالان پر نظر دوڑائی، مگر لڑکیاں دکھائی نہیں دیں۔ بڑے دروازے سے باہر نکلے تو اس کے جوتے غائب تھے۔ اس پر وہ پریشان ہو اُٹھی۔ جسے نے کہا:

''ماتا جی! آج کل تو یہاں جوتے محفوظ رکھنے کا بھی انتظام ہے۔ آپ نے اپنے جوتے یہیں کیوں رکھے؟''

''سوچا تھا کہ مَیں جلدی ہی واپس لوٹ جاؤں گی، اسی لیے جوتے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ کوئی ایسے نئے جوتے بھی نہیں تھے، کہ ان کی چوری کا ڈر ہوتا۔''

''چنتا نہ کیجیے۔ مَیں ابھی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔''

''ارے! تم میرے جوتوں کو پہچانو گے کیسے؟''

اصل میں وہ ان جوتوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ بولا:

''میں نے آپ کے جوتوں کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ جہاں کہیں بھی نظر آئے، میں اُٹھا کر لے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے بھول سے انہیں پہن کر اِدھر اُدھر رکھ دیا ہو۔ یہاں اور بھی تو کئی جوڑے جوتے رکھے ہیں۔''

ماسی وہیں بیٹھ گئی اور جسا لپک کر گوردوارے کے پیچھے پہنچا۔ تینوں نے شرارت بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر جسا جوتے لے کر بڑی تیزی سے ماسی کے پاس پہنچ گیا۔

ماسی بالکل مایوس سی بیٹھی تھی۔ اپنے جوتے پا کر چہک اُٹھی۔ بولی:

''واہ بیٹا! تیرا بھی جواب نہیں ہے۔''

''مَیں نے کہا تھا نا کہ آپ کے جوتے اِدھر اُدھر پڑے ہوں گے۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔''

ماسی نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

''نہ جانے وہ چھوکریاں کہاں چلی گئیں۔ اب میں لاٹھی کے بنا گھر تک کیسے پہنچوں گی۔''

''چلیے، میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔''

''ارے بیٹا! آج تُو نے میری کتنی سیوا کی ہے۔ تُو نہ ہوتا تو مَیں رَہٹ کے اولُو کے پاس ہی گھسٹتی رہتی۔ اب تو مجھے پہنچانے کے لیے اپنے کاموں کا ہرج کرے گا۔''

''بزرگوں کی سیوا کرنا ہی سب سے بڑا کام ہے۔''

ماسی کے من پر ان باتوں کا گہرا اثر پڑا۔ جسّے کے بازو کا سہارا لے کر وہ دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چل دی۔ راستے میں پُلیا سے گزرے۔ اس کے بعد چھوٹا سا قبرستان آیا۔ اس کے بعد گاؤں کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر یعنی رُوڑی، آگے تنگ گلی تھی، جو ذرا اوپر کو جاتی تھی۔ گلی کے ڈھول میں ملے ہوئے سُوکھے پتے اور بھوسے کے تنکوں کو جوتوں تلے روندتے ہوئے وہ گلی کے موڑ تک پہنچ گئے۔ دائیں بائیں کچی اینٹوں کے لیے پتے مکان تھے۔ اور نکڑ پر ہی ماسی کا مکان تھا۔ گلی میں سے گزرنے والوں کو صحن کی ہر چیز دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں میں کسی کی کوئی چیز دوسروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ سب ایک بڑے کنبے کی طرح رہتے تھے، اور ایک دوسرے کے مکانوں کو اندر باہر سے پہچانتے تھے۔

بڑے دالان میں پیپل کا بڑا درخت تھا۔ ماسی نے آواز لگائی:

''اَری بہو، ایک چارپائی تو چھایا میں ڈال دے۔''

مکاں سے بہو کے نکلنے سے پہلے ہی دیپی اور پرسنّی نکل آئیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی ماسی چلّا اُٹھی:

''تم دونوں کہاں مرگئی تھیں؟ میلے میں پہنچتے ہی ایسی غائب ہوئیں کہ پل بھر کو دکھائی ہی نہیں دیں۔''

دیپی بھی چلا کر بولی:

''واہ ماسی! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ غائب خود ہو گئیں اور پھٹکار ہم کر رہی ہو۔''

یہ تو ماسی کے لیے اور بھی حیرت کی بات تھی۔ پلٹ کر جسّے کی طرف دیکھا اور بولی: ''سُنا تم نے؟''

دیپی نے کہا:

''تم اولُو پر ہاتھ پاؤں دھو رہی تھیں اور ہم دونوں کچھ لڑکیوں سے باتیں کرتے ہوئے ذرا پرے چلی گئیں۔ لوٹ کر آئیں تو تُم وہاں نہیں تھیں۔ پھر ہم نے گوردوارے کے ہال میں نظر دوڑائی، تم وہاں بھی نہیں تھیں۔ سارا میلہ چھان مارنے پر بھی تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔ آخر ہم نے یہی سمجھا کہ ماتھا ٹیک کر تم گھر لوٹ گئی ہو۔ اس کے بعد ہم نے تھوڑی بہت گھمائی کی اور گاؤں کو واپس آ

گئیں۔''

ماسی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اسے وشواس ہونے لگا کہ بھول اسی کی تھی اور وہ خود ہی جسّے کا سہارا لے کر گوردوارے کو چلی گئی تھی۔ لڑکیوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ جب تک ہم نہیں لوٹیں گی، ماسی اولو پر ہی بیٹھی رہے گی۔

اتنے میں پرسّی نے اس کے کان میں پھسپھسا کر کہا:

''یہ تو بتاؤ ماسی، اس مکھن چکر کو کہاں سے پکڑ لائیں؟''

اشارہ جسّے کی طرف تھا جو اس وقت چارپائی پر بیٹھا دستی پنکھا اپنے ہاتھ میں گھمار ہا تھا۔

ماسی کو کچھ یاد آیا اور وہ اونچی آواز میں بولی:

''یہ ہے جسا...... جسا سنگھ! اگر یہ مجھے میلے میں نہ مل جاتا تو ضرور بڑی پریشانی اُٹھانی پڑتی۔ بے چارا مجھے گوردوارے کے ہال تک چھوڑ آیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اٹھا کر باہر لایا تو میرے جوتے ہی غائب تھے۔ اس بے چارے بھاگ دوڑ کر کے میرے جوتے بھی ڈھونڈ نکالے۔ تب یہ مجھے یہاں چھوڑنے چلا آیا۔ بڑے اونچے وچار ہیں اس کے۔ ایسے بھلے لڑکے بہت کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔''

پرسّی نے ناک چڑھا کر کہا:

''مگر شکل سے یہ تو پکا ڈاکو نظر آتا ہے۔ ماسی، ڈاکوؤں کا یہ ہتھکنڈہ ہوتا ہے کہ دن میں کسی بہانے سے لوگوں کے گھر میں جا کر سارا پتا لے لیتے ہیں اور رات کو ڈاکہ ڈالتے ہیں۔''

''ہٹ ری کلمُو ہی کہیں کی، سمجھتی ہے کہ مَیں نے بال دھوپ میں سفید کیے ہیں...... ست سنگ کا ایسا پریمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بوڑھے ہو جانے پر تو سب ہی بھگوان کے نام کو سمرن کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس نوجوانی میں گوردوانی سے اتنا گہرا پریم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو نا، تم دونوں تو گوردوارے کے بھیتر ماتھا ٹیکنے بھی نہیں آئیں۔''

دیپی بولی:

''ایسے انجان کو گھر میں لانا اچھی بات نہیں ہے۔ اب تُم لے ہی آئی ہو تو اس کو لسی پانی پلا کر چلتا کرو...... اَری پرسّی جالسّی وَتّی دے آ۔''

پرسّی نے کانسی کے بڑے کٹورے میں لسّی بھری اور اس میں مکھن کا گولہ ڈال کر جسّے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''بھرا جی! آپ کو بھی دیر ہو رہی ہوگی لیکن جانے سے پہلے لسّی تو پی لیجیے۔''

یہ کہتے کہتے پرسّی نے آنکھ ماری۔ جسّے نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو بچاتے ہوئے کٹورا منہ سے لگا لیا۔ مکھن کا گولہ کھا کر ہونٹ پونچھے۔ وہ اُٹھنے کو تیار ہوا اور بولا:

''اچھا ماتا جی! اب میں چلتا ہوں۔''

ماسی کے دل میں وہ گھر کر چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی:

''نہ بیٹا! اب بھتے ویلا ہونے کو ہے۔ کھانا کھلائے بنا میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔''

جسا صرف ذرا سا پہلو بدل کر پھر چار پائی پر پسر کر بیٹھ گیا۔

کھانے کی تیاری ہونے لگی۔

بڑی عزت سے جسے کو بھوجن کرایا گیا۔ جب وہ جانے لگا تو ماسی نے کہا:

''بیٹا! ایک ہی شرط پر تجھے جانے دُوں گی۔''

جسے نے بھولے پن سے پوچھا:

''وہ کیا شرط ہے ماتا جی۔''

''جب تک تو گوردوارے میں رہے گا۔ تب تک یہیں سے کھانا کھائے گا۔ دن اور رات دونوں وقت کا بھوجن کرنے کے لیے آنے کے لیے تجھے وچن دینا ہوگا۔''

''میں وچن دیتا ہوں ماں!'' جسے نے فوراً ہی کہہ دیا۔

ماسی کے پیچھے کھڑی پرسنّی اور دیپی نے جسے کی اس بات پر اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ تب جسے کو محسوس ہوا کہ اس نے ہاں کرنے میں ضرورت سے زیادہ ہی جلدی بازی کر دی۔ مگر ماسی کو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ وہ جسے کی بلائیں لیتی ہوئی بولی:

''بیٹا ہو تو ایسا۔''

تب جسا سب کو ست سری اکال کہہ کر وہاں سے چل دیا۔

رتّو کے گاؤں سے چل کر گوردوارے تک جسا کبھی سیٹی بجانے لگتا اور کبھی دھیمی آواز میں کسی گیت کے بول گنگنانے لگتا۔ اسے اُونگھ سی محسوس ہونے لگی۔ گوردوارے کے ہال میں سونے کا آج کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ اس لیے وہ میلے سے ذرا ہٹ کر بڑے درخت کی گھنی چھایا میں جا لیٹا۔ داہنے بازو کا جیسے تکیہ بناتے اس نے اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ جب جاگا تو دن کا تیسرا پہر ڈھل چکا تھا۔

۳

دِن ڈھلے جسا پھر رتّو کے گیا۔ ماسی نے بڑی عزت سے اسے بھوجن کرایا۔ دونوں لڑکیاں دُور دُور سے آنکھیں مٹکا مٹکا کر اشارے کرتی رہیں کہ کھانا کھاتے ہی وہ وہاں سے پھوٹ جائے۔ جسے نے ایسا ہی کیا۔

گرنتھی جی نے گوردوارے کے صحن میں جسے کے لیے ایک چار پائی کا بندوبست کر دیا۔ وہ رات بھر گہری نیند سویا اور سہانے سپنے دیکھتا رہا۔

صبح جاگنے کے بعد چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ بالوں میں کنگھا کر رہا تھا کہ اسے دونوں لڑکیاں دالان کے اندر آتی دکھائی دیں۔

وہ چونک پڑا، مگر دوسرے ہی پل ان کے ہاتھوں میں برتن دیکھ کر اس کو پتا چل گیا کہ وہ اس کا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ان کے قریب پہنچ جانے پر جسا بولا:

''اُرے! ابھی تو میں کُلاّ بھی نہیں کیا۔''

پرسنی بولی:

''سوتو ہمیں معلوم ہے، مگر کیا کریں تمہاری ماتاجی بُری طرح پریشان تھیں وہ سوچ رہی تھیں کہ بیٹا بھوکا بیٹھا ہوگا۔ اس نے ہم دونوں کو جلد سے جلد پراٹھے پکا کر تم تک پہنچانے کا حکم دے دیا۔ ہم بے چاری مجبور ہوکر ادھر چلی آئیں۔''

اس بات پر وہ تینوں ہی خوب ہنسے۔ دیپی نے دھیرے سے سجھاؤ دیتے ہوئے کہا:

''آؤ گوردوارے سے ذرا دُور ہٹ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھیں۔ یہاں آنے جانے والوں میں کوئی نہ کوئی جان پہچان کا دکھائی دے سکتا ہے۔''

یہ سجھاؤ قبول کر لیا گیا۔ وہ تینوں باہر نکل گئے۔ پرسنی نے کہا:

''اب تم دونوں بیٹھو، ناشتہ کرو گپیں ہانکو، تھوڑی دیر تک میں آجاؤں گی۔ بھولنا نہیں، ہم کو جلدی ہی لوٹ جانا چاہیے۔''

دیپی نے بڑے پریم سے جسے کو پراٹھے کھلائے۔ پراٹھوں کے ساتھ دہی اور ڈیلوں کا اچار بھی تھا۔ جسے کو ناشتہ کرنے کا اتنا آنند آیا جتنا جیون میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

پرسنی لوٹ آئی۔ جاتے جاتے دیپی نے جسے کو تاکید کرتے ہوئے کہا:

''تم وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ جانا۔ کچھ گپ شپ رہے گی۔''

اس طرح دونوں پریمیوں نے مثالی حالت پیدا کر لی۔ دن کے کھانے کے بعد وہ چوپڑ کھیلنے بیٹھ جاتے۔ دو دن تو ایسے بھی گزرے کہ جسا دن کے بھوجن کے بعد گوردوارے کو لوٹ ہی نہیں سکا۔ دوپہر پھر چوپڑ چلی اور رات کا کھانا کھا کر ہی لوٹا۔

دوپہر کا وقت ہی ایسا ہوتا تھا۔ جبکہ گھر کے دوسرے افراد سو جاتے اور دونوں پریمیوں کو جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع مل جاتا اور وہ اس نئی حالت کا پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ دیپی مزے میں آ کر کہتی:

''پتاجی تو سمجھے بیٹھے ہوں گے کہ بٹیا جسے سے بہت دُور ماسی کے پاس محفوظ بیٹھی ہے۔''

''ہاں، وہ اس بات پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ جسا یہ بھی نہیں جانتا کہ دیپی گئی کہاں۔ تمہاری اس سہیلی کو بھی مَیں داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔ عشق پریم کے معاملے میں یہ بہت چالاک ہے۔ یہ نہ ملتی تو ہم کو ایک دوسرے سے ملنے جُلنے میں کتنی کٹھنائی کا سامنا کرنا پڑتا۔''

دیپی چہک اُٹھتی:

''اور اب تو ایسی حالت بن گئی ہے کہ بے چاری ماسی خود ہی تمہیں بلا بلا کر کھلاتی پلاتی ہے۔ پرسنی نے بھی کتنا سوچ وچار کر کیسی اچھی ترکیب بنائی۔''

جسا یکا یک گھمبیر ہو کر کہتا:

''دیپی جو کوئی سچے پریمیوں کے بیچ میں رُکاوٹ ڈالتا ہے اس کا منہ کالا ہو کر رہتا ہے۔''

دیپی جھوٹ موٹ بگڑ کر بولی:

''تو کیا تُم میرے پتا کا منہ کالا کر کے چھوڑو گے؟''

''ارے ارے۔ تم ٹھیک سے سمجھی نہیں۔ ہم دونوں تو ڈنکے کی چوٹ پر شادی کریں گے۔ دیکھنا تو سہی مَیں تمہارے گھر بارات لے کر آؤں گا۔ جب تمہارے ماتا پتا خود ہی مجھ سے تمہاری شادی کر دیں گے تو پھر اس میں منہ کالا کرنے کی کیا بات ہے۔''

''ٹھیک ہے جاؤ! تمہیں اب کے ما پھ کیا۔ آئندہ ایسی بھول نہیں ہونی چاہیے۔''

اس طرح میلے کے دن بڑی ہنسی خوشی سے بیت گئے۔ میلے کے آخری دن جب کہ بہت سے دُکانداروں نے اگلے پڑاؤ کو جانے کے لیے تیاریاں شروع کر دی تھیں اور رونق کچھ کم ہو گئی تھی، دیپی اور جسا گوردوارے کے پچھواڑے درختوں کے جُھنڈ میں ٹہل رہے تھے۔ وہ خاموش تھے کیونکہ جدائی کی گھڑی قریب آ گئی تھی۔ من ہی من وہ خوش تھے کہ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا اتنا اچھا موقع ملا۔ یکا یک دیپی بولی:

''وہ رات یاد کرو جب میرے ماتا پتا نے مجھے یہاں بھیجنے کا پروگرام بنایا اور میں اُسی وقت تمہارے پاس پہنچ گئی۔ تم بھلا اُٹھے سوچو کہ اگر میں ہمت سے کام لے کر وہاں نہ پہنچ جاتی تو یہ ملن کیسے ہوتا۔''

جسا سنگھ نے اپنے اسے چھوٹے قد کی دیپی کو پیار بھری نظر سے دیکھتے ہوئے قبول کیا:

''یہ تو ماننا پڑے گا کہ اگر تم اس دن اتنا حوصلہ نہ دکھاتیں تو میں ہری پورے میں بیٹھا آہیں بھرتا بھرتا رہتا اور تم یہاں بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں پرسنی کا احسان ماننا ہوگا، جس نے ایسا منصوبہ بنایا کہ میں سیدھا تمہاری ماسی کے گھر پہنچ گیا۔''

دیپی یکا یک گھمبیر ہو کر بولی:

''بے چاری پرسنی بڑی مصیبت میں پھنسی ہے۔''

جسا چوکنا ہو گیا۔ بولا:

''پرسنی کی مشکل تو یہی ہے نا کہ وہ پورن سنگھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔ مجھے وجہ تو نہیں مالوم، مگر اتنا جانتا ہوں کہ پورن سنگھ کا من پرسنی کے لیے کچھ میلا ہو گیا ہے۔ مَیں، اس سے مل کر اس کے دل کی حالت کو سمجھ لوں گا اور پھر دونوں کے ملن کی کوشش کروں گا۔''

''اس سے بھی پہلے پرسنّی کو ایک اور مصیبت سے واسطہ پڑا ہے۔''

''کیسی مصیبت؟''

''اس مصیبت کا نام ہے صورت سنگھ۔''

''وہ کیا چاہتا ہے؟''

''تم جانتے ہی ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ پرسنّی کو کسی طرح بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ اُسے حاصل کرنے کے لیے صورت سنگھ آخری تک جانے سے نہیں ہچکچے گا۔''

یہ سُنتے ہی جسا سنگھ کے چہرے کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اپنے آپ کو ایسی حالت میں پا کر اس نے من ہی من سوچا کہ کچھ ہی عرصہ پہلے وہ قتل کے الزام سے بال بال بچا تھا لیکن کیا اب وہ ضرورت پڑنے پر بھی کسی کی جان لے سکتا ہے؟ خود وہ اس بات کا جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

دیپی نے اس کی شکل سے اس کے من کی حالت کو بھانپ لیا۔ بولی:

''اب تم من میں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہر کٹھن موقع پر تمہارے پاس وہی ایک طریقہ ہے...... یعنی دوسرے کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اس کی گردن مروڑ دینا۔ جیسا کہ تم نے گھُنے کے ساتھ کیا۔ کچھ دماغ سے بھی کام لینا چاہیے۔''

جسّے نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا:

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر بھی صورت سنگھ کا کچھ علاج تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''اس کے قتل کے علاوہ جو بھی طریقہ ہوگا، مجھے منظور ہوگا۔ بے چاری پرسنّی کی ایسی حالت ہرگز نہ ہوتی اگر اس کے سر پر باپ ہوتا یا کم سے کم اس کے بھائی ہی ہوتے۔ بیوہ ماں کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس کی سُندرتا اس کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی ہے۔ مَیں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی کیونکہ ہماری ملاقات یہیں پر ہوئی ہے۔ وہ ایسی ملنسار ہے اور من کی اچھی ہے کہ ایک دم ہی میری اس کی دوستی ہو گئی۔''

لگتا تھا کہ جسّے کا دھیان اس کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈُوبا ہوا تھا۔ دیپی کی بات ختم ہوئی تو وہ ذرا چونکا بولا:

''ایسا ہے کہ میں خود پرسنّی سے بات چیت کر کے اسے کوئی ایسی ترکیب بتا دوں گا کہ جس سے اس کی یہ مصیبت ٹل جائے۔ اس کی مدد کرنا ہمارا سب سے پہلا فرض ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، مَیں پرسنّی سے کہہ دوں گی کہ وہ اپنی ساری مصیبت تمہارے سامنے رکھ دے۔ اس وقت تک تمہیں بھی کوئی نہ کوئی حل سوجھ جائے گا۔''

ان دونوں کی گفت وشُنید یہیں پر ختم ہو گئی۔

دوسرے دن جسّے کو ہری پورے واپس جانا تھا۔ اس نے پرسنّی کی بات سُن کر اسے سمجھا دیا کہ صورت سے

سنگھ سے ملاقات ہونے پر اسے کیا کرنا ہوگا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ صورت سنگھ نے پرسنّی کو جسے کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اصل میں وہ کسی ضروری کام سے اپنے گاؤں لوٹ گیا تھا۔ اسے وِشواس تھا کہ پرسنّی اپنا دیا ہوا وچن پورا کرے گی۔ اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ اگر اس نے وَچن نہ بھی پورا کیا تو اس کے چنگل سے نکل کر جائے گی کہاں۔ اس لیے وہ پورے اطمینان سے منگل وار کو مقررہ جگہ پر مقررہ وقت سے پہنچ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پرسنّی پہلے سے ہی وہاں موجود تھی۔ وہ خوش ہو کر بولا:

''مَیں سمجھے بیٹھا تھا کہ نہ جانے مجھے کتنی دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تم پہلے سے ہی موجود ہو، اس سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے مَن میں اَب بھی میرے لیے گہری قدر اور پریم ہے۔''

پرسنّی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مُسکراہٹ پیدا ہوئی۔ کہنے لگی:

''ذرا دھیر بولو...... آس پاس والا کوئی آدمی ہماری بات نہ سُن لے۔''

''یہاں آس پاس ہے کون؟ رَہٹ کی گدّی پر صرف دس گیارہ برس کا لڑکا بیٹھا بیل ہانک رہا ہے۔ دُور کھیتوں میں کچھ آدمی کام کر رہے ہیں لیکن ان تک ہماری آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔''

''وہ سب ٹھیک ہے، مگر اس بات کا بھی تو امکان ہے کہ کہیں ہم اپنی ہی بحث میں لگے ہوں اور آنے والا شخص ہمیں احساس ہی نہ ہو۔''

''بحث؟ سمجھ میں نہیں آتا پرسنّی، تم بحث کیوں کرنا چاہتی ہو۔ کچھ ہی ماہ پہلے ہم دونوں گھی شکر تھے۔ پھر وہ دار وغہ آیا اور گاؤں کا واقعہ تم نے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری نیت بدل گئی۔''

پرسنّی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس سے گھی شکر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا۔ وہ پورن سنگھ کو جلانے کے لیے کہا تھا، مگر اس دن پورن سنگھ نے ثابت کر دیا کہ جس شخص کو اب اس نے اپنا رکھا تھا وہ نہ تو اس کے مقابلے میں طاقتور تھا اور نہ ایک انسان کے ناطے وہ اونچی سطح کا تھا۔

صورت سنگھ سے یہ ساری باتیں کہنا بیکار تھا۔ وہ سچے مَن سے یہی سمجھ رہا تھا کہ پرسنّی دراصل اسی کو پریم کرتی ہے۔ شاید پورن سنگھ سے اس کا تھوڑا بہت میل رہا ہو، مگر اس دن اس کی وردی شان اور رُعب دیکھ کر وہ اس سے متاثر ہو گئی تھی۔ صورت سنگھ کو وشواس تھا کہ پورن سنگھ بھلا ایک بیوہ کی دیہاتی لڑکی سے بیاہ کیوں کرنے لگا۔ اس کی نظر میں پرسنّی کا پورن سنگھ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنا ہی بیکار تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں پرسنّی کو سمجھائیں مگر پرسنّی عورت ہونے کے ناطے جانتی تھی کہ پورن سنگھ کے من میں اب بھی اس کے لیے جگہ تھی۔ اگر ایک بار وہ اس کی بھول معاف کر دے تو سدا کے لیے اس کا ہو سکتا تھا۔

صورت سنگھ بولا:

''میں پھر دُہراتا ہوں کہ یوں ہی سات رنگوں والی کمان کے پیچھے مت بھاگو۔ پورن سنگھ کو لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ اچھے سے اچھے گھر کی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی سے وہ شادی کر سکتا ہے۔ میرے دوبارہ کہنے کا بُرا نہ مانو کہ آخر تم معمولی غریب بیوہ کی بے سہارا لڑکی ہو۔ مانا کہ کسی

تکڑم بازی سے آج تم پورن سنگھ کو پھسلا کر اس سے شادی کر لیتی ہو، لیکن بعد میں کیا ہوگا؟ تمہیں ایسا آدمی چننا چاہیے جو خود تمہارے پیچھے بھاگ رہا ہے اور تمہارا ہاتھ تھامنے کو بے تاب ہو رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔"

پرسنّی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ صورت سنگھ کو لگا، کہ پرسنّی کا من پگھل رہا تھا۔ یہ موقع تھا، جبکہ وہ اس کو اور زیادہ پھسلا سکتا تھا۔ پرسنّی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا:

"تم میری باتوں پر جتنا زیادہ غور کرو گی، اتنا ہی تمہیں وشواس ہوتا جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ یاری واری دو چار دن کی بات ہوتی ہے لیکن یاری میں سارا جیون تو نہیں کاٹا جا سکتا۔ ہر عورت کو مرد کی نہیں خاوند کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف پریمی نہ ہو بلکہ سارے سماج کے سامنے اپنی پتنی ماننے کو تیار ہو۔ بولو، مَیں غلط تو نہیں کہتا؟"

پرسنّی نے محسوس کیا کہ اب وہ موقع تھا جب وہ اپنی بناوٹی اُڑچن کو اس کے سامنے رکھ سکتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ جان بوجھ کر ٹال مٹول کرتی رہی تا کہ یہ ساری بات چیت عام لگے۔ صورت سنگھ دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبوبہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ پرسنّی اچھی طرح سوچ وِچار کر کے اپنے من کی بات اِسے بتا دے۔

آخر پرسنّی نے سر اُوپر اُٹھایا اور صورت سنگھ کی طرف اُداس نظر سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا:

"مشکل تو یہ ہے کہ تم مرد لوگ عورت کے سنسار کو، اس کے جذبات کو اور اس کی پریشانیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔"

صورت سنگھ اَکھڑپن سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پرسنّی کا دل کچھ کچھ پگھلنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پرسنّی کافی گرم طبیعت کی تھی اور اگر اس موقعہ پر اس نے اسے بھڑکا یا تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ بولا:

"میں مانتا ہوں کہ ہم مرد عورت کے سنسار کو نہیں سمجھ پاتے لیکن اگر تم مجھ کو سمجھاؤ تو میں ضرور ہی سمجھ لوں گا۔ میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم اچھے خاصے ایک دوسرے کے پریم میں ڈوبے ہوئے تھے، پھر اس دن تم کو نہ جانے کیا ہوا کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اب تم ہی کہو کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جان بوجھ کر پہیلی بنو گی تو دوسرے کی سمجھ میں کیا آئے گا۔"

"میری مشکل یہ ہے کہ اگر میں تمہارا سجھاؤ مان بھی لوں تو بھی ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔"

"وہ کیوں؟"

"ایک بھاری اُڑچن پڑ گئی ہے۔"

صورت سنگھ ذرا تاؤ میں آ کر بولا:

''اُڑ چن؟ اگر تمہارے ہمارے بیچ پہاڑ بھی کھڑا ہو جائے تو مَیں اسے اُٹھا کر پرے پھینک دوں گا۔''

''یہ اُڑ چن پہاڑ سے بھی بڑی ہے۔''

''کچھ پتا تو چلے، یہ اُڑ چن ہے کیا؟''

''میرا ایک بھائی ہے............''

''بھائی؟''

''سگا نہیں، رِشتے کا بھائی ہے۔ مجھے اُمید نہیں کہ وہ، ہم دونوں کے رشتے کو قبول کرے۔''

''کیوں، مجھ میں اُسے کیا بُرائی دکھائی دِی ہے؟''

''بُرائی کیا دکھائی دیتی، اُسے تو ابھی اس بات کا پتا بھی نہیں ہے کہ تم کون ہو۔''

''تو پھر تم کیسے کہتی ہو کہ وہ، ہم دونوں کے بیاہ پر اعتراض اُٹھائے گا۔''

''میں نہیں کہتی، ماں کہتی ہے۔ ماں کو تمہارے میرے تعلقات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جب پتا چلا تو اس نے مجھے روکا اور بتایا کہ میرے رِشتے کے بھائی کو اس پر اعتراض ہوگا۔''

''مگر اسے اعتراض کیوں ہوگا؟ جبکہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں تو......''

پرستی نے بات کاٹ کر کہا:

''ماں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میرے رِشتے کے بھائی نے میرے لیے کوئی اور بَر ڈھونڈ رکھا ہے۔''

''ایسی حالت میں تمہاری ماں کو چاہیے تھا کہ وہ اسے میرے بارے میں بتا دیتی۔''

''ماں ڈرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت ہی اُجڈ آدمی ہے۔ اپنی ضد پوری کر کے چھوڑتا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ دونوں، یعنی ماں بیٹی نے خامخاہ ہی من میں یہ خوف کھڑا کر لیا ہے۔ دُرست طریقہ تو یہ ہے کہ تم ہی اپنے بھائی کو بتاتیں کہ اصل میں تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ اس کے بعد وہ شاید مجھے بلاتا۔ مجھ سے بات چیت کرتا اور میرے بارے میں اِدھر اُدھر سے بھی جانکاری حاصل کرتا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ کوئی اعتراض اُٹھاتا تو تمہاری کٹھنائی میری سمجھ میں آ جاتی مگر یہ سب تو بیکار کی باتیں ہیں۔''

پرستی نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں اُٹھا کر اس پر بھرپور نظر ڈالی اور پوچھا:

''تمہیں کوئی ترکیب سوجھی ہو تو بتاؤ؟''

صورت سنگھ نے اطمینان سے کہا:

''سیدھی سی بات ہے کہ اسے میرے بارے میں کچھ بھی مالوم نہیں۔ ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ میری

مخالفت کرے گا تو ماننے والی بات نہیں ہے۔''

''تو؟''

''تو میں سوچتا ہوں کہ میں خود ہی اُس سے مل لوں۔''

پرسنّی خوش ہو کر بولی:

''ہاں! یہ ہوئی مردوں والی بات۔''

اس پر صورت سنگھ نے بڑے فخر سے نتھنے پھلا لیے۔ تب پرسنّی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''بے شک اس سے ملو، مگر خامخواہ گرمی مت دکھانا۔ اگر تم نے دھاکڑ بازی سے کام کرنے کی کوشش کی تو بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔''

''ارے نہیں، میں ایسا مورکھ نہیں ہوں۔ آخر وہ تمہارا بھائی ہے اور اسی سے مجھے تمہارا ہاتھ مانگنا ہے۔ مَیں بھلی بھانت جانتا ہوں کہ ایسے موقعوں پر کس طرح بات چیت کرنی چاہیے۔''

پرسنّی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''اوہ، تم کتنے سمجھدار ہو۔ میں بیکار ہی تمہیں اُلّو کا پٹھا سمجھتی رہی۔''

صورت سنگھ نے کھیسیں نکال دیں۔ پھر اس کے من میں ایک وِچار آیا، تو اس نے پوچھا: ''ایک بات میں تم سے جاننا چاہتا ہوں۔''

''بولو!''

''جب میں اس سے ملنے کے لیے جاؤں، تو کیا میں اسے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''کیوں نہیں، تم یہاں تک کہہ سکتے ہو کہ اگر مجھ سے شادی نہ ہو سکی تو پرسنّی خودکشی کر لے گی۔''

پرسنّی کے یہ زوردار شبد سُن کر ایک بار تو صورت سنگھ بالکل بدحواس ہو کر رہ گیا۔ آج پرسنّی نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بڑے بڑے ہاتھوں میں محبوب کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا:

''میں جانتا تھا کہ تمہارے من کی گہرائی میں صورت سنگھ کی ہی صورت بسی ہے۔''

''تم بڑے چالاک ہو۔'' پرسنّی نے دانت دِکھاتے ہوئے کہا۔

''سچ سچ پرسنّی، اگر میں یہ کہہ دوں گا کہ مجھ سے شادی نہ ہونے پر تم جان دے دو گی، تو تمہارے اس بھائی کا دل موم کی طرح پگھل جائے گا۔''

''پگھلنا تو چاہیے..... مگر میں اپنی طرف سے اس کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتی۔ دراصل مَیں نے بھی اسے بہت کم دیکھا ہے۔ دیکھا بھی تو یہ نہیں سمجھا کہ اس کا ہم پر کوئی احسان ہے۔ یہ تو اب میری ماں نے بتایا کہ پتا جی کی موت کے بعد اس نے ہماری کتنی مدد کی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اگر

وہ ہماری مدد نہ کرتا تو ہم بھوکوں مر جاتے۔"

صورت سنگھ نے پرسنّی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا:

"چنتا مت کرو۔ اب بھوکوں مرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھے گا۔ تم دونوں کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں، پہلے میں تمہارے بھائی سے مل تو لوں۔ آخر بڑی مشکل سے تم نے اصلی بات بتائی۔ پہلے ہی بتا دیتی تو ہم دونوں کو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔"

"کیا بتاؤں، ماں نے اس بھائی کا نام لے کر مجھ کو اتنا ڈرا دیا کہ میں بالکل ہی مایوس ہوگئی۔"

"ارے ہاں! تم نے بھائی کا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"تم نے پوچھا ہی نہیں...... اس کا نام جسا سنگھ ہے۔ لوگ اسے چک پیراں کا جسّو کہتے ہیں۔"

"تو کیا وہ چک پیراں کا نواسی ہے؟"

"نہیں، وہ ہری پورہ میں رہتا ہے۔"

"ہری پورہ۔ سال بھر سے اُوپر ہوگیا، جب میں وہاں گیا تھا۔ یوں ہی کسی سے ملنا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ مَیں نے کہیں تمہارے بھائی کا نام تک نہیں سنا۔"

"اِن دونوں وہ وہاں نہیں آیا تھا۔ زیادہ مجھے بھی نہیں پتا۔"

"کوئی چنتا نہیں۔ اب میں خود ہی ساری باتوں کا پتا لگا لوں گا۔"

نوواں غلاف

مکر رَن دِے جیڈ نہ مکر کوئی، رَبّ وِچ قُرآن فرماوندا اے

(وارث شاہ)

''عورت کی چالاکی کے برابر کوئی چالاکی نہیں، خدا نے قرآن میں یہی فرمایا ہے۔''

۱

دِن کے تیسرے پہر صورت سنگھ ایک مانگے کے گھوڑے پر سوار ہری پورے گاؤں کے قریب پہنچا۔ راستے کی دھول اور دُھوپ کی وجہ سے سوار اور گھوڑے دونوں کا ہی حلیہ بگڑ گیا تھا۔ وہ ایک رہٹ کے پاس برگد کی چھایا تلے گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اس نے سوچا کہ منہ ہاتھ دھوکر کپڑے بدل کر اور ذرا تازہ دم ہوکر گاؤں کی طرف بڑھے گا۔

دُور گاؤں کے مکانوں کی مٹیلی دیواریں ایک دوسرے سے کھچڑی ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی چوبارے پر میلے سے کپڑے کی جھنڈی اُڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ کوؤں کی منڈھ منڈھ کائیں کائیں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ آکاش کی اونچائی پر چیلیں اُڑ رہی تھیں۔

صورت سنگھ نے رَہٹ کے اولُو میں گرتے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ پنڈلیوں تک پاؤں کی دھول دھوڈالی۔ دیسی جوتوں کو کپڑے کے ٹکڑے سے صاف کیا۔ گلابی رنگ کی پگڑی کو پھیلا کر جھاڑا اور پھر نئے سرے سے اسے سر پر لپیٹ لیا۔ ایک چھوٹے سے ٹین کے فریم والے شیشے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ مونچھوں کو اُنگلیوں سے چھوا۔ اس طرح یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ وہ خودتو اپنے تصوراتی سالے سے ملنے کے قابل بن گیا تھا، اس نے ذرا مریل سے گھوڑے پر نظر ڈالی جو ادھر اُدھر سونگھ کر گھاس چرتا پھر رہا تھا۔ بہتا ہوا پانی پی کر گھوڑا ابھی کچھ چوکنا دکھنے لگا۔ صورت نے انگوچھے سے کاٹھی صاف کی، گھوڑے کے بدن کا پسینہ پونچھا اور اس کی تھوتھنی کی جھاگ بھی صاف کی۔

اس طرح تیار ہوکر اسے کچھ یاد آیا، تو اس نے پَرے بیلوں کے پیچھے گدی پر بیٹھے شخص کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے پاس جا کر پوچھا:

''کیا جسا سنگھ اسی گاؤں میں رہتا ہے؟''

بوڑھے کی سفید بھویں جھک کر اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ اس نے اُداس نظروں سے صورت سنگھ کی طرف دیکھا اور پوپلے منہ سے پوچھا:

''کیا تم کو چک پیراں والے جسُو سے ملنا ہے؟''

''ہاں ہاں، وُہی۔''

''ہاں، وہ اسی گاؤں میں رہتا ہے۔''

''اس کا گھر کہاں ہے؟''

بوڑھے نے سوکھا ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''سامنے دُھول بھرے میدان کے پاس پیپل کا بڑا پیڑ دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں!''

''وہیں پر تمھیں ایک بہت چوڑا گلیارا بھیتر جاتا دکھائی دے گا۔ اس دروازے کے پرلی طرف ایک بڑا دروازہ ہے۔ وہ اُنہیں کا احاطہ ہے۔ اس کے پچھواڑے وہ مکان ہے، جہاں چک پیراں کا جسُّو رہتا ہے۔''

اِتنا کہہ کر بوڑھے نے یوں منہ پھیر لیا، جیسے اس بارے میں وہ اور زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ شاید صورت سنگھ اس سے اور جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، مگر بوڑھے کے برتاؤ کو دیکھ کر اس نے گھوڑے کی لگام تھامی، بائیں رکاب میں پاؤں رکھا اور ایک ہی چھلانگ میں کاٹھی پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا سر جھکائے ٹھمکتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میدان میں پہنچ کر اس کی ٹاپوں سے کافی دُھول اُڑنے لگی۔ پیپل کا پیڑ اَحاطے سے بہت اُوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ اِسے گلیارا ڈھونڈنے میں پل بھر کا وقت بھی نہیں لگا۔ دروازہ اس کے سامنے ہی کھلا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہی اَحاطے کے بھیتر تک چلا گیا۔

پَرلی دیوار کے قریب اَحاطے کے کونے میں بندھی بھینس کو ایک لڑکا نہلا رہا تھا۔ بھینس کا چکنا تن چمک اُٹھا تھا۔ اَحاطے کے ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا، جس کے اُوپر کھپریل کی چھت تھی۔ ذرا دُوری پر بھاری چکّی تھی، جسے چلانے کے لیے اُونٹ سے کام لیا جا رہا تھا۔ اونٹ بے ڈھب چال سے چل رہا تھا اور اس کے گلے میں بندھی گھنٹی بج رہی تھی۔

صورت سنگھ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ پہلے اس نے سامنے بنی کچی دیواروں والی دو کوٹھڑیوں پر نگاہ ڈالی اور پھر چھوٹے کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

لڑکا اڑیل ٹٹو کی طرح یوں اس کی طرف بڑھا، جیسے اس کا اس سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ پاس آ کر بہت کس کر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا اور صورت سنگھ کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

صورت سنگھ نے اس اُجڈ لڑکے پر نظر ڈالی اور پوچھا:

''کیا چک پیراں کا جسُّو یہیں رہتا ہے؟''

''تمھارا مطلب سردار جسا سنگھ جی سے ہے؟''

اب صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اسے اپنے ہونے والے سالے کو صرف جسّو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ذرا جھینپ کر بولا:

''ہاں، ہاں! میرا مطلب سردار جسا سنگھ جی سے ہے۔''

لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر جما لیے اور بولا:

''ہاں! یہیں پر رہتے ہیں...... بولو!''

صورت سنگھ کو لڑکے کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ دو کوڑی کا نوکر کس اینٹھ سے بات کر رہا تھا۔ جی چاہا کہ اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ جما دے۔ مگر اس نے غصہ دباتے ہوئے کہا: ''میں اِن سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس کی اس بات پر لڑکا بولا تو کچھ نہیں، مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اس کے ماتھے پر کچھ گہرے بل دکھائی دینے لگے۔ اس نے اپنے منہ کا حلیہ کچھ ایسا بنا لیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ آدمی اس کے مالک سے ملنے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ صورت سنگھ نے سوچا کہ کم سے کم میری شکل تو ایسی نہیں ہے کہ میں اسے کل کے چھوکرے کو بہت ہی معمولی آدمی دکھائی دُوں۔ اس کے من میں یہ وچار بھی آیا کہ جس مالک کے معمولی نوکر اتنے بے ہودہ قسم کے تھے، وہ خود کیسا ہو گا لیکن یہ موقع ہی ایسا تھا کہ صورت سنگھ اپنی کسی بھی حرکت سے اپنا کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جتنی دیر تک وہ چھوکرا اسے گھورتا رہا، وہ بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔

آخر لڑکے نے ایک لمبی سانس لی اور بولا:

''اچھا، صبر کرو، میں بھیتر جا کر مالک سے کہتا ہوں۔''

وہ چھوکرا پہلوانوں کی طرح اپنے بازوؤں کو ذرا پھیلائے اور ٹانگوں کو چوڑا کیے ہوئے بڑے اطمینان سے سامنے والی ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

صورت سنگھ اس کی یہ ادائیں دیکھ کر من ہی من تاؤ کھاتا رہا۔ پھر اس نے زور سے دھرتی پر تھوک دیا۔ وہ چپ چاپ چھوکرے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن چھوکرا لوٹا نہیں، بلکہ اُٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ دھول میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر سنبھل کر اُٹھا اور اپنے کپڑوں پر سے دُھول اور تنکے جھاڑنے لگا۔ اس نے مہمان کی طرف دیکھا تک نہیں اور بھینس کے پاس جا کر اپنے کام میں جُٹ گیا۔

صورت سنگھ یہ عجیب تماشا دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ چپ چاپ لوٹ جائے یا خود بڑھ کر کوٹھڑی میں جھانکے کہ وہاں کون بیٹھا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

صورت سنگھ یہ سب سوچ کر ہی رہ گیا۔ وہ نہ واپس لوٹا اور نہ کوٹھڑی کی طرف بڑھا کچھ بھی تو فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کیا اسے دن بھر یوں ہی کھڑا رہنا پڑے گا؟

شاید واہگورو اکال پُرکھ نے اس کی سُن لی کیونکہ اسی بیچ اسے دروازے میں سے تو تیا رنگ کے تہمد کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اسے گھٹنے تک کا لمبا کُرتہ نظر آیا۔ دروازے سے بھی اُونچا ہونے کی وجہ سے جسا سنگھ سر جھکا کر باہر نکلا۔ دالان میں قدم رکھتے ہی وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی اونچی، مضبوط اور تنی ہوئی گردن پر صورت سنگھ کو ایسا چہرہ دکھائی دیا، جو سندر نہ ہونے پر بھی لاکھوں میں ایک تھا۔ اس وقت اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی، صرف بڑا سا

جوڑا کس کر بندھا ہوا تھا، جس کی جڑ میں ہاتھی دانت کا کنگھا دھنسا ہوا تھا۔

پہلے نہ جاننے کے باوجود صورت سنگھ سمجھ گیا کہ یہی جسا سنگھ ہے..... یہی چک پیراں کا جسّو ہے مگر جسّے نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظر کام کرتے ہوئے لڑکے پر جمی ہوئی تھی، جسے کچھ ہی دیر پہلے ایک ہاتھ سے پکڑ کر باہر پھینک دیا تھا۔

ماحول پر عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جسا ایک موٹے تنکے سے اپنا داہنا کان کرید رہا تھا۔ پل پل ماحول بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ آخر جسّے کی سارے دالان پر گھومتی ہوئی آنکھ صورت سنگھ پر آ کر ٹک گئی۔ ڈھلی ہوئی شام کے سے رنگ والے چہرے میں اس کی دونوں آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں سی لگ رہی تھیں۔ لمحہ بھر کو صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اس کے بولنے کی طاقت ہی ختم ہو چکی ہے۔ اس نے سوچا، تو یہ ہے پرسنّی کا بھائی۔

''تم صورت سنگھ ہو نا؟'' جسّے نے بنا آنکھ جھپکائے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

''ہاں!''

جسا نظر پڑتے ہی صورت سنگھ کو پہچان گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پرسنّی کا وہ پریمی اسے ملنے آنے والا تھا لیکن صورت سنگھ نہ اسے پہچانتا تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ اس کا سواگت کرنے کے لیے جسا پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔

صورت سنگھ اس انتظار میں تھا کہ جسا اسے بیٹھنے کے لیے کہے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں جہاں کے وہاں کھڑے رہے۔

ایک بات سوجھی تو صورت سنگھ نے کہا:

''تم مجھے پہچانتے ہو کیا؟''

جسّے نے اپنی اسی مخصوص آواز میں جواب دیا:

''تمہارے جیسے لوگوں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔''

صورت سنگھ کے پاؤں کے نیچے سے جیسے دھرتی کھسک گئی۔ ڈر کی وجہ سے نہیں صرف اس وچار سے کہ بات چیت کا یہ آغاز اچھا نہیں تھا۔ اسے وشواس ہو گیا کہ جسا پرسنّی سے اس کے بیاہ پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ اس وچار سے اس کا دل تو ایک بار ڈوب گیا، پھر اُبھرا تو اس خیال سے کہ پرسنّی صرف اسی کو چاہتی ہے اور جسّو کی اجازت نہ ملنے پر بھی وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنی پتنی بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

جو بھی ہو وہ اپنے آنے کا مقصد بتائے بنا تو نہیں لوٹ سکتا تھا۔ بولا:

''میں ایک خاص کام سے آیا ہوں۔''

جسا کچھ دیر تک چپ چاپ کان کریدنے میں مگن رہا۔ آخر میں اس کے منہ سے آواز نکلی: ''بولو!''

''تم رتّو کے دالی پرسنّی کے رشتے میں بھائی ہو کیا؟''

جسّے کی گھنی بھویں ذرا سا پھڑ پھڑ کر رہ گئیں: ''تم سے مطلب؟''

''بات یہ ہے کہ میں پرسنی سے مل کر ہی اِدھر آ رہا ہوں۔''

''اس سے ملنے کی تمھیں جرأت کیسے ہوئی؟''

صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اس کا کام تو بگڑتا ہی جا رہا تھا۔ اب اسے یہ بھی لگا کہ اگر جسّے کی منظوری نہ حاصل ہوئی، تو پرسنی کو قابو کرنا بھی ناممکن نہیں، تو بہت کٹھن ضرور ہو جائے گا۔ وہ بے اختیار ہی ہکلاتے ہوئے بولا:

''ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

اب جسّے نے اپنے چہرے سے کچھ اس طرح کا تاثر ظاہر کیا، کہ جیسے یہ خبر سُن کر اُسے تعجب ہو رہا ہو۔ اس نے صورت سنگھ کا اُوپر سے نیچے تک کا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا: ''شادی تم اس سے کرنا چاہتے ہو، یا وہ بھی چاہتی ہے؟''

صورت سنگھ نے پُراُمید آواز میں کہا:

''وہ بھی دل سے چاہتی ہے کہ ہم دونوں......''

''لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، وہاں کا میلہ دیکھنے کے لیے میں بھی رتّو کے گیا تھا۔ اسی کے گھر ٹھہرا۔ اس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔''

صورت سنگھ نے سوچا کہ یہ تو بڑی گڑبڑ ہوئی۔ پرسنی خود اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، تو اپنی ماں کے ذریعے کہلوا سکتی تھی۔ بڑی چوک ہوئی۔ اب وہ اس بات کا جسّے کو کیا جواب دے؟

لیکن جسّے نے ہی اپنی ایک بات سے صورت سنگھ کی پریشانی دُور کر دی۔ بولا:

''صورتیا! لگتا ہے کہ وہ شرم کے مارے مجھ سے کچھ کہہ نہیں سکی۔ وہ اتنی شرمیلی اور سیدھی ہے کہ اس نے ماں سے بھی کچھ نہ کہا ہوگا، ورنہ کم سے کم وہ تو مجھ سے اس بات کا ذکر ضرور کرتی۔''

صورت سنگھ مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا:

''ٹھیک سمجھے۔ بہت ہی سیدھی اور بھولی لڑکی ہے۔ تم کو بہت مانتی ہے۔ مجھ سے کہتی تھی کہ تم سے اتنا گہرا پریم ہونے کے باوجود ویر (بھائی) نے منظوری نہ دی، تو یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکے گی۔''

جسّے نے کچھ دیر تک اسے گھور کر دیکھا اور پھر غرّا کر بولا:

''صورتیا! وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔''

جسّے نے اسے اب تک بالکل ڈانواں ڈول سمت میں رکھا تھا۔ جس کے نتیجہ میں صورت سنگھ کی ساری ہیکڑی پل بھر کو غائب ہو گئی۔ وہ ایک قدم آگے رکھ کر دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا:

''جسا سنگھ! اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ شادی ہو سکتی ہے؟''

جس تنکے سے جسا کان کرید رہا تھا، اسی کو اُلٹ کر اس کے دوسرے سرے سے کان کریدنے لگا۔ کچھ پل اسی طرح بیت گئے۔ آخر میں جسا نے کہا:

''یہ شادی ہو سکتی ہے۔''

یہ سنتے ہی صورت سنگھ کا جی چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر آکاش کو چھو لے۔ اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ ایک بار تو یوں لگا، جیسے وہ اپنے آپ کو جسّے کے پاؤں میں گرادے گا۔

''مگر......'' جسّے نے فوراً کہنا شروع کیا۔

صورت سنگھ کی آنکھوں کے سامنے نوکیلے شعلے اُڑنے لگے۔ سوکھتے ہوئے گلے سے پوچھا: ''مگر کیا؟''

جسا چلتا ہوا صورت سنگھ کے ذرا قریب آ گیا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک قدم آگے صورت سنگھ کا مریل سا گھوڑا کھڑا تھا، جس کی لگام اب بھی صورت سنگھ کے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ میں تھی۔

سوچتے سوچتے جسّے نے سر اُٹھایا اور کہا:

''صورتیا! جب تم دونوں ہی ایسا چاہتے ہو تو شادی ہو جانی چاہیے......لیکن لڑکی والوں کو بہت سی باتیں سوچنی پڑتی ہیں۔''

صورت سنگھ جلدی سے بولا:

''بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ آخر لڑکی کے پورے جیون کا ماملہ ہوتا ہے۔ شادی ایک دو دِن کی بات تو ہے نہیں۔''

''تم ٹھیک سمجھے۔''

''میں ہر طرح سے تمہاری تسلی کرنے کو تیار ہوں۔''

جسّے نے ایک اُنگلی اپنے سر کے بالوں میں گھسیڑی......شاید اس جگہ کچھ کھجلی محسوس ہو رہی تھی۔ بولا:

''تم ذرا بدمعاش قسم کے آدمی ہو۔''

صورت سنگھ جیسے آدمی کے لیے بدمعاش کہلانا فخر کی بات تھی۔ مگر اس وقت اس کی گُٹی پھنسی ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جسا اسے ضرورت سے زیادہ بدمعاش سمجھ بیٹھے۔ کھسیا کر بولا:

''جسا سنگھ، یہ تو عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ ویسے میں کسی ایسی بدمعاشی میں نہیں ہوں کہ جس کا میرے بیاہتا جیون پر کوئی اَثر پڑے۔''

''تب ٹھیک ہے۔ تمہارے بارے میں کچھ اور باتوں کی جانکاری بھی ضروری ہے تاکہ مجھے اس بات کی تسلی ہو جائے کہ میری بہن تمہاری پتنی بن کر ہر طرح سے سُکھی رہے گی۔ ابھی کچھ دنوں تک تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ ہاں فرصت پا کر تمہارے بارے میں مَیں ساری باتوں کا پتا لگاؤں گا۔''

یہ کہتے کہتے جسّے نے اپنا داہنا پاؤں اُٹھا کر قریب کھڑے گھوڑے کے پیٹ پر رَکھ دیا۔ اس کی بات کے جواب میں صورت سنگھ نے کہا: ''ضرور!''

جسّے نے پیٹھ دیوار کے ساتھ کچھ اور ستالی، پاؤں پیچھے ہٹا کر جوتے کے تلے سے زور کی ٹھوکر اس گھوڑے کو ماری۔ کچھ جانور کمزور، کچھ جسّے کی ٹانگ کا انتہائی بل، گھوڑا لڑکھڑا کر اُلٹا اور اس چھوکرے کی طرح دُھول میں گر پڑا۔

گھوڑا بے بس ہوا میں ٹاپیں مار رہا تھا اور صورت سنگھ یہ منظر دیکھ کر بھونچکا سا کھڑا تھا: ''اب تم جا سکتے ہو۔''
صورت سنگھ نے گھوڑے کی لگام سنبھال کر اسے چاروں ٹانگوں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ جب وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو انگوچھے سے اس کی کاٹھی اور بدن کی دُھول جھاڑی۔ تب اس نے جسّے کی طرف ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''اچھا! تو مَیں چلتا ہوں تم اور کاموں سے فرصت پالو۔ پھر جس طرح چاہو، میرے بارے میں اطمینان کر لینا۔''

جسا کچھ نہیں بولا۔ وہ پہلے کی طرح پھر سے دانت کریدنے لگا۔
صورت سنگھ نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دھیرے دھیرے بڑے دروازے میں سے گزر کر دالان کے باہر نکل گیا۔

اس کا دماغ سُن سا ہو رہا تھا۔ وہ کیا سمجھے، کیا نہ سمجھے، اس بات کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

۲

جسّے کے احاطے سے نکل کر جب صورت سنگھ دُھول بھرے میدان میں پہنچا، تو اس نے ذرا چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ کہاں جائے۔ پہلا گھر جو اسے یاد آیا، وہ چنن سنگھ کا تھا۔ اس کے لڑکوں سے اس کی کچھ واقفیت تھی۔ ان کے علاوہ وہ اور کسی کو اچھی طرح پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اسے انکا گھر ٹھیک طرح سے یاد تو نہیں تھا، لیکن پوچھ کر وہاں پہنچنا کٹھن نہیں تھا۔

گھوڑے پر سوار ہونے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی گھوڑا جسّے کی لات کھا کر دُھول میں لُڑھک گیا۔ ایسے گھوڑے پر ایک دم سے سواری کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ شاید گھوڑا بھی اس کی نظر سے گر چکا تھا۔
یہ سب سوچ کر اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور دھیرے دھیرے کچھ اونچی جگہ پر دکھائی دینے والی گلی کی طرف بڑھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹی سی دُکان دکھائی دی، جس کے چبوترے پر کچھ لوگ بورا بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ رُک کر اس نے اِن سے دلیر اور لکھا کے گھر کا پتا پوچھا۔ ان میں سے ایک شخص نے ہاتھ اُٹھا کر کہا:

''اس گلی سے سیدھے چلے جاؤ۔ جہاں چرکھڑے والا کنواں دکھائی دے، وہیں سے داہنے ہاتھ کو گھوم جانا، پھر بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹی سی گلی دکھائی دے گی۔ جہاں وہ گلی بند ہو جاتی ہے، وہاں پر ان دونوں کا مکان ہے۔''

بات تو ایک شخص کر رہا تھا، مگر اس کی طرف سب ہی لوگ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھ گیا، تو بھی دُکان پر بیٹھے لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

بتائے ہوئے راستے کے مطابق وہ تنگ گلی کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اسے آواز دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوئی۔ سامنے شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے دروازے کی چوکھٹ میں دلیر سنگھ کھڑا دکھائی دے گیا۔ دلیر سنگھ کو اسے پہچاننے میں ایک دو لمحے لگے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا سواگت کیا۔ اتنے میں لکھا سنگھ بھی آ گیا۔ اس نے بڑی خوشی ظاہر کی۔

گھوڑے کو گلی میں چھوڑ کر وہ تینوں بھیتر چلے گئے۔ کافی بڑا دالان تھا، جہاں دو تین چارپائیاں اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ دالان سے دوسرے سرے پر دو بھینسیں اور ایک گھوڑا کھونٹے سے بندھا دکھائی دیا۔

چنن سنگھ بھی دالان میں بیٹھا تھا۔ اس کے بیٹوں نے صورت سے تعارف کرایا۔ باپ بیٹے دراصل خوش تھے، کیونکہ ٹھنا کے واقعہ کے بعد گاؤں میں ان کی ساتھ بہت کم ہو گئی تھی۔ صورت سنگھ دیکھنے میں سجیلا جوان تھا۔ وہ دوست ہونے کے ناطے ان سے ملنے آیا تھا۔ یہ ان کے لیے کافی فخر کی بات تھی۔

صورت سنگھ ایک طرح سے بے عزت ہو کر وہاں پہنچا تھا لیکن ان کے سواگت کرنے سے صورت کا حوصلہ کچھ بڑا اور کمتری کا احساس کچھ کم ہوا۔

بات چیت شروع کرنے کے وچار سے دلیر سنگھ بولا:

''کافی عرصے کے بعد اِدھر آنا ہوا تمہارا۔ میرے خیال میں لگ بھگ ایک برس تو ہو ہی چکا ہے۔''

''ہاں! صورت سنگھ نے کہنا شروع کیا، شاید میں آج بھی نہ آتا مگر مجھے جسا سنگھ سے ملنا تھا۔ اسے لوگ یہاں چک پیراں کا جسُو کہتے ہیں۔''

اس کی اس بات پر باپ بیٹوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر وہ ان کے دُشمن سے ملنے کیوں آیا۔ وہ جانتے تھے کہ صورت سنگھ ان کا دُشمن نہیں تھا، دوست تھا، شاید اسے جسُو سے ان کی دُشمنی کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھے کہ صورت جسّے سے مل کر آ رہا ہے، بلکہ وہ سمجھے کہ اب اس سے ملنے جائے گا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صورت جسّے سے ملے۔ نہ جانے ملنے پر کیا کیا باتیں ہوں۔ دلیر نے کہا:

''چک پیراں کے جسُو سے تمہیں کیا کام آ پڑا ہے؟ وہ تو بڑا بدنام آدمی ہے۔ گاؤں میں اس کی کوئی عزت نہیں ہے۔''

صورت سنگھ نے بے بسی سے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا:

''اب وہ جیسا بھی ہے، اس کے بنا میرا کام بن نہیں سکتا تھا۔''

یہ سن کر ان تینوں کے من سب کچھ جاننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ صورت کے رنگ ڈھنگ سے لگتا تھا کہ وہ ان سے کچھ بھی نہیں چھپائے گا۔ اسے اور بھی اچھے موڈ میں لانے کے لیے دلیر سنگھ نے آواز دے کر گھر سے

لسّی کا چھنّا (کٹورہ) منگوایا، جس میں مکھن کا گولا تیر رہا تھا۔ صورت سنگھ کو پیاس لگی ہی تھی اور بھوک بھی لگی تھی۔ اس نے جس جلدی سے گولا منہ میں پھینک کر لسّی پی، اس سے اس کے میزبان سمجھ گئے کہ اس کو ضرور ہی بھوک لگی ہے، دلیر نے پھر آواز دے کر پراٹھے تیار کرنے کو کہا۔

چنن نے سنگھ نے آواز میں لوچ پیدا کرتے ہوئے پوچھا:

"بیٹا! اس ظالم کے بغیر تمہارا کون سا کام رُکا ہوا ہے۔ میرے دونوں بیٹے تمہارے ساتھ ہیں۔ کوئی بھی ضرورت ہو تو بلا جھجکے بتا سکتے ہو۔ انہیں اپنا بھائی سمجھو۔"

صورت سنگھ نے ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا:

"شاید آخر میں ان دونوں کی ضرورت پڑے گی مجھے۔"

لکھا سنگھ نے گردن آگے بڑھا کر پوچھا:

"آخر میں؟...... ہمارے وچار سے تو تم اس کے پاس نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو کسی کے کام آسکے۔"

اس کی اس بات سے صورت سنگھ کے چہرے پر گہری مایوسی کی جھلک دکھائی پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ لکھا سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بوجھل آواز میں بولا:

"لیکن میں تو اسے مل آیا ہوں۔"

وہ تینوں لگ بھگ اُچھل پڑے اور ایک آواز ہو کر بولے:

"تو کیا تم جسّے کے گھر سے ہو کر آ رہے ہو؟"

"ہاں!"

دلیر سنگھ نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"جب تم جانتے تھے کہ ہم یہاں موجود ہیں، تو اس کے پاس جانے سے پہلے ہم سے تو مل لیے ہوئے۔"

"نہیں بھئی، اس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ مجھے تو وہاں جانا ہی تھا، چاہے پہلے، چاہے بعد میں۔"

چالاک چنن سنگھ نے پوچھا:

"ایسی ہی مجبوری تھی، تو پہلے اسی کے پاس جانے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کام بنا یا نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں بنا۔"

میزبانوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ انہوں نے معنی خیز ڈھنگ سے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ چنن سنگھ نے بزرگانہ انداز سے ہاتھ بڑھا کر صورت کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:

"اور نہ ہی یہ کام بنے گا، یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارا برا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں مالوم کہ تم کس کام

سے وہاں گئے تھے۔ مگر اتنا تو میں جانتا ہوں کہ جسُّو جیسے آدمی سے تمہارا کام نہیں نکل سکتا۔ تمہارا کیا، اس کے ہاتھوں کسی کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا، یہ بات تو دُنیا جانتی ہے۔''

دلیر بولا:

''لیکن بھئی! یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کام کیا تھا؟ اگر کوئی خفیہ بات ہے تو رہنے دو۔ ہم تو صرف اس لیے جاننا چاہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت تمہاری مدد کر سکیں۔''

ان کی ہمدردی سے متاثر ہو کر صورت بولا:

''تم سے کیا چھپانا، ہری پورہ میں سوائے تم لوگوں کے میرا اور کون ہے۔''

''بالکل ٹھیک!'' لکھا بولا۔

صورت سنگھ نے رُک رُک کر ساری کہانی کہہ سنائی۔ پرسَنی نے اس کا پیار، شادی کا فیصلہ، پرسَنی کی سچی محبت، لیکن جسّے کی وجہ سے ایسی بڑی رکاوٹ کہ شاید ان کا یہ معاملہ کھٹائی میں ہی پڑ جائے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ جسُّو سے مل کر اس نے اپنے آپ کو بے عزت محسوس کیا لیکن یہ اشارہ ضرور دیا کہ اس کے رویے سے اسے مایوسی ہوئی تھی۔

چنن سنگھ نے ناک سکوڑ کر سر کھجاتے ہوئے کہا:

''لیکن جسُّو پرسَنی کا رشتے میں بھی بھائی کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے یہ بات آج تک نہیں سنی۔ وہ لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی۔ گاؤں میں ہر کوئی ایک دوسرے کی رِشتے داریوں کو جانتا ہے۔ جسُّو تو بگّا سنگھ کے خاندان کا کوئی اناتھ (یتیم) بچہ تھا، جو تیرہ چودہ برس کی عمر میں یہاں آیا۔ وہ چاچا کے ٹکڑوں پر پلتا رہا لیکن وہ دراصل اتنا گندہ اور بدکردار لڑکا تھا کہ چاچا نے اسے چک پیراں بھیج دیا۔ اتنے برسوں تک اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔ جوان ہونے پر یہاں آدھمکا......''

چنن سنگھ نے رام پیاری سے بگّا سنگھ کے تعلقات کا ذکر کیا اور اس خوبصورت عورت کے پتی سے بگّے کا جھگڑا پھر فوجداری، پھر پانچ سال کی قید......سب کچھ بتا دیا۔

یوں تو صورت سنگھ بھی اپنی گنتی دھاکڑ لوگوں میں ہی کرتا تھا لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ اس کا پالا کیسے آدمی سے پڑا ہے۔

پراٹھے کھا کر صورت سنگھ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ چنن سنگھ نے رائے دیتے ہوئے کہا:

''صورت سنگھ تم اس بات کا پتا لگانے کی کوشش کرو کہ جسّے کا پرسَنی سے حقیقت میں کوئی رِشتہ ہے بھی یا نہیں۔ مجھے تو یہاں تک شک ہے کہ کہیں پرسَنی سے ہی اس کا پیار نہ ہو اور وہ دونوں شادی کرنے کے چکر میں ہوں۔''

دلیر سنگھ کو دیپی کا خیال آیا۔ وہ جانتا تھا کہ دیپی اور جسّے کا پریم تھا اور پرسَنی سے اس کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ لیکن اس نے بات کو جھٹلایا نہیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ صورت جتنا زیادہ مایوس ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔

صورت کے یہ بالکل ہی نئی بات تھی مگر اسے پورے طور پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہ تو اچھی طرح جانتا تھا کہ پرسنی کی دلچسپی پورن سنگھ کی طرف تھی۔ جسا سنگھ کو آج تک پرسنی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا، نہ ہی پرسنی نے پچھلی بار کے علاوہ جسّے کا ذکر کیا تھا۔ اس کے باوجود چنن سنگھ کے یہ الفاظ اس کے دل میں کانٹے کی طرف کھٹکنے لگے۔ اس کی عقل زیادہ تیز نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ چالاک تھی۔ اس طرح کی اُلٹی سیدھی باتوں سے اس کی اُلجھن بڑھ گئی۔ کافی دیر تک چلتی رہی۔ آخر صورت سنگھ جانے کو تیار ہوا تو دلیر سنگھ نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چاہے جو کچھ بھی ہو، تم ہم پر بھروسہ کر سکتے ہو اگر جسّے سے ٹکر بھی لینی پڑی تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

دلیر سنگھ یا اس کے خاندان میں کسی کے بھیتر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ جسّے سے ٹکر لے سکے۔ صورت سنگھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے وشواس ہو جائے کہ ہری پورے میں ان کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ مقصد بھی تھا کہ صورت سنگھ کے من میں ان کے لیے وشواس بنا رہے، تاکہ موقعہ پڑنے پر وہ اس کا شطرنج کے مہرے کی طرح استعمال کر سکیں۔ جسّے کے لیے مصیبت کھڑی کرنے کا کوئی بھی موقع وہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ صورت سنگھ نے اُٹھ کر سب سے ہاتھ ملایا اور کہا:

''آپ سب نے مجھے مدد دینے کا جو وعدہ کیا ہے۔ اس کے لیے سدا میں احسان مانوں گا۔''

دونوں بھائی صورت سنگھ کو تنگ گلی میں کچھ قدموں تک وِداع کرنے کے لیے آئے، مگر وہ اور زیادہ آگے نہ بڑھے، کیونکہ اب گاؤں والوں کی نظر میں اُن کی وہ شان اور دبدبہ نہیں رہا تھا۔

گلیوں میں سے گزرتے ہوئے صورت سنگھ اور اس کے گھوڑے کا سر نیچے کو جھکا رہا۔ وجہ یہ کہ کمزور گھوڑا تھک گیا تھا اور صورت سنگھ کے ذہن میں اُلجھنیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ جب وہ اس دُکان کے آگے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ چبوترے پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ شاید یہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے اسے گاؤں کے بھیتر جاتے دیکھا تھا۔ جس شخص نے اسے دلیر سنگھ کے گھر کا پتا بتایا تھا۔ شاید وہ اپنے اضطراب کو دبا نہیں سکا۔ اس نے پوچھا:

''کہو سردار جی! آپ کو گھر مل گیا تھا؟''

''جی ہاں۔''

صورت سنگھ نے کچھ بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس شخص نے پھر پوچھا: ''آپ ابھی تک اس کے یہاں ہی ٹھہرے رہے۔''

''جی!''

صورت سنگھ کو تھوڑا تعجب ہوا کہ وہ شخص اتنی کرید کیوں کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ زیادہ تر لوگ ان کی بات چیت میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ سب کچھ اسے غیر معمولی سا لگ رہا تھا۔

بات چیت چلتی رہی۔ اس سے پھر پوچھا گیا: ''چنن سنگھ آپ کے رشتے دار ہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''اچھا تو کوئی واقفیت ہوگی؟''
''چنن سنگھ کے دونوں لڑکے میرے دوست ہیں۔''
وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں یہ سُن کر پھیل گئیں۔
اگلا سوال تھا: ''لگتا ہے آپ کسی خاص کام سے آئے تھے؟''
صورت سنگھ کو اس طرح کی پوچھ تاچھ بُری تو لگ رہی تھی، مگر وہ یہ بھی سوچ رہا تھا، شاید اس بات چیت سے اس کو کچھ نئی جانکاری ہی حاصل ہو جائے۔ بولا:
''ہاں میں خاص کام سے ہی آیا تھا، مگر وہ کام جسا سنگھ سے تھا۔ وہی جسا سنگھ جو چک پیراں کے جسّو کے نام سے مشہور ہے۔''
یہ سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے، ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور انہوں نے بھودیں اُٹھا کر اور آنکھوں کی پُتلیاں گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
اگلا سوال: ''تو اب آپ جسا سنگھ کے ملنے جا رہے ہیں؟''
''نہیں، اس سے ملاقات کے بعد ہی میں اِدھر آیا تھا۔''
اب صورت سنگھ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا، بلکہ کسی ایک نے سب لوگوں سے کہا: ''یہ بے چارہ..........
اگرچہ صورت سنگھ کو مخاطب نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ خود ہی بول اُٹھا:
''ویسے میں پچھلے برس بھی یہاں آیا تھا۔ یہ میرا دوسرا چکر ہے۔ پھر بھی میں یہاں پر نیا ہی ہوں۔''
وہاں بیٹھے ہوئے پورے دَل پر خاموشی چھا گئی۔ صورت نے بلا ارادہ ہی ان سے پوچھا: ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''
جواب ملا:
''کوئی خاص بات تو نہیں ہے...... لیکن آپ اس چکر سے دُور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں آپ کے آنے جانے پر کوئی اعتراض ہے۔ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ نہیں مالوم آپ کس کام سے یہاں آئے ہیں لیکن جو کچھ بھی کریں وہ سوچ سمجھ کر کریں۔''
صورت سنگھ پل دو پل کے لیے وہاں رُکا رہا، سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔
اب بھی وہ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں پکڑے چلا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ دھول بھرا میدان پار کر لوں تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھوں گا۔
دھیرے دھیرے وہ اس میدان کو بھی پار کر گیا۔ اس نے رکاب پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر نظر ڈالی، تو جسا سنگھ گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے کچھ دیر تک اس کا جسّے سے ساتھ ہو جائے گا، اس لیے وہ جلدی سے کاٹھی پر بیٹھ گیا۔
اتنے میں جسّے نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا ہنہنایا، پُتلیاں نچائیں اور دانتوں

میں لگام چباتے ہوئے رُک گیا۔ اس کی ٹاپوں سے دھول چھوٹے چھوٹے بادلوں کی طرح اُوپر کو اُٹھنے لگی۔

دونوں کی آنکھیں ملیں تو صورت سنگھ کو جسا پہلے سے بھی زیادہ پُراسرار دکھائی دیا۔ بھڑکتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر اسے بس میں رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جسّے نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے جسّے کو گھور کر دیکھا اور پوچھا:

''تم چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملنے گئے تھے کیا؟''

صورت سنگھ کو یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اتنا اندازہ تو وہ لگا ہی چکا تھا کہ جسّے اور چنن سنگھ کے خاندان کی آپس میں گہری دشمنی تھی۔ ایسی حالت میں جب کہ پرسنی کی شادی جسا سنگھ کی رضامندی سے ہی ہو سکتی تھی، اس کا چنن سنگھ کے بیٹوں سے ملاقات کرنا جسّے کی نظر میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ سب سوچ کر صورت سنگھ بوکھلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں اس بات کو قبول کرے کہ وہ چنن سنگھ کے گھر گیا تھا۔ اگر اسے پہلے سے ان ساری باتوں کا پتا ہوتا تو وہ کم سے کم اس موقع پر ان سے ملنے نہ جاتا۔

وہ اسی اُلجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ جسا سنگھ نے اپنے گھوڑے کی لگام زور سے کھینچی، واپس مُڑا اور تیز رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس اسی سمت کو چلا گیا۔ جدھر سے آیا تھا۔

یہ درست تھا کہ صورت سنگھ جسّے کے سوال کا جواب ذہنی اُلجھن کی وجہ سے نہ دے سکا لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی لگا کہ جسا اسے جواب کا موقعہ ہی دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے کانوں میں صرف یہ بات ڈال دینا چاہتا تھا کہ چنن سنگھ اور اس کے لڑکوں سے اس کی ملاقات کے بارے میں وہ جانتا تھا۔

وہ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جسا سنگھ اسی تیز رفتار سے ایک بڑا سا چکر لگا کر گاؤں کے پرلی طرف اوجھل ہو گیا۔

جسا سنگھ نے جو یہ بات کہی تھی کہ پرسنی سے شادی کے معاملے میں رضامندی دینے سے پہلے وہ اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرے گا، کیا وہ اب بھی اپنی اس بات پر قائم رہے گا؟

بہت سوچنے پر بھی صورت کو اپنے من میں اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے لگام کھینچ لی اور گھوڑا مری ہوئی چال سے آگے بڑھنے لگا۔ صورت سنگھ کی شکل سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت بُری طرح پٹ کر واپس جا رہا ہو۔

۳

کچھ ہی دیر میں جسا سنگھ اپنے گاؤں سے کافی دُور نکل گیا۔ تب اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ مڑ کر دیکھا تو ببول، شیشم اور شریہنہ کے درختوں میں گھرا ہوا مٹیالا ہری پورہ پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ گاؤں میں رحیمے اور جھنو کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر کچھ دنوں کے لیے باہر جا رہا تھا۔ اس نے تھوڑے سے کپڑے کھدر کے تھیلے میں ڈال لیے تھے اور تھیلے کو کاٹھی کے پیچھے والے حصے میں باندھ رکھا تھا۔ آدھے سے زیادہ

راستہ پار کر کے وہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے آرام کرنے کو رُکا۔ وہ چک پیراں جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا۔ اس وقت اس کا وچار تھا کہ پوٹلی میں بندھی روٹیاں کھا کر، کچھ دیر لیٹنے کے بعد دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل دے گا۔ اسی بیچ گھوڑا بھی دانا پانی کر کے چوکنا ہو جائے گا۔

درختوں کے جھنڈ سے تھوڑی ہی دُوری پر رَہٹ چل رہا تھا۔ وہ چاہتا تو رَہٹ کے قریب ہی بیٹھ کر کھانا کھا سکتا تھا۔ مگر وہاں کچھ اور لوگ بیٹھے تھے اور جسا یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے اس کی گپ شپ شروع ہو جائے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ گھر سے ہی بہت دیر سے چلا تھا۔ آدھی رات سے تھوڑا پہلے ہی چک پیراں پہنچنے کی اُمید تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس روز پور ینما کی رات ہوگی، اس لیے سفر کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

درختوں کے جھنڈ کے نیچے کافی گھاس تھی۔ جسّے نے گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی اور دوسرا ساز و سامان اُتار کر دھرتی پر رکھ دیا اور اپنے بیٹھنے کے موٹا سا کھیس بچھالیا۔ گھوڑا گھاس چرنے لگا تو وہ پینے کے لیے پانی کا کمنڈل لے کر رہٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے آس پاس موجود لوگوں پر اُچٹتی ہوئی نظر ضرور ڈالی مگر جلدی سے کمنڈل بھر کر وہاں سے لوٹ آیا۔ کھانا کھایا اور آنکھوں پر باز و رکھ کر سو گیا۔

لگ بھگ آدھا گھنٹہ سونے کے بعد آنکھ کھلی۔ گھوڑا اب بھی گھاس چر رہا تھا۔ اس نے اس کی پیٹھ پر زین کسی اور اس پر سوار ہو کر اسے پانی پلانے کے لیے رَہٹ کی طرف چلا گیا۔ پانی پلا کر جب وہ لوٹنے کو ہوا، تو پیچھے سے آواز آئی:

''جسیا!''

مردانہ آواز تھی، وہ جلدی سے پہچان نہیں پایا اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہاں اس کا واقف کون سا شخص ہو سکتا تھا...... یا اسے آواز دینے والا دُشمن تھا یا دوست۔

اتنے میں ہی ایک لمبا سا شخص اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ایسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے، جیسے ان دنوں کے کھاتے پیتے رئیس پہنا کرتے تھے، یعنی لمبی سی قمیص اس کے نیچے ریشمی آزار بند والی شلوار، پاؤں میں تلے والا جوتا، کُرتے پر خاکی رنگ کا سوتی کوٹ، سر پر دو شملوں والی پگڑی۔

اسے پہچاننے میں جسّے کو تھوڑا وقت ضرور لگا کیونکہ اس وقت پورن سنگھ نے پولیس کی وردی نہیں پہن رکھی تھی۔

جسا گھوڑے سے اُتر پڑا اور اپنا ہاتھ پورن سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''یار وردی کے بنا میں تمہیں پہلی نظر میں بالکل نہیں پہچان سکا۔ وجہ یہ کہ مَیں نے تمہیں وردی میں ہی دیکھا تھا۔''

پورن سنگھ نے ایک اُنگلی اوپر اُٹھا کر کہا:

''یاد ہے، پچھلی بار ہم کب ملے تھے؟''

''یاد ہے، یہ وہی دن تھا، جب تم نے صورت سنگھ کو پکڑ کر چھوڑ دیا تھا۔''

پورن سنگھ کے ماتھے کا رنگ کچھ گہرا پڑ گیا، جیسے اسے کوئی پرانا واقعہ یاد آ گیا ہو۔ اس موضوع کو چھوڑ کر اس نے پوچھا:

''کہاں جا رہے ہو؟''

''چک پیراں جانے کے ارادے سے نکلا تھا۔''

''چک پیراں تو ابھی بہت دُور ہے۔''

''میرا جلدی چلنے کا ارادہ تھا، مگر بلا وجہ دیر ہو گئی۔ ویسے میں چک پیراں سے ہو کر تم سے بھی ملنا چاہتا تھا۔''

''لیکن میں تو راستے میں ہی مل گیا۔''

''اتنا سا ملنے کا کیا مزہ۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ آج کل میں بھی چھٹی لے کر اپنے گاؤں آیا ہوا ہوں۔ پرسوں ڈیوٹی پر لوٹ جاؤں گا۔ ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور۔''

''کیا تم چک پیراں کسی ضروری کام سے جا رہے ہو؟''

''خاص ضروری تو نہیں ہے۔ کافی عرصہ سے چاچا سے ملاقات نہیں ہوئی، سوچا، اس سے مل آؤں۔''

''اگر تم کل یا پرسوں چک پیراں پہنچ جاؤ تو کیا کوئی خاص فرق پڑے گا؟''

جسّے کی بھوویں پل بھر کو اوپر اٹھیں:

''فرق کیا پڑے گا گھر کا کام رحیم سنبھال لے گا۔ وہ ہمارا پرانا نوکر ہے۔ ویسے بُوا جھجو بھی کم ہوشیار نہیں ہے۔''

''تم مجھ سے ملنا تو چاہتے ہی تھے کیوں نہ آج ہمارے یہاں رُک جاؤ۔ بہت جلدی ہو تو کل صبح چل دینا۔ ورنہ پرسوں تک بھی جا سکتے ہو۔ میرا گاؤں قریب ہی ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لڑکپن کے بعد اب ہم کچھ وقت کے لیے ایک دوسرے کے پاس رہ سکیں گے۔''

''بس تو آؤ، میرا گھوڑا طویلے کے پیچھے بندھا ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گھوڑوں پر سوار دوست چلے جا رہے تھے۔

وہ دونوں خاموش تھے، جسّے نے محسوس کیا کہ پورن سنگھ اپنے وِچاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اس طرح کھویا کھویا دیکھ کر جسّے کی سمجھ میں بھی نہیں آیا، کہ وہ کس موضوع پر بات کرے۔

آخر پورن سنگھ خود ہی بولا:

''جسیا! تمہیں وہ لڑکی یاد ہے؟''

''کون لڑکی؟''

''جو اس دن صورت سنگھ کے ساتھ تھی۔''

''ہاں! اچھی طرح یاد ہے، کیوں؟''

پورن سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں چپ چاپ بڑھنے لگے۔ سامنے گاؤں دکھائی دینے لگا تھا۔ راستے میں واقف لوگوں سے پورن سنگھ کی ست سری اکال بھی ہوئی۔

گاؤں میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ وہی کچی اینٹوں کے بنے ہوئے اُبڑ کھبڑ چھتوں والے ناہموار مکان، باہر گندے پانی کا جوہر، جس میں اس وقت کچھ بھینسیں گھسی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر اُروڑیاں، گندگی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ بیکار سے کتے کوڑا سونگھتے پھر رہے تھے اور مرغیاں خوراک کی تلاش میں جگہ جگہ اُروڑیوں کو کھود رہی تھیں۔

گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ دونوں گھوڑوں سے اُتر گئے۔ آگے آگے پورن سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے جسا۔

یہ گلی عام گلیوں سے کچھ چوڑی تھی۔ پورن سنگھ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رُک گیا اور تختے کے اوپر لٹکتے کُنڈے کا سرا تھام کر اس نے کافی زور سے کھٹکھٹایا۔ کچھ ہی پل کے بعد دروازہ کھلا۔

جس عورت نے دروازہ کھولا، اسے دیکھ کر جسا چونک پڑا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے اس نے رتّو کے گوردوارے کے قریب دیکھا تھا اور اس کے بارے میں پرسنّی نے بتایا تھا کہ وہ پورن سنگھ کی بہن ہے۔

دروازے کی دہلیز گلی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ گھوڑے آسانی سے بھیتر گھس گئے۔ جسّے نے دیکھا کہ وہ ایسے گلیارے میں تھے، جہاں کچھ دوسرے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ گوبر کی بُو ان کی ناک تک پہنچ رہی تھی۔ گلیارے کا بھیتری دروازہ بڑے دالان میں کھلتا تھا۔ گھوڑوں کو وہیں پر چھوڑ کر وہ دروازے سے باہر نکل آئے۔

دالان میں دیوار کے ساتھ کچھ چار پائیاں کھڑی تھیں۔ پورن نے ان میں سے دو کو گھسیٹ کر دالان میں بچھالیا۔

شاید گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھ کر وہ عورت گلیارے سے دالان میں آئی۔ پورن نے ہاتھ سے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''میری بہن بنتو۔''

بنتو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

جسّے نے بھی ہاتھ جوڑے، لیکن ساتھ ہی اس کے منہ سے اچانک نکل گیا:

''میرا خیال ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔''

بنتو کے چہرے پر حیرانگی کی علامات اُبھر آئیں۔

پورن سنگھ نے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ یوں ہی ہلکی سی دلچسپی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

جنتو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''آپ کو ضرور کوئی بھول ہو رہی ہے۔ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ۔''

جسّے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''رتّو کے کے گوردوارے میں جو میلا لگا تھا، وہیں پر مَیں نے آپ کو دیکھا تھا، ممکن ہے کہ آپ نے مجھے نہ دیکھا ہو۔''

پورن سنگھ بیچ میں ہی بولا:

''ٹھیک کہتے ہو، یہ رتّو کے گئی تھی، میلہ دیکھنے کے لیے۔''

جنتو بھیتر چلی گئی۔

جسا سوچنے لگا کہ بہن بھی اپنے بھائی کی طرح بہت خوب صورت ہے۔

شاید پورن سنگھ نے محسوس کیا کہ جسا جنتو کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ بولا: ''اس کا خاوند نہیں ہے۔''

جسّے کے چہرے پر اُلجھن کے نشان اُبھرے۔ پوچھا:

''شادی ہی نہیں ہوئی یا......؟''

جسّے کے لیے یہ بات ماننے کی تھی ہی نہیں کہ ایسی حسین لڑکی کی شادی نہ ہوئی ہو۔ پورن سنگھ بولا:

''شادی ہوئی تھی، لیکن دُر بھاگیہ سے تین برس پہلے اس کے پتی کو اچانک ہیضہ ہو گیا اور وہ بچ نہیں سکا۔''

''کوئی اولاد ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر......؟''

جسّے کا مطلب سمجھتے ہوئے پورن سنگھ نے کہا:

''ہمارے سماج میں بیوہ کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بے چاری بہت پریشان اور دُکھی ہے۔ اپنے آپ کو بہت بدنصیب سمجھتی ہے۔ ہمارے یہاں ہر ایک عورت کے من میں یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سہاگن ہی رہے۔''

''دوسری شادی ممکن نہیں ہے کیا؟''

''ممکن تو کیا ہے، عورت کی شادی ایک ہی بار ہوتی ہے۔ مَیں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بہن کا دُکھ دیکھ نہیں سکتا۔ اگر یہی حال رہا تو یہ جیون بھر میری ذمہ داری بنی رہے گی۔ مَیں اس ذمہ داری سے

گھبراتا تو نہیں ہوں، لیکن یہ کوئی اچھی حالت تو ہے نہیں۔ شادی کی بات اس لیے نہیں سوچ سکتا کہ وہ خود اس پر راضی نہیں ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ جب سدا سہاگن رہنا اس کی قسمت میں ہی نہیں لکھا تھا، تو پھر اسے قسمت کے آگے سر جھکانا ہی پڑے گا۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جسا کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا اور پورن سنگھ کے پاس اس بارے میں کچھ اور کہنے کو نہیں تھا۔ بولا:

"یہ بات خواہ مخواہ چل نکلی۔ اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ بہتر یہی رہے گا کہ اس مسئلہ پر ہم کوئی بات ہی نہ کریں۔ باتیں کئی بار ہو چکی ہیں اور ہر بار میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کوئی سجھاؤ رکھتا ہوں تو بنتو تعاون کرنے کو تیار ہی نہیں۔ اب تو مَیں نے اس بات کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

اتنے میں بنتو مکان کے دروازے سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ پورن سنگھ خاموش ہو گیا۔ وہ پاس آئی اور اس نے پوچھا:

"کھانے پینے کے لیے کیا لاؤں؟"

پورن سنگھ مسکرا کر بولا:

"یہ میرا بچپن کا سب سے پیارا دوست ہے۔ جو من میں آئے اسے کھلاؤ پلاؤ..........."

جسّے نے بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"نہیں بھئی، جس وقت ہم ملے تھے اس سے لگ بھگ آدھا گھنٹہ پہلے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں!"

پورن سنگھ نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"تو پھر گرم گرم دودھ لے آؤ۔ اس کے بعد رات کے کھانے کی تیاری کرو۔"

دالان کے کونے میں بالشت بھر کچی منڈیر سے گھرا ہوا رسوئی گھر تھا، جس میں دو لپے پتے چولہے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کونے میں دھرتی کے نیچے بنی ہوئی انگیٹھی تھی جو مٹی کے چاپڑ یعنی گول ڈھکن سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بنتو نے چاپڑ اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ گوبر کے اُپلوں کی گرم راکھ پر دھری دودھ کی ہانڈی کو باہر نکالا۔ دھیمی آگ پر پکنے کی وجہ سے دودھ کی رنگت مٹمیلی سی ہو گئی تھی وراس کے اوپر موٹی ملائی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دو کٹوروں میں دودھ بھر کر اس پر ملائی ڈالی اور ہانڈی پھر انگیٹھی میں رکھ کر اسے چاپڑ سے ڈھک دیا۔

جب بنتو دودھ کے کٹورے لے کر ان کے پاس پہنچی، تو پورن سنگھ نے پوچھا:

"بے بے اور دوسرے لوگ کہاں گئے ہیں؟"

''آج پڑوس والوں کے گھر میں شادی کا گانا ہو رہا ہے۔ وہیں گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دو۔''

کٹورے ان کے حوالے کر کے بنو چپ چاپ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد گھر کے دوسرے افراد بھی آ گئے۔ پورن سنگھ نے ان سے جسا سنگھ کا تعارف کرایا تو ماں جس نے جسے کو لڑکپن میں دیکھا تھا، کچھ حیرانگی سے منہ کھول کر بولی:

''اب تو جسا سنگھ نال (بھگوان کی کرپا سے) بڑا اونچا، لمبا اور تگڑا جوان بن گیا ہے۔''

رات کا بھوجن اندھیرا ہوتے ہی ہو گیا۔ آکاش میں چاند نکل آیا۔ پورن سنگھ نے سجھاؤ دیا کہ باہر کھیتوں میں جا کر ٹہلا جائے۔ جسے نے یہ بات مان لی اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چل نکلے۔ جو بات پورن سنگھ کے من میں تھی، سو جسا بھی جانتا تھا۔ بیچ بیچ میں اس کا جی چاہا کہ اگر پورن سنگھ کو کچھ کہنے میں تامل ہو رہا تھا تو وہ خود ہی اس کو چھیڑ دے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا تاکہ وہ اپنے ہی ڈھنگ سے اپنی مشکل بتائے تو ٹھیک رہے گا۔

یکایک چلتے چلتے پورن سنگھ کے منہ سے نکلا:

''تو تمہیں وہ لڑکی یاد ہے۔''

جسا سنگھ رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ کہنی پر رکھ کر بولا:

''یہ بات تو تم پہلے بھی پوچھ چکے ہو۔ میں نے جواب دیا تھا کہ ہاں، مجھے وہ لڑکی اچھی طرح یاد ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ مجھے صرف یاد ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے مَیں کئی بار مل چکا ہوں۔ اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اس کا نام پرسنی ہے۔''

پورن سنگھ دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ جیسے جسے نے اس کے سینے پر گھونسہ دے مارا ہو۔ اسے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ آخر گلے میں پھنسی آواز سے بولا:

''اچھا تو وہ تم سے بھی ملتی رہی ہے؟''

''ہاں!''

''مجھے اس سے اس بات کی اُمید نہیں تھی۔''

''اس کا اُمید سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو اتفاق کی بات تھی۔''

پورن سنگھ نے سر اُٹھا کر جسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے چہرے پر دُکھ کی علامات صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ بولا:

''اتفاق؟...... دُنیا میں کئی باتیں اس اتفاق کا ہی نتیجہ بتائی جاتی ہیں۔ مگر میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا ہوں۔ نہ جانے وہ کس کس سے ملتی رہی ہے اور اب بھی ملتی رہتی ہے۔''

جسے نے تھوڑی خاموشی کے بعد پوچھا:

''وہ کسی سے بھی ملے، تمہیں کیوں پریشانی ہوتی ہے؟''
پورن سنگھ نے چونک کر دوست کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا:
''ہاں، ٹھیک ہی تو ہے، مجھے کیوں پریشانی ہوتی ہے۔''
''میں تم سے اس بات کا جواب مانگ رہا ہوں کہ تم کو کیوں پریشانی ہوتی ہے؟''
''میں بھی اس کا جواب ہی سوچ رہا ہوں۔''
''سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں اس سے گہرا پریم ہے۔''
''یہی میری بدقسمتی ہے۔''
''بدقسمتی نہیں، یہی تمہاری بیوقوفی ہے۔ تم پڑھے لکھے اور پولیس افسر ہو کر اس معاملے میں اتنے گھونچو نکلو گے، یہ مجھے مالوم نہیں تھا۔''
پورن سنگھ نے کچھ کہنا چاہا تو جسّے نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روک دیا:
''اب تم مجھ کو بولنے دو۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم مجھ سے اس بات کی جانکاری حاصل کرتے کہ پرسنّی کب کیسے اور کس لیے مجھ سے ملی۔ تم نے یہ سب نہیں پوچھا تو میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے مَیں ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا تم کو دیپی نامی لڑکی یاد ہے؟''
تھوڑا سوچنے پر پورن سنگھ کو دیپی کی صورت یاد آ گئی۔ بولا:
''وہی سجن سنگھ کی بیٹی؟''
''ہاں۔''
''تم کئی لڑکیوں میں رانجھا بنے گھوما کرتے تھے۔ انہیں میں سے دیپی بھی تھی۔''
''دیپی ان میں ایک نہیں، بلکہ دیپی ہی وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے کئی لڑکیاں بھی میرا ساتھ دیتی تھیں......''
''تم گاؤں بھر کے کتے جنگلی بلوں کے پیچھے دوڑایا کرتے تھے۔''
''دراصل میں دیپی کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ مجھے چاچا نے چک پیراں بھیج دیا تو یہ دوڑ کچھ برسوں کے لیے ختم ہو گئی۔ جب میں پھر ہری پورہ پہنچا تو یہ دوڑ دوبارہ شروع ہو ہو گئی۔ ماں باپ کو بُرا لگا۔ انہوں نے دیپی کو دوسرے گاؤں بھیج دیا۔ اس گاؤں کا نام رتّو کے ہے۔ دیپی نے مجھے بتا دیا تھا کہ ماں باپ نے اس کی ماسی کے پاس بھیج رہے ہیں۔ دیپی سے ملنے رتّو کے پہنچا۔ گاؤں سے باہر تالاب کے قریب ایک لڑکی سے مَیں نے پوچھا کہ کیا اس گاؤں کا نام رتّو کے ہے۔ وہ لڑکی پرسنّی تھی...... پرسنّی اور دیپی گہری سکھیاں ہیں......''
اس کے بعد پوری کہانی کہہ ڈالی۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ پرسنّی سے اس کے بارے میں کوئی بات چیت ہوئی یا نہیں۔ بے چارہ پورن سنگھ تو یہی جاننے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا کہ پرسنّی نے بات چیت کے دوران اس کا

نام لیا یا نہیں۔

سب کچھ سن کر پورن سنگھ نے کہا:

''مجھے خوشی ہے کہ تم اس معاملے میں خوش قسمت ہو۔''

جسّے نے پورن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''مگر دوست! بدقسمت تم بھی نہیں ہو۔''

''یہ کیا مذاق ہے؟''

''مذاق نہیں، ٹھیک بات ہے۔ پرسنّی تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔ تمھارے ہی نام کی مالا جپتی ہے۔ سدا کے لیے تمھاری ہی بن کے رہنا چاہتی ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں، یہ حقیقت ہے۔''

پورن سنگھ کچھ دیر تک سُن سا کھڑا رہا۔ آخر بولا:

''تم نے اس سے صورت سنگھ کے بارے میں نہیں پوچھا؟ اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور کیوں؟''

''پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے خود ہی بتا دیا۔ صورت سنگھ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ اس سے پیچھا چھڑا رہی ہے۔ اس سلسلے میں مَیں پرسنّی کی مدد کر رہا ہوں۔''

''اوہ، اب سمجھا میں۔ اس روز تمھارے سامنے میں نے صورت سنگھ کو پرسنّی کی نظروں سے گرا دیا۔ یہ آوارہ آدمی اپنے کو بڑا جوان اور دھاکڑ سمجھتا تھا۔ مَیں نے پرسنّی کی آنکھوں کے سامنے ثابت کر دیا کہ کوئی بات نہیں تھی۔ دراصل میں نے پرسنّی کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ تھپڑ بہت ہی کرارا پڑا۔ اب وہ اسے چھوڑ کر پھر مجھ سے ناطہ گانٹھنا چاہتی ہے۔''

جسا بولا:

''دوست! اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے چھوڑ کر پرسنّی نے صورت سے ناطہ کیوں جوڑا؟''

''نہیں، اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، لیکن ممکن ہے پرسنّی کے پاس اس کا کوئی جواب ہو۔''

پورن سنگھ نے مایوسی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

''نہیں اس کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ پہلے پہل جب میں نے سنا کہ پرسنّی نے صورت سے ناطہ جوڑ لیا ہے۔ تو مجھے وشواس نہیں ہوا مگر جب مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وشواس کرنا ہی پڑا۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ پرسنّی کی محبت نے تمہیں بالکل ہی اندھا بنا دیا ہے۔''

''بے شک اس کی آنکھوں نے اندھا بنا دیا ہو لیکن جب میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ مجھ اندھے کو پھر سب کچھ دکھائی دینے لگا۔''

''اگر پرسنّی کو تم سے محبت نہ ہوتی تو وہ صورت سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھ سے کچھ نہ کہتی۔ مگر تم کہو گے کہ تم نے صورت کو اس روز جب نیچا دکھا دیا تو پرسنّی کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے صورت کے لیے اپنا رویہ بدل لیا۔ میری رائے میں بہتر یہی ہوگا کہ میں پرسنّی سے مل کر پوچھوں کہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر صورت سے ناطہ کیوں جوڑا۔ اگر اس نے کوئی اطمینان بخش جواب دیا تو ٹھیک ہے ورنہ میں سمجھوں گا کہ وہ مجھ سے بھی ناٹک کر رہی تھی، بولو منظور ہے؟''

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اب باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔''

''کل کا دن تو تم یہاں میرے پاس ہی رہو گے نا؟''

''نہیں، جو ضروری بات چیت تھی وہ ہو چکی۔ کل صبح یہاں سے چل دوں تو ٹھیک رہے گا۔''

''ارے ہاں، یاد آیا، تمہارا چاچا تو بیمار ہے۔''

''بیمار؟''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ معمولی طبیعت خراب ہے۔ میرے خیال میں، تھوڑا بخار بھی چل رہا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں ایک کام سے پرسوں چک پیراں گیا تھا۔ سوچا کہ چاچا سے بھی ملتا جاؤں۔ تب ہی اس بات کا پتا چلا۔''

''تب تو میرا جانا اور بھی ضروری ہے لیکن تم نے پہلے یہ بات نہیں بتائی۔''

''ارے بھئی، میں اپنے ہی چکر میں تھا۔''

''اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے وہ گھر لوٹ آئے۔''

دوسرے دن صبح سویرے جسا اُٹھ بیٹھا۔ پورن سنگھ بھی جاگ پڑا۔ دونوں جنگل پانی کے لیے کھیتوں کی طرف نکل گئے اور رَہٹ سے نہا دھو کر ہی نکلے۔ ناشتہ تیار تھا۔ جب جسا گھوڑے پر سوار ہوا تو دھوپ پھیل چکی تھی۔ پورن سنگھ گاؤں سے باہر تک اسے وِداع کرنے آیا۔

پورن سنگھ کو گاؤں سے چک پیراں تک پہنچنے میں کم ہی وقت لگا۔ اب جسا چک پیراں میں داخل ہوا تو گاؤں کی عورتیں تپتے ہوئے تنوروں میں روٹیاں بنا رہی تھیں۔

گھوڑے سے اُتر کر لگام ہاتھ میں تھامے جسا مکان کے دالان میں گھسا، تو اس نے وہیں اُگے دھریک

کے درخت کے نیچے چاچا کو چار پائی پر بیٹھے دیکھا۔
اس پر پہلے جگیر سنگھ کی نظر پڑی اور وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی آڑھی ترچھی ٹانگوں سے چلتا ہوا جسے کی طرف بڑھا۔
چاچا نے ابھی تک جسے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے کھانسنے میں جٹا تھا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور چہرے کا رنگ لال پڑ گیا۔ اس نے جگیر سنگھ کی باتوں کا شور سنا، تو سر اُٹھا کر جسے کی طرف دیکھا۔
جگیر سنگھ سے فرصت پا کر جسا چاچے کی طرف بڑھا۔ چاچا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ جس میں جسے کو دبی دبی محبت کا احساس ہوا۔ پل بھر کو ایسا لگا کہ وہ اس کا ظالم، اُکھڑ چاچا نہیں تھا، بلکہ باپ ہی تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے پاؤں چھو لے، مگر برسوں سے من بھی دبی نفرت کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔ چاچا نے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بے رَس آواز میں پوچھا:
''کہو، اچانک کیسے چلے آئے؟''
''تمہاری بیماری کا حال سنا، تو ملنے چلا آیا۔''
چاچا نے ذرا چونک کر بھتیجے کی طرف دیکھا:
''تم کو کس نے بتایا کہ میں بیمار ہوں؟''
''مجھے پورن سنگھ کی زبانی پتا چلا۔''
''ہاں، وہ اِدھر آیا تھا۔''
''بات یہ ہوئی کہ کل میں ایک کام سے اس کے گاؤں گیا تھا۔ رات اسی کے گھر میں ٹھہرا۔ جب اس نے تمہارے بارے میں بتایا تو میں ہری پورہ لوٹنے کی بجائے اِدھر چلا آیا۔''
جسا جان بوجھ کر بناوٹ کی بات نہیں کر رہا تھا لیکن انجانے ہی اس طرح کے شبد اس کے منہ سے نکل گئے۔ اسی ڈھنگ سے بات کرنا اسے مناسب لگا۔
چاچا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:
''آؤ، بیٹھو۔''
چار پائی پر بیٹھتے ہوئے جسے نے پوچھا:
''کہو چاچا! اب کیا حال ہے؟ پورن سنگھ کہہ رہا تھا کہ تمہیں بخار چڑھتا ہے۔''
''معمولی بخار تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ بخار نہیں ہے۔ صرف کھانسی اور گلا خراب ہے۔''
آج ان دونوں کے من میں ہلکی سی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ چاچا نے پھر کہا:
''صبح ہی حکیم جی آئے تھے۔ نبض دیکھ کر بتایا کہ اب بخار نہیں ہے۔ انہوں نے ہلکا کھانا کھانے کو کہہ دیا ہے......اور کہو، بہن بھجنو کا کیا حال ہے؟''

بگّے کو بہن کی بہت زیادہ چنتا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بھولو ہے کالٹھ تھی۔ اسے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہن کو جوں کا توں دیکھ رہا تھا۔ اصل میں اس وہ جسّے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہا تھا۔ اس نے آج تک اپنے بھتیجے کو کسی قابل نہیں سمجھا، کبھی اسے اہمیت نہیں دی۔ مگر اس نے کتنا بڑا کارنامہ کر ڈالا تھا۔ ایک بار تو اس نے اس کے خاندانی دشمن چنن سنگھ کے دانت کھٹے کردیئے تھے۔

اِدھر جسا یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا چاچا صرف بُرا ہی نہیں تھا، یا اتنا بُرا نہیں تھا جتنا وہ اسے دکھائی دیا کرتا تھا۔ ضرور اس میں انسانیت کی کمی تھی، جو پہلے کی حالت میں دبی رہی۔ مگر اب وہ کمزور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے روّیے میں پہلے والا گھمنڈ اور اکھڑپن نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جسّے کو اپنے چاچا پر کچھ کچھ ترس آنے لگا، یا محسوس ہونے لگا کہ چاچا اس کی ہمدردی کا مستحق تھا۔

دوسرے ہی پل بگّے کے کھردرے چہرے پر پہلے والا اکھڑپن اُبھر آیا۔ یہ اکھڑپن جسّے کے لیے نہیں، بلکہ فطری تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ جسا خود اسے چنن سنگھ سے ٹکر والی بات کہ سنائے گا اور بتائے گا کہ اس نے کیسے ٹھُنّے کو ٹھکانے لگایا۔ مگر جسّے نے اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔

کھانا کھا چکے تو جگیر سنگھ سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا:

''بیٹا جسّے، یہاں تو تمہاری دھوم مچی ہوئی ہے۔''

''دھوم کیسی؟'' آہستہ سے جسّے نے سوال کیا۔

جگیر نے بڑے فخر سے ٹھنّے والے واقعہ کا ذکر کیا، تو جسا بولا:

''مَیں نے بہت کوشش کی کہ ان کے ساتھ ٹکر نہ ہونے پائے۔ میں جتنا بچنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی انہیں یہ وشواس ہوتا جاتا کہ میں ان سے ڈرتا ہوں، آخر وہی کچھ ہو کر رہا، جس کا مجھے ڈر تھا۔''

چاچا بولا:

''مَیں نے سنا ہے کہ اب اِن کا دماغ ٹھکانے پر آگیا ہے، بلکہ سارے گاؤں میں دہشت پھیل گئی ہے۔ لوگ تم سے خوش ہیں، اس لیے دہشت کے باوجود وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔''

جگیر نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا:

''ہمارا جسا کسی کو بھی بیکار پریشان نہیں کرتا۔ ایسی حرکتیں تو وہ کمینے ہی کیا کرتے تھے۔ واہ میرے شیر! ہری پورہ کیا پورے علاقے میں دھوم مچا دی ہے، میرے بیٹے نے۔''

جسّے کے چہرے پر کوئی تاثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''مجھے شیر سنگھ چاچا نے بچالیا۔ ٹھنّے کی جان لینا تو ایسا کٹھن نہیں تھا لیکن قانون کے چنگل سے بچ نکلنا میرے لیے ناممکن تھا۔''

بگّا بولا:

''میں شیر سنگھ سے ملوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ ہم اس کے کتنے شکر گزار ہیں۔''

جسا بولا:

''اس کی مدد کے ساتھ ساتھ اگر گاؤں والوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو بھی گڑبڑ ہو جاتی۔ چنن سنگھ کے بیٹوں اور ان کے چمچوں نے گاؤں کی بہو بیٹیوں تک کے ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ لوگ ڈر کے مارے کچھ بولتے نہیں تھے۔ اسی لیے جب موقع آیا تو انہوں نے میرے خلاف گواہی نہیں دی۔ گاؤں بھر میں ایک بھی شخص کو ان سے ہمدردی نہیں تھی، اور نہ ہے۔ میرے خیال میں اب گاؤں والے سُکھ کی سانس لے رہے ہیں...... چنن سنگھ اور اس کے بیٹے گھر میں گھسے رہتے ہیں۔ جب نکلتے بھی ہیں تو کسی سے آنکھ نہیں ملاتے۔ بس چپ چاپ گلیوں میں سے گزر جاتے ہیں۔''

بگا بولا:

''چنن سنگھ سانپ ہے، اور اس کے بیٹے سانپ کے بچے۔ اس بات کو کبھی نہ بھولنا۔ ہمیشہ خبردار رہنا۔ انہیں جب موقع ملے گا وہ تمہیں ڈسنے کی کوشش کریں گے۔.......... اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھو۔ مرد کے لیے برہمچاریئے ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ تم نے صرف اپنے ہاتھوں سے تُھمّے جیسے طاقتور شخص کو مرغے کی طرح توڑ مروڑ کر کچل دیا۔ یہ برہمچاریئے کی وجہ سے ہی تھا۔ پُرانے شاستروں میں لکھا ہے......''

اس کے بعد چاچا نے کافی لمبا بھاشن دیا۔ برہمچاریئے کے بعد عورتوں کی چالاکی پر روشنی ڈالی۔ پرانی تاریخ میں سے عورتوں کی ایسی مثالیں دیں، جن سے پتا چلتا تھا کہ کیسے ان کی چالاکی سے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، یہاں تک کہ راج پاٹ تباہ اور برباد ہو گئے۔

جسا چپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔

بگّے نے اپنے پرانے انداز میں غُرّا کر پوچھا: ''کچھ سمجھے؟''

''ہاں چاچا۔'' جسّے نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

بگّے کی اس قسم کی باتوں سے ماحول کافی گھمبیر ہو گیا تھا۔ جگیر نے بے دانت کے منہ سے قہقہہ اُڑاتے ہوئے پوچھا:

''وہ حرامجادے سمجھتے تھے کہ پہلے چاچا ہری پورہ چھوڑ کر چک پیراں جا بیٹھا اور اب بھتیجے کو بھی وہاں پہنچا دیں گے، جہاں سے وہ آیا تھا۔''

بگّے کے من میں یہ بات ذرا کھٹکی۔ اس نے جگیر کی طرف دیکھا اور پھر زمین پر تھوکتے ہوئے بولا:

''ان سورِدے پتروں کو یہ نہیں معلوم کہ بگا ان کے ڈر سے نہیں، کسی اور وجہ سے چک پیراں چلا آیا تھا۔''

جگیر نے نتھنے پُھلا کر کہا:

''بگا سنگھ سردار! وہ ساری عمر تم سے دشمنی کرتے رہے مگر جسّے نے جو تمہارے بیٹے جیسا ہے ان کی

ناک دھول میں رگڑ کر رکھ دی ہے۔ اگر اب کبھی تم وہاں جاؤ، تو وہ تم سے منہ چھپاتے پھریں گے۔"

بگّے نے گردن اکڑا کر کہا:

"میں مورکھ تھا، جو رام پیاری کے چکر میں پھنس گیا۔ میرے یہ شریک میرا بال تک بھیکا نہیں کر سکتے تھے۔ مَیں ان کا نہیں رام پیاری کا مارا ہوا تھا۔ اب میں عورت کی اصلیت کو سمجھ گیا ہوں۔ بے خوف جب میرا جی چاہے گا ہری پورے جاؤں گا۔ وہ میرا اور میرے باپ دادا کا جنم استھان ہے اور رام پیاری واقعہ نہ ہو گیا ہوتا، تب وہ لوگ بگا سنگھ کے ہاتھ دیکھتے۔"

بے شک بگا، چنن سنگھ سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا اور رام پیاری کو کہاں تک بھلا چکا تھا اور دل پر کھایا ہوا یہ زخم کہاں تک بھر چکا تھا، اس کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا کٹھن ہے۔

منہ سے چاہے بگا یہ باتیں کہہ رہا تھا، جن میں سچائی بھی تھی، مگر ممکن ہے اس طرح بدنام ہو جانے پر اس نے محسوس کیا ہو کہ اب شریکوں کے سامنے اس کی مونچھ نیچی ہو گئی تھی کم سے کم جگیر سنگھ بگّے کے بارے میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ ویسے تو جگیر سنگھ اور بگا سنگھ دونوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ ہری پورہ میں حالات اب کافی بدل چکے تھے۔

جسا چک پیراں میں ایک ہی رات رہا۔ دوسرے دن واپس آنے سے پہلے اس نے بگّے سے کہا:

"چاچا! میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا مگر ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تھوڑے ہی دنوں میں کمزوری دُور ہو جائے گی۔ تب ہی میں ہری پورے آنے کی بات سوچوں گا۔"

صرف سوچنا نہیں، ضرور چلے آنا۔ مَیں وہاں اکیلا ڈرتا ہوں، مانا کہ میرے دشمن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، مگر بزرگوں کا سایہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس وقت تو کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تمہاری میری آپس میں بالکل نہیں بنتی اور ہم ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتے۔ تم کچھ دنوں کے لیے بھی آ جاؤ گے تو گاؤں والوں کے مَن سے یہ خیال نکل جائے گا اور ہمارے دشمن بھی خبردار ہو جائیں گے۔"

جسّے نے چاچا کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جان بوجھ کر یہ باتیں کہی تھیں۔ دراصل بگّے کے مَن پر ان الفاظ کا اچھا اثر پڑا۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ اب وہ اپنے شریکوں کے سامنے مونچھوں کو تاؤ دے سکتا تھا اور گاؤں والوں کے سامنے سینہ تان کر چل سکتا تھا۔

بگا جسّے کو گاؤں سے باہر تک وِداع کرنے آیا۔ جب جسا لگام سنبھال کر رَکاب پر پاؤں رکھنے لگا، تو بگّے نے بھالو کے پنجے نما اپنا بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا:

"جسّے! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تمہارا چاچا زندہ ہے۔ تم تو چھٹپن سے ہی میرے

پاس رہے۔ تم کیسے سمجھ سکتے تھے کہ علاقے بھر میں تمہارے چاچا کی کیسی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ صحت یاب ہو جانے پر جب میں وہاں آؤں گا، تو دیکھنا کہ سارے گاؤں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہمارے شریکوں کے گھر میں دُکھ اور مایوسی کی وجہ سے دیا تک نہیں جلے گا۔ جاؤ! اکیلا محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا ہاتھ تمہارے سر پر رہے گا۔"

چاچا کی باتیں سُن کر جسا مَن ہی مَن مُسکرایا، اور پھر ایک ہی چھلانگ میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

"اچھا چاچا، واہگورو کا خالصہ واہگورو کی فتح۔"

جب تک جسا نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، تب تک بگا جہاں کا دہاں کھڑا رہا۔ آخر جب وہ لوٹا تو اس کی آنکھیں دھرتی پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنے وِچاروں میں کھویا ہوا وہ دِھیرے دِھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔

"واہ! اپنا جسا بھی بس لاکھوں میں ایک جوان ہے۔"

بگے نے چونک کر سر اُٹھایا۔ سامنے جگیر سنگھ اپنی چوڑی اور ٹیڑھی ٹانگوں پر کھڑا جسے کی تعریف کر رہا تھا۔ اس کے میلے کچھے (جانگیئے) کا آزار بند اس کے گھٹنوں کے نیچے تک لٹک رہا تھا۔

دسواں غلاف

کرے اُنکڑاں کھایئے کے دُدّھ چاول، ایہہ رج کے کھان دِیاں مستیاں نیں
گھروں نکلیں تے مریں پیا بھکھا، سبے بُھل جان خرمستیاں دے

(وارث شاہ)

''دودھ چاول کھا کر ہیکڑی دکھاتا ہے، یہ پیٹ بھر کھانا ملنے کی مستیاں ہیں۔ گھر سے نکل جائے تو بھوکا مرے اور سب خرمستیاں بھول جائیں۔''

ا

چک پیراں سے لوٹ کر جسا اَحاطے میں پہنچا تو اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ گھوڑے کی ٹاپوں اور ہنہناہٹ کی آواز سن کر جھجو بڑی تیزی سے گھر میں سے نکلی اور جسّے کی طرف لپکتے ہوئے بولی: ''آ گئے تم بیٹا!''

جسّے نے جھک کر اپنا ایک ہاتھ یوں بڑھایا، جیسے جھجو کے پاؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہو اور بولا: ''ہاں بُوا، آ گیا میں۔''

بُوا نے آشیرواد دیتے ہوئے کہا:

''بہت اچھا کیا بیٹا، مَیں تو پریشان تھی۔''

جسّے نے لگام ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے جھجو کی طرف غور سے دیکھا، اور پوچھا:

''کیوں پریشانی کی کیا بات ہوگئی؟''

''بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی، مگر جب تک تم گھر یا گاؤں سے باہر رہتے ہو، مجھ کو چنتا لگی رہتی ہے۔''

''وہ کیوں بُوا؟''

''تیرے اتنے تو دُشمن ہیں۔ ہر وقت واہگورو اکال پُرکھ سے تیرے بچاؤ کے لیے پراتھنا کرتی رہتی ہوں۔''

''بُوا، میرے تو سب دوست ہی دوست ہیں۔ مجھے بھلا کون نقصان پہنچائے گا؟ رہی بات ایک آدھ دُشمن کی، مگر دُشمن تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ سنسار میں کون ایسا شخص ہے، جس کا ایک بھی دُشمن نہ ہو، یہ سب تو چلتا ہی ہے۔''

''بھوک لگی ہوگی، چلو، پہلے بھیتر۔''

''ہاں، بھوک تو زور کی لگی ہے۔''

چلتے چلتے جھجو ہنس کر بولی:

''میں تو تیری صورت سے ہی پہچان گئی تھی کہ تو اس وقت کتنا بھوکا ہوگا۔''

گھر کے بھیتر جب جسا کھا پی رہا تھا تو جھجو نے پوچھا:

''چاچا سے ملاقات ہوئی؟''

''ہاں ہوئی۔''

''کیا کیا کہا اس نے؟''

''بُوا، اس کے پاس کہنے کو صرف ایک ہی بات ہے۔ وہ یہ کہ عورتوں سے دُور رہو، شادی کا نام تک نہ لو۔''

''پگلا کہیں کا، تمہارے چاچا پر بھی نہ جانے کیسا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اس کی اپنی شادی تو ہو نہیں سکی اور اب تیری شادی بھی روکنا چاہتا ہے۔ اس کے من میں اتنا ہی بیراگ جاگ اُٹھا ہے تو وہ سادھو بابا کیوں نہیں بن جاتا؟''

اتنا کہہ کر جھجو ہنسنے لگی۔

جسے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک پیدا نہ ہوئی۔ گمبھیر آواز میں بولا:

''وہ تو مجھ ہی کو سادھو بابا بنانے پر تلا ہوا ہے۔''

''پرانی کہاوت ہے کہ زیادہ چالاک کوّا آخر میں گوں پر ہی گرتا ہے۔ وہی حال تیرے چاچا کا ہے۔ پہلے تو گھر بسایا نہیں، پھر اس کا دل آیا بھی تو نہ جانے کس بازاری عورت پر...... بازاری عورت کا تو کام ہی دھوکا دینا ہے۔ بگے کو میں سمجھاتی رہی کہ کسی بھلی عورت سے شادی کر کے گھر بسالے۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ کیا کہا جائے؟ جو تقدیر میں بندھا ہوتا ہے، وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ تُو نے اپنی مٹی پلیت تو کر لی، اب بھتیجے کا جیون برباد کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے۔''

''تم تو جانتی ہو، بُوا! میں اس سے اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتا۔''

''تم نہیں تو میں کروں گی، اسے یہاں آنے دو۔''

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ جسا ناشتہ کرتا رہا اور جھجو ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر وہ بولی:

''دیپی سے ملاقات ہوئی کہیں پر؟''

جسا جانتا تھا کہ بُوا کو دیپی اور اس کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل ہے۔ مگر اسے اس بات کی آشا نہیں تھی کہ وہ اِتنا کھل کر اس سے یہ بات پوچھ بیٹھے گی۔ اس لیے وہ ذرا سنبھل کر بولا:

''دیپی یہاں ہے کہاں۔ تمہیں مالوم نہیں کہ اس کے ماں باپ نے اسے کسی اور گاؤں میں بھیج دیا ہے۔''

جھجو یہ بات جانتی تھی مگر دیپی کے ماتا پتا نے جان بوجھ کر اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے بیٹی کو کس گاؤں میں بھیجا ہے۔ مگر جھجو کو وشواس تھا کہ جسا ضرور ہی اس بھید کو جانتا ہو گا۔ اس نے بلا تردد پوچھا:

"کون سے گاؤں میں ہے وہ؟"

جسا بھی کم چالاک نہیں تھا کچھ بگڑ کر بولا:

"تم بھی کمال کرتی ہو بُوا، انہوں نے مجھ سے پوچھ کر یا بتا کر تو دبی کو نہیں بھیجا۔"

بھجنو ہلکے ہلکے مسکراتی رہی۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ہیر دوسرے گاؤں چلی جائے اور رانجھے کو پتا بھی نہ چلے۔

یہ سوچنے کے باوجود بھجنو نے اس بارے میں اور زیادہ کچھ نہیں کہا۔

بھجنو کو خاموش پا کر جسّے کو کچھ تعجب ہوا۔ اسے آشا تھی کہ بھجنو اس موضوع کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ دبی کے بارے میں بات چیت چلتی رہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسے نتیجے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسے دبی کا ذکر پسند تھا۔ جس طرح اسے دبی اچھی لگتی تھی، اسی طرح اسے دبی کے بارے میں بات چیت کرنا اچھا لگتا تھا۔ مگر وہ یہ بات بھجنو سے کھل کر کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ بھجنو کا اس طرح خاموش رہنا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نرمی سے کام لے کر بولا:

"میرے راستے میں روڑے اَٹکانے والا چاچا تو ہے، مگر مدد کرنے والا کوئی نہیں۔"

بھجنو بولی:

"رشتے ناطے کی باتیں تو عورتیں ہی چلایا کرتی ہیں۔ یہ مردوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

جسا بھجنو سے کہنا چاہتا تھا کہ کیا وہ عورت نہیں ہے۔ وہ تو یہ نہیں کہہ پایا، مگر شاید بھجنو کو خود ہی اس بات کا احساس ہو گیا، مسکرا کر بولی:

"ارے، من کیوں مَیلا کرتا ہے، جو ہو سو ہو، اب تو مَیں ہی دبی کی ماں سے یہ بات چلاؤں گی۔"

"اور چاچا؟"

"چاچے کو بھی سمجھا بجھا لوں گی۔"

جسا جانتا تھا کہ چاچے میں اتنی عقل نہیں تھی کہ اسے سمجھایا بجھایا جا سکے۔

ناشتہ پانی ختم ہو چکا تو جسّے نے دو تین ڈکار لے کر انگوچھے سے مونچھیں پونچھ ڈالیں۔ وہ گھر سے احاطے میں پہنچا۔ لڑکا دیوار کے قریب گھوڑے کے بدن کی مالش کر رہا تھا۔ رحیم کہیں آس پاس نظر نہیں آیا۔ جسّے کو اس سے کوئی کام بھی نہیں تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اس نے اپنے تہمد کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر تھامے رکھا تا کہ میدان کی دھول سے خراب نہ ہونے پائے۔

وہ کہاں کو جا رہا تھا، اس بات کا احساس یکا یک ہی ہوا۔ عجیب سا لگا کہ وہ گھر سے نکل کر وہ جائے کہاں۔ یہ بات تو گھر میں ہی سوچنے کی تھی۔ بے مہار اونٹ کی طرح کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ کیوں نہ چل کر سوڈے کی میٹھی بوتلیں پی جائیں۔ اس کے بعد کچھ اور سوچا جائے گا۔

اِٹھلاتے ہوئے بے پروائی سے نپے تُلے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ سوڈے والی دکان کی طرف بڑھنے لگا۔

گاؤں سے تھوڑا ہی پرے پیڑوں کے نیچے سوڈے کی دُکان تھی۔ دو کچے کمروں والا مکان تھا۔ دُور سے یوں لگتا تھا جیسے یہاں ناجائز شراب کا دھندہ ہوتا ہے۔ لگتا بھی تھا اور جسّے نے لوگوں کی زبانی دبی دبی باتیں بھی سُنی تھیں۔ اس کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شراب کا شوقین بھی نہیں تھا۔

دُور سے ہی دُکان کے باہر کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے لوگوں کی ٹولی دکھائی دینے لگی۔ جسا وہاں پہنچا تو سب لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا سواگت کیا۔ جو لوگ چبوترے پر بیٹھے تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ جسّے کو اچھا نہیں لگا کہ اس کی خاطر اپنی جگہ چھوڑ دیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس سے سہمے رہیں، یا اسے بڑا بھاری غُنڈہ اور دھاکڑ بدمعاش سمجھیں۔ اس نے کھڑے ہونے والے لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پھر سے وعدہ کیا اور بولا:

''میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تھا، اسی لیے اِدھر چلا آیا۔ بیٹھنے کو من نہیں ہو رہا۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔''

اِتنے میں ہی دُکاندار نے ایک بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ پہلے تو وہ اس کو لینے لگا، پھر ہاتھ روک کر بولا:

''نہیں بھئی، سب کو باری باری دو، جو مجھ سے پہلے آئے ہیں، ان کو پہلے دو۔''

وہاں کھڑے لوگوں نے اصرار کیا کہ پہلے وہی بوتل پئے، مگر جسا نہیں مانا۔ بولا:

''مجھ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے، جیسے آپ ویسے میں۔ مَیں آپ کے پیار کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں لیکن میری خوشی اسی میں ہے کہ سب بھائی اپنی اپنی باری سے پئیں۔''

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہاں کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں جسّے کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ جسا اپنے گاؤں کا ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کا جیسے لیڈر بن چکا تھا۔ اس کے برعکس چنن سنگھ کے بیٹے اور چمچے کتنے کمینے تھے۔ وہ باتیں بیت چکیں۔ اب ان میں سے کوئی بوتلیں پینے کے لیے دُکان پر نہیں آتا تھا۔ ضرورت پڑتی تو گھر میں ہی منگوا لیتے۔

اس کی باری پر جب دکاندار نے بوتل بڑھائی تو جسّے نے اپنے لمبے چوڑے ہاتھ میں بوتل تھام کر عادت کے مطابق انگوٹھا گولی پر جما دیا۔ وہاں کھڑے لوگ جب بھی یہ منظر دیکھتے، تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ بھولی بسری باتیں یاد آنے لگتیں۔ خاص کر اس دن کا واقعہ جب تھمّنے نے اسی ڈھنگ سے بوتل کی گولی دبانے کی کوشش کی تھی...... اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے واقعات پر ہلکی پھلکی بات چیت، چھوٹا موٹا ہنسی مذاق، کیسا اچھا ماحول ہو گیا تھا۔ گاؤں کا۔ نہ دنگا، نہ فساد، نہ لڑائی نہ گالی گلوچ، نہ کمینوں کی دھاکڑ بازی، اور نہ آنے جانے والی بہو بیٹیوں سے مذاق۔ یہ سب جسّے کا رُعب تھا۔

جسّے نے تیسری بوتل ختم کی ہی تھی کہ سامنے سے شیر سنگھ آتا دکھائی دیا۔ گاؤں کا جانا اور مانا ہوا شخص، جو چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے کم دھاکڑ نہیں تھا، لیکن چالاکی میں اِن کے بھی کان کاٹ لینے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ اپنے دماغ کا غلط استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر موقع آنے پر جسّے کا ساتھ دیا۔ سارا گاؤں جسّے کا احسان

مانتا تھا اور جسا شیر سنگھ کا احسان مند تھا۔
کچھ قدم کی دُوری سے ہی شیر سنگھ جسّے کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے بولا:
"کہو جسّے کہاں رہے؟ بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیئے۔"
جسّے نے ایک بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:
"مَیں گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔"
شیر سنگھ نے منہ سے بوتل لگا کر ایک ہی سانس میں آدھی خالی کر دی اور پھر پوچھا:
"باہر تو گئے تھے، لیکن کہاں؟"
یہ کہتے ہوئے شیر سنگھ ہنس رہا تھا، جیسے وہ جان بوجھ کر جسّے کو کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہو۔ یہ دیکھ کر شیر سنگھ کو اور مزہ آیا کہ اس کے سوال میں جسا صرف ہنس کر رہ گیا اور اس کی طرف دوسری بوتل بڑھا دی۔ شیر سنگھ نے بائیں ہاتھ سے دوسری بوتل پکڑی اور پہلی کو گلے میں اُنڈیل لیا۔
وہ جانتا تھا کہ جسا اس سے کچھ نہیں چھپائے گا، مگر وہ اپنی نجی باتیں سب کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا۔"
دُکاندار کو پیسے دے کر جسّے نے شیر سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دھیرے دھیرے وہاں سے چل دیئے۔ جب وہ دُکان سے کچھ دُوری پر نکل گئے تو جسّے نے آہستہ سے کہا:
"مَیں دوسرے گاؤں چلا گیا تھا۔"
"کون سا گاؤں؟"
جسا کچھ کہنے کو ہی تھا کہ شیر سنگھ ٹوک کر بولا:
"اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تم چک پیراں چاچے سے ملنے گئے تھے، کل مجھو گوردوارے جا رہی تھی، تو اس نے بتایا تھا۔ میں اس سے پہلے کی بات پوچھ رہا ہوں۔"
"میں رتّو کے گیا تھا۔"
"یعنی جہاں دیپی رہتی ہے؟"
ایک بار تو جسا بھی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:
"گھبرانے کی کوئی بات نہیں جسّے! جس راستے پر تم آج چل رہے ہو، ہم اسی راستے سے بہت پہلے گزر چکے ہیں۔"
اتنا تو جسّے کو بھی وشواس تھا کہ شیر سنگھ اس کے اس معاملے میں اڑچن نہیں ڈالے گا، بلکہ کچھ مدد ہی کرے گا۔ مگر فی الحال اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس بارے میں شیر سنگھ کا وِچار کیا تھا۔
چلتے چلتے یکا یک رُک کر شیر سنگھ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جسا بھی رُک گیا اور شیر سنگھ کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے من کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

شیر سنگھ بولا:
"تم دیپی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ لڑکپن میں بھی تم دونوں ایک ساتھ رہے، اور اب بھی ایک دوسرے کے بنا بے چین رہتے ہو۔"
دراصل جسا پریشان تھا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہوسکتا ہے، کچھ مایوسی سے کہنے لگا: "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"
"کیسے ہوسکتا ہے؟ تمہاری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔"
"یہ کام میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں اور نہ میرے کہنے سے ہو جائے گا۔"
"یہی تو تمہاری بھول ہے۔ آج علاقے بھر میں تمہارا رنگ جما ہوا ہے۔ اگر تم دیپی کے گھر جا کر اس کے باپ سے کہو کہ تم اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو وہ کیا انکار کر سکے گا؟ اتنا حوصلہ کہاں سے لائے گا وہ؟"
جسے کی آنکھوں میں کچھ درد کی جھلک دکھائی دی، پوچھا:
"کیا یہ اچھا لگے گا؟"
شیر سنگھ پل دو پل جوں کا توں کھڑا رہا۔ پھر کہے بنا آگے بڑھنے لگا۔ جسا بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔
شیر سنگھ ڈاڑھی کے بھیتر اُنگلی گھسیڑ کر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا:
"تم ٹھیک کہتے ہو، ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"
"خاص کر جب کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دیپی کا باپ اس رشتے کے خلاف ہے۔"
شیر سنگھ گھمبیر آواز میں بولا:
"یہ سب تمہارے چاچا کا کیا دھرا ہے۔ بڑی ہی اُلٹی کھوپڑی کا آدمی ہے۔ دل بھی لگایا تو کس سے؟ ایک ایسی عورت سے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ جس کے بارے میں کسی کو بھی مالوم نہیں تھا کہ وہ بیاہتا ہے، یا کنواری ہے۔ کنواری تو خیر وہ دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ کون جانے کہ لوگوں میں پھیلی ہوئی افواہ کے مطابق وہ بنارس کی کوئی طوائف ہی رہی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے چاچا کی مورکھتا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چنن سنگھ نے چال چلی تھی۔ بڑا مکار آدمی ہے۔ لیکن اگر بگا تھوڑا بھی سمجھدار ہوتا اور چنن سے خبردار رہتا تو اس کے جال میں ہرگز نہ پھنستا...... خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو آگے کی بات سوچنا چاہیے۔"
"آگے کی بات بھی سوچنا بیکار ہے۔ چاچا عورت، ذات کا ہی دُشمن بن بیٹھا ہے۔"
"اسی سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنا اُجڈ ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تُو نے کون سی سَتی ساوتری سے دل لگایا تھا، جواب اس کی بے وفائی سے مایوس ہو کر دُنیا بھر کی عورتوں کو گالیاں دیتا ہے۔"
"یہی نہیں، اب چاچا چاہتا ہے کہ میں بھی برہمچاری بن جاؤں اور کبھی کسی عورت کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دُوں۔"

شیر سنگھ چلتے چلتے پھر رُک گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے بولا:

''کیا یہ بات سچ ہے؟''

''بالکل سچ ہے۔''

''تمہارے چاچا کی عقل کے بارے میں پہلے بھی میری رائے اچھی نہیں تھی مگر اب تو کمال ہی ہو گیا ہے۔ وہی کہاوت ہوئی کہ بلی حج کو چلی، نو سو چوہے کھا کر۔ بگّے نے تو خود سب کچھ کر لیا، خرابی کا ہر کام کیا، لیکن تمہیں وہ من پسند لڑکی سے شادی نہیں کرنے دیتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں کوئی ارادہ نہیں کر پایا۔ نہ دیپی کا باپ اور نہ چاچا یہ شادی ہونے دیں گے۔ میرے خیال میں مجھے چاچا کا ہی کہنا ماننا پڑے گا۔''

''حیرت ہے۔ مَیں تو سمجھتا تھا کہ کم سے کم اس معاملے میں تم چاچے سے دبو گے نہیں۔ اپنی شکل اور حرکتوں سے تم ایسے تو نہیں لگتے۔''

جسّے نے شیر سنگھ کی طرف ایسے دیکھا، جیسے وہ نا اُمیدی کی وجہ سے بالکل ٹھس ہو کر رہ گیا ہو۔ پھر دھیرے سے بولا:

''میرے من میں بار بار یہی وچار آتا ہے کہ اگر چاچا نہ ہوتا تو نہ جانے میری کیا گت بنتی۔ مجھے چاچا کا سہارا اس وقت ملا، جبکہ سنسار میں میرا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔''

کھڑے کھڑے شیر سنگھ کچھ دیر تک جسّے کو ایک ٹک دیکھتا رہا، اور پھر اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بولا:

''میں سمجھ گیا تم چاچا سے بغاوت نہیں کرنا چاہتے۔ پھر نراش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔''

اتنی بات چیت کے بعد شیر سنگھ نے وِداع ہوتے ہوئے پھر کہا:

''مجھ سے ملتے رہا کرو۔ مَیں پھر کہوں گا کہ نراش مت ہونا۔ اگر دیپی کا اور تمہارا پیار سچا ہے تو واہگورو ضرور ہی تم دونوں کو ملا دے گا۔''

شیر سنگھ چلا گیا اور جسّا کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

۲

جب لکھا سنگھ گلی میں سے لپکتا ہوا اپنے اَحاطے میں گھسا، تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ باپ اور بھائی کو دالان میں پڑی چار پائیوں پر بیٹھے دیکھا، تو وہ جھپٹ کر ان کے پاس پہنچا۔

چنن سنگھ نے بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا:

''بات کیا ہے؟ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟''

لکھا سنگھ نے ہانپتے ہوئے خبر سنائی:

''بگا آ گیا ہے۔''

یہ سُن کر دلیر اور چنن سنگھ دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چنن سنگھ کو اپنے کانوں پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ چلّا کر بولا:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے......''

دلیر سنگھ نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

''ہو کیوں نہیں سکتا۔ یہاں پر اس کی زمین ہے، مکان ہے اور یہیں کا وہ رہنے والا ہے۔ اسے یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے؟''

باپ بولا:

''آنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا، لیکن حالات ہی ایسے تھے کہ اس کے آنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔''

دلیر پھر بولا:

''اب حالات ویسے نہیں ہیں۔''

چنن سنگھ کو احساس ہوا کہ دراصل اس کا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی اس نے لکّھا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا:

''تمہاری آنکھوں نے دھوکہ تو نہیں کھایا؟''

''نہیں۔''

''تم نے اسے کہاں دیکھا؟''

''گاؤں کے باہر، برگد والے رَہٹ کے قریب۔''

یہ رَہٹ گاؤں سے کافی دُوری پر تھا۔

لکّھا پھر بولا:

''میں اس رَہٹ پر ہی تھا، جب مَیں نے دُور سے بگّے کو گھوڑے پر سوار آتے دیکھا۔''

''ممکن ہے کہ اتنی دُور سے تم اسے نہ پہچان پائے ہو۔ شاید وہ بگّے سے ملتی جلتی شکل والا کوئی اور آدمی ہو۔''

لکّھا کا پارہ چڑھنے لگا کچھ گرم ہو کر بولا:

''میری آنکھیں چیل کی طرح تیز ہیں۔ یہی نہیں، رہٹ کے کچھ قریب پہنچ کر بگّا کسی آدمی سے

بات کرنے کے لیے رُک گیا۔ شُبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مَیں فوراً کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اور بگّے کی نظر سے بچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ مالوم ہو جائے کہ مَیں نے اسے دیکھ لیا ہے۔"

دلیر سنگھ یک دم چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا:

"یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ مَیں ابھی دیکھ کر آتا ہوں کہ واقعی بگّا لوٹ آیا ہے یا نہیں۔"

دلیر کے پیچھے لکھا بھی لپکنے لگا تو باپ نے اسے روکتے ہوئے کہا:

"تم کیا کرو گے جا کر؟ دونوں کا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ دلیر لوٹ آئے تو پھر آگے کی بات سوچی جائے۔"

دلیر سنگھ پتلی گلی میں سے گزر کر داہنے ہاتھ کو مڑ گیا۔ ابھی وہ گاؤں کے بیچ والے کنوئیں کے چبوترے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ چبوترے پر کھڑی کچھ عورتیں چرکھڑی پر لٹکے ہوئے ڈول کے ذریعے اپنے گھڑوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے جھنڈ میں وہ کنواں گھرا ہوا تھا۔ دلیر وہیں پر رُک گیا اور ایک پیڑ سے کندھا ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ عورتوں میں سے کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

اتنے میں گھوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اَب شک کی کوئی بات نہ رہی۔ گھوڑ سوار بگّا ہی تھا۔ دلیر جانتا تھا کہ اپنے گھر پہنچنے کے لیے اس کی طرف نہیں مُڑے گا، بلکہ سیدھا چلا جائے گا۔ وہ جہاں کا وہاں ساکت سا کھڑا رہا تاکہ بگّے کی اس پر نظر نہ پڑے۔

گھوڑے پر بیٹھے بگّے کو گلی کے اور آگے دُکان کے چبوترے پر بیٹھا جانے پہچانے لوگوں کا گُٹ دکھائی دیا۔ اس کا دھیان اُدھر کو ہی لگ گیا اور وہ سیدھا اُدھر کو ہی نکل گیا۔

بگّے کو دیکھتے ہی وہ سب چبوترے سے نیچے اُتر آئے۔ ایسی حالت میں بگّے کو بھی گھوڑے سے اُترنا پڑا۔ سب نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔ گرما گرم باتیں ہوتی رہیں۔ ایک شخص نے شکایت کی......

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سب سے روٹھ کر تم نے چک پیراں میں کیوں ڈیرہ جما لیا ہے۔ برسوں سے تم اپنے گاؤں میں نہیں آئے۔"

بگّے نے قہقہہ لگا کر جیسے اس شخص کی بات کو ہوا میں اُڑا دیا اور پھر اس کے کندھے کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا:

"اچھی طرح جانتے ہو کہ پانچ برس تک مَیں اپنی سرکار کا مہمان رہا۔ ہاں یہ یہ ٹھیک ہے کہ جیل سے چھوٹ کر مَیں سیدھا چک پیراں چلا گیا۔ مجھے وہاں کی کھیتی باڑی کی زیادہ چِنتا تھی۔ جسا آخر بچہ ہے۔ دُنیا کا تجربہ تو دھیرے دھیرے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے مَیں نے اِسے یہاں بھیج دیا۔ یہاں چلے چلائے کام کو دیکھنا اس کے لیے آسان ہے۔"

یوں تو پہلے بگا سنگھ کے لیے گاؤں والوں کے من میں کوئی خاص عزت نہیں تھی۔ اس کے خاندانی جھگڑوں کا گاؤں والوں کے جیون پر اُلٹا سیدھا اثر پڑھتا تھا، مگر اب جسا سنگھ کے چاچا ہونے کے ناطے سے وہ ان کی نظر میں اونچا مقام حاصل کر چکا تھا۔ شاید پانچ برس جیل کاٹنے کی وجہ سے اس کی بات چیت اور رویے میں پہلا والا اُجڈ پن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلاشبہ اگر وہ پہلے والی ہُلڑ بازی کو نہ اپنائے تو گاؤں والوں کی نگاہ میں اس کی عزت بنی رہ سکتی تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تفصیل سے بات کرنے کا وہ موقع بھی نہیں تھا۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے بگا آگے بڑھ گیا۔ اب کے وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوا کیونکہ اس کا مکان قریب ہی تھا۔

اُحاطے میں کھڑے جسّے نے اپنے چاچا کو آتے دیکھا تو اسے جسم میں کچھ سنسنی کا احساس ہوا۔ بولا:

''چاچا، اچانک کیسے آ گئے؟ اچھا کیا جو چلے آئے۔ آنے سے پہلے مجھے اطلاع کر دیتے تو کیا ہرج تھا۔''

آگے کو لپکتے ہوئے لڑکے کی طرف گھوڑے کی لگام پھینک کر بگا بولا:

''من کی موج ہے۔ جب موج اُٹھی تو میں اِدھر کو چل دیا۔ اس میں کوئی ہرج تو نہیں؟''

''ہرج کیا ہوتا، اپنے ہی گھر تو آنا تھا۔ جب جی چاہا، چلے آئے۔''

بگّے نے اتنے لمبے عرصے کے بعد اپنے آپ کو اس اُحاطے میں پایا، جہاں وہ جیون کے ان گنت پل گزار چکا تھا۔ وہ پل سکھ کے بھی تھے، دُکھ کے بھی۔ زیادہ کچھ نہیں بدلا تھا، پھر بھی کچھ نیا نیا لگتا تھا۔

چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بگّے نے پوچھا:

''جھنجو بھیتر ہی ہے کیا؟''

''ہاں چاچا! جاؤ مل لو نا۔''

''تم نہیں آؤ گے کیا؟''

''میں بھی آؤں گا لیکن ذرا رُک کر۔ اس وقت اپنی چکی چل رہی ہے۔ کچھ دیر میں اس کا کام ختم ہو جائے گا، تو میں چلا آؤں گا۔ تم نہا دھو کر ناشتہ پانی کر لو۔''

بگّے نے کھڑے کھڑے صرف سر ہلا دیا اور پھر گھر میں دالان کی طرف بڑھ گیا۔ ایک رسوئی دالان میں بنی تھی اور دوسری باہر والے پسار میں۔ رسوئیاں کیا تھیں، دو دو چولہے تھے۔ بارش یا بہت تیز دھوپ نہ ہوتی تو صحن والے رسوئی گھر میں کھانا پکتا تھا۔ اس وقت بھی جھنجو چولہے میں جلتی لکڑیوں پر سوکھے اُپلوں کے کچھ ٹکڑے رکھ کر زور زور سے پھونک مار رہی تھی۔

بگا کچھ دیر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا پھر اونچی آواز میں بولا:

''مڑ کر نہیں دیکھو گی جھنجو...... دیکھو تو کون آیا ہے۔''

جھنجو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے روکھے سوکھے سفید بالوں میں اُپلوں کی ہلکی ہلکی راکھ بھی دکھائی

دے رہی تھی۔ بھائی کو پہچانتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بولی:

"میں کیا جانوں کہ میرا بھیا آیا کھڑا ہے۔"

اتنا کہتے ہی وہ اُٹھی اور دوپٹا سنبھالتے ہوئے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھی۔ بگے نے دونوں بازو پھیلا دیئے.........اور دوسرے ہی پل وہ دونوں گلے مل گئے۔

عجیب وقت تھا۔ دونوں کے دل بھر آئے، وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ آخر جھجو نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے بگّے کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"اتنے برسوں کے بعد گھر کی دالان میں گھر کے مالک کو دیکھ کر جانتے ہو مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

بگّے نے زور سے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیے۔ سر پر سے پگڑی اُتاری اور داہنے ہاتھ سے گردن پر گرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے باہر والے پسار میں رکھی چار پائی کی طرف بڑھ گیا۔

اگرچہ اسی گھر میں وہ جیون گزار چکا تھا۔ پھر بھی خواہ مخواہ اس کی آنکھیں چپے چپے کو دیکھ رہی تھیں۔ اپنا ہی گھر پردیس سا معلوم ہوتا تھا۔ جھجو سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کچھ کھانے پینے سے پہلے نہانا چاہتا تھا۔ مگر جھجو نے اعتراض کیا، کہ پہلے کچھ کھا پی لے، بعد میں آرام کر کے نہا لے۔

اسی دوران جسا بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کا گرما گرمی والا رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی من میں وہ پہلے کے برعکس ایک دوسرے کے کچھ قریب محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ جائیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس موڑ پر وہ ایک دوسرے سے سدا کے لیے الگ ہو جائیں۔ مسئلہ جسّے کی شادی کا تھا۔

دن گزرنے لگے۔ جسّے نے سارا کام سنبھال رکھا تھا اور بگّے کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت ہی فالتو تھا، وقت کاٹنے کے لیے کبھی وہ کھیتوں میں نکل جاتا، کبھی سوڈے کی دکان پر پہنچ جاتا، کبھی کسی چبوترے پر پرانے واقفوں کے ساتھ اڈے بازی کرتا۔

ایک روز گلی میں چلتے وقت بگّے کا چنن سے سامنا ہو گیا۔ وہ دونوں ہی کچھ ٹھٹکے۔ چنن سنگھ باہم برتاؤ کے معاملے میں زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے فوراً ہی واہگورو جی کا خالصہ، واہگورو جی کی فتح، کا نعرہ لگایا۔

بگّے نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ چنن نے فوراً کہا:

"بھئی، مجھے تو کل شام ہی پتا چلا کہ تم لوٹ آئے ہو۔ آج مَیں تم سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ مجھے تم سے اس بات کی شکایت ضرور ہے کہ دو تین دن سے یہاں موجود ہو مگر میرے گھر نہیں آئے۔"

بگا اُجڈ ہونے کے باوجود کبھی کبھی چالاک بھی دکھائی دیتا تھا۔ بولا:

"ٹھیک کہتے ہو، چنن سنگھ! میں آ نہیں سکا، اس کا مجھے افسوس ہے۔ ہر وقت من میں یہی رہا کہ تم سے ملنے جاؤں۔ ادھر کچھ کام بھی دیکھنا تھا۔ تم جانتے ہی ہو جسا ابھی ناتجربہ کار ہے۔ بس اسی

طرح کی اُلجھنوں میں وقت گزر گیا۔''
بگّے کو اس بات کی آشا بالکل نہیں تھی کہ چنن سنگھ اس سے اتنی اچھی طرح ملے گا۔ آخر ٹُھمنے کے قتل کا واقعہ ایسا تو نہیں تھا، جسے چنن سنگھ اور اس کے بیٹے آسانی سے بھول سکیں۔ ہری پورے پہنچ کر بگّے نے قتل کی کہانی پوری تفصیل کے ساتھ سنی تھی۔ ایک نہیں کئی لوگوں نے اس پر روشنی ڈالی تھی۔
چنن سنگھ دوسرے کے من کی بات بوجھ لینے میں کافی ہوشیار تھا اور پھر جو بات اتنی واضح ہو، اس کی طرف بھلا اس کا دھیان کیسے نہ جاتا۔ ٹُھمنے کا قتل ہی تو دونوں دلوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ آخر چنن سنگھ نے بگّے کا بازو اپنے بازو میں لیا اور وہ دھیرے دھیرے گاؤں کے باہر کی طرف چل دیئے۔ چنن سنگھ نے کہنا شروع کیا:
''بگا سنگھ، جو کچھ بھی ہو ہم تم رشتے دار ہیں۔ جو برتن ایک دوسرے کے قریب رکھے ہوتے ہیں وہ کبھی کبھی آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ یہ پرانی کہاوت ہے۔ یہی ہم دونوں کا حال ہے۔ رہی بات ٹُھمنے کی...... تو اس کے قتل کی وجہ سے ہم اپنے تعلقات کیوں خراب کریں۔ ٹُھمنا تمہارا رشتے دار نہیں تھا۔ مانا کہ وہ میرا رشتے دار تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آنکھیں بند کر کے اس کی بُری بات کو بھی درست کہتے رہیں۔ مَیں ہی نہیں، سارا گاؤں جانتا ہے کہ اس روز ٹُھمنے نے ہی زیادتی کی تھی۔ اس نے خامخاہ شیر کے منہ میں سر گھسیڑ دیا۔ ایسی حالت میں وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ صرف اس بات کے لیے ہم کیوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں۔''
بگّے کو معلوم تھا کہ چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے جسّے کو ٹُھمنے کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ چنن سنگھ کو بھی معلوم تھا کہ بگا سنگھ یہ بات بھی جانتا ہے۔ وہ بولا:
''شاید تم سوچو کہ میرے بیٹوں نے ہی تھانے میں جا کر اس بات کی رپورٹ لکھوائی۔ مگر بھئی یہ ضروری تھا۔ تمہیں مالوم ہی ہوگا کہ اب میں گاؤں کا نمبردار ہوں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو جائے تو یہ میرا فرض ہے کہ میں تھانے تک اس کی رپٹ پہنچاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود ہی پھنس جاتا۔''
اتنا کہہ کر چنن سنگھ نے بگّے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ بگا سنگھ بھی سر ہلا کر ہوں ہاں کرتا رہا۔
اب چنن سنگھ نے بگّے کی کمر کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا:
''میں یہ بھی جانتا تھا کہ جسّے کا بال بیکا نہیں ہو سکے گا۔ اس بات کا بندوبست ہو چکا تھا کہ ٹُھمنے کی لاش غائب کر دی جائے اور گاؤں کا ایک بھی آدمی جسّے کے خلاف گواہی نہ دے۔ اسی وِشواس کی وجہ سے رَپٹ لکھا دی گئی۔ سرکاری خانہ پُری ہو گئی اور اپنے جسّے کا کچھ بگڑا بھی نہیں۔''
بگّے کو، اپنے جسّا، کہنا بہت عجیب لگا۔ جسّا کب سے ان کا اپنا ہو گیا تھا مگر وہ کھلم کھلا یہ اعتراض نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ چپ چاپ چنن سنگھ کی باتیں سنتا رہے۔ چنن سنگھ بولتا گیا:
''رشتے داروں کی آپس میں کھینچا تانی چلتی رہتی ہے۔ ہماری بھی چلی۔ اس کے نتائج بھی نکلے۔ ضروری نہیں کہ انسان جیون بھر کسی بات کو ایک ہی طرح سے سوچتا رہے۔ اب ہماری عمر بھی بڑھ گئی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا

کہ آپسی کھینچا تانی کا نتیجہ سدا بُرا ہی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیوں نہ ہم پچھلی باتوں کو بھول کر نئے سرے سے اپنے تعلقات کو مضبوط کر لیں۔"

اِتنا کہہ کر چنن سنگھ پیچھے کو ہٹا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بگّے نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس طرح کم سے کم دکھانے کے لیے دونوں ایک ہو گئے۔ بگّے نے سوچا کہ شاید ٹُھنّے کے قتل سے ان کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہے، یا کم سے کم چنن سنگھ نے اتنا ضرور سمجھ لیا ہے کہ اب کھلم کھلا دشمنی کرنا اس کے مفاد میں نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ یہ آنے والا زمانہ بتائے گا۔

اس کے بعد پیار بھرے ماحول میں گھریلو بات چیت چلتی رہی۔ آخر چنن وِداع ہو کر گاؤں کو لوٹ آیا اور بگّا اپنے رَہٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے جسّے سے چنن کے ساتھ ہوئی ملاقات کا ذکر کیا۔

جسّا سب کچھ سُن کر چپ رہا۔ وہ پل بھر کو چنن کی باتوں پر وشواس کرنے کو تیار نہیں تھا۔

چنن سنگھ لپکتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ لڑکے وہیں موجود تھے۔ اس نے بھی بگّے سے ہوئی بات چیت بتانے کے بعد کہا:

"مجھے لگتا ہے کہ بگّا اب پہلے والا اُجڈ نہیں رہا۔ بنیادی طور سے چاہے وہ وہی کچھ ہو جو پہلے تھا، پھر بھی سوجھ بوجھ بہتر ہو گئی ہے۔ مَیں نے اسے اُلٹی سیدھی پٹی پڑھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مَیں سوچتا ہوں کہ گاؤں والوں کی نگاہ میں ہمارے تعلقات اچھے بنے رہیں۔"

دلیر سنگھ کڑوے انداز سے بولا: "اِن حرامیوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے کا کیا فائدہ؟"

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

چنن سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"مگر سیدھی ٹکر کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ ہماری دُشمنی اب بھی قائم رہ سکتی ہے اور رہے گی۔"

لکّھا محسوس کر رہا تھا کہ بگّے سے اس کے باپ کی جو بات چیت ہوئی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاندان کی مونچھ نیچی ہو گئی تھی۔ وہ ناراضگی کے انداز میں بولا: "اب ہم ان کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں؟"

چنن نے بیٹے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا:

"تمہارا باپ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے۔ سیدھی ٹکر لینا مناسب نہیں ہے۔ یعنی سیدھی اُنگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا، تو ٹیڑھی اُنگلیوں سے نکالا جائے گا۔"

دلیر نے بوجھل نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا: "وہ کیسے؟"

"ہمارے پاس ایک مہرہ ہے۔"

"کون سا مُہرہ؟"

"صورت سنگھ۔"

"جب ٹُھنّے جیسا آدمی جسّے سے ٹکر لے کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، وہاں صورت سنگھ کیا کر لے

گا۔ مانا صورت سنگھ تگڑا جوان ہے، مگر جسا صورت سنگھ کی پل بھر میں گردن مروڑ کر پھینک سکتا ہے۔''

چنن بولا:

''تم ایک بات بھولتے ہو۔ وہ یہ کہ ٹھُمنے نے جسے کی طاقت کا اندازہ لگائے بنا سیدھی ٹکر لے لی۔ سچ پوچھو تو خود مجھے اس بات کا وِشواس نہیں ہوا کہ جسے نے ٹھُمنے جیسے آدمی کو اس طرح توڑ موڑ کر پھینک دیا۔ بلکہ یہ کہ اندازہ چاہیے میرا ہو یا ٹھُمنے کا...... وہ غلط نکلا۔ اب صورت سنگھ کو اس بات پر نہیں اُبھارنا چاہیے کہ وہ جسُو سے سیدھی ٹکر لے......''

لکھا بیچ میں ہی بول اُٹھا:

''مگر صورت سنگھ جسے سے ٹکر کیوں لینے لگا؟''

''ضرور ہی اسے ٹکر لینی پڑے گی۔ عشق کا بھوت بہت بُرا ہوتا ہے۔ یہی وہ بھوت تھا۔ جس کی وجہ سے بگّا ہمارے شکنجے میں پھنس گیا اور پانچ برس تک جیل کی ہوا کھاتا رہا۔''

دلیر نے کہا:

''اگر اسے پرسنّی کے معاملے میں ناامیدی ہوئی، تب ہی وہ جسے کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سوچے گا۔''

چنن نے رائے دی......

''ہمیں صورت سنگھ کو وشواس دلا دینا چاہیے کہ جسا ہی ایک ایسی اڑچن ہے، جس کی وجہ سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکے گا۔ عشق کا مارا صورت سنگھ سیدھے نہ سہی تو دھوکے سے جسے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اندھیرے سویرے راستہ چلتے جسے کا چھوی سے پیٹ چیر دے، اور خود بھاگ جائے تو جسا اس کا پیچھا نہیں کر سکے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو، چّھوی پیٹ چیر کر آنتیں باہر کھینچ لاتی ہے اور انہیں بھی کاٹ ڈالتی ہے۔ اس کے بھرپور وار سے کبھی کوئی بچ نہیں سکتا۔''

دلیر نے پوچھا: ''اگر صورت سنگھ پکڑا جائے تو؟''

''تو کیا؟...... اسے پھانسی پر چڑھنا پڑے گا۔''

''اگر اس نے ہمیں پھانسنے کی کوشش کی...... میرا مطلب ہے کہ اس نے یہ بیان دیا کہ ہم نے اس قتل کے لیے اُبھارا تھا، تو پھر کیا ہوگا؟''

''عدالت اس کے بیان کو تسلیم نہیں کرے گی۔ قتل کی وجہ واضح کر دی جائے گی۔ ضرورت پڑنے پر ہمارا وکیل عدالت کو بتا دے گا، کہ جسے اور صورت کی لڑائی کی مول جڑ پرسنّی تھی۔ وہ دونوں اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرسنّی کا جھکاؤ جسے کی طرف تھا۔ اسی لیے مایوس ہو کر صورت نے جسے کو

قتل کر ڈالا۔ ہم میں سے قتل کے وقت کوئی بھی صورت کے آس پاس نہیں رہے گا۔ کوئی بالغ آدمی اس بات کا سہارا نہیں لے سکتا، کہ اس نے کسی اور کے اُکسانے میں آ کر قتل کر ڈالا۔"

دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں کچھ چمک سی دکھائی دی۔ دلیر نے پوچھا:

"اب ہم کو کیا کرنا چاہیے؟"

لگّھا کو بات سوجھی تو بولا: "جھوٹی گواہیاں بھی تو بھگتائی جا سکتی ہیں۔"

باتوں کا سلسلہ اس طرح توڑنے پر دلیر کو لگّھا پر تھوڑی اُلجھن ہوئی کہنے لگا:

"وہ سب تو ہو جائے گا، ابھی ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ یہ سارا منصوبہ کیسے بنایا جائے۔"

چنن نے بیٹوں کی اس جھپٹ کو نظر انداز کر کے رائے دی......

"دلیر! پہلے تو تم خود ہی صورت سنگھ سے مل لو اور اسے بتاؤ کہ تمہیں اِدھر اُدھر سے خبر ملی ہے کہ پرسنّی اور جسّے کا آپس میں پریم ہے۔ اس بات کو وہ ابھی چھپائے ہوئے ہیں، مگر موقع ملنے پر وہ شادی کر لیں گے۔ صورت سنگھ کو اس بات کا بھی وشواس دلا دو کہ جسا اسے پرسنّی سے شادی کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔"

"ٹھیک ہے، میں آج یا کل صورت سنگھ کے گاؤں چلا جاؤں گا۔"

۳

اب بگّے کو اپنے گاؤں میں رہنے کا مزہ آ رہا تھا۔ حالات بالکل بدل چکے تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پانسہ پلٹانے میں جسّے کا کتنا ہاتھ تھا۔ بلکہ صرف جسّے کی وجہ سے ہی چنن کے خاندان کو نیچا دیکھنا پڑا اور لوگ جسّے کے چاچے کو بھی عزت دینے لگے۔ بگا جسّے سے بہت خوش تھا۔ صرف شادی کی بات سے ہی وہ بھڑک اُٹھتا تھا۔ عورت کے ہاتھوں اِتنی توہین اور مایوسی برداشت کرنے سے اس کے لاشعور میں ایک گانٹھ سی پڑ گئی تھی۔ آج کے نفسیات دان اسے کمپلیکس کہیں گے۔ وہ اپنے علاوہ جسّے کے جیون میں بھی کسی عورت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے یہ بھی اپنے آپ میں بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔

ایک رات دیئے جل جانے پر جسا باہر سے گھر لوٹا۔ ابھی وہ بڑے اُحاطے میں ہی تھا کہ اسے بھیتر سے بگّے کی گرج اور جھجو کی چلاّہٹ کی آوازیں سنائی دیں۔

کچھ دیر ٹھٹھک کر وہ پھر آگے بڑھا، کیونکہ یہاں سے اسے صرف شور سنائی دے رہا تھا، باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ مکان کے صحن میں گھسا۔ جھگڑا بھیتر والے پسار میں ہو رہا تھا۔ جسا باہر والے پسار کے فرش پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کی شادی کے معاملے میں بھائی بہن کی بات چیت چل رہی تھی۔ جھجو کہہ رہی تھی:

"تم عجیب باتیں کرتے ہو۔"

بگا بولا:

''مَیں کوئی عجیب بات نہیں کر رہا ہوں۔ مَیں نے زندگی کا اصول بنالیا ہے کہ میں عورت کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔''

''تمہارے منہ سے یہ کوئی نئی بات نہیں سُن رہی ہوں۔''

''نئی بات کیسے سُن سکتی ہو، پُرانا سوال اُٹھاتی ہو، پرانا جواب پاتی ہو۔''

''جو اُصول تم نے اپنے لیے بنایا ہے، وہ تمہیں کو مبارک ہو۔''

''ٹھیک ہے، مجھ ہی کو مبارک ہو۔''

''مگر تم دوسروں پر بھی اسے لاگو کر رہے ہو۔''

''دوسرا کون؟''

''جسا۔''

''جسا دوسرا ہے۔''

''تو تم اسے اپنا مانتے ہو۔''

''مورکھتا کی باتیں کرتی ہو، کسی کو اپنا مان کر ہی گھر میں رکھا جا سکتا ہے۔''

''جب اِسے اپنا مانتے ہو تو اسے شادی کیوں نہیں کرنے دیتے؟''

''جس کام میں مَیں نے نقصان اُٹھایا ہے، میں نہیں چاہتا کہ اسی کام کو کر کے جسا بھی نقصان اُٹھائے۔''

''تو شادی کرنا گھاٹے کا سودا ہے۔''

''یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو اس کا پریم کا چکر چل رہا ہے۔ چاچے نے پریم کیا، تو اس کی جوگت بنی، سو دنیا نے دیکھی۔ اب بھتیجا وہی کام کرنے جا رہا ہے۔ کیا کوئی کسر رہ گئی ہے، جو بھتیجا پوری کرے گا۔ اس کی شادی کی کوئی بات نہیں چل رہی ہے۔ اس کے پریم کا چکر چل رہا ہے۔''

''میرے بھولے بھیا، سنسار میں بہت بڑے بڑے پریمی ہوئے ہیں۔''

''اب ہمارے خاندان میں گویا بڑے بڑے پریمی پیدا ہوں گے...... تمہارے آشیرواد سے۔''

''چلو پریم وریم کو چھوڑو۔ اگر وہ دیپی سے شادی کرے، تو تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟''

''میرے اعتراض کا سوال تو بعد میں اُٹھے گا۔ دیپی کی ماں باپ اس شادی پر راضی نہیں ہیں۔''

''ممکن ہے، ان دونوں کا سچا پریم دیکھ کر وہ راضی ہو جائیں۔''

''تم تو تھوک میں پکوڑی نکالتی ہو۔ کہہ دیا نا کہ وہ یہ شادی نہیں کریں گے۔''

''میں سمجھ گئی، اگر وہ چاہیں بھی تو تم دھمکی دے کر انہیں ڈرا دو گے۔ قدرتی بات ہے کہ چاچے کی دھمکیاں سُن کر وہ اس کے بھتیجے کو اپنی لڑکی کیوں دینے لگے۔''

''تم بہت زیادہ مین میخ نکالتی ہو۔ مَیں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔''

''طوطے کی طرح ایک ہی بات رَٹے جا رہے ہو۔ تمہاری اِسی ضد نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا۔''

''برباد؟ مجھے برباد کون کہتا ہے؟ میری دو گاؤں میں زمین ہے، مکان ہیں، گھوڑے اور بھینسیں ہیں، روپیہ ہے...... کون مجھے برباد سمجھے گا؟''

آخر جھجو بھی اس کی بہن تھی، وہ بھی اونچی آواز میں بولی:

''یہ سب کچھ تمہارے جیتے جی تک ہے نا۔ مر گئے تو اس ساری دولت جائیداد کا مالک کون ہوگا؟ یہ شریک تمہارا سب کچھ آپ میں بانٹ لیں گے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے مرے ہوئے بھینسے کو کوّے اور گدھ نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔''

پل بھر کو بگا سناٹے میں آ گیا۔ پھر آنکھیں نکال کر غرّاتے ہوئے بولا:

''تم بہن ہو کر مجھ سے ایسی بات کہتی ہو؟''

''میں کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ مَیں تو تمہارے کرموں کا نقشہ تمہارے آگے رکھ رہی ہوں۔ جو تم نے پہلے کیا تھا، اس کا نتیجہ آج بھوگ رہے ہو...... اور جو اب کرو گے، اس کا نتیجہ کل بھوگو گے...... مرنے کے بعد بھی بھوگو گے۔''

بات کڑوی ہوتے ہوئے بھی سچی تھی۔ اس لیے جھجو کے یہ شبد بگّے کے من کی گہرائی کے کسی کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ مگر ہر اُجڈ آدمی کی طرح وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ بولا:

''بڑی بہن ہو نا، جو شراپ تم دے رہی ہو، شاید وہ پورا ہو کر رہے۔ تمہارے کلیجے میں تو ٹھنڈک پڑ ہی جائے گی۔''

''ارے! مَیں موت کنارے کھڑی بڑھیا۔ تم عمر میں مجھ سے اتنے چھوٹے ہو، کیا تمہارے مرنے تک میں زندہ رہوں گی؟...... اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ میں تمہیں کوئی شراپ نہیں دے رہی ہوں، بلکہ جو شراپ تم خود اپنے اوپر لے رہے ہو، میں اسے ہٹانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

بگا اُجڈپن سے بھڑک کر بولا: ''یہ سب کچھ نہیں، تم دونوں نے سازش کر رکھی ہے۔''

''ہم دونوں کون؟''

''جسا اور تم۔''

''لو! اب اپنی بات چھوڑ کر جسّے کی بات شروع کر دی۔ اس میں بھی تمہاری مورکھتا یہ ہے کہ باپ تو کبھی بنے نہیں، اس لیے تم نوجوانوں کے من کے جذبات کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔''

''نوجوانوں کو ڈالو بھاڑ میں...... میں نے جسّو کو اپنے پاس نہ رکھا ہوتا تو آج اس کی کیا حالت ہوتی۔ یہ بات نہ تم سمجھتی ہو اور نہ وہ سمجھتا ہے۔''

''یہ بھی خوب رہی، اس نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ تم پانچ سال کے لیے جیل چلے گئے، تو چک میراں کی زمین اور جائیداد کی دیکھ بھال وہی کرتا رہا۔ یہاں تو خیر مَیں تھی۔ تم جیل سے نکلے تو چک پیراں چلے گئے۔ تم نے جسّے کو یہاں بھیج دیا۔ جس خاندان کی ناک کو تم نے دھرتی میں رگڑ کر رکھ دیا تھا، جسّے نے اِسی ناک کو اُونچا کر دیا۔ سارے گاؤں، سارے علاقے میں ہمارے شریک دندناتے پھر رہے تھے۔ اب وہ سب کھجلی مارے کتوں کی طرح اِدھر اُدھر منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں نے بھی تو جسُّو کو بیٹے کی طرح ہی رکھا ہوا ہے۔ ایک اناتھ لڑکا آج مالک بنا گھومتا ہے۔ یہ بھی تو میرا ہی رُعب وجلال ہے۔''

''اسی لیے تو مَیں کہتی ہوں کہ تم دونوں کا تعاون بنا رہے۔ اسی میں تم دونوں کا اور خاندان کا بھلا ہے۔''

''مان لیا، میں اس کے راستے میں کوئی اڑچن تو نہیں ڈال رہا ہوں۔ مَیں نے گھر بار کا سیاہ سفید اسی کو سونپ رکھا ہے۔ لیکن اب پھر تم شادی کی بات اُٹھاؤ گی۔''

''ضرور اُٹھاؤں گی۔ ارے جب اولاد ہی نہ ہو تو خاندان کیسے آگے بڑھے گا۔ بزرگوں کی بنائی ہوئی جائیداد محفوظ کیسے رہے گی۔ اوّل تو تمہیں بیاہ کرنا چاہیے۔ بیکار کی حرکتوں میں تم اس عمر تک آ پہنچے۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی رشتہ مل ہی سکتا ہے۔''

بگّے نے فوراً ہی دونوں بازو اوپر اُٹھا دیئے اور کرشی مُنیوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا:

''نہ بابا! بگّے نے جو بات ایک بار کہہ دی، سو ہمیشہ اٹل رہے گی۔''

''اگر بگّے کی عقل اتنی ہی ماری گئی ہے تو وہ جسّے کی ہی شادی کرا دے۔''

''اس کی بھی شادی ہو جائے گی، لیکن میرے مَرنے کے بعد۔''

''مطلب یہ ہے کہ تمہارے مرنے کے انتظار میں وہ بھی بوڑھا ہو جائے۔ بھلا پھر اسے کون پوچھے گا۔''

''اب یہ تُم جانو یا جسّا۔ مجھے جو کہنا تھا سو کہہ دیا۔''

''تمہیں کیا آکاش والی ہوتی ہے۔ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کا بُرا بھلا سوچنا تمہارا فرض نہیں ہے؟''

''میں نے بُرا بھلا سب سوچ لیا ہے۔''

''یہ تو نہیں سوچا کہ جب تمہارے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوا تھا، تو تم کسی کی نہیں سنتے تھے۔ اب جسّے کے سر پر یہی بھوت سوار ہے، تو کیا وہ کسی کی سُنے گا۔''

''نہ سُنے۔ اسے کوئی مجبور تو نہیں کرتا کہ وہ دوسروں کی بات سُنے۔''

''اگر وہ اپنی ضد پر اَڑ کر شادی کر لے، تو؟''

"کر لے..... لیکن میرے گھر میں رہنے کا اسے کوئی حق نہ ہوگا۔ بے شک وہ شادی کر کے جہاں جی چاہتا ہے، چلا جائے میں اسے روکوں گا نہیں۔"

"تمہیں اس کے چلے جانے کا کوئی دُکھ نہیں ہوگا؟"

"جب وہ عورت کی خاطر مجھے چھوڑ سکتا ہے، تو میں بھی اسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

پل بھر رُک کر بھجو بولی: "یہ نہ سمجھنا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ لیکن اگر وہ شادی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ تو وہ اپنا جیون نئے سرے سے شروع کر سکتا ہے۔ میں اسے اس بات کی آزادی دیتا ہوں۔"

باہر دالے پسار میں بیٹھا جسا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اب وہ اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اَحاطے میں سے ہوتا ہوا وہ دھول بھرے میدان میں پہنچ گیا۔ آکاش میں چاند نہیں، صرف تارے ہی تارے تھے، ہر طرف تاروں کا مند پرکاش پھیلا ہوا تھا۔

وہ کھیتوں میں چلتا گیا۔ کافی دُور پہنچ کر رُکا۔ مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ گاؤں کے مکان پھیکے پھیکے دھبّے سے بن کر رہ گئے تھے۔ گاؤں کے باہر کانٹے دار گھنی جھاڑیوں نے اور بھی گہرے رنگ کے دھبّوں کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھ کر بہت ہی دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس کا دماغ کئی اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے اس بات کا پتا چل گیا، کہ چاچا دراصل اس کی شادی کے کتنا خلاف تھا اور اگر وہ شادی کر لے تو چاچا اسے سدا کے لیے چھوڑ دینے کو بھی تیار تھا۔

ابھی تو شادی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا کیونکہ دیپی کے ماں باپ اس بات کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ اس لیے ابھی چاچے سے کسی طرح کے جھگڑے کی حالت ہی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر چاچا اپنے اُجڈپن پر اڑا ہوا تھا، تو وہ بھی الگ سے زندگی بسر کرنے کا کوئی پروگرام بنا سکتا تھا۔

یہاں تک اس کی سوچ پہنچی، تو من ہی من وہ چونک پڑا۔ کیا وہ واقعی ضرورت پڑنے پر چاچا کو چھوڑ سکتا تھا؟ کچھ سوچنے پر اس کے من کی گہرائی سے آواز سنائی دی کہ یہ کام اس کے لیے مشکل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ زندگی میں اپنا راستہ الگ سے بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ چاچے سے اس کو نہ جانے کس قسم کا لگاؤ تھا۔ شاید چاچے کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ ابھی ایک دوسرے سے الگ رہ کر انہوں نے اس لگاؤ کو کسوٹی پر پرکھا نہیں تھا۔ چُھٹپن کی بات یاد آ گئی، جب چاچا اسے اُلٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارتا تھا، تو وہ لڑھک کر پرے جا گرتا تھا، مگر وہ مار کے ڈر سے بھاگتا نہیں تھا، بلکہ پھر مار کھانے کے لیے چاچا کے سامنے کھونٹے کی طرح جا کھڑا ہوتا۔ اگر چاچے کی ایک خاص قسم کی شخصیت تھی، تو بھتیجے کی بھی خاص شخصیت تھی، وہ ہار کر بھاگنے والا نہیں تھا۔

اس کے اس خیال سے اس کے من میں نئی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ یہ گانٹھ ایسی تھی، جس کے بارے میں اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے کھولی جائے۔ یہ ایسا مسئلہ تھا، جس کا کوئی حل نہیں تھا۔

چاچا اپنی ضد میں پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا، اور بھتیجا میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں تھا۔ ان دونوں کا میل بڑا عجیب تھا اور اپنے آپ میں اپنی مثال آپ تھا۔

مانی ہوئی بات ہے کہ جو شخص سوچ بچار میں ڈوبے رہنے کا عادی ہو جائے تو ایک سطح پر پہنچ کر اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ جس اُلجھن کا حل عقل کے ذریعے نہیں ہوتا ان کو حالات خود ہی سُلجھا کے رکھ دیتے ہیں۔

شاید جسا اپنے چاچے سے کم اُجڈ نہیں تھا، مگر لگا تار مصیبتیں سہنے کی وجہ سے اسے اس طرح کا علم حاصل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی اُلجھنیں نہیں سلجھا سکا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ کیوں ہلکا ہو گیا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

جسا سنگھ اپنے رَہٹ پر گیا، کھیتوں میں گھومتا رہا اور پھر کافی رات گزر جانے پر گھر کو لوٹا۔

وہ باہر والے احاطے کے کمرے میں ہی سو گیا۔ گھر کے بھیتر جانے کو من نہیں ہُوا۔

۴

جسا ایک روز صبح سویرے اپنے رَہٹ پر پہنچ گیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا کمی (نوکر) رَہٹ کی گادھی پر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا یا نہیں۔ بیلوں کی عادت تھی کہ جب ان کو ہانکنے والا کوئی نہ ہو تو وہ تین چار چکر کاٹ کر رُک جاتے تھے۔ دُور سے ہی جسے نے دیکھا کہ بیل اپنے دائرے والے راستے پر دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ رَہٹ کے رُوں رُوں کرنے کی آوازیں دھیمے دھیمے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ رَہٹ کے قریب جا کر اسے پتا چلا کہ گادھی پر بیٹھا بیٹھا کمی اونگھ رہا تھا، وہ بیلوں کو ہانک تو نہیں رہا تھا مگر شاید بیلوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ڈنڈے سے ان کی پٹائی کرنے والا ابھی موجود ہے۔

جسے نے اس گول راستے کے کنارے پر کھڑے ہو کر کمی کا کندھا ہلایا اور وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ جاگتے ہی ڈنڈا ہلا ہلا کر ٹخ ٹخ کا شور مچانے لگا۔

جسے کو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ آگے بڑھ گیا، یہ جاننے کے لیے کہ اگر ضرورت ہو تو پانی کا رُخ نئے کھیت کی طرف بدل دے۔ اس طرح پانی کی کچی نالیوں، کھیتوں اور ان میں اُگتے ہوئے ننھے ننھے پودوں کا جائزہ لیتے ہوئے کافی دُور تک نکل گیا۔

گاؤں کا گڈریا بھینسوں اور گایوں کے گلّے کو ہانکتا ہوا گھاس چرانے کے لیے قریب والے چوڑے کچے راستے پر سے گزر رہا تھا۔ آس پاس زندگی کی گہما گہمی کے نشان دکھائی دینے لگے تھے۔ گزشتہ دو دو دنوں میں اس کی اپنے چاچا سے بہت کم بات چیت ہوئی تھی۔ کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی کیونکہ جھگڑے کے موضوع کو نہ جسے نے چھیڑا اور نہ چاچا نے۔ ویسے دونوں کے من کی گہرائی میں یہ موضوع جیسے لمبے تیز کانٹے کی طرف چبھا ہوا تھا۔ انجانے ہی وہ سوچ بچار میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے۔ ظاہراً وہ اپنی اپنی ضد پر اَڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے

نہ کوئی جھکنے کو تیار تھا، نہ پیچھے ہٹنے کو اور نہ اس موضوع پر وچار کے لیے پہل کرنے کو۔

ایسی ہی حالت میں جسا دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھے رہٹ کی طرف لوٹ آیا۔ اس کی نظر دھرتی پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس لیے جب اچانک اس نے نظر اُٹھائی تو صورت سنگھ کو سامنے پا کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''ست سری اکال۔''

صورت سنگھ کی آواز سنائی دی۔

جسّے نے تو ست سری اکال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف بھاری آواز میں پوچھا:

''آج گھوڑا ساتھ نہیں لائے؟''

صورت سنگھ نے چونک کر جسّے کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر طنز کی کوئی علامت نہیں تھی۔ صورت سمجھا کہ جسّے کے وچار میں شاید میں پیدل ہی اپنے گاؤں سے وہاں آیا ہوں۔ لیکن اس نے اس بات کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا، کیونکہ جسّے نے یہ الفاظ سوالیہ ڈھنگ سے نہیں کہے تھے۔ بولا:

''میں پہلے تمہارے گھر پر گیا تھا۔ پتا چلا کہ تم کھیتوں کو گئے ہو، میں یہاں چلا آیا۔''

''گھر پر کیوں گئے تھے؟''

جسّے کی آواز سپاٹ تھی، مگر صورت کو اس کی یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ جسا پچھلی بات چیت کو بھول گیا تھا، کیا اسی نے نہیں کہا تھا کہ پرسنّی سے شادی والی بات کا جواب ہو کچھ دنوں میں دے گا۔

جسّے نے اپنی ہی دُھن میں دوبارہ پوچھا: ''تم اتنی سویرے ہمارے گاؤں کیسے پہنچ گئے؟''

جسّے کو اصلیت کا کچھ اندازہ تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ سوال پوچھا تھا۔ صورت سنگھ نے جواب دیا:

''میں آج صبح نہیں پہنچا، کل رات ہی آ گیا تھا۔''

''رات چنن سنگھ کے بیٹوں کے ساتھ کاٹی ہوگی؟''

صورت ٹھٹھک کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اپنی رو میں وہ یہی کہنے والا تھا کہ رات اس نے گوردوارے میں کاٹی تھی لیکن جسّے کے سیدھے سوال کا اُلٹا یا غلط جواب دینے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ اس نے ہاں یا ناں کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف خاموش رہا۔

جسّے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے بھاری اور سپاٹ آواز میں پوچھا: ''کہو کیسے آنا ہوا؟''

اب صورت سنگھ کو وشواس ہونے لگا کہ جسّے کی نیت خراب تھی۔ اس کے من میں غصہ اُبھر آیا۔ بڑی مشکل سے من کے اس جذبے کو دباتے ہوئے اس نے پوچھا:

''جسا سنگھ! کیا تم ساری آپس میں ہوئی بات چیت کو بالکل بھول گئے؟''

''نہیں۔'' جسّے نے فوراً جواب دیا۔

جسّے کے جواب سے صورت سنگھ کے من میں آشا پیدا ہونے کی بجائے۔ مایوسی کا اندھیرا چھانے لگا۔ جسّے

کی گھمبیر بلکہ کٹھور شکل سے ہی ظاہر تھا کہ اسے اس سے کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے بار بار اسے یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جسے سے کسی بات کی آشا رکھنا بیکار ہے۔

صورت سنگھ کے من میں جیسے بڑے زور کی آواز میں یہ سوال گونجا، کہ کیا جسا خود پرسنّی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور بھائی بہن کا یہ ناٹک صرف ڈھونگ ہی تھا۔

باقی سب کچھ بھول کر صورت سنگھ صرف اسی بات کو سوچنے لگا، کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ جسّے سے وہ کس طرح نپٹ سکے گا۔ اپنی جگہ صورت سنگھ بھی دھاکڑ تھا لیکن اس پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس معاملے میں وہ جسّے کی دھول کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے اس بات کے بھی اشارے مل چکے تھے کہ دلیر سنگھ اور لکّھا سنگھ اسے جسّے سے نپٹنے کے داؤ پیچ بتا سکتے تھے۔ آخر ایسی کون سی ترکیب ہو سکتی تھی جس سے جسّے جیسے پہاڑ کو اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا............

اپنے ہی وِچاروں میں کھوئے ہوئے صورت سنگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب جسّے نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور کہا:

''مجھے سب یاد ہے، تم پرسنّی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اسی سلسلے میں تم میرے پاس آئے تھے۔ اب میں اس مسئلہ پر اچھی طرح وِچار کر چکا ہوں۔ مَیں تمہارے خاندان، گھر بار اور دھن جائیداد کے بارے میں جانکاری حاصل کر چکا ہوں۔ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے۔''

صورت سنگھ کا سارا جسم اوپر سے نیچے تک جیسے تھرا اُٹھا۔ بھیتر ہی بھیتر اسے کپکپی بھی چھوٹی ہوئی تھی۔ کسی خوف کی وجہ سے نہیں، صرف یہ جاننے کے لیے کہ جسا آخر میں کس نتیجہ پر پہنچا۔ مگر یہ جاننے کی ضرورت بھی تھی؟ کیا جسّے کی شکل سے واضح نہیں تھا کہ وہ کس نتیجہ پر پہنچا ہے؟

اس دوران جسا اس کے کندھے سے ہٹا کر اس کی طرف پیٹھ موڑ کر بہت ہی دھیرے دھیرے آگے قدم بڑھا رہا تھا...... یعنی صورت اور اپنے بیچ والی دُوری کو بڑھا رہا تھا۔

یکا یک جسا پلٹا، ٹکٹکی باندھ کر صورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر واضح آواز میں بولا:

''مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔''

اگر چہ جسّے نے ایسی بات کہی تھی، جسے سننے کے لیے صورت سنگھ کا من ترس رہا تھا، مگر اس وقت صورت کو ایسا لگا کہ جیسے اس کے کانوں میں گولے پھٹ گئے ہوں۔ پل بھر کو محسوس ہوا کہ اس کے دھڑ کے نیچے کا حصہ گیلی مٹی کی طرح بیٹھ جائے گا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

عجیب حالت تھی، جس بات کو سننے کے لیے اس کا من ترس رہا تھا۔ اسی کو سُن کر اسے یوں لگا، جیسے اسے ان ہونی بات سُن لی ہو۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھا، تو جلدی سے پاؤں چھونے کے انداز میں وہ اپنے دونوں ہاتھ جسّے کے گھٹنوں تک لے گیا۔ جسا کھڑے کھڑے دھیمے سے مسکرایا۔ بولا:

''صورت تم عمر میں مجھ سے بڑے ہی ہو گے۔ میرے پاؤں چھونے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟''

احسان تلے دبے صورت سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے، وہ بھرائے ہوئے گلے سے بولا:
''لیکن جسا سنگھ تم پرسنّی کے بھائی ہونا۔''
''ہاں، سو تو ہوں۔''
خوشی میں صورت اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ بولا:
''تم نہیں جانتے کہ دوسروں نے مجھے مایوسی کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔''
جسّے نے دونوں بھوؤں کے بیچ میں بل ڈال کر پوچھا: ''وہ کیسے؟''
''میرے کان بھر بھر کر۔''
اب ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر جسا چاہتا تو صورت سے کرید کرید کر پوچھ تاچھ کر سکتا تھا۔ صورت بھی بنا تامل کے پوری پوری جانکاری دے سکتا تھا۔ مگر جسّے نے ایسا نہیں کیا۔ صورت کے اتنا کہہ دینے سے ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ صورت کو یہ وِچار بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ چنن سنگھ اور اس کے بیٹے اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، یا یہ انہیں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ جسا یہ بھی جانتا تھا کہ آئندہ صورت سنگھ کے ساتھ اس کے کس طرح کے تعلقات ہونے والے ہیں۔ اس بات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے بھی اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔
کچھ تو ان کی بات چیت ہی ختم ہو چکی تھی اور کچھ صورت سنگھ مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد پرسنّی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ جسّے سے وِداع ہونے سے پہلے صورت نے پوچھا:
''کیا تم نے پرسنّی کو اپنے اس فیصلہ سے خبردار کیا ہے؟''
''ابھی نہیں۔''
صورت ذرا مایوس ہو کر بولا: ''تب میری گاڑی آگے کیسے بڑھے گی؟''
''ارے بھولے، جب میں نے اجازت دے دی، تب اس گاڑی کو کون روک سکتا ہے؟''
''لیکن پرسنّی کو بھی پتا چلنا چاہیے۔''
''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا میں اسے آج ہی پیغام بھیج دوں گا۔''
''اِسے کب تک پتا چل جائے گا؟''
''اگر کل شام تک تم اسے ملو گے تو میرا پیغام اس تک پہنچ چکا ہو گا۔''
صورت کا چہرہ پھر دمک اُٹھا، وہ دانت نکال کر بولا:
''وچن پورا کرو گے نا؟''
''اگر مجھے اپنا یہ وچن پورا نہ کرنا ہوتا تو مَیں تم سے یہ بات کہتا ہی نہیں۔ کل شام کو پرسنّی کی زبانی تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا پیغام اس تک پہنچ چُکا ہے۔''
''اچھا تو میں چلتا ہوں۔''
گاؤں کو واپس آنے کے لیے صورت سنگھ مُڑا۔ پھر یکا یک ہی کچھ سوچھا، تو وہ لپک کر جسّے کے قریب پہنچا

اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی گرم جوشی سے ہلایا۔
جسا گاؤں سے واپس لوٹتے ہوئے کچھ دیر تک صورت کو دیکھتا رہا۔
صورت بڑی تیزی سے گلیوں میں سے ہوتا ہوا چنن سنگھ کے گھر پہنچا۔
باپ بیٹے دالان میں بیٹھے بڑی بے تابی سے صورت سنگھ کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنے من کی بات من میں ہی دبائے ہوئے تھے۔ چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ مگر جب ان کی نظر صورت سنگھ پر پڑی، تو انہیں محسوس ہوا کہ اس کا تو حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دلیر سنگھ نے ذرا ایک طرف کو کھسک کر اس کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے کہا: ''کہو، مل آئے؟''
صورت سنگھ کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ وہ خوشی بھری آواز میں بولا:
''ہاں، رَہٹ پر ملاقات ہو گئی۔''
وہ تینوں صورت سنگھ کے چہرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صورت سمجھے کہ وہ سارا معاملہ جاننے کے لیے کتنے بے چین ہو رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ صورت زیادہ باتیں کرنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر چنن نے ہی پوچھا: ''سب ٹھیک رہا نا؟''
''بالکل۔''
اس ایک لفظ سے ان سب کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ چنن نے بزرگانہ انداز جاری رکھتے پھر پوچھا:
''ابھی اس بارے میں تمہیں جسا سنگھ سے پھر ملنا پڑے گا کیا؟''
''نہیں۔''
''تو مطلب یہ ہے کہ پرسنی سے تمہارے بیاہ پر جسے کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟''
''بالکل نہیں۔''
باپ بیٹوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ انہونی بات ہو کیسے گئی۔
صورت سنگھ نے خود ہی کہنا شروع کیا:
''بات بس اتنی تھی کہ جسا سنگھ میرے خاندان اور میرے بارے میں کچھ جانکاری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کل کو مجھے اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ کرنا پڑے تو میں اس کے ہونے والے پتی اور اس کے خاندان کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنا چاہوں گا۔ جسے نے بھی میرے بارے میں پوچھ تاچھ کر کے اپنی تسلی کر لی ہے۔ مَیں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ اگر اس کی نیت خراب نہیں ہے، تو میرے اور میرے خاندان کے بارے میں کوئی بھی قابل اعتراض بات اسے مالوم نہیں ہو سکے گی۔''
لکھا بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر بولا: ''کیا تمہیں وشواس ہے کہ جسے کی نیت خراب نہیں ہے؟''

باپ نے بیٹے کو بیچ میں ہی ٹوک کر کہا:

''چھوڑو ان باتوں کو۔ کہاوت مشہور ہے کہ میاں بیوی راضی، کیا کرے گا قاضی۔ صورت سنگھ تم لوگوں کا دوست ہے، اسی کی خوشی میں ہماری خوشی ہے۔''

دراصل چنن سنگھ چاہتا تھا کہ اس طرح اسے اصلی حالات کا پورا پورا پتا چل سکے گا۔ یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ جسّے کے حامی بھر دینے سے صورت سنگھ کے من کی حالات اب بالکل بدل چکی ہو گی اور جسّے کے خلاف باتیں کر کے اس کی حمایت حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ لگّھا باپ کی اس چالاکی کو نہیں سمجھ پایا مگر آگے کچھ بولنے کا بھی اسے حوصلہ نہیں ہو سکا۔ وہ کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گیا اور صورت کو تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔

دلیرا اپنے باپ کی طبیعت کو اپنے بھائی سے بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ یہ بھی واضح تھا کہ جسّے کا ہمدرد بن جانے کے بعد صورت سنگھ کو اس کے خلاف کچھ کہنے میں ضرور ہی تامل ہو گا۔ اصل میں اس وقت حالت کیا تھی، یہ جاننا بھی ضروری تھا۔ یہی سب سوچ کر دلیر سنگھ نے کہا:

''تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ تمہارے انتظار میں ہم نے بھی ابھی تک کچھ کھایا پیا نہیں......۔''

یہ سب جھوٹ تھا، وہ ناشتہ کر چکے تھے۔ صورت کو روکے رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ مگر صورت سنگھ اپنا کام نکل جانے کے بعد وہاں زیادہ دیر رُکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جسّے کے ساتھ اس کی میزبانوں کے جو تعلقات تھے، اسے معلوم تھے۔ اگر جسّے کو پتا چل گیا کہ اب بھی وہ چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں کے ساتھ گھی شکر ہو رہا تھا تو اس کے مفاد میں اچھا نہیں ہو گا۔ ناشتہ تو وہ کہیں بھی کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ بولا:

''اب تو مجھ کو جانا ہی پڑے گا۔ گھر پر میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔''

یہ کہہ کر وہ چار پائی سے اُٹھا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کاٹھی کو گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ رہا تھا تو دلیر سنگھ نے بھی چار پائی سے اُٹھتے ہوئے کہا:

''اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ناشتہ کرنے سے ایسی کوئی دیر تو نہیں ہو جائے گی۔ ہم کو بھی یہ اچھا نہیں لگے گا کہ مہمان کچھ کھائے پیئے بنا گھر سے چلا جائے۔''

''مہمان؟'' صورت سنگھ بھی ذرا چالاکی سے ہنستے ہوئے بولا:

''مَیں مہمان نہیں ہوں، ہمارے تو بھائیوں کے سے تعلقات ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر بعد صورت سنگھ گھوڑے کی لگام تھام کر ان سے وداع ہو گیا۔ چنن اور اس کے بیٹے اسے اس وقت تک دیکھتے رہے، جب تک کہ وہ گلی کے نکڑ پر ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ تب دلیر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا: ''ایک کبوتر ہاتھ لگا تھا، سو وہ بھی گیا۔''

چنن نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''میرے خیال میں یہ کبوتر لوٹ کر آئے گا۔ عشق کے مارے اس کی عقل برباد ہو گئی ہے۔ آخر میں اسے مایوسی ہو گی اور وہ پھر ہری پورے واپس لوٹ کر آئے گا۔''

گیارھواں غلاف

رَبّا! عزتاں ذِلتاں وَس تیرے......

(وارث شاہ)

"اے پالنے والے! عزت ذلت سب تیرے ہاتھ میں ہے۔"

۱

رات کا بھوجن کر کے سجن سنگھ نے آخر میں کُلاّ کیا اور آخری ڈکار لی۔ من میں کچھ وِچار آیا تو اس نے پتنی کی طرف دیکھ کر اِشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

وہ سمجھی کہ نہ جانے کیا خاص بات ہے۔ اپنا کام چھوڑ کر وہ پتی کے قریب بیٹھتے ہوئے پھسپھسائی: ''کہو۔''

سجن سنگھ نے اپنی میلی میلی آنکھیں پتنی کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے دھیرے سے کہا:

''میں سوچ رہا تھا کہ ہم کچھ دنوں کے لیے رتّو کے چلے جائیں۔''

''دیپی کو وہاں بھیجا، سو تو ٹھیک کیا، مگر ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔ اس کا جانا ضروری تھا، ہمارے پیچھے کون سا جسا سنگھ پڑا ہے، کہ ہم بھی رتّو کے چل دیں۔''

''بڑی مورکھ ہو! اگر کوئی ہماری بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے تو سمجھو کہ ایک طرح سے وہ ہمارے ہی پیچھے پڑا ہے۔''

''مان لیا، مگر دیپی تو رتّو کے میں اپنی ماسی کے پاس محفوظ بیٹھی ہے۔ جسے کو تو یہ بھی نہیں مالوم ہوگا کہ وہ کہاں غائب ہوگئی۔''

''ٹھیک ہے، لیکن ہمیں بھی تو جا کر اپنی بیٹی کا پتا کرنا چاہیے۔''

''ماسی اس کے لیے ہم سے کم فکر نہیں کرتی۔ وہاں وہ اس گاؤں سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔''

''پھر بھی تمہاری بہن یہ تو سوچ سکتی ہے کہ جوان بیٹی کو یہاں پھینک کر ماں باپ نے ایک بار بھی اس کی خبر نہیں لی۔''

''ایسی نہیں ہے میری بہن، دیپی اسے بالکل بیٹی جیسی ہی لگتی ہے۔''

''اُف! بھئی دُنیاداری بھی تو کوئی چیز ہے۔ کچھ نہیں تو دیپی ہی کے من میں یہ وِچار آ سکتا ہے کہ کیسے ہیں میرے ماں باپ جو مجھے یہاں پھینک کر جیسے گنگا نہا لیے۔ کبھی بیٹی کی شکل تک دیکھنے نہیں آئے۔''

پتنی نے ماتھے کو اُنگلیوں سے چھو کر کہا:

''یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم پر جو دُھن سوار ہو جائے وہ پوری کر کے ہی چھوڑو گے۔''

سجن ہنسا:

''مَیں بھی جانتا تھا کہ اگر تم کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو تم آخر بات ضرور سمجھ جاتی ہو۔''

''مگر جلدی نہ مچانا۔''

''جلدی کا ہے کی۔ کل صبح تک یہاں سے چل دیں گے۔''

''وہی بات ہوئی نا، مَیں صبح تک کیا کیا سمیٹوں گی۔ گھر کا بھی تو کوئی بندوبست کرنا ہوتا ہے۔''

''گھر چلتا رہے گا، تم سمجھتی ہو، کہ تم ذرا اِدھر اُدھر ہو جاؤ گی، تو گھر کو چیل کوے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ بہو گھر کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتی ہے۔''

''اچھا اچھا، دھیرے بولو۔ بہو سُن لے گی تو اس کا دماغ اور اُوپر کو چڑھ جائے گا۔ وہ پہلے ہی اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتی۔''

''چار چھ دن رہ کر واپس آ جائیں گے۔''

''آ تو جائیں، مگر وہاں پہنچیں گے کیسے؟''

''اب تو تمہارے لیے موٹر گاڑی آنے سے رہی۔ سندر بڑھی والا اپنی گھوڑی لے چلے گا۔ ہمیں رتّو کے پہنچا کر اگلی صبح تک لوٹ آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو دن کے پیسے لے لے گا۔''

''اِسے فرصت ہوگی تو چھوڑ کر آئے گا۔''

''وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''تم پر میں کچھ نہیں چھوڑ سکتی۔ کھٹ سے اس کے گھر جاؤ اور جھٹ سے لوٹ کر آؤ، اگر وہ چلنے کو تیار ہو تو میں بھی جلدی سے تیاری کر لوں۔''

''ہاں، کسی سے ذکر نہ کرنا، کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

''یہی بات میں تم سے کہنے جا رہی تھی مگر یہ بھی تو سوچ لو کہ کہیں سُندر کسی سے نہ کہہ دے۔''

''اس کی چِنتا مت کرو۔ اسے میں کہہ دوں گا۔ بھلا آدمی ہے۔ اِدھر سے اُدھر لگانا اس کی عادت نہیں ہے۔''

''اسے یہ بھی کہہ دینا کہ تاروں کی چھاؤں میں ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔ رات کا تیسرا پہر ختم ہونے پر وہ گھوڑی لے آئے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اب کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ نا۔''

''بھئی کمال کرتی ہو، خود ہی تو باتیں کیے جا رہی تھی اور اب ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی۔''

پتنی جان بوجھ کر چپ رہی اور سجن سنگھ ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو تھپتھپاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

ابھی وہ کچھ ہی قدم چلا ہوگا کہ آگے یک دم جسا سنگھ آتا دکھائی دیا۔ اس نے بہت چاہا کہ آنکھ بچا کر دائیں بائیں کھسک جائے، مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ اب فرار ہونا ناممکن تھا۔ سامنا ہوتے ہی جسّے نے بڑی خوش مزاجی سے اونچی آواز میں کہا:

''کہو چاچا! کیسے ہو؟''

جب سے جسا رنّو کے ہو آیا تھا۔ تب سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ کہیں بھی سامنا ہو جانے پر سجن سنگھ بھی اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا کیونکہ اس کا وِچار یہ تھا کہ دہی چونکہ جسّے کے پُٹھ نگل سے دُور بیٹھی ہے، اس لیے اب اس سے کھنچے کھنچے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ آخر گاؤں میں کون ایسا شخص تھا، جو جسّے سے بگاڑ کر چین کی سانس لے سکے۔ چنن سنگھ کے اکڑ باز بیٹوں کو تو اس نے سوڈے کی جھاگ کی طرح بٹھا دیا تھا، بھلا دوسرے لوگ کس کھیت کی مولی تھے۔ لیکن جسّے نے بڑا ہی پُرمعنی سوال کیا تھا۔ کہیں وہ اس کے گھر کے باہر دروازے کے باہر لگا ان کی باتیں تو نہیں سُن رہا تھا۔ گھبراہٹ میں سجن سنگھ یہ بھول گیا کہ پتنی سے اس کی پھسپھساہٹ تو خود گھر والے بھی نہیں سن پائے تھے۔ بہرحال اس نے بھی یوں ہی ہاتھ اُٹھا کر کہہ دیا:

''بس وہاں تک گھومنے جا رہا ہوں۔ کھانا کھایا تو سوچا کہ ذرا سی سیر کر آؤں۔''

''اچھا، اچھا۔'' یہ کہا، ہنسا اور پھر جسا آگے بڑھ گیا۔

سجن سنگھ بھی آگے کو چل تو دیا مگر وہ چھپی چھپی نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کہیں جسا اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا۔

گلی سنسان پڑی تھی۔ سجن سنگھ سیدھے راستے کی بجائے بیکار کا چکر لگاتا ہوا سُندر کے گھر پہنچا۔ اس نے چپکے سے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹایا اور خود گلی میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دُور سے کوئی پرچھائیں بھی نظر آتی تو جسّے کے دھوکے میں چونک کر رہ جاتا۔

دروازہ کھلا تو آگے کو لٹکی مونچھوں والا سندر کھڑا تھا۔ سندر اسے ٹھیک طرح پہچان بھی نہیں پایا تھا کہ سجن سنگھ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے ہلکے سے پیچھے دھکیلتے ہوئے چھوٹے سے گلیارے میں گھس گیا اور دروازے کی کُنڈی چڑھا دی۔

سندر کی مونچھیں اور بھی نیچے کو لٹک آئیں۔ آنکھیں پھیلا کر بولا:

''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں۔''

''کہو۔''

''گھوڑی چاہیے۔''

''کب؟''

''کل......صبح سویرے۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''رتّو کے۔''

''اس میں تو سارا دن لگ جائے گا۔''

''سو تو ہے۔ تمھیں رات وہاں کاٹنی پڑے گی اور پرسوں شام کو لوٹ پاؤ گے۔ تمھیں کہیں اور تو نہیں جانا ہے؟''

''نہیں.....لیکن......''

''وہ میں سمجھ گیا تمھیں دو دن کا مختانہ ملے گا۔''

سندر کی لٹکی ہوئی مونچھیں ذرا سی پھڑ پھڑائیں۔ سجن سنگھ پھر بولا:

''رات کا تیسرا پہر ختم ہونے تک پہنچ جانا۔ ہم تیار رہیں گے......''

''ہم؟''

''ہاں بھئی! دیپی کی ماں بھی تو جا رہی ہے۔ اسی کے لیے ہی تو گھوڑی چاہیے ورنہ میں پیدل ہی نکل جاؤں؟''

''ٹھیک ہے۔''

''یہ نہ ہو کہ تم پڑے سوتے رہ جاؤ اور اِدھر سورج نکل آئے۔ ہمیں تاروں کی چھاؤں میں ہی نکل جانا ہے۔''

''واہ سردار جی! کمال کرتے ہو، ہمارا تو کام ہی یہی ہے سوتے رہ جائیں تو بس ہو چکا کام۔''

اب یکا یک سجن سنگھ کو لید کی دُرگندھ کا احساس ہوا۔ اس نے پگڑی کا لٹکتا ہوا شملہ ناک پر رکھتے ہوئے کہا:

''اچھا، تو میں چلتا ہوں۔''

''جاؤ۔''

سندر نے جلدی سے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ آدھے کھلے دروازے میں سے سجن نے ایک قدم گلی میں رکھا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹا لیا۔

گلی میں جسا سنگھ کھڑا تھا؟

نہیں۔

سجن سنگھ کو ایک بہت خاص یاد آ گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر پہلے سندر کی مونچھوں پر نظر ڈالی، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

''ایک بات یاد رکھنا۔''

''بولو۔''

''نہ جانے سے پہلے اور نہ لوٹ آنے پر، تم کسی سے یہ کہو گے کہ تم رتّو کے گئے تھے۔''

سندر آنکھیں جھپکا کر بولا:

''میں نہیں سمجھا۔''

''ارے بھئی سیدھی سی بات ہے کہ تم کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم ہمیں رتّو کے چھوڑنے جا رہے ہو۔ اب تو سمجھ گئے نا؟''

''سمجھا۔''

اس طرح من کی پریشانی ہلکی کر کے سجن سنگھ نے بھیتر سے ہی گلی کے دونوں طرف اچھی طرح نظر دوڑا کر قدم باہر رکھا اور پھر وہاں سے یوں گھر کی طرف لپکا جیسے ڈاکو اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پل دو پل ہانپتا رہا، ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پتنی سے کہنے لگا:

''سب ٹھیک ہو گیا۔''

پتنی نے اس کی حالت دیکھ کر طنزیہ انداز سے ہاتھ ہوا میں جھٹک کر کہا:

''واہ، بڑا میدان مار آئے۔''

سجن سنگھ کی پتنی کافی دیر تک سامان ٹھیک کرتی رہی جبکہ وہ خود خراٹے لے رہا تھا۔ پتنی کی آواز سن کر ہی اس کی نیند کھلی۔ وہ کہہ رہی تھی:

''جاگو، جانے کا وقت ہو گیا۔''

سجن ہڑبڑا کر اُٹھا۔ جلدی سے نہایا دھویا۔ پتنی دہی بلو چکی تھی اور آلو والے پراٹھے تیار کر چکی تھی۔ دونوں ناشتہ کرنے کے بعد کپڑے پہن چکے تو پتنی بولی:

''دیکھ لو، سندر ریڑھی والا ابھی تک نہیں پہنچا۔ تمہارے کام ہی ایسے ادھورے ہوتے ہیں۔''

''میں تو اسے تاکید کر کے آیا تھا۔''

''تم جو کچھ بھی کر آئے تھے، اب جاؤ اور فوراً اسے بلا کر لاؤ۔''

سجن نے صحن والا دروازہ کھولا تو ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ دروازے کے آگے گٹھر سا پڑا تھا جسے دیکھ کر وہی وہ ہڑبڑایا تھا۔ پتنی نے خود آگے بڑھ کر دیکھا تو بولی:

''تم بھی بس کمال کے آدمی ہو، دیکھتے نہیں، سندر ریڑھی والا چادر اوڑھے اونگھ رہا ہے۔ گھوڑی وہ سامنے کھڑی ہے۔''

اتنے میں سندر بھی جاگ اُٹھا۔ کچھ دیر تک اسی بات پر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر گھوڑی پر سامان لاد کر پتنی کاٹھی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ گاؤں سے نکل پڑا۔ کافی دور آ جانے پر سجن مونچھوں میں مسکرا کر پتنی سے کہنے لگا:

''ابھی تو جسا سو کر بھی نہیں اُٹھا ہو گا۔''

یہ بات تھی بھی ٹھیک۔ جسا واقعی اس وقت مزے کی نیند سو رہا تھا۔

پتی پتنی کی یہ یاترا مزے میں کٹ گئی۔ راستے میں کبھی آرام کے لیے، کبھی بھوجن کے لیے یا کبھی پانی پینے کے لیے وہ کسی راہٹ یا راستے میں پڑنے والے گاؤں میں رُک جاتے۔ سورج غروب ہو کر اُفق تک پہنچ چکا تھا کہ دور سے انہیں رتّو کے کے قریب والے کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ بہت چھوٹی سی نہر پار کر کے گاؤں کے باہر والا تالاب بھی نظر آنے لگا، جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے درخت تھے۔

دُھول بھری گلی میں سے ہوتے ہوئے وہ دیپی کی ماسی کے مکان کے سامنے رُک گئے۔ کُنڈی کھٹکھٹائی تو پرسنّی نے دروازہ کھولا۔ وہ دیپی کی ماں باپ کو پہچانتی نہیں تھی اس لیے وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ یاتری بھیتر گھس پڑے، تو وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ صحن میں بچھی چار پائی پر بیٹھی ماسی اور دیپی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی:

''آپ کے مہمان آئے ہیں، لگتا ہے کہ کوئی رشتے ہیں کیونکہ کچھ پوچھے بنا ہی وہ بھیتر چلے آئے۔''

ماسی تو بھاری بھر کم تھی، بھلا اتنی جلدی کیسے اُٹھ پاتی، مگر دیپی کھٹاک سے اُٹھ کر گلیارے کے دروازے کے سامنے جا پہنچی۔ دوسرے ہی پل وہ ''بے بے'' کہہ کر چلا اُٹھی اور بازو پھیلا کر گلیارے کے بھیتر پہنچی اور ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔

ماسی کو یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس کی چھوٹی بہن آئی ہے۔ وہ بھی گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اور پرسنّی کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی وہ دو ہی قدم بڑھ پائی ہوگی کہ سامنے دیپی کی ماں دکھائی دی۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے سے لپیٹ گئیں۔ ماسی کے من میں شک سا اُٹھا، کہ اس طرح اچانک آنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ پوچھا تو دیپی کی ماں بولی:

''سب کُشل منگل ہے۔ رات بیٹھے بیٹھے مَیں نے دیپی کے پتا سے کہا، کہ بٹیا کو دیکھنے کو بڑا من چاہتا ہے۔ اس طرح باتوں باتوں میں یہاں آنے کا پروگرام بن گیا۔''

صحن میں چار پائی ڈال دی گئی اور اس پر اُجلا کھیس بچھ گیا۔ اس بستر پر سجن سنگھ براجمان ہو گیا۔ سندر گھوڑی کو کھونٹے سے باندھنے کے لیے وسیع صحن کے دوسری طرف چلا گیا۔

ماسی بولی:

''دیکھ لے اپنی بٹیا کو کہ کہیں دُبلی تو نہیں ہو گئی۔''

بٹیا کی طرف دیکھ کر ماں بولی:

''بھلا ماسی کے گھر رہ کر وہ دُبلی کیسے ہو سکتی ہے۔ مَیں تو دیکھ رہی ہوں کہ اس کے گالوں پر اور بھی گہری سُرخی جھلک رہی ہے۔''

یہ بات سُن کر پھولی ہوئی ماسی اور زیادہ پھول گئی۔

مہمانوں کے گھر میں آنے سے گہما گہمی ہو گئی۔ گاؤں کی جو بھی عورت گلی سے گزرتی وہ صحن میں معمول سے

زیادہ شور سن کر بھیتر جھانکنے چلی آتی ۔ تب ماسی بتاتی:

''میری چھوٹی بہن آئی ہے ۔ دیپی کی ماں ۔ کیا کہوں، مَیں دُور کر سفر کر نہیں سکتی اور یہ بے چاری گھر کے کاموں سے فرصت نہیں پاتی ۔ دونوں بہنیں ملیں بھی تو کیسے ۔''

ہر آنے والی عورت اپنی خوشی ظاہر کرتی اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد وِداع ہو جاتی ۔ کھانا تیار ہوا تو سُندر سب سے پہلے بھوجن کر کے سو گیا، کیونکہ اُسے صبح سویرے واپس چل دینا تھا۔

گھر کے دوسرے لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ یہاں تک جب سب سو گئے تب بھی دونوں بہنیں پھُسپھساتی رہیں ۔ اسی دوران چھوٹی بہن نے کہا:

''مجھے تو دیپی کی چِنتا کھائے جارہی ہے۔''

''چِنتا کی کیا بات ہے ۔ کیا اوروں کے گھر میں لڑائیاں نہیں ہوتیں ۔ اپنے اپنے وقت پر سب ہی کی شادی ہو جاتی ہے ۔ دیپی کی ابھی عمر ہی کیا ہے ۔''

''عمر تو کچھ بھی نہیں بہن، لیکن دیکھتی نہیں کہ روز بروز کتنی جوان ہوتی جارہی ہے ۔ اس پر جوانی بھی تو قہر بن کر ٹوٹی ہے ۔ جب جب اس پر نظر پڑتی ہے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں ۔''

بڑی بہن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''یہ سب مجھ پر چھوڑ دو ۔ اب سو جاؤ، کل جی بھر کر باتیں کریں گے ۔''

۲

پرسنّی ایسی گہری نیند سوئی کہ جب دوسری صبح جاگی تو اسے لگا کہ ساری رات کچھ پلوں میں ہی ختم ہو گئی ۔ سامنے کچی دیوار کے اوپر دھوپ چمک رہی تھی ۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی، آنکھوں پر چھینٹے دیئے اور سر پر دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر والے دروازے کی طرف لپکی تو ماں نے پوچھا:

''یہ جاگتے ہی کہاں کو چل دی؟''

''دیپی کے پاس جارہی ہوں ۔''

''دیپی، دیپی، دیپی، جب دیکھو دیپی کی دُھن سوار ہے ۔''

''بے بے! دیپی کے ماں باپ آئے ہوئے ہیں ۔ میں نہیں جاؤں گی تو بُرا مانے گی ۔ سوچیں گے کہ ہماری بیٹی کی سب سے گہری سکھی اطمینان سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئی ۔''

''کل ان سے ملاقات نہیں ہوئی کیا؟''

''ہوئی تو، مگر نہ ہونے کے برابر، اندھیرا ہو چکا تھا ۔ مَیں جان بوجھ کر نہیں رکی یہ بھی چِنتا تھی کہ تم انتظار کر رہی ہوگی ۔''

ماں چپ رہ گئی اور پرسنّی جھپاک سے گلی میں جا پہنچی۔ نکڑ پر مڑنے لگی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سامنے صورت سنگھ کھڑا تھا۔
پرسنّی نے دوپٹے کا کونہ اُنگلیوں میں مروڑتے ہوئے پوچھا:
''اتنی صبح کیسے چلے آئے؟''
''اتنی صبح؟ ذرا دھوپ تو دیکھو، سمجھ گیا، تو ابھی ابھی سو کر اُٹھی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ جوں ہی جاگوگی توں ہی باہر کو بھاگوگی۔ جانتی ہو، سورج اُگنے سے پہلے کا یہاں کھڑا ہوں۔''
''مگر کیوں؟''
''یہ تو بتانے آیا ہوں۔''
''مجھے فرصت نہیں ہے۔''
پرسنّی پہلو بچا کر قریب سے گزرنے لگی، تو صورت نے ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔
پرسنّی بگڑ کر بولی:
''یہ کیا خرمستی ہے۔ وقت بے وقت نہیں دیکھتے۔ کہہ دیا نا مجھے فرصت نہیں ہے۔''
''بھاڑ میں گئی تمہاری فرصت، میں خاص طور سے تمہیں سے ملنے آیا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ تمہاری دُھتکار سن کر اپنا سامنہ لے کر واپس اپنے گاؤں کو لوٹ جاؤں؟''
''جو جی چاہے سو کرو۔ اتنا تو سوچو کہ کیا یہ بھی کوئی جگہ ہے بات کرنے کی گلی میں۔''
''میں خود نہیں چاہتا کہ گلی میں بات چیت ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم گوردوارے کو چلو، میں پیچھے پیچھے آتا ہوں۔''
''اگر وہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟''
''بیکار مجھے ٹرخانے کی کوشش مت کرو۔ وہاں کی پھلواری کے کسی کونے میں باتیں کریں گے۔''
دبی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پرسنّی بولی:
''آنے جانے والے ہمیں گھور رہے ہیں۔ تمہیں میری بدنامی کا بھی خیال نہیں ہے؟''
''خیال تو ہے لیکن تم ہی گلی میں اَڑ کر کھڑی ہو۔ میرا کہنا مانو تو کوئی پریشانی نہ ہو۔''
بے بس پرسنّی نے کہا:
''اچھا، تم چلو مَیں آتی ہوں۔''
''نا، نا! مَیں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ تمہارے جھانسے میں آ کر مَیں یہاں سے چلا گیا تو بس سمجھو کہ چلا ہی گیا۔ پہلے تم قدم بڑھاؤ پیچھے پیچھے میں آؤں گا۔''
پرسنّی نے زہریلی نظر ایک بار صورت پر ڈالی اور آگے کو لٹکی ہوئی اپنی موٹی چوٹی پیچھے کی طرف پھینک کر گوردوارے کو چل دی۔

وہ گاؤں کے باہر نکل گئی تو صورت بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ گوردوارے کی پھلواری میں پہنچ کر صورت نے دیکھا کہ پرسنّی دُور ایک کونے میں درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے کھڑی تھی۔ سامنا ہوتے ہی وہ جنگلی بلی کی طرح کھوکھیا کر بولی:

''تم بڑے جھگڑالو آدمی ہو، جھگڑا کرتے ہو۔''

''گلی کے نکڑ پر کھڑی ہو کر تم بیکار کی چل پوں نہ کرتی تو اب تک ہم یہاں پہنچ کر اپنی بات بھی ختم کر چکے ہوتے۔ سارا دن گلیاں ناپتی پھرتی ہو، لیکن پل دو پل کسی بھلے آدمی سے بات کرنے میں بدنامی ہو جانے خوف جتلانے لگتی ہو۔''

''اچھا، اچھا...... بولو۔''

''تمہیں جسّے کا پیغام تو مل گیا ہوگا؟''

''ہاں!''

''کیا منہ لٹکا کر ہاں کر دی۔ اتنی خوشی کی بات سُن کر بھی تمہارے چہرے پر رونق نہیں آئی، تمہیں تو خوشی کے مارے چہکنا چاہیے تھا۔''

پرسنّی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھا کر سپاٹ آواز میں بولی:

''اس میں چہکنے کی کیا بات ہے؟''

''ارے واہ! میری تمہاری شادی ہونے جا رہی ہے اور تم پوچھ رہی ہو، کہ چہکنے کی کیا بات ہے۔''

پرسنّی نے بے وفا طوطے کی طرح پٹاک سے ایک نظر صورت پر ڈالی اور طنزیہ لہجے میں بولی:

''تم سے کس زنخے نے کہہ دیا کہ تمہاری میری شادی ہونے والی ہے؟''

''ہاں زنخے نے ہی کہا ہے، اس کا نام جسّا ہے، تم اُسی کو تو اپنا بھائی کہتی ہو نا۔''

''جسّے کو زنخا کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس نے سُن لیا تو تمہاری گردن مروڑ کر پھینک دے گا۔''

''بڑا رُعب دکھا رہی ہو سالے کا۔ ابھی اسے ٹھیک سے سالا بن تو لینے دو۔''

''اس جنم میں تو وہ تمہارا سالا بننے سے رہا۔''

''اری جانی! سالا تو وہ بن ہی چکا ہے۔''

''سپنے میں؟''

''جی نہیں، اس نے اپنی زبان سے مانا ہے کہ تمہاری میری شادی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ مَیں پرسنّی کو پیغام بھیج دوں گا۔ تم مان چکی ہو، کہ تمہیں اس کا پیغام مل گیا ہے۔''

''ہاں...... ارے پیغام یہی تھا کہ اسے تمہارا میرا رشتہ منظور نہیں ہے۔''

''جاؤ جاؤ! یہ جھانسہ کسی اور کو دینا۔ دو دن پہلے کی بات ہے۔ اس کی رضامندی حاصل ہو جانے پر مَیں نے اس کے پاؤں چھوئے۔''

''اب چاہے تم نے پاؤں چھوئے، یا ناک رگڑی، مگر مجھے یہاں پیغام ملا ہے کہ تمہارا میرا رشتہ نہیں ہو سکتا۔''

پرسنّی کا لہجہ گھمبیر تھا۔ اس کو شک بھی گھمبیر تھی۔ صورت سنگھ کے من میں شُبہ اُٹھا اور وہ تیز آواز میں بولا:

''دیکھو پرسنّی! اس معاملے میں مجھ سے مذاق مت کرو، کیونکہ مذاق کا نتیجہ بھی بڑا بھیانک ہو سکتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ نتیجہ بھی بھیانک ہوگا، میرا مطلب ہے کہ تمہارے لیے بھیانک ہوگا۔ مگر جہاں تک پیغام کا تعلق ہے، میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔''

صورت چپ چاپ ٹکٹکی باندھے پرسنّی کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ صورت پھر بولا:

جسا اتنی کمینی حرکت کرنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا مگر تم اسی بات پر اڑی رہیں، تو مجھے خود اس کے پاس جا کر پوچھنا پڑے گا کہ اس نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟''

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ اپنے پیغام میں اس نے مجھے تم سے ناطہ توڑنے کے لیے نہیں کہا تھا تو جو ڈنڈ چاہو مجھے دے دینا۔''

اتنا کہہ کر پرسنّی وہاں سے چل دی۔

اب کے صورت نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے من میں لاوا سا اُبل رہا تھا۔ جسا چاہتا تو اس کے منہ پر ہی پرسنّی کے بارے میں انکار کر سکتا تھا۔ اسے انکار کرنے کا اختیار تھا۔ وہ ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اس سے خوفزدہ ہو کر منہ کے سامنے تو اس رشتے کو قبول کر لیتا اور بعد میں انکار کر دیتا۔

بڑا سوچا، بڑی عقل دوڑائی کہ یہ ہُوا کیسے؟ بے شک پرسنّی نے جھوٹ نہیں بولا تھا مگر جسے نے ایسا پیغام کیوں بھیجا، یہ اپنے آپ میں ہی بڑی دلچسپ بات تھی۔

ہوا یہ کہ جس روز ہری پورے میں صورت نے چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں کو یہ خبر سنائی کہ جسے نے پرسنّی سے اس کا رشتہ قبول کر لیا ہے، تو ان سب کے من پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی۔ دلیر سنگھ جیسے غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ چنن کو نہ جانے کیوں اس بات کی آشا تھی کہ جسے کے اس وچن میں کوئی سچائی نہیں ہو سکتی اور آخر کار صورت اس سے مایوس ہو کر پھر اس کے پاس آئے گا۔

غصے کی وجہ سے لکّھا کا بھی بُرا حال تھا، مگر من ہی من وہ سوچتا رہا کہ اب بھی کوئی داؤ بھڑایا جا سکتا تھا کہ نہیں۔ آخر میں اسے ایک طریقہ سوجھ گیا۔ یہ پھولا نہیں سمایا۔ اس نے اس ڈر سے بھائی اور باپ کو اپنا پروگرام نہیں بتایا کہ کہیں وہ اِسے ردنہ کر دیں۔ اس لیے وہ چپ چاپ کھسکا اور جسے کو اس کے رَہٹ پر جا ملا۔

جسّے نے دُور سے اِسے آتے دیکھا تو اسے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ دلوں میں جوالہ مکھی بھڑکنے کے باوجود اس کی آپس میں بات چیت بند نہیں ہوئی تھی۔ لکّھا نے اونچی آواز میں ''ست سری اکال'' کا نعرہ لگایا۔

جسّے نے بھی خوش مزاجی سے جواب دیا:

''ست سری اکال! سناؤ لکّھا کیسے آنا ہوا؟''

''مَیں اِدھر اپنے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا، تم دکھائی دیے تو مَیں اِدھر چلا آیا۔ سوچا تھوڑی گپ چپ رہے گی۔ چاہے دُنیا کچھ بھی کہے، آخر ہم رشتے میں بھائی بھائی ہیں۔''

جسا من میں چونکا اور محسوس کیا کہ ضرور ہی کسی خاص کام سے لکّھا یہاں آیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی جسا اسی رنگ میں رنگ اور کہنے لگا:

''دُنیا کا کیا ہے، وہ تو بھائی بھائی کو لڑا لڑا کر تماشا دیکھتی ہے۔''

لکّھا کو اس بات کی آشا نہیں تھی کہ جسّے کا ردِ عمل اتنا مناسب ہوگا۔ ضرور ہی اس کا منصوبہ کامیاب رہے گا۔ ہوا میں ہاتھ اُٹھا کر بولا:

''لاکھ روپے کی بات کہہ دی تم نے۔ کیا کروں، اس گاؤں کا ماحول بڑا خراب ہے۔ بھائیوں کو ایک دوسرے سے بھڑانے میں لوگوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ دوسروں کی بات چھوڑو، ہمارے اپنے گھر میں ہی کچھ ایسا ہوتا ہے، جو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔''

جسّے کے کان کھڑے ہو گئے، مگر اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آہستہ آواز میں بولا:

''کیوں، ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''صورت سنگھ کو تو تم بھلی بھانت جانتے ہو۔''

''ہاں، مجھے وہ ایک دو بار مل چکا ہے۔''

''اپنی کسی مشکل کے لیے وہ تم سے چاہے ہزار بار ملے، مگر ہمارے یہاں آ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا تو اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے تو دلیر کو صاف کہہ دیا کہ صورت کا ہمارے یہاں آنا جانا یہاں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ دوست کے ناطے آئے، کھائے پیے اور جب تک اس کا جی چاہے ٹکے۔ مگر اس کی کسی حرکت یا بات سے ہمارے تمہارے تعلقات پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔''

''ہاں، صورت سنگھ بتا رہا تھا کہ وہ جب بھی یہاں آتا ہے، تمہارے یہاں ٹھہرتا ہے۔ میں نے کبھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔''

''اعتراض کی کوئی بات بھی نہیں لیکن اگر ہم دونوں کے بیچ کوئی خاص بات چل رہی ہو، تو ہمیں اس سے الگ رہنا چاہیے۔ آگے چل کر نہ جانے تم دونوں کے تعلقات کیا کروٹ لیں۔''

لکّھا سب کچھ جانتے ہوئے بھی چاہتا تھا کہ جسا خود اسے بتائے کہ صورت اس کے پاس کس کام سے آیا تھا۔ اب جسّے نے اس بارے میں خاموشی اختیار کر لی، تو لکّھا بولا:

''اسی کے بتانے سے ہم کو پتا چلا کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو دُور کی رشتے سے تمہاری بہن لگتی ہے۔''

''اس نے ٹھیک کہا۔''

''ہمیں بھلا اس بات سے کیا مطلب؟ پہلے جب وہ آیا تو بہت مایوس تھا، وہ سمجھتا تھا کہ تم اسے بات کی اجازت ہرگز نہ دو گے۔ ہم سب بھی سوچتے تھے کہ اگر یہ رشتہ نہ ہو تو اچھا ہے۔''

''لیکن مَیں نے تو اِسے اجازت دے دی۔''

''ہاں، ہمیں اس بات کا اُسی وقت پتا چل گیا تھا۔''

''کیسے؟''

''خود اس ہی نے بتایا تھا۔''

''لیکن تم لوگوں کے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا، تم لوگ یہ محسوس کیوں کرتے تھے کہ یہ رشتہ نہ ہو تو اچھا ہے؟''

''چھوڑو جسے! اب تم نے رضامندی دے دی ہے تو ضرور ہی کچھ سوچ سمجھ کر تم نے ایسا کیا ہوگا۔ ہمارا اس مالے میں بولنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔''

''یہ رشتہ تو اَب بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں یہ رشتہ ٹھیک نہیں رہے گا؟''

''ماپھ کرنا بھائی جسے، ہم اس مالوں میں بالکل نہیں بولیں گے۔ تم خود سمجھ دار ہو، تم نے دُنیا کا اُونچ نیچ دیکھا ہے تم جو کچھ کرو گے سو ٹھیک ہی کرو گے۔ ہم اس مالے میں کچھ بولیں تو کل تمہیں کو اس بات پر شکایت ہو کہ ہم نے تمہیں غلط راستے پر ڈال دیا، یا کل صورت سنگھ ہی ہم سے آ کر کہہ سکتا ہے کہ ہم نے اُس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ نہ بابا ہمارا کچھ نہ کہنا ہی ٹھیک ہوگا۔''

''کچھ نہ کہہ کر بھی تم نے میری بھلائی کی بات کہہ دی ہے۔''

لگھا کو اپنی کامیابی پر بہت خوشی ہو رہی تھی، بولا:

''ذرا سی بات سے اندازہ لگالو کہ وہی صورت سنگھ جو پہلے نہ جانے تمہارے بارے میں کیا کیا کہا کرتا تھا۔ لیکن رشتہ ہو جانے پر ہمارے پاس ایک پل نہیں بیٹھا۔ ایسا طوطا چشم آدمی ہے۔''

''ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔''

''ویسے بھی جسے، تم نے صورت کے بارے میں اچھی طرح جانکاری حاصل کر لی ہے، یا نہیں؟ تمہیں شاید نہیں مالوم کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کل کو کوئی بات ہو جائے تو اس کے ساتھ تمہاری ہماری بدنامی بھی تو ہوگی۔ ہم دونوں کا خاندان علاقے بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے...... تمہارا اور میرا جو بھی آپس میں اختلاف رائے ہو، پھر بھی ہمارا خون کا

رشتہ ہے۔ جہاں ہم میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا، دوسرا بولے بنا نہیں رہ سکے گا۔ جب تم لوگوں کی نظر میں صورت سنگھ اس رِشتے کے قابل نہیں ہے۔ تو مَیں ضرور ہی یہ رشتہ توڑ دوں گا۔"

لکّھا جیسے اُچھل پڑا۔ جسا اتنا آسان شخص ہوگا۔ یہ بات لکّھا کے تصور میں بھی نہیں آئی تھی۔ جب صورت سنگھ کو پتا چلے گا کہ جسا اپنے وچن سے مکر گیا ہے، تو وہ جل بھن کر کباب ہو جائے گا اور پھر وہ گاؤں میں آ کر ہمارا ہی دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

لکّھا نے پھر انکساری سے کہا:

"جسّے! یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا، اس لیے میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔ خود ہی سوچو کہ مجھے اس میں کیا لینا دینا ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ظاہر ہے۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ بھائی بھائی کا بھلا نہیں سوچے گا تو پھر کون سوچے گا۔"

"ہاں جسّے! مَیں تو تمہیں اپنا بھائی سمجھ کر ہی آیا ہوں۔ ممکن ہے کہ میرے بھائی اور باپ کے من میں کوئی نارمل ہو، مگر میں نے تامل نہیں کیا۔ مَیں تو چلا ہی آیا۔"

"بہت اچھا کیا۔ مَیں تمہارا احسان مانتا ہوں۔ مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ صورت سنگھ سے پرسّی کا رِشتہ کبھی نہیں ہونے دُوں گا۔"

لکّھا خوش ہو کر بولا:

"جی خوش ہو گیا۔ مجھے بھی تھوڑا تامل ہو رہا تھا کہ کہیں تم مجھ سے یہ نہ کہو کہ میرے نجی معاملوں میں تم لوگوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے۔ مگر نہیں، تم نے میرا مان رکھ لیا۔ سچ! کتنی مورکھتا بھی یہ ہماری کہ ہم غیروں کے بہکاوے میں آ کر ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے۔"

جسّے نے لکّھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

"صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے، تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"آہاہا۔"

اِس طرح دو چار میٹھی میٹھی باتیں اور ہوئیں، پھر لکّھا جھومتا جھامتا وہاں سے چل دیا۔ اگلے دِن جسّے نے بھی پرسّی کو پیغام دیا کہ یہ رشتہ اسے منظور نہیں تھا۔

۳

صورت سنگھ کو کچھ پتا نہیں تھا کہ جن لوگوں کو وہ اپنا دوست سمجھتا تھا، انہیں میں سے ایک نے اس کے کیے

کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بے شک جسا پرسّی اور صورت سنگھ کے رشتے پر دراصل کبھی خوش نہیں ہوسکتا تھا بلکہ اس کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ پرسّی سے اس کی سازش تو یہی تھی کہ کسی طرح صورت کا پتا کاٹا جائے۔ جسا صورت دو ٹک جواب بھی دے سکتا تھا، مگر جسا اب کوئی ایسا بہانہ کھوج رہا تھا، جس کی بنیاد پر وہ صورت سنگھ کو ٹرخا سکے اور اس سے یہ کہہ سکے کہ کس بات کی وجہ سے وہ اپنا دِیا ہوا وچن توڑنے پر بے بس ہو گیا...... خوش قسمتی سے خود لکّھا نے اِسے کسی قسم کا بہانہ ڈھونڈنے کی ضرورت سے ہی آزاد کر دیا۔

گوردوارے کی پھلواری میں ملاقات کے بعد پرسّی کے وداع ہونے پر صورت وہاں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ یکا یک ہی اپنے آپ کو اس حالت میں پا کر اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ کیا کرے گا، یا کیا کر سکتا تھا، یا ایسی حالت ہی کیوں پیدا ہوئی...... اِسی قسم کے سوالات کے گولے اس کے دماغ میں پھٹ رہے تھے۔

پرسّی صورت سے پیچھا چھڑا کر بھاگی اور سیدھی دیپی کے گھر پہنچی۔ دیپی کے ماتا پتا سے اس کا تعارف ہو ہی چکا تھا اور وہ ان کے سامنے بلا جھجک بات چیت کر سکتی تھی اور گھوم پھر سکتی تھی۔

جب ذرا موقع ملا تو پرسّی نے دیپی کو الگ لے جا کر پوچھا:

''کہو کوئی کام کی بات بھی ہوئی؟''

''کام کی بات کیسی؟''

''اَری، وہی تیری شادی کی۔''

''دُھت تیری کی۔''

''مَیں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ تیرے ماتا پتا ضرور ہی اس مسئلہ کو اُٹھائیں گے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ یہاں پر اسی کام سے آئے ہیں۔''

''نہیں، مجھے دیکھے اتنا عرصہ ہو چکا تھا۔ اِن کا جی چاہا کہ ایک نظر اپنی بیٹی کو دیکھ لیں......''

پرسّی نے بات کاٹ کر کہا:

''بس، یہی تو تمہاری اُلّو پنے کی باتیں ہیں۔ تم اِن کے لیے کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں ہو کہ جسے دیکھنے کے لیے وہ یہاں چلے آتے۔''

''یہاں نہ آتے، تو کیا کرتے؟''

''تمہیں بُلا بھیجتے۔''

''ہری پورے میں تو جسّے کا ڈر تھا نا اِنہیں۔''

''اچھا تو یہاں پر جسّے کا کوئی ڈر نہیں ہے؟''

وہ دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

دیپی گھمبیر بن کر بولی:

''اَری پرسنّی، کہیں تیرا وِچار ٹھیک نکلا تو؟''

''یہی تو سوچنے کی بات ہے۔''

''باپ رِے! کیسے مزے سے دن کٹ رہے تھے۔ ہری پورے میں اس ڈر سے کہ کہیں میں جسّے سے ملنے نہ چل دُوں، میری ماں مجھے گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھنے دیتی تھی۔ یہاں کتنا مزہ ہے۔ جب جہاں جی چاہے جاؤ، آؤ۔''

''ارے ہاں! اسی بات پر یاد آیا کہ آج رات پرمی کے گھر گانا ہوگا۔''

''اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے نا؟''

''ہاں، تمہیں نہیں مالوم کیا؟''

''وہ سکھی تو تمہاری ہے نا۔ اس سے میری ملاقات تو یہاں آ کر ہوئی۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن پرمی نے خود تم سے کہا تھا، آج رات آنے کے لیے۔''

''ہاں، یاد آ گیا۔''

''تو؟''

''تو کیا چلیں گے۔''

''تمہاری بے بے تو کوئی اِعتراض نہیں اُٹھائے گی نا؟''

''یہاں بے بے کا نہیں، میری ماسی کا راج ہے۔ میں اس کی رضامندی پہلے سے لے لوں گی۔ تب بے بے ٹانگ اڑانے کا حوصلہ نہیں کر پائے گی۔''

''اچھا بھئی، مَیں تو چلی۔''

''کیوں؟''

''دیکھتی نہیں، کتنی دیر ہو گئی ہے۔ گھر پر بھوجن بھی تو کرنا ہے۔''

''بھوجن یہیں پر کر لینا۔''

''نہ بابا! اماں کی ڈانٹ کون کھائے گا۔ یہاں آتے وقت بھی انہوں نے تھوڑی بہت کُرید تو کی تھی۔ میرے گھر میں میری ماں کا ہی راج ہے، ماسی کا نہیں۔''

یہ کہہ کر پرسنّی ہنسنے لگی۔

دیپی کچھ اُداس ہو کر بولی:

''اب کب ملاقات ہو گی؟''

''کمال کرتی ہو، کیا میں کہیں پردیس جا رہی ہوں۔ شام کا بھوجن کرنے کے بعد آؤں گی، تم تیار رہنا۔ ہم دونوں پرمی کے گھر چلیں گے۔ خوب چہل رہے گی۔''

دیپی منہ بسور کر بولی:
''صبح بھی تو اتنی دیر سے آئی تھی۔''
''ارے ماں! دیر کی وجہ تو بتانا ہی بھول گئی۔ نہ تم نے پوچھا، نہ میں نے بتایا۔''
''اب بتا دے دنا۔''
''اِدھر آ رہی تھی تو راستے میں صورت مل گیا۔''
''اوہ سمجھی۔''
''کیوں شرارت سے آنکھیں مٹکا رہی ہو جانتی ہے کہ میں صورت پر تھوکتی بھی نہیں۔''
''اس پر تھوکنے میں کیا حرج ہے۔ کیا تمہیں تھوکنے پر بھی کوئی اعتراض ہے؟''
''نہیں تو۔''
''لگتا ہے کہ اتنی دیر اس پر تھوکنے میں ہی لگ گئی تجھے۔''
پرسنی نے چپت مارنے کے انداز سے ہاتھ اوپر اُٹھایا اور دانتوں کے بیچ میں سے بولی:
''ایک دن مار کھائے گی مجھ سے۔''
''دیکھو بھئی، ہاتھ چلانے کی نہیں مانیں گے۔ صرف زبان چلاؤ، ہاں تو پھر کیا ہوا؟''
''وہ مجھے گوردوارے کی پھلواری میں لے گیا۔''
''ارے واہ! بالکل اسی طرح ہیر بھی رانجھے سے ملنے کے لیے کالے باغ میں گئی تھی۔''
''بکواس نہیں بند کرو گی، تو مَیں اس کے آگے کچھ نہیں کہوں گی۔''
''میری پیاری سکھی! بتا تو اس کے بعد کیا ہوا کیا تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ تو نہیں کیا گیا جو رانجھے نے ہیر کے ساتھ کیا تھا؟''
پرسنی سچ مچ ہی بگڑ اُٹھی۔ ماتھے پر بل ڈال کر بولی:
''اچھا تو مَیں چلی، تمہیں اس وقت خرمستی سوجھ رہی ہے۔''
''اری، کچھ تو بتاتی جا، مَیں اپنی بھول کے لیے معافی چاہتی ہوں۔''
''نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر پہنچ کر پہلے ڈانٹ کھانی پڑے گی اور پھر کھانا ملے گا۔''
''تُو تو سچ مچ روٹھ گئی۔''
''رُوٹھی نہیں، لیکن باقی باتیں اب رات کو ہی ہوں گی۔''
چلتے چلتے پرسنی پل بھر کو رُکی اور ایک اُنگلی اُٹھا کر دیپی کو سمجھانے لگی:
''دیکھ اپنی بے بے اور ماسی کی بات چیت کی بھنک لیتی رہنا۔ ہمیں مالوم ہونا چاہیے کہ وہ اگلا کون سا قدم اُٹھانے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چپ چاپ تمہاری کہیں منگنی کر ڈالیں۔ ایسی حالت میں تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، سمجھی؟''

''ہاں، سمجھ گئی۔''

پرسنی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چلی گئی۔

دن بھر دیپی، ماسی اور بے بے کی باتوں کی طرف کان لگائے رہی، مگر کوئی بھی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جس سے کہ اسے پریشانی کا احساس ہوتا۔ اس کے رشتے یا شادی کی بات تک نہیں چلی۔

دیہات میں اِن دنوں اندھیرا ہوتے ہی کھانا کھا لیا جاتا تھا، مٹی کے دیئے کی روشنی میں گھر کا کام نپٹانا کٹھن ہو جاتا تھا۔ دیپی بھی کھا پی کر تیار ہو گئی اور پرسنی کا انتظار کرنے لگی۔

پرسنی دیر سے پہنچی۔ دیپی اس پر بگڑی تو اس نے کہا:

''جانتی تو ہے، مجھے گھر کا سارا کام نپٹانا پڑتا ہے۔ اسے نپٹائے بنا میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔''

وہ گھر سے چلیں تو گلی میں دیپی نے صورت سنگھ سے ملاقات والی بات پوچھی...... پرسنی نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

پری کے مکان کے قریب پہنچیں، تو ڈھولک بجنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ بھیتر والے پسار میں لڑکیوں کا جھمگٹا لگا تھا۔ ان دونوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان پر نظر پڑی تو بڑے زور کا ہلڑ مچا۔ دیر سے پہنچنے کی جواب طلبی کی گئی۔ کچھ دیر تک تُو تُو مَیں مَیں ہوتی رہی۔ آخر پرسنی نے ڈھولک تھامی اور دیپی نے روڑا پکڑ لیا۔ اِدھر پرسنی ڈھولک بجانے لگی تو اُدھر دیپی ڈھولک کی لکڑی پر روڑا بجانے لگی۔

تھوڑی ہی دیر محفل گرم ہو گئی۔ ایک گیت ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ کچھ لڑکیوں نے گھنگھرو باندھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ خوب دھما چوکڑی مچی۔

آدھی رات کے کچھ پہلے یہ محفل ختم ہو گئی۔ دونوں سکھیاں لوٹنے لگیں، تو دیپی نے پرسنی کا بازو تھام کر کہا:

''تمہیں میرے گھر تک چلنا ہو گا۔''

''وہ کیوں؟''

''مجھے وہاں تک چھوڑ آنا۔''

''اکیلی کیوں نہیں جا سکتی؟''

''ڈر لگتا ہے۔''

''ارے اب میں تم کو چھوڑ کر اپنے گھر جاؤں گی تو کیا مجھے ڈر نہیں لگے گا؟''

''تمہیں جانے کون دے گا؟''

''زبردستی ہے کیا؟''

''ہاں!''

پرسنی چنچلتا سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی:

''مَیں پہلے سے ہی جانتی تھی کہ تم کیا کرنے والی ہو۔ مَیں نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ زیادہ دیر ہو گئی

تو مَیں دیپی کے گھر میں ہی سو جاؤں گی۔''
''شاباش پٹھی۔''
''ہٹ! کیسی بازاری زبان بولتی ہے۔''
''گھر چل، پھر مَیں تجھ سے بازاری حرکتیں بھی کروں گی۔''
''تُو سمجھتی ہے کہ مَیں جوابی کارروائی نہیں کر سکتی؟''
اس طرح بے تکی باتیں کرتے ہوئے وہ دیپی کے مکان تک پہنچ گئیں۔ دیپی ہاتھ اُٹھا کر کُنڈا کھٹکھٹانے لگی تو پرسنّی نے اِسے روک کر کہا:
''ٹھہر! شاید بھیتر سے کُنڈی نہ چڑھی ہو۔ اگر ہم چپکے سے بھیتر گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو ممکن ہے کہ تمہاری بے بے اور ماسی کی بات چیت سننے کا موقع مل جائے گا۔''
''ہو سکتا ہے کہ وہ سو گئی ہوں۔''
''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جاگ رہی ہوں اور اس موقع کا فائدہ اُٹھا کر چپکے چپکے خاص قسم کی باتیں کر رہی ہوں۔''
تب پرسنّی نے دروازے کو دھیرے سے دھکیلا۔ مگر دروازہ تھوڑا سا کھل کر رہ گیا۔ پرسنّی مایوس ہو کر بولی:
''کُنڈی تو بھیتر سے چڑھی ہوئی ہے۔ اب دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔''
''ٹھہر!''...... دیپی نے ٹوکا۔ اور پھر تھوڑے کھلے دروازے میں اپنا ہاتھ گھسیڑ دیا۔ اِدھر اُدھر ٹٹولنے کے بعد اس کا ہاتھ کُنڈی تک پہنچ گیا اور وہ دھیرے سے کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ پرسنّی خوش ہو کر بولی:
''واہ ری تیرا جواب ہی نہیں ہے۔''
''اصل بات یہ ہے کہ بیچ والی یہ کُنڈی ڈھیلی ہے اور جو کوئی ترکیب جانتا ہو وہ اسے کھول سکتا ہے۔ اسی لیے ہم کُنڈی میں تالا بھی لگا دیا کرتے ہیں۔ ابھی ماں کو ہمارے پہنچنے کا انتظار ہوگا، اسی لیے تالا نہیں لگا۔''
یہ ساری باتیں پھسپھساتی آواز میں ہوئیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم ناپتی ہوئیں اندر گھسیں اور گلیارے کے بھیتر والے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو سرسوں کے تیل کا دِیا جل رہا تھا۔ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ آواز اِتنی اُونچی تھی کہ گلیارے میں کھڑے کھڑے سب کچھ اِن کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ شاید وہ دونوں بہنیں بے فکر تھیں کہ اس وقت لڑکی گھر میں موجود نہیں تھی۔ اتفاق سے بات بھی دیپی کی شادی کی چل رہی تھی۔ دیپی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
پرسنّی بھی گلیارے میں کھڑی کھڑی سر آگے کو بڑھا کر سُن رہی تھی۔
دیپی کی ماں وہی اپنا پُرانا رونا رو رہی تھی کہ دیپی کی شادی کی چنتا اِسے بھیتر ہی بھیتر کھائے جا رہی تھی۔
ماسی چھوٹی بہن کو ڈانٹتے ہوئے بولی:

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں چنتا کی کیا بات ہے۔ دیپی کو تو مَیں نے اپنی بیٹی بنالیا ہے۔''
''جیسے میری بیٹی، ویسے تمہاری بیٹی، بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟''
''لیکن میں کہنے تک ہی نہیں رہوں گی۔ مَیں شادی کا سارا خرچ کروں گی۔ تم پر ایک پیسے کا بوجھ نہیں پڑنے دوں گی۔''
''یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنی اچھی بہن ملی، لیکن خرچ کا مسئلہ تو بعد میں اُٹھے گا۔ پہلے تو لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔''
''کہہ دیا نا کہ چنتا مت کر۔ مَیں نے لڑکا بھی ڈھونڈ لیا ہے۔''
دیپی کی ماں فرش سے اُچھل پڑی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
''سچ؟''
''نہیں تو کیا مَیں تُم سے مذاق کروں گی؟''
''مَیں بھی تو سُنوں کہ وہ لڑکا کون ہے۔''
''سُن کر کیا کرو گی؟ جب تک دیکھو گی نہیں، سُننے سے کیا پتا چلے گا؟''
''پر تم نے تو دیکھا ہے؟''
''ضرور دیکھا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ مَیں نے اِسے اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔''
''کہاں کا رہنے والا ہے؟''
''یہ مَیں نہیں جانتی، لیکن اِتنا جانتی ہوں کہ کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ دراصل اور زیادہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ جب یہاں سے چلا گیا، تو مَیں نے پکّا ارادہ کرلیا، کہ دیپی کی شادی اِسی سے کروں گی۔''
''لیکن وہ ملا کہاں؟''
''یہیں ہمارے گاؤں کے گوردوارے میں جو میلہ لگا تھا وہاں وہ بھی آیا تھا......''
اس کے بعد ماسی نے لمبی کہانی سُنا ڈالی۔ آخر میں بولی:
''لڑکا دیکھو گی تو مسحور ہو جاؤ گی۔ جب تک میلہ چلتا رہا وہ ہمارے گھر میں آتا رہا۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد میں نے بھانپ لیا کہ دیپی اور وہ ایک دوسرے کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اور بھی اچھا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، دل مل گئے......تو پھر اور کیا چاہیے۔''
دیپی کی ماں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے سے میل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ زمانہ بھی ایسا نہیں تھا، مگر ماسی کے دماغ پر جو دُھن سوار ہو جائے، اس کے آگے جُھکے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
چھوٹی بہن بولی:
''اب جو مناسب سمجھو، سو کرو، بیٹی تمہاری ہے۔ ہم نے تو اِسے تمہارے حوالے کر دیا ہے لیکن

بہن، تُم نے لڑکے کا نام تو پوچھا ہوگا۔"

"کیوں نہیں، وہ پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔ اب کے میں باقی جانکاری بھی حاصل کرلوں گی اور یہ بھی پوچھ لوں گی کہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے۔"

"نام کیا ہے اِس کا؟"

"جسا سنگھ!"

یہ سنتے ہی دیپی کی ماں بے اختیار ہی پیچھے کو کھسک گئی۔ اِسے چکر سا آنے لگا۔

دیپی اور پرسنی نے اس بات پر ایک دم ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ گلیارے میں ہی ناچنے لگیں اور بار بار ایک دوسرے کے گلے سے لپٹنے لگیں۔

دیپی بولی:

"اب ہمارا دالان میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اِنہیں شک ہو جائے گا کہ شاید ہم نے اِن کی باتیں سُن لی ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟"

"گلی میں چلو، میں بھیتر سے ہاتھ ڈال کر پھر کُنڈی چڑھا دوں گی۔"

پرسنی چٹکی بجا کر بولی:

"بس، سمجھ میں آ گئی تمہاری بات۔"

وہ دونوں اُچھل کر گلی میں پہنچ گئیں۔ دیپی نے بھیتر ہاتھ ڈال کر کُنڈی چڑھا دی اور باہر لٹکتے ہوئے بڑے کُنڈے کو پکڑ کر زور سے کھٹکھٹایا۔

دیپی کی ماں دروازہ کھولنے آئی۔ دونوں لڑکیاں غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ چہرہ تھوڑا اُترا ہوا تھا اور اس پر پریشانی کی علامات دکھائی دے رہی تھیں۔ مری ہوئی آواز میں بولی:

"بہت دیر کر دی تم لوگوں نے۔"

دیپی بولی:

"پرسنی میرے ساتھ ہی سوئے گی آج۔"

"ٹھیک ہے، چلو اب جلدی سے سو جاؤ۔"

دونوں سکھیاں پڑے پڑی چار پائی پر لیٹ گئیں اور دھیرے دھیرے پُھسپھسانے لگیں۔ پرسنی بولی:

"دیکھا، کیسی اچھی خوشخبری سُننے کو ملی۔"

"ہاں...... لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تُم ہی تو کہتی تھیں کہ ماسی کے سامنے نہ تمہاری بے بے اور نہ پتا سر اُٹھا سکتے ہیں۔"

ا

ہری پورہ کے مغرب کی طرف لال سورج اُفق پر اَٹکا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُفق کی ریکھا کے نیچے غروب ہو گیا۔ اندھیرے کا آنچل مشرق سے مغرب تک لہرا گیا اور اس میں ستارے جھلملانے لگے۔ گاؤں سے آدھے میل کی دُوری پر مغرب کی طرف یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے زمین پر بھی ننھے ننھے تارے جھلملا رہے ہیں۔ یہ تارے نہیں تھے، بلکہ رنگ برنگے کاغذوں کی لالٹینیں تھیں، جو گوردوارے کے چاروں طرف درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کے ساتھ لٹکا دی گئی تھیں۔

کوئی تہوار تھا، جو تین دن تین رات تک چلتا تھا۔ آس پاس کے دیہات سے سنگتیں جمع ہوتیں اور ان کے راگی جتھے شبد کیرتن کے ذریعے انہیں سکون پہنچاتے تھے۔ ایسے میلوں پر عام لوگوں کو ایک دوسرے سے میل جول، اظہارِ خیال، گپ شپ اور بات چیت کے تبادلے کا موقع ملتا۔ یہ چھوٹا سا تاریخی گوردوارہ بھیتر سے بھی خوب سجا ہوا تھا۔ بجلی کے بجائے گیس کے ہنڈوں، مٹی کے دِیوں اور موم بتیوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ گورو گرنتھ صاحب کے سامنے لمبی چوڑی دَری پر اُجلی چادریں بچھی ہوتی تھیں، جن پر شبد کیرتن کرنے والے راگی ہارمونیم اور طبلے کے ساتھ گوردوانی کے شبد گایا کرتے تھے۔

آج رات بھی ایسے ہی مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے احاطے کی پھلواری میں تالاب کے کنارے کنارے دیپ جل رہے تھے اور تالاب کے جگہ جگہ پر کائی سے ڈھکے پانی میں سے مینڈک اُبلی اُبلی آنکھوں سے عجیب و غریب روشنیوں کو دیکھ رہے تھے۔ بوڑھی اور بیوہ عورتیں، گورو کے لنگر میں بھوجن تیار کر رہی تھیں، نوجوان لڑکیاں پھلواری اور کھیتوں میں ہرنیوں کی طرح چھلانگیں لگاتی پھر رہی تھیں۔ ان میں دیپی بھی تھی۔ اس کے ماں باپ اِسے واپس لے آئے تھے۔ شادی کے مسئلے نے نئی کروٹ بدل لی تھی۔ یہ سب کچھ بتانے کے لیے اس نے جسّے کو بلا بھیجا تھا مگر وہ ابھی تک گوردوارے میں نہیں آیا تھا۔

جسّے کا چاچا ململ کی اُجلی پگڑی باندھے مردوں کے ایک گٹ میں بیٹھا تھا۔ مانڈ لگی پگڑی کا ایک شملہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور دوسرا پڑ پھیلائے کندھے پر جھول رہا تھا۔ اس کے لگ بھگ سب پرانے ساتھی اور مددگار اس وقت اس کے ساتھ تھے۔ لدّھا سنگھ، کشن سنگھ، وریام سنگھ، کرن پال سنگھ وغیرہ۔ اب چنن سنگھ اور اس کے بیٹے کھلم کھلا اپنی دُشمنی کا دکھاوا نہیں کرتے تھے۔ وہ گوردوارے میں آئے، گورو گرنتھ صاحب کے آگے ماتھا ٹیکا، تھوڑی دیر شبد کیرتن سنا اور پھر اپنے سارے دَل سمیت جب وہ بگّا سنگھ کے دَل کے قریب سے گزرے، تو واہ گورو جی کا

خالصہ، واہگورو جی کی پھتح، کہہ کر وہیں پر رُک گئے۔ دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں ایک دوسرے کا کُشل منگل پوچھا گیا اور وہ آگے چلے گئے۔ اب ان کی دُشمنی من کی گہرائیوں میں چلی گئی تھی۔

لالہ بالمکند اب بھی گاؤں کے جانے مانے بزرگ تسلیم کیے جاتے تھے۔ وہ دونوں گٹوں میں اپنا رنگ پانی جمائے رکھتے۔ مگر ہر ایک کا رنگ پانی دکھاوے کا تھا۔ اصلی شخصیت تو جسا سنگھ کی تھی، جس سے گاؤں کا لگ بھگ ہر شخص متاثر تھا۔ اگرچہ جسا وہ شخص تھا، جس نے کبھی جان بوجھ کر اپنا رنگ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی خاموشی اور چلنے پھرنے کا انداز اور اس کے اچھے رویے سے ہی لوگوں کے من میں اس کے لیے بڑی عزت واحترام پیدا ہو چکا تھا۔ ٹھینے کے قتل کے واقعہ کے بعد گاؤں اور علاقہ بھر میں جو اس کی دَھاک بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس عزت سے مختلف اپنے آپ میں الگ چیز تھی۔

کشن سنگھ جیسے صلاح کار بھی اب کسی قسم کی رائے نہیں دیتے تھے کیونکہ بگے کو ان کے صلاح مشوروں کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ چنن سنگھ کے ساتھی جیسے شام سنگھ، بدھا سنگھ، جیون سنگھ وغیرہ بھی اب بیکار ہو چکے تھے۔ کسی کو اپنی دال گلتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر دل اب بھی بنے ہوئے تھے، جو پرانی یادوں کے سہارے چل رہے تھے۔ اتنے میں شیر سنگھ اِدھر آ نکلا۔ جیمل سنگھ اور سوہن سنگھ اس کے ساتھ تھے۔ بگے کو دیکھ کر شیر سنگھ اس کی طرف بڑھا، ہاتھ ملایا اور پھر شیر سنگھ کے اِشارے پر صرف بگا اس کے ساتھ ٹہلتا ہوا باقی لوگوں سے الگ ہو گیا۔

بگے نے پوچھا: ''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

شیر سنگھ پہلے تو چپ چاپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جوں کا توں کھڑا رہا اور پھر بھاری آواز میں بولا: ''بات تو خاص ہی ہے۔ اگر تمہارے ذہن میں بیٹھے تو۔''

شیر سنگھ کی آشا کے برعکس بگے نے اس بات کا بُرا نہیں مانا۔ دوستانہ انداز میں دانت دکھاتے ہوئے بولا:

''شیریا! اب تو بگے کی عقل پہلے سے کافی باریک ہو گئی ہے۔''

''سچ؟''

''ہاں لوگوں نے بھی ایسا کہا ہے کہ اور میں خود بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔''

''تو پھر میں اپنے من کی بات کہہ ہی دُوں۔''

''کہہ ڈالو۔''

''شیر سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''اب تم شادی کر ڈالو۔''

بگا بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور کھردری آواز میں بولا:

''یار! نہ جانے لوگوں کو میری شادی سے کیا دلچسپی ہے۔ بہت سے لوگ یہی سجھاؤ دے رہے ہیں۔ مجھے اس سے چڑ ہوتی ہے۔''

''بس تم کھونچڑ کے کھونچڑ ہی رہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جس بات کو دُنیا کہہ رہی ہے، اس میں کچھ تو سچائی ہوگی۔''

"لیکن یہ میرا ذاتی مااملہ ہے۔ دوسروں کو اس میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت؟"

"کوئی غیر آدمی تمہیں شادی کا سجھاؤ نہیں دے سکتا۔ تمہارے دوستوں اور ہمدردوں کے علاوہ کوئی دوسرا تم سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ایسے دوستوں کو ہر طرح کا مناسب سجھاؤ دینے کا حق ہے۔ تم کو ان کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہیے۔"

"مَیں اپنے دوستوں کے حق کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن شادی نہ کرنے کا مَیں نے پکّا ارادہ کر لیا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے میں شادی نہیں کروں گا۔"

کافی دیر تک شیر سنگھ دوستانہ انداز میں اسے ڈانٹتا پھٹکارتا رہا، مگر بگا اپنی ضد پر اَڑا رہا۔

اِدھر دیپی کی چنچل آنکھیں جیسے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ پل بھر کو وہ رُکی، کیونکہ جس کی انہیں تلاش تھی، اس کی جھلک پل بھر کو دکھائی دی اور پھر غائب ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ جسا جان بوجھ کر دور ہی کھڑا رہا اور ایک بار آنکھیں مل جانے پر وہ کھسک کر اُونچی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اب وہیں پر وہ اس کا اِنتظار کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دیپی پہلے تو سہیلیوں سمیت لنگر کی طرف گئی، جہاں عورتوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور پھر سب کی آنکھ بچا کر اکیلی وہاں سے نکل آئی اور جھاڑیوں کے اس جھنڈ کی طرف چل دی جہاں جسا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچی تو دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے اور کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ آخر جسّے نے پوچھا: "کوئی خبر؟"

"بڑی زوردار خبر ہے۔" دیپی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بھی تو سُنوں۔" جسّے کی آواز میں کچھ مایوسی اور کچھ گمبھیرتا تھی۔

"کیوں بیکار میں اِتنے اُداس ہو رہے ہو؟ ہمارا مسئلہ تو واگورا کال پُرکھ نے حل کر کے رکھ دیا۔"

"وہ کیسے؟"

اب دیپی نے ساری کتھا کہہ سنائی۔ آخر میں بولی:

"ماسی تمہیں سے میری شادی کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ میرے ماں باپ ہر طرف سے پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں بھی تمہیں سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تم بھی مجھ ہی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ جب جسا کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے ماں باپ مجھے یہاں لے آئے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ واگورا کال پُرکھ کی بھی یہی مرضی ہے۔ جبھی تو اس نے رتّو کے ہیں ہم دونوں کی ملاقات کرا دی، ماسی کے مَن میں تمہارے لیے اِتنا پریم جگا دیا۔ اسی لیے اب میرا وہاں رہنا بیکار تھا۔ مطلب یہ کہ اب ہمارے خاندان کی طرف سے کوئی اڑچن نہیں پڑے گی۔ اس کے آگے تم جانو، تمہارا کام۔"

جسّے نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پوچھا: "پرسنّی کا کیا حال ہے؟"

"ارے ہاں، وہ بھی مزے میں ہے۔"

''کوئی خاص بات؟''

''پرسنی اور پورن سنگھ کی گڑبڑ کا بھید تو صرف یہ تھا کہ پورن سنگھ کے ماں باپ نے بیٹے کو بتائے بنا اس کی کہیں منگنی کر دی۔ پرسنی کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بگڑ اُٹھی۔ اس نے بدلے کے جذبے میں صورت سنگھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔ اِسے مالوم نہیں تھا کہ پورن سنگھ کی منگنی اس سے پوچھے بنا ہی ہوئی ہے۔ اب تک یہی جھنجٹ چلتا رہا۔ اتفاق سے پورن سنگھ کو اپنی منگنی کے بارے میں پتا چل گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ پرسنی اس سے کیوں کٹی کٹی رہتی تھی اور شاید بدلے کے احساس سے ہی اس نے صورت سنگھ کے ساتھ پریم کا ڈھونگ رچا تھا۔ وہ فوراً اپنی منگنی توڑ کر پرسنی کے پاس پہنچا اور اس سے مافی مانگی۔ پرسنی نے تسلیم کیا کہ اس نے جھلاہٹ میں آ کر صورت سے ناطہ باندھا۔ مگر جب صورت سنگھ حد سے بڑھنے لگا تو اس نے اس سے ناطہ توڑنے کی کوشش کی، مگر صورت سنگھ اب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ تب پورن سنگھ نے پرسنی سے کہا کہ ایسی بچکانہ حرکت کرنے سے پہلے اسے اصلیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، جو ہونا تھا، سو ہو چکا، اب وہ صورت سنگھ کو گرفتار کر لے گا۔ صورت سنگھ کے کچھ جرم ایسے ہیں، جن کے لیے کل ملا کر وہ کم سے کم چھ سات سال تک جیل خانے میں ڈنڈ بھوگتا رہے گا۔''

یہ بات سُن کر جسے کو کچھ تعجب ہوا۔ کہنے لگا: ''سچ مچ اب واہگورو دا کال پُرکھ چاہے تو مصیبتیں دُور ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ سب جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔''

''مگر ہماری جو مشکل حل ہوگئی، اس پر تم نے کوئی خوشی ظاہر نہیں کی۔''

''کیا کروں دیپی! سب سے بڑا پہاڑ تو ہمارے آگے سے ہٹا ہی نہیں۔''

''کیسا پہاڑ؟''

''چاچا!''

''تم چاچے سے اِتنا کیوں گھبراتے ہو؟ وہ کیا تمھیں پھانسی پر لٹکا دے گا؟ چاچا زیادہ سے زیادہ اپنے گھر سے نکال دے گا۔ تو کیا چاچے کے گھر سے نکل کر تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے؟ مَیں کہتی ہوں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم یہ گاؤں ہی چھوڑ دیں گے۔ شہر کو چلے جائیں گے۔ میری ایک سہیلی کا بیاہ شہر میں ہُوا ہے۔ اس کے پتی کا یوں ہی چھوٹا موٹا کاروبار ہے۔ ان کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ مزے اُڑاتے ہیں۔ چاچے کی یہی شرط ہے کہ یا تم شادی کر سکتے ہو، یا اس کے پاس رہ سکتے ہو۔ دوسرے الفاظ میں تمھیں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ تم دیپی کو زیادہ چاہتے ہو، یا چاچا کی دولت کو، بس اتنا سا فیصلہ کرنا تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔''

جسا چپ رہا۔ دیپی نے ذرا تیز آواز میں کہا: ''بولو!''

''مَیں کہیں چلا گیا تو چاچا بالکل برباد ہو جائے گا۔''

''بھاڑ میں جائے چاچا! جب وہ برباد ہونا ہی چاہتا ہے تو تم اسے بچانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟''

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر جسا بولا: ''تم گوردوارے کو جاؤ، مَیں سوچوں گا۔''

۲

اسی رات بگّے نے جسّے سے کہا: ''میں نے کل چک پیراں جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ جگیر سنگھ سے مل آنا، ویسے تھوڑی گھمائی بھی ہو جائے گی۔''

جسا تیار ہو گیا۔

چک پیراں جانے کے لیے ضروری تھا کہ مسافر صبح سویرے ہی ہری پورہ سے چل دے، تاکہ شام ہوتے ہی منزل پر پہنچ جائے۔ بُھجو نے تاروں کی چھاؤں میں ہی دہی بلویا، مکھن نکالا، اور پھر آلو کے پراٹھے بنانے بیٹھ گئی۔ بگا بھی اس وِچار سے کہ ذرا جلدی جانا ہوگا، کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ اس نے جسّے سے کہا:

''لو بھئی، اب چھاہ ویلا (ناشتہ) کرلیں، تو چلیں۔''

جسّے نے چاچا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور کہا: ''ہم اتنی جلدی کیسے چل پائیں گے؟''

''کیوں؟''

''چاچا! اتنے عرصے بعد گاؤں آئے تھے، تو کیا اب چک پیراں جاتے وقت اپنے سارے دوستوں سے نہیں ملو گے؟ میرے خیال میں تو چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملاقات کرلو، تو اچھا رہے گا۔''

بگا کچھ بھڑک کر بولا: ''بھئی، تم بھی کمال کرتے ہو...... اب اتنا وقت کہاں ہے۔''

بُھجو بھی ان کی بات چیت سُن رہی تھی، بولی:

''بگّے! کمال وہ نہیں تم کر رہے ہو، تمھیں کون ریل گاڑی پر جانا ہے، جو دیر ہو جانے سے چھوٹ جائے گی؟ اپنی ہی تو سواری ہے۔ جب جی چاہا رکاب میں پاؤں رکھا اور چل دیئے۔''

بگّے نے ان دونوں کی طرف باری باری یوں دیکھا جیسے انہوں نے اس کے خلاف سازش کر رکھی ہو لیکن غصہ پی کر رہ گیا، بولا: ''تو ابھی پراٹھے کھانے کا کیا فائدہ؟ میں لوگوں سے مل کر لوٹوں گا، تو پیٹ پوجا بھی ہو جائے گی۔''

بگا زور زور سے دھرتی پر پاؤں مارتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے شیر سنگھ، کشن سنگھ کے علاوہ لالہ بالمکند اور دوسرے دوستوں کے گھر جا جا کر ان سے وِداع لی۔ جب کوئی پوچھتا کہ اب کب تک لوٹو گے تو وہ جواب دیتا: ''اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔''

اِن ملاقاتوں کے دوران وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ وہ چنن سنگھ کے گھر جائے یا نہ جائے۔ آخر کار اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ چنن سنگھ سے ضرور ملے گا کہ جسّے کے اس سجھاؤ پر بُھجو نے بھی کوئی اعتراض نہیں اُٹھایا تھا۔

جب اس نے چنن کے دروازے کا کنڈہ کھٹکھٹایا، تو خود چنن سنگھ نے ہی دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے بگّے کو پا کر اسے بڑا تعجب ہوا کیونکہ اِتنے دن گاؤں میں رہنے کے باوجود نیز کبھی کبھی ملاقاتیں ہو جانے پر بھی بگا اس کے گھر پر نہیں آیا تھا۔

جلد ہی اپنی حیرانگی پر چنن سنگھ نے قابو پا لیا اور بڑی خوش مزاجی سے بگّے کا سواگت کیا۔ بھیتر صحن میں چار پائیاں بچھی تھیں۔ عورتیں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ لڑکے بالے ابھی تک سو ہی رہے تھے۔ دلیر سنگھ اور لکّھا سنگھ کی نیند کھل چکی تھی، مگر وہ اپنی اپنی چار پائیوں سے ٹانگیں نیچے لٹکائے جمائیاں لے رہے تھے۔ بگّے کو دیکھتے ہی دونوں بھائی اپنے ڈھیلے ڈھالے جوڑوں کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال، کہی۔

بگّے کے من میں جو یہ چور تھا کہ شاید اس کا ٹھیک سے سواگت نہ ہو، وہ دُور ہو گیا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ چنن کے ہاتھ کا اشارہ پا کر وہ بڑے پلنگ پر بیٹھ گیا، اور بولا: ''مَیں نے تم لوگوں کو سویرے سویرے کشٹ دیا......''

چنن سنگھ اور اس کے پریوار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صبح ہی صبح کیوں دھمک پڑا۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھے۔ چنن بولا: ''کشٹ کیسا؟ اپنوں کے آنے جانے سے کہیں کشٹ ہوتا ہے، تم چاہو آدھی رات کو بھی آؤ تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

دِلوں میں بیر ہوتے ہوئے بھی آپس میں یہ میٹھی میٹھی باتیں کرنا سب کو اچھا لگ رہا تھا۔ بگّا بولا:

''بات یہ تھی کہ مَیں آج چک پیراں جا رہا ہوں، سوچا کہ تم سب سے مل لوں۔''

اَب اِس کے آنے کا بھید کھلا۔ اس پر سب کو اطمینان بھی ہوا۔ چنن نے کہا:

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ اگر تم ہم سے ملنے بنا چلے جاتے، تو ضرور ہی ہم کو تم سے گلہ کرنا پڑتا۔''

''اسی لیے تو۔'' بگّے نے خوب زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت ہی میٹھی میٹھی باتیں۔

آخر میں بگّے نے اُٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا:

''اچھا، اَب جانے کی آگیا دو۔ کچھ کھا پی کر لمبا سفر بھی کرنا ہے۔''

چنن بولا: ''یہاں بھی سب کچھ تیار ہے، تھوڑی دیر اور بیٹھو نا۔''

''نہیں بھئی، جسا میرا انتظار کرتا ہوگا۔''

''جسّے کی بھی بھلی کہی! اِسے یہ تو مالوم ہونا چاہیے کہ اس کا چاچا کسی پرائے کے نہیں، بلکہ اپنوں کے گھر ہی گیا ہے اور وہ کھلائے پلائے بنا نہیں لوٹنے دیں گے۔''

واقعی گھر کے سب لوگوں نے اتنا اصرار کیا کہ بگّے کو رُکنا پڑا۔ ناشتے پانی کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی چلتی رہی اور اس طرح وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

جب بگّا گھر پہنچا تو نَھجو چلائی: ''کہاں تو کسی سے ملنے کو تیار نہیں تھے اور کہاں چلے گئے تو پیچھے کی خبر ہی نہیں رہی......چلو، کچھ کھا پی لو۔''

بگّے نے انکار میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا دیئے اور کہا: ''چنن نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا کہ بنا کچھ کھلائے

پلائے جانے نہیں دوں گا۔''

''اِدھر جسا تمہارا انتظار کرتا رہا کہ چاچے کے ساتھ ہی چھاہ دیلا کروں گا......''

''وہ ہے کہاں؟''

''جب تم نہیں آئے تو وہ کھا پی کر کھیتوں کو چلا گیا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ تم لوٹو تو اسے بلوا لینا۔''

بگا بھڑکا......

''عجیب آدمی ہے وہ، خامخواہ دیر پر دیر کرائے جا رہا ہے۔''

''عجیب وہ ہے کہ تم ہو؟ دوسرے پر چڑھ دوڑنا تمہیں خوب آتا ہے۔''

بھجنو کی پھٹکار سے بگا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار محسوس کر رہا تھا اور یہ بالکل نہیں سمجھ پایا کہ جسا جان بوجھ کر اسے دیر کروا رہا تھا۔ چھوکرے کو کھیتوں کی طرف دوڑایا گیا، تاکہ وہ جسے کو بلا لائے، مگر جسے کا ڈیڑھ دو گھنٹے تک پتا ہی نہیں چلا۔ آخر جب وہ لوٹا، تو بگا بھرا بیٹھا تھا۔ من میں چور ہونے کی وجہ سے گالیاں بکنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن بُرا سا منہ بنا کر بولا: ''بہت دھوپ چڑھ آئی ہے۔ چک پیراں پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو جائے گی۔ اب کل ہی چلیں گے۔''

جسا چپ رہا۔ مگر بھجنو کھوکھیائی:

''بیکار کی باتیں مت بناؤ۔ صبح سویرے سے میں تم لوگوں کی وجہ سے جاگی، تم سب سے مل ملا آئے اور اب دن میں تمہیں یہیں پر گھومتے پھرتے دیکھ کر سب لوگ تمہیں پاگل ہی تو سمجھیں گے۔ میں نے پراٹھے، اچار اور پیاز باندھ کر پوٹلی تیار کر دی ہے۔ گھوڑے بھی تیار ہیں، واہگورو کا نام لو اور چلو۔''

تھوڑی ہی دیر میں بھجنو سے وِداع ہو کر دونوں مسافر ہری پورہ سے نکل پڑے۔ بات چیت میں سفر کٹتا گیا۔ کہیں کہیں وہ پانی پینے کے لیے رُک جاتے۔ دوپہر کو بڑے زور کی بھوک لگی تو وہ دونوں ایک اچھے سے رَہٹ کے قریب برگد کی گھنی چھاؤں میں گھوڑوں سے اُتر پڑے۔

رَہٹ کی چھال کے پاس کسی پریمی سجن نے لسّی کا مٹکا رکھ چھوڑا تھا کھانا کھایا، لسّی پی اور پھر جسا تھوڑی دیر کو اُونگھنے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹنے کو تو بگے کا بھی من ہو رہا تھا، مگر جسے کا اس طرح لیٹنا اسے کھل گیا۔ من ہی من بڑبڑایا کہ یہ حرامی خواہ مخواہ دیر کیے جا رہا ہے۔

وہ دونوں ہی تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ جب جاگے تو ایک بار پھر پتلی لسّی پی کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

چلتے چلتے شام ہونے کو ہوئی تو بگا بولا:

''اب خود ہی سوچ لو کہ ہم چک پیراں آدھی رات کے بعد ہی پہنچ پائیں گے۔ نیند تو خراب ہو گی ہی اور جگیر سنگھ کو الگ پریشانی ہو گی۔''

جسا بولا: ''چاچا، مجھے ایک بات سوجھی ہے۔''

''بول!''...... بگے کے ماتھے پر گہرے بل پڑ گئے۔

جسا گھمبیرتا سے بولا: ''وہ میرا دوست ہے نا پورن سنگھ۔''

''پولیس کا تھانیدار؟''

''ہاں، وہی اس کا گاؤں یہاں سے کوئی زیادہ دُور نہیں ہے۔ کیوں نہ رات ہم اسی کے گھر میں کاٹیں۔ پیٹ بھر مزیدار کھانا ملے گا۔ رات بھر اطمینان سے سوئیں گے۔ کل صبح چھاہ ویلا کر کے چل دیں گے اور مزے مزے میں چک پیراں پہنچ جائیں گے۔''

بگّے کے ماتھے پر گہرے بل جوں کے توں بنے رہے، مگر اسے یہ سجھاؤ بُرا نہیں لگا۔

چاچا کو خاموش دیکھ کر جسّے نے گھوڑے کی باگ اس گاؤں کی طرف موڑ دی۔ جب وہ قریب پہنچے تو گاؤں کے باہر ریتلے میدان میں کھیلنے والے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر ان اجنبی گھوڑ سواروں کو دیکھنے لگے۔ دانہ دُنکا چگنے والی چڑیاں گھوڑوں کی ٹاپوں سے بچنے کے لیے پر پھڑائی ہوئیں اِدھر اُدھر بھاگ نکلیں۔

جسا بولا: ''پورن سنگھ نے گاؤں کے باہر رَہٹ کے پاس پکی بیٹھک بنوا رکھی ہے۔ وہ اکثر وہیں بیٹھتا ہے۔''

بگّا خاموش رہا اور جسّے کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے وہ بیٹھک کے سامنے پہنچ گیا۔ اصل میں اس کمرے کی ایک دیوار پکی تھی۔ باقی دیواریں اور چھت سب کچی تھیں۔ ذرا دُوری سے آتا ہوا رَہٹ کا رُوں رُوں کا ہلکا شور کانوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ جسا گھوڑے سے اُترا اور چاچا جوں کا توں کاٹھی پر بیٹھا رہا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا۔ جسّے نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھامی اور لمبا سا ڈگ بھر کر دروازے سے بھیتر جھانکنے کے لیے گردن بڑھائی۔ اِتنے میں ہی ایک عورت باہر نکلی۔

یہ اتنا اچانک ہوا کہ اِدھر عورت بدک گئی اور اُدھر جسا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دوسرے ہی پَل اس نے پورن سنگھ کی بہن بنتو کو پہچان لیا۔ بنتو کے چہرے سے بھی حیرانگی کے آثار اُڑ گئے اور وہ بہت ہی ہلکی سی مُسکان ہونٹوں پر لاتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی: ''ست سری اَکال۔''

جسّا نے بھی سنبھل کر جواب دیا: ''ست سری اکال۔''

بنتو نے دبی آواز میں پوچھا: ''کب آئے؟''

''بس، چلا ہی آ رہا ہوں۔''

بنتو نے ایک دبی نظر اس کے ساتھی پر ڈالی، تو جسّے نے دوسرے گھوڑ سوار کی طرف ہاتھ سے اِشارہ کرتے ہوئے کہا: ''میرے ساتھ میرا چاچا بھی ہے۔''

بنتو نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ بیوہ ہونے کی وجہ سے اِس کا زیادہ بولنا ذرا سی بھی چنچلتا دکھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

جسّے نے اپنے آنے کی وجہ بتانا ضروری سمجھا، بولا:

''ہم ہری پورے سے چک پیراں کو جا رہے تھے۔ راستے میں دیر ہوگئی۔ مَیں نے سوچا، چلو یہیں رُک

جائیں۔ رات بھی آرام سے کٹ جائے گی اور پورن سنگھ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"
بنتو نے دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بھاپا تو گھر پر نہیں ہے۔ وہ ڈیوٹی پر ہے۔"
اِسی دوران ایک آدمی اِن کے قریب آ کھڑا ہوا، جو شکل سے ہی کمی نظر آ رہا تھا۔ جسّے کو کچھ اور کہنے کا موقعہ نہ دیتے ہوئے بنتو نے اِس کمی سے کہا: "دونوں گھوڑے طویلے میں لے جاؤ۔"
نوکر نے جسّے کے گھوڑے کی لگام تھامی، تو اس وقت تک بگا بھی اپنے گھوڑے سے نیچے اُتر چکا تھا۔
بنتو نے پھر کہا: "گھر چلو، ماں سے مل لو۔"
جسّے کے جواب کا انتظار کیے بِنا بنتو آگے آگے چل دی اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ مکان گاؤں کے ذرا بھیتر جا کر ہی تھا۔ گلیوں میں سے گزرتے وقت بہت سے لوگوں نے جسّے کو پہچان لیا، کیونکہ وہ اِسے پورن سنگھ کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔
گھر پہنچے تو بگّے کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے بھتیجے کو گھر والے اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے وہاں تکلف یا پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔
گھر میں مہمانوں کا بہت اچھا سواگت ہوا۔ پورن سنگھ کی ماں جسّے کو بیٹے کی طرف ہی مانتی تھی۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب عورتیں اپنے بیٹے کے دوست کو دیکھ کر واہگورو اکال پُرکھ کا شکریہ ادا کرتی تھیں اور کہتی تھیں:
"واہگورو نے انہیں بیٹا نہ دیا ہوتا تو آج بیٹے کے دوست اِن کے گھر کیسے آتے۔"
مہمانوں کے ساتھ باہر والوں جیسا برتاؤ نہیں ہوا۔ گھر کی دوسری بہو بیٹیاں ان کے آس پاس گھومتی پھرتی رہیں۔ وہ دونوں اُجلے بستر پر بیٹھے تھے۔ وہیں پر انہوں نے کھانا کھایا۔
بھوجن کے بعد جسّے نے خود ہی کہا:
"بے بے! اب ہم بیٹھک کو جاتے ہیں...... صبح ملاقات ہوگی۔"
اس طرح اجازت لے کر مہمان بیٹھک کی طرف چلے گئے۔ دروازے کا کُنڈہ چڑھا ہوا تھا لیکن سدا کی طرح تالہ نہیں لگا تھا۔ پولیس افسر کی بیٹھک میں گھسنے کی بھلا کس کو جرأت ہو سکتی تھی۔
کُنڈہ کھول کر وہ بھیتر پہنچے تو دیکھا کہ دو پلنگوں پر پہلے سے ہی دو اُجلے بستر بچھے ہوئے تھے۔ پانی کا بڑا سا لوٹا اور چاندی کے دو گلاس دیوار میں بنے ہوئے آلے میں رکھے ہوئے تھے۔ بیٹھک اپنے زمانے کے انداز میں سجی ہوئی تھی۔ دیواروں پر دسوں گوروں کے علاوہ دیوی سرسوتی وردیوی لکشمی کے چتر بھی چوکھٹوں میں جڑے لٹک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان چوکھٹوں اور ان کے شیشوں کی باقاعدہ صفائی کی جاتی تھی، کیونکہ کسی بھی شیشے پر مکھیوں کی گندگی کے دھبے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔
بگّے نے سر سے پگڑی اُتار کر بندھی بندھائی حالت میں کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا:
"اچھا کھاتا پیتا گھرانہ معلوم ہوتا ہے۔"
"ہاں، چاچا! بہت بڑا خاندان ہے۔ پورن سنگھ کے پولیس میں اَفسر بن جانے سے علاقے بھر

میں اِن کا دبدبہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔''

اِدھر اُدھر کی باتیں چلتی رہیں بگّے نے پوچھا:

''سفید کپڑوں والی وہ عورت کون تھی، جو ہمیں سب سے پہلے بیٹھک کے دروازے پر ملی تھی؟''

جسّے کو یاد تھا کہ چاچے کے سامنے ہی بنتو نے پورن سنگھ کے بارے میں بتاتے ہوئے اُسے بھاپا کہا تھا۔ شاید چاچے نے بے دھیانی میں یہ بات سنی نہیں۔ وہ بولا:

''وہ عورت پورن سنگھ کی بہن ہے۔ بے چاری اِتنی چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئی، بچہ وچہ بھی کوئی نہیں ہوا۔ اب یہیں ماں کے پاس رہ رہی ہے۔''

چاچانے جوڑے کی جڑ میں پھنسے ہوئے لکڑی کے کنگھے کو باہر کھینچا اور بالوں میں دھیرے دھیرے کنگھا کرنے لگا۔ جسّا پھر بولا:

''اچھا ہی کیا جو ہم یہاں چلے آئے، گھر کا سارا سکھ بھی ملا۔ رات بھی آرام سے کٹ جائے گی۔''

جب مہمانوں کو نیند کے جھونکے آنے لگے تو اتنے میں بیٹھک کا دروازہ پھر کھلا۔ اِن دونوں کی نظریں اُدھر کو اُٹھ گئیں۔ بنتو دونوں ہاتھ میں دو گلاس دودھ لیے چلی آ رہی تھی۔ لالٹین کے مند پرکاش میں سانولے رنگ کی وہ حسینہ بالکل جادوگرنی سی لگتی تھی۔ جسّا یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ جب بنتو دیپی کی عمر کی رہی ہو گی تو دیپی سے ضرور ہی زیادہ حسین لگتی ہو گی۔

اِن دونوں نے بے شک اِسے دیکھا، مگر بنتو نے اِن دونوں میں سے کسی کے چہرے پر نہ نظر ڈالی اور نہ ہی آنکھ ملائی۔ چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں دودھ کے گلاس تھما کر وہ ہلکے پھلکے قدم اُٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ صرف اس کا ایک ہاتھ دروازے کے تختے پر لٹکا ہوا تھا۔ تختے کو آگے کھینچ کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور پھر اس کا سلونا ہاتھ بھی اِن کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دونوں مہمان ایسی گہری نیند سوئے کہ صبح ہی اِن کی آنکھ کھلی۔ جانے کی بہت جلدی نہیں تھی۔ وہ دونوں کھیتوں کو نکل گئے۔ ببول کے پیڑ سے تازہ داتنیں کاٹیں، انہیں دانتوں میں دبا کر وہ کھیتوں میں گھس گئے۔

جب دھوپ تھوڑی چڑھ آئی تو اس وقت تک وہ دونوں نہا دھو کر تیار بیٹھے تھے۔ اب کے انہیں بنتو نہیں گھر کا ایک چھوکرا آیا اور بولا: ''آپ کو چھاہ ویلے کے لیے بے بے جی نے بلایا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں پھر ایک بار صحن میں بیٹھے تھے۔ گھی کے پراٹھے، ان پر مکھن، دہی کے کٹورے اور لسّی کے چھنّے اِن کے آگے رکھ دیئے گئے۔

کھا پی کر وہ ڈکاریں لے چکے تو بے بے نے کہا:

''جسّے، میں تو سوچتی ہوں کہ کچھ پراٹھے ساتھ لیتے جاؤ، راستے میں بھوک لگ سکتی ہے۔''

''نہیں بے بے! راستہ اتنا لمبا نہیں ہے کہ ہمیں بھوک لگ جائے۔''

گھر والوں سے وِداع ہو کر وہ پھر بیٹھک کو چلے گئے۔ ان کے گھوڑے تیار تھے اور تازہ دم تھے، کیونکہ

انہیں اچھا دانہ پانی اور آرام مل چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں گھوڑ سوار گاؤں کی حد سے باہر نکل گئے۔ کھیتوں میں کسان کام کر رہے تھے۔ مکانوں کی منڈیروں پر کانو کانوں کرنے والے کوؤں کا تیز شور مند پڑتا جا رہا تھا۔ ہوا میں تازگی تھی۔ کہیں کہیں سے ان کے کانوں میں بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آنے لگتی۔

اِتنے میں ہی جنو کچھ فاصلے سے آتی دکھائی دی۔ اس کے کپڑوں اور چلنے کے انداز سے ہی جسّے نے اِسے پہچان لیا۔ مگر بگا اسے اس وقت تک نہیں پہچان پایا، جب تک کہ وہ اِن کے بالکل قریب نہیں پہنچ گئی۔ دونوں گھوڑ سوار بھی رُک گئے۔ جسّے نے پوچھا:

''کہاں کی سَیر ہو رہی ہے؟''

جنو کے ہونٹوں پر رنگ برنگے پروں والی تتلی کی طرف مسکراہٹ پھڑ پھڑائی اور اس نے دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

''سَیر نہیں، میں گوردوارے سے آ رہی ہوں۔''

''اتنی دیر سے گوردوارے جاتی ہو کیا؟''

جنو نے انکار میں سر ہلایا تو چُنری سے دو ڈھکے ہوئے بالوں کی دو زُلفیں باہر کو نکل پڑیں۔ اس نے اُنگلیوں سے اُنہیں پیچھے ہٹا دیا: ''سدا تو صبح سویرے ہی چلی جاتی ہوں، مگر آج دیر ہو گئی۔''

جسا گھوڑے کی ہنہناہٹ کی سی ہنسی ہنسا: ''اوہ، سمجھا، آج ہماری وجہ سے دیر ہو گئی۔''

اس بات کا جنو نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے گلے میں لٹکی اُون کے منکوں کی مالا کو اُنگلیوں سے چھونے لگی۔

بھدّی اور بے تکی خاموشی چھا گئی۔ اسی کو توڑتے ہوئے جسا بولا:

''اچھا تو ہم چلتے ہیں۔''

جنو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ سیپیوں جیسے اس کے پپوٹے پل بھر کو کھلے اوپر کو اُٹھے اور پھر نیچے جُھک گئے۔ وہ گاؤں کی طرف بڑھ گئی اور یاتری منزل کی طرف چل دیئے۔

جنو نے پائل نہیں پہن رکھی تھی، پھر بھی بہت دیر تک جسّے کے کانوں میں جیسے چھن چھن کا سنگیت گونجتا رہا۔ اس نے چاچا کی طرف دیکھا۔ بگّے نے اپنے چہرے پر اتنے ہی بل ڈال رکھے تھے، جتنے کہ وہ ڈال سکتا تھا۔ اس سے اس کا چہرہ اُبڑ کھبڑ ہو رہا تھا۔ جسّے کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بولا:

''لگتا ہے پورن سنگھ کی یہ بہن پوری طرح سے بھگتن ہو چکی ہے۔''

جسا کافی دیر تک تجسّس بھری نگاہوں سے چاچا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر اس کی نظر بگّے کے چہرے کی اُبڑ کھبڑ ریکھاؤں میں کھو کر رہ گئی اور وہ سپاٹ آواز میں بولا: ''ہاں چاچا!''

اس کے بعد چک پیراں پہنچنے تک اِن کی اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

۳

لگ بھگ تین ہفتے گزر گئے ۔ بُری طرح چھٹپٹایا ہوا صورت سنگھ، چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملنے کے لیے آ چکا تھا۔ جسّے کو اس بارے میں معلوم تھا۔ وہ یہ بھی معلوم کرتا تھا کہ اب کوئی سازش ہونے جا رہی ہے ۔ اس بات کا انتظار کرنے کے سوا کہ سب مل کر اگلا قدم کیا اُٹھاتے ہیں، جسّے کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اِسے اس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی ۔ اس نے سوچا، جو ہوگا اس سے نمٹ لیا جائے گا۔

جسّے سے مایوس ہو کر جب صورت سنگھ چنن کے گھر پہنچا تو خوشی سے اِن کی باچھیں کھل گئیں ۔لکھا سنگھ نے مَن میں سوچا کہ آخر اس کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ سب نے اِسے بڑی عزت سے اُجلی چادر والی چار پائی پر بٹھایا۔ بہت ہی کان دھر کر اس کی دُکھ بھری کہانی سنی ۔ جب وہ مَن کا غُبار نکال چکا، تو چنن سنگھ نے بہت گھمبیر آواز میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی......

''کیا کہا جائے بیٹا! آج کل زمانہ ہی ایسا ہے ۔ میرا وِچار تو یہ ہے کہ تم خود اس سے مل کر پوچھو، کہ آخر اس نے اپنا وچن کیوں توڑا؟''

صورت سنگھ کی نسوں میں جوانی کا گرم خون لہریں لے رہا تھا۔ وہ منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے بولا:

''جسّا اپنے آپ کو بڑا پاٹے خاں سمجھتا ہے۔ علاقے بھر میں اس کی دہشت بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود صورت سنگھ اس کے سامنے گڑگڑانے کے لیے نہیں جائے گا اور اگر جائے گا تو اس سے اس بات کا جواب سُنے بنا نہیں لوٹے گا ۔ اِسے سوچ سمجھ کر جواب دینا پڑے گا۔ کیونکہ صورت زندگی اور موت کی حالت پیدا کر دے گا۔''

صورت سنگھ کو اتنے تاؤ میں دیکھ کر چنن سنگھ نے چپکے سے اپنے لڑکوں کو آنکھ ماری اور اَحاطے سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

باپ کے جانے کے بعد لکھا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دلیر نے بولنے میں پہل کر دی:

''دیکھو صورت! تمہاری سب سے بڑی بھول یہ تھی کہ تم نے اس پر بھروسہ کیا۔ جس روز اس نے تمہیں شادی کی اجازت دی تھی، اس روز تم نے ہماری ایک نہیں مانی۔ ہم جانتے تھے کہ تم کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وہی ہوا۔ اب تم کہتے ہو کہ تم اس سے پوچھنے جاؤ گے کہ اس نے اس نے اپنا وچن کیوں توڑا ۔ یہ بات کہنی جتنی آسان ہے۔ اتنا ہی اسے کرنا مشکل ہے ۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں کہ تمہیں بھڑکا کر مگر مچھ کے جبڑے میں دے دیں ۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، جو کچھ سارے گاؤں نے دیکھا ہے...... اسے سامنے رکھتے ہوئے ہم تمہیں اس سے اکیلے بھڑنے کو کبھی نہیں کہیں گے۔ ٹھُنا تمہارے جیسے چار جوانوں پر بھاری تھا۔ جسّے نے اسی ٹھنے کو کیسے توڑ مروڑ کر پھینک دیا، وہ سارا گاؤں جانتا ہے۔''

ان باتوں سے صورت کا تاؤ تھوڑا کم ہوا۔ وہ جذباتی ہو کر بولا:

''آخر تم لوگ، جنہیں میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ میرے کام کب آؤ گے؟''

''ہم ہر وقت تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن بھئی، آج تمہارا مقابلہ ایک ایسے شخص سے ہے جو ہمارا رشتے دار ہے۔ ہم اتنا کھلم کھلا اس سے جھگڑا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ مگر ہم تمہاری حالت کو سمجھتے ہوئے تمہاری طرف داری کرنا چاہتے ہیں مگر چھپکے سے۔ ہم خود اس کے سامنے نہیں جائیں گے اور اگر تم نے کسی سے بھی یہ بات کہہ دی کہ ہم اس معاملے میں تمہاری مدد کر رہے ہیں تو پھر جسّے کے ساتھ ساتھ ہم بھی تمہارے دُشمن بن جائیں گے۔''

لکّھا نے بھی بھائی کی حامی بھرتے ہوئے کہا:

''ہاں صورت! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔''

صورت نے جلدی سے اپنا ایک ہاتھ لکّھا کی ران پر رکھا اور دوسرا دلیر کے کندھے پر اور پھر جیسے اپنے دل کو اپنی آنکھوں میں سماتے ہوئے بولا:

''یہ راز سدا میرے من میں ہی رہے گا۔ مَیں کسی سے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

دلیر سنگھ نے کھانس کر ذرا گلا صاف کیا اور پھر بولا:

''جسّا دن میں ایک بار سوڈے کی میٹھی بوتلیں پینے ضرور آتا ہے۔ اسی موقعے پر اس سے بھڑ جانا مناسب رہے گا۔ تمہارا اکیلے اس کا سامنا کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ہم پانچ چھے ہتھیار بند آدمیوں کا بندوبست کر دیں گے۔ جب تم جسّے سے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ گے اور ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جائے گی تو وہ ہتھیار بند آدمی ہلّہ بول دیں گے۔ تم جسّے کے چنگل سے بچ جاؤ گے لیکن وہ آدمی جسّے کے ہاتھ پاؤں اور گلا کاٹ کر پھینک دیں گے۔ اس روز ہم میں سے کوئی بھی گاؤں میں نہیں رہے گا تاکہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ اس میں ہمارا بھی ہاتھ تھا۔ جو آدمی تمہاری مدد کریں گے، انہیں بھی ہری پورے کا کوئی شخص بھی نہیں پہچانتا ہو گا۔ وہ بالکل اجنبی ہوں گے۔ گاؤں والے دیکھیں گے کہ تم بالکل نہتے تھے اور اکیلے تھے۔ تمہاری جسّے سے تُوتُو مَیں مَیں ہو گئی اور پھر ایک طرف سے کچھ ہتھیار بند آدمی آئے اور انہوں نے جسّے کو قتل کر دیا۔ کوئی چشم دید گواہ یہ نہیں کہہ سکے، کہ تم جسّے کو قتل کرنے کے مقصد سے یہاں آئے تھے، کیونکہ تمہارے پاس ایک چاقو تک نہیں ہو گا۔ تم اس بات سے صاف انکار کر دو گے کہ تم قاتلوں کو جانتے تھے۔ خود گاؤں والے اس بات کی گواہی دیں گے، کہ وہ بھی قاتلوں کو نہیں جانتے تھے۔ ہم لوگ اپنے بارے میں کہہ دیں گے کہ اس واقعہ کے دن ہم ہری پورے میں تھے ہی نہیں۔''

صورت سنگھ خوش ہو کر بولا: ''یہ منصوبہ تو بہت اچھا ہے۔''

''بس، اب دن مقرر کرنا ہو گا۔''

''تمہی بتاؤ، مَیں تو ہر دم تیار ہوں۔''

دلیر سنگھ نے ایک نظر اپنے بھائی پر ڈالی اور پھر صورت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''آج سے چوتھے روز یعنی سنیچر وار کے دن کیسا رہے گا؟''

''بالکل ٹھیک۔''

یہ منصوبہ بن جانے کے بعد صورت سنگھ، چنن سنگھ کے گھر میں ہی ٹِکا رہا۔ وہ گھومتے پھرتے بھی رہے۔ دلیر سنگھ نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ ابھی جسّے کے پاس نہ جائے اور نہ ابھی اس سے یہ پوچھے کہ اس نے اپنا دیا ہوا وچن پورا کیوں نہیں کیا۔ اس کا اکیلے میں ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ مقرر ہ وقت پر جب کہ اس کے مددگار اس کے ساتھ ہوں، تب وہ جسّے کا راستہ روک کر اس سے اس بارے میں بات کرے گا۔

صورت بھی اپنے دوستوں سے متفق تھا۔ کچھ اور نہیں تو کم سے کم اس نے جسّے کو ایک لات مار کر گھوڑا دھرتی پر گراتے دیکھا تھا۔ اس کے ہوش ٹھکانے پر رکھنے کے لیے یہی کافی تھا۔ مقررہ دن کی رات کو صورت نے ساتھیوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ گنتی میں وہ پانچ تھے۔ ان پانچوں کے پاس ہتھیار تھے، یعنی ایک کے پاس چھوی، دوسرے کے پاس کلہاڑی، تیسرے کے پاس کرپان، چوتھے کے پاس گنڈاسہ اور پانچویں کے پاس لاٹھی، کیونکہ جب وہ گھما کر لاٹھی مارتا تھا، تو اس کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اب نیا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے تو صورت سنگھ جسّے کا راستہ روک کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرے گا۔ اس سے پہلے کہ جسا اس گردن دبوچ سکے۔ اس کے پانچوں ساتھی لپک کر ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ سب سے پہلے لٹھ باز لاٹھی گھما کر جسّے کے سر پر مارے گا۔ انہیں وِشواس تھا کہ لاٹھی کی اس چوٹ سے جسا ایک بار ضرور چکرا جائے گا۔ اسی موقع پر باقی آدمی اپنے اپنے ہتھیار لے کر اس پر جھپٹ پڑیں گے۔

چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں کو اس بات کا وشواس تھا کہ جس طرح گھُنّے کے اعلانیہ مارے جانے پر گاؤں کے کسی شخص نے جسّے کے خلاف گواہی نہیں دی تھی، اسی طرح جسّے کے مارے جانے کے بعد گاؤں کا کوئی آدمی صورت کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس بات کا بھی پہلے فیصلہ ہو چکا تھا، کہ صورت کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا اور وہ کسی طرح بھی جسّے پر حملہ نہیں کرے گا۔ ان دونوں کا جھگڑا صرف زبانی ہوگا۔ یہ کام اس وقت کیا جانا تھا، جب جسا سوڈے کی میٹھی بوتلیں پینے جا رہا ہوگا یا اس دُکان سے لوٹ رہا ہوگا۔

سب کچھ طے ہو جانے کے بعد چنن اور اس کے دونوں بیٹوں نے ایک بار پھر گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی کہ وہ تینوں شوکر وار کی صبح کو ہی تین چار دن کے لیے گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔

دوسرے روز صبح سویرے ہی چنن سنگھ اور اس کے دونوں بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔ اس وقت بھی گاؤں کے کچھ لوگ کھیتوں میں کام کرنے چلے جاتے اور کچھ گوردوارے کو ماتھا ٹیکنے جایا کرتے تھے۔ ان تینوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کے جان پہچان کے کچھ لوگ انہیں گاؤں سے وِداع ہوتا دیکھ لیں۔

نہ جانے کیسے بھیتر ہی بھیتر گاؤں میں افواہ پھیل گئی کہ کچھ نہ کچھ ہونے جا رہا تھا، کیونکہ صورت سنگھ چار پانچ

جسے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ دھیرے سے بولا:

''تمہارے ساتھی تو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

صورت نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو واقعی اس کے ساتھی غائب ہو چکے تھے...... حالانکہ وہ اِنہیں آگے بڑھتے دیکھ چکا تھا۔ انجانے میں ہی جسے گا گریبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے سر سے پاؤں تک پسینہ چھوٹ آیا۔ اکیلا رہ جانے پر وہ جسے جیسے پہاڑ سے کیسے ٹکرا سکتا تھا۔ ٹکرانے کی بات تو ایک طرف رہی، اب تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ جسے کے چنگل سے کیسے بچ سکے گا۔

اِتنے میں ہی سارا بھید کُھل گیا۔ پورن سنگھ وردی پہنے گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا اور اس کے ساتھ کئی سپاہی تھے۔ پاس پہنچ کر پورن سنگھ نے پوری حالت کا جائزہ لیا اور پھر صورت سنگھ سے کہا:

''میرے خیال میں آج تمہیں دوڑ لگا کر پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

اپنے افسر کے اشارے پر ایک سپاہی نے فوراً ہی صورت سنگھ کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پورن سنگھ نے جسے کی طرف دیکھا تو دونوں دوست بے اختیار ہی مُسکرا دیے...... پورن سنگھ نے جان بوجھ کر جسے سے کوئی بات نہیں کی۔ اب گاؤں کے لوگ آگے بڑھ آئے۔ ان میں سے ایک ہاتھ جوڑ کر پورن سنگھ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا:

''سرکار! آپ بڑے اچھے موقع پر یہاں پہنچ گئے، ورنہ یہاں خون خرابہ ہو جاتا۔''

پورن سنگھ نے گاؤں والوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''اب چنتا کی کوئی بات نہیں صورت کو تو کئی جرموں کے لیے لگ بھگ چھ سات سال تک جیل میں سڑنا پڑے گا۔ مَیں بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا چل چکا تھا کہ صورت کچھ دنوں سے اس گاؤں میں ٹِکا ہوا ہے۔ اس کے پانچوں ساتھیوں کو پکڑنے کے لیے مَیں نے کچھ سپاہی پہلے سے ہی سَید کے باڑے کی طرف بھیج دیئے تھے۔ وہ دیکھو وہ پانچوں بھی سپاہیوں کے گھیرے میں چلے آرہے ہیں۔ ان غنڈوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب پورن سنگھ بدل کر اس علاقے کی ڈیوٹی سنبھال چکا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔''

۴

صورت سنگھ واقعہ کے بعد گیارہ دن گزر گئے۔ اس دن بھی گاؤں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح کُھنے کی جان گئی تھی، اسی طرح صورت بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ مگر جسا دراصل اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ پھر کسی کا کھلم کھلا قتل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ عین موقع پر پولیس پہنچ گئی تو نہ صرف جسے کے من کا بوجھ اُتر گیا، بلکہ گاؤں والوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ انہیں جسے سے ہمدردی

تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ چنن سنگھ اور اس کے لڑکوں کی سازش میں پھنس کر جسے پر پھر سے قتل کا مقدمہ چلے۔

اِدھر چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ اِن کی یہ آخری سازش بھی بیکار گئی۔ وہ فوراً لوٹ آئے۔ صورت کے لیے تیار کیے گئے۔ ان کے پٹھوں میں سے کسی نے اِن کا نام بتاتے ہوئے پولیس کو کہہ دیا کہ ان کی پیٹھ پر چنن سنگھ اور ان کے لڑکوں کا ہاتھ تھا۔ اس لیے ان سے بھی پولیس نے پوچھ تاچھ کی، مگر کوئی ثبوت نہ ہونے پر معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ چک پیراں کا جسا ان سے زیادہ چالاک تھا، اور موقعہ پڑنے پر بدمعاشی اور دھاکڑ بازی میں بھی اِنہیں پیچھے چھوڑتا آتا تھا۔ اِن کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ یا تو وہ جسے سے اچھے تعلقات پیدا کریں اور آئندہ اس کے خلاف سوچنا اور سازشیں کرنا چھوڑ دیں۔ وہ تینوں خود جسے کے پاس گئے اور اسے وشواس دلانے کی کوشش کی کہ صورت سنگھ کی اس حرکت کے پیچھے ان کا ہاتھ نہیں تھا۔

لکھا بولا:

''بھائی جسے! میں نے تو اسی روز رَہٹ پر تمہیں یہ بات بتا دی تھی کہ صورت بدکردار شخص ہے اور پولیس کسی بھی دن اس کو دھر لے گی۔ اب تم نے خود دیکھ لیا کہ میری یہ پیشگوئی بالکل سچ نکلی۔''

اس طرح کی باتیں کر کے چنن سنگھ اور اس کے بیٹے اپنے گھر کو لوٹ گئے۔

ہر طرح سے حالات میں سُدھار ہونے کے باوجود جسے کا سب سے مشکل مسئلہ جوں کا توں بنا ہوا تھا۔ دیپی لگ بھگ روزانہ اسے کہتی رہتی تھی یا تو چاچا کو منا لو، یا اسے چھوڑ کر شادی کر لو اور پھر آزادانہ طور پر اپنے جیون کا آغاز کر پائیں گے۔''

اسی دوران جسا، پورن سنگھ سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے بھی گیا۔ آپس میں کئی باتیں ہوئیں، مگر چاچا سے نپٹنے کی کوئی بھی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔

سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، گھومتے پھرتے، یہی ایک مسئلہ جسے کو بے چین رکھتا تھا۔ بھجو کہتی کہ ایک بار چاچا سے بات کر کے تو دیکھو۔ مگر جسا اپنے چاچا کی نس نس کو پہچانتا تھا۔ وہ تو ایک چھوڑ دس بار اس موضوع پر چاچا سے بات کرنے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، سو وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

ایک رات جسے نے کھانے کے بعد کُلا کیا۔ پھر یکایک ہی بھجو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''آج میں چک پیراں جاؤں گا۔''

بھجو کو تعجب ہوا، جیسے اس کے کانوں نے کوئی انہونی بات سن لی ہو۔ اس نے پوچھا:

''کل صبح ہی جاؤ گے نا؟''

''نہیں، ابھی...... اِسی وقت۔''

جسے نے گھر ہی میں سے رحیم کو آواز دے کر کہا کہ اس کا گھوڑا تیار کر دے۔

گھر کے سب لوگ حیران تھے، مگر تھوڑی ہی دیر بعد جسا سنگھ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے جب اِیڑ لگائی تو گھوڑا ایک دم اِتنی تیزی سے بھاگا، کہ جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگا ہو۔ گاؤں کے باہر دھول بھرے میدان

سے گزرتے وقت وہ جیسے دُھول کے بادلوں کی چھوٹی سے ریکھا اپنے پیچھے اُڑتی چھوڑ گیا۔ جہاں تک پتھریلی زمین ہوتی تو گھوڑے کی نعلوں سے چنگاریاں اُڑنے لگتیں۔ کچھ پگڈنڈی کے کناروں پر گھوڑوں کے سُم پڑتے تو گھاس کے ٹکڑے دُھنی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں اُچھلنے لگتے۔

اِسی تیز رفتاری سے جسا بڑھتا چلا گیا۔ جب وہ محسوس کرتا کہ گھوڑے کو کچھ تھکان محسوس ہو رہی ہے، تو وہ اس کی رفتار کم کر دیتا یا کسی رہٹ پر رُک کر اسے پانی پینے کا موقع دے دیتا۔

اس طرح یہ گھوڑسوار صبح سویرے ہی چک پیراں کی حد تک جا پہنچا۔ چونکہ مکان گاؤں کے بھیتر نہیں تھا۔ اس لیے وہ گھوڑے پر سوار دروازے تک جا پہنچا۔ دروازہ اتنا چوڑا اور اونچا تھا کہ اس کے کھل جانے پر وہ گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے اُترے بنا ہی بھیتر جا سکتا تھا۔ دالان کی نیچی دیوار کے اس پار اس نے صحن کا جائزہ لیا۔ دالان کے پرلے سرے پر شاید جگیر ایک ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا چاچا بائیں ہاتھ والی کوٹھڑی میں سویا ہوگا۔ اِن دِنوں موسم ایسا تھا کہ زیادہ تر لوگ کھلی چھتیں چھوڑ کر کوٹھڑیوں میں سونے لگے تھے۔ صرف جگیر سنگھ کی عادت تھی کہ برسات کے موسم کو چھوڑ کر وہ سدا کھپریل کے نیچے سوتا تھا۔

سارے گاؤں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صحن میں بھی خاموشی تھی اور ہر چیز ساکن سی نظر آتی تھی۔ دالان سے اس پار گاؤں کی ڈھلان سے بھی پرے وہ درختوں اور کھیتوں کی پھیکی پھیکی ریکھائیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے وِچاروں میں کھوئے کھوئے اس نے دھیرے سے نیچے اُتر کر دروازے کے اوپر لٹکتا ہوا کنڈہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

جگیر صبح سویرے ہی جاگ اُٹھتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ روشنی پھیلنے تک وہ چارپائی پر لیٹا رہتا۔ کنڈے کی آواز سنتے ہی وہ اُٹھا اور اپنی اَکڑی ٹانگوں سے چلتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا:

"کون ہے؟"

"مَیں ہوں...... جسا۔"

آواز پہچانتے ہی جگیر نے فوراً دروازہ کھول دیا اور جسّے کا سواگت کرنے کے لیے دونوں بازو پھیلا دئے۔ مگر جسّے نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے گھوڑے سمیت بھیتر گھس پڑا اور لگام جگیر کی طرف پھینکتے ہوئے پوچھا:

"چاچا کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے۔"

"جگا دو۔"

جگیر گھوڑے کو اب تک لے جا چکا تھا۔ اسے تعجب ہوا بولا:

"جلدی کیا ہے؟ دن چڑھنے کو ہے۔ بیٹھوان کے جاگنے پر مل لینا۔"

"فضول کی بات مت کرو۔ مَیں انتظار کرنے کے لیے راتوں رات یہاں نہیں آیا ہوں۔"

جگیر کو اس کے بولنے کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔ مگر جب اس نے جسّے کے تیور دیکھے تو خاموش ہو گیا۔

چار پائی کے قریب پڑی لالٹین کی بتی کو اس نے اوپر اُٹھایا اور لالٹین کو ہاتھ میں لٹکائے بگے کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

بگّے کا سرہانہ دروازے کی طرف تھا اور پاؤں پچھلی دیوار میں بنے چوکور سوراخ کی طرف تھے۔ اس سوراخ کو کھڑکی کی بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں لوہے کی سلاخوں کی بجائے موٹی لکڑی کی شاخیں لگی ہوئی تھیں۔

اپنی پائنتی پر جگیر کو کھڑے دیکھ کر بگّے نے کھردری آواز میں پوچھا:

''ابھی تو اندھیرا ہے۔ کہو، کیا پریشانی ہے؟''

جگیر تو جلدی میں کوئی جواب نہ دے پایا، جسّے کی آواز سنائی دی:

''پریشانی میں ہوں۔''

بگّے نے مُڑ کر جسّے کی طرف دیکھا، حیرانگی سے پوچھا: ''تم کب آئے؟''

''ابھی...... سیدھا ہری پورے سے آ رہا ہوں۔''

''کیوں راتوں رات آنے کی وجہ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے، چاچا۔''

جگیر نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کچھ گرما گرمی ہونے جا رہی تھی۔ اس نے چپ چاپ لالٹین کو ایک خالی کنستر پر رکھا اور خود وہاں سے کھسک گیا۔

بگّا اُٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ڈھیلے ڈالے جوڑے کو پھر سے کس کر باندھتے ہوئے کہا:

''ہاں تو کیا بات ہے؟ کیا ٹھجو مرنے کو ہے؟ یا چنن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے کوئی اور شرارت کی ہے؟''

جسّے کے ہاتھ میں گھاس کا ایک لمبا سا تنکا تھا۔ وہ اسے اُنگلی اور انگوٹھے میں لے کر گھماتے ہوئے بولا:

''میری اور دیپی کی شادی ہونے جا رہی ہے۔''

ایک بار تو کوٹھڑی میں سناٹا چھا گیا۔ بگّے نے بھتیجے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ جسّے کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو اس کی پوری گہرائی تک سمجھنے کے بعد بگّا کڑوی ہنسی ہنس کر بولا:

''یہ بات مجھ سے کہنے کے لیے تم راتوں رات گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہاں تک پہنچے، میری نیند خراب کی، لیکن یہ نہیں سوچا کہ میرا اس بات سے کیا تعلق؟''

''تمہارا تعلق ہے چاچا۔''

''تمہیں ضرور کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ میرا تمہاری شادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بارے میں جو میرے وِچار ہیں سو تم جانتے ہو۔ شاید تمہیں مالوم نہیں کہ تمہارے لیے اس شادی کا کیا نتیجہ ہو گا۔''

''مجھے مالوم ہے۔ جب تم ہری پورے آئے تھے، تو بُوا سے میری شادی کے بارے میں بات

چیت کرتے وقت خوب بھڑکے تھے۔ مَیں باہر کھڑا سُن رہا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ اگر میں دیپی یا کسی سے بھی شادی کی تو مجھے تمہارے گھر سے نکلنا پڑے گا۔"

"بہت اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی سُن لیا۔ اب تم اچھی طرح جانتے ہو کہ دیپی سے شادی کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"ہاں چاچا! مَیں تو یہ بات جانتا ہوں لیکن تم ایک بات نہیں جانتے۔"

"کیا؟"

"تم نہیں جانتے کہ اگر تم نے شادی نہیں کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"شادی کرنا یا نہ کرنا میرا نجی مالمہ ہے۔ جو فیصلہ میں نے کیا ہے، وہ ساری دُنیا جانتی ہے۔ میرے دوست تک مجھے اَڑیل ٹٹو کے طعنے دیتے ہیں۔ مگر مَیں اپنے ارادے پر اٹل ہوں۔"

وہ سب تو ٹھیک ہے، مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"نتیجہ! ہاں یہ بھی خوب رہی۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ ہوگا، جو تمہیں مالوم ہے اور مجھے نہیں مالوم۔"

"ہاں...... ہے۔"

"مَیں بھی تو سُنوں۔"

"اگر تم شادی کے لیے راضی نہ ہوئے تو اب اس کوٹھڑی سے تم نہیں تمہاری لاش نکلے گی۔"

بگا بھڑک کر چار پائی سے یوں اُٹھا، جسے بھڑ نے اس کے کولہوں پر ڈنک مار دیا ہو۔ وہ کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ پھر رُکا اور جسّے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"تو یہ بات ہے؟"

"ہاں چاچا، یہی بات ہے۔"

"تم اپنے ساتھ کس کس کو لائے ہو؟"

"مَیں اکیلا ہوں۔"

"مجھے کون مارے گا؟"

"مَیں۔"

"تمہارے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دیکھ رہا ہوں۔"

جسّے نے اپنے دونوں ہاتھ ذرا آگے بڑھا کر کہا:

"میرے یہ ہاتھ ہی ہتھیار ہیں۔ پہلے میں ایک ہاتھ توڑتا ہوں، پھر دوسرا۔ تب ایک ٹانگ اور دوسری توڑتا ہوں۔ آخر میں گردن کہنی کے گھیرے میں لے کر ایک ایسا جھٹکا دیتا ہوں کہ گردن کے منکے تڑاک سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مَیں نے تھیئے کو ایسے ہی مارا تھا۔"

"بچو! میں تھیئا نہیں ہوں۔"

''ہاں چاچا، یہ تو میں جانتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہارا قتل کرنا اور بھی آسان ہے۔''
''تم ایک قتل کر کے بچ نکلے، تو اب یہ سمجھتے ہو کہ جب جسے چاہو، ٹھکانے لگا سکتے ہو۔''
''ہاں! یہی سمجھتا ہوں۔''
بگا اور بھی زیادہ بھڑک کر بولا:
''مَیں کوٹھڑی سے باہر نکلتا ہوں...... دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے روکتا ہے۔''
جسا ایک ہی ڈگ بھر کر اس کے راستے میں جا کھڑا ہوا۔ دروازے کی کنڈی بھیتر سے چڑھا دی، اس سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور گھاس کا تنکا منہ میں لے کر دانتوں سے دھیرے دھیرے چبانے لگا۔
بگا دو قدم آگے بڑھا تھا لیکن فوراً ہی چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جسے کی طرف دہکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

جسا پھر بھاری آواز میں بولا:
''میں جانتا ہوں کہ تم اڑیل ٹٹو ہو۔ اسی لیے میں تمہاری لاش ٹھکانے لگانے کا پورا بندوبست کر کے آیا ہوں۔''
یکا یک بگا گرج کر بولا:
''وہ بڑا منحوس دن تھا، جب نہ جانے کون آدمی تمہیں ایک اناتھ کے رُوپ میں میرے گھر لے آیا۔''
''سچ مچ وہ بڑا ہی منحوس دن تھا۔''
''تو کسی حرامزادے کی اولاد ہے۔ بدکا تخم! مادر چود ہے۔''
''ہاں، چاچا۔''
پنجرے میں بند جنگلی شیر کی طرح بگے نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس نے کھڑکی نما سوراک کی طرف دیکھا، مگر اس میں سے فرار ہونا ناممکن تھا۔
کافی دیر تک کوٹھڑی میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ آخر بے بس ہو کر بگا چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا:
''ابے حرام جادے! آخر مجھ سے شادی کرے گا کون؟''
''بنتو۔''
''بن............'' آواز بگے کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ پھر سنبھل کر بولا:
''تمہارا مطلب، پورن سنگھ کی بہن سے ہے؟''
''ہاں، میں نے اس سے بات کی اس نے یہ رشتہ قبول کر لیا ہے۔''
''اور جتو؟''
بگا بنا آنکھیں جھپکائے بھتیجے کی طرف دیکھے جا رہے تھا۔

جسا بولا: ''اسے بھی تم پسند ہو۔''
یہ سن کر بگّے کا انگ انگ سنسنا اُٹھا۔
باہر سے چڑیوں کے چہکنے کی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ چوکور سوراخ میں سے دُھندلا پرکاش پھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔
جسّے نے کنڈی کھول دی اور بولا:
''چاچا اب تم تیار ہو جاؤ۔ پورن سنگھ نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوہ بہن کی شادی اسی طرح کرے گا جس طرح کنواری لڑکی کی شادی کی جاتی ہے۔ وہ شگن لے کر جلد ہی پہنچ جائیں گے۔ تم بھی نہا دھو لو۔''
بگّے نے محسوس کیا کہ اب انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اس نے تہمد کو جھاڑا اور کس کر باندھ لیا۔ پگڑی بغل میں دابے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ قدم باہر رکھنے سے پہلے وہ ٹھٹھک کر رُکا، بھتیجے کی طرف زہر بھری نظر ڈالی اور بولا:
''سور دے پتر! بات تمیز سے کرنا سیکھو، نہیں تو کسی روز مجھ سے جھاپڑ کھا جائے گا۔''
جسّے کی گھمبیرتا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس وِچار سے کہ بگّا آسانی سے باہر نکل سکے، اس نے دوسرا تختہ کھولتے ہوئے جواب دیا:
''ہاں چاچا!''

Scanned with CamScanner

انواسی
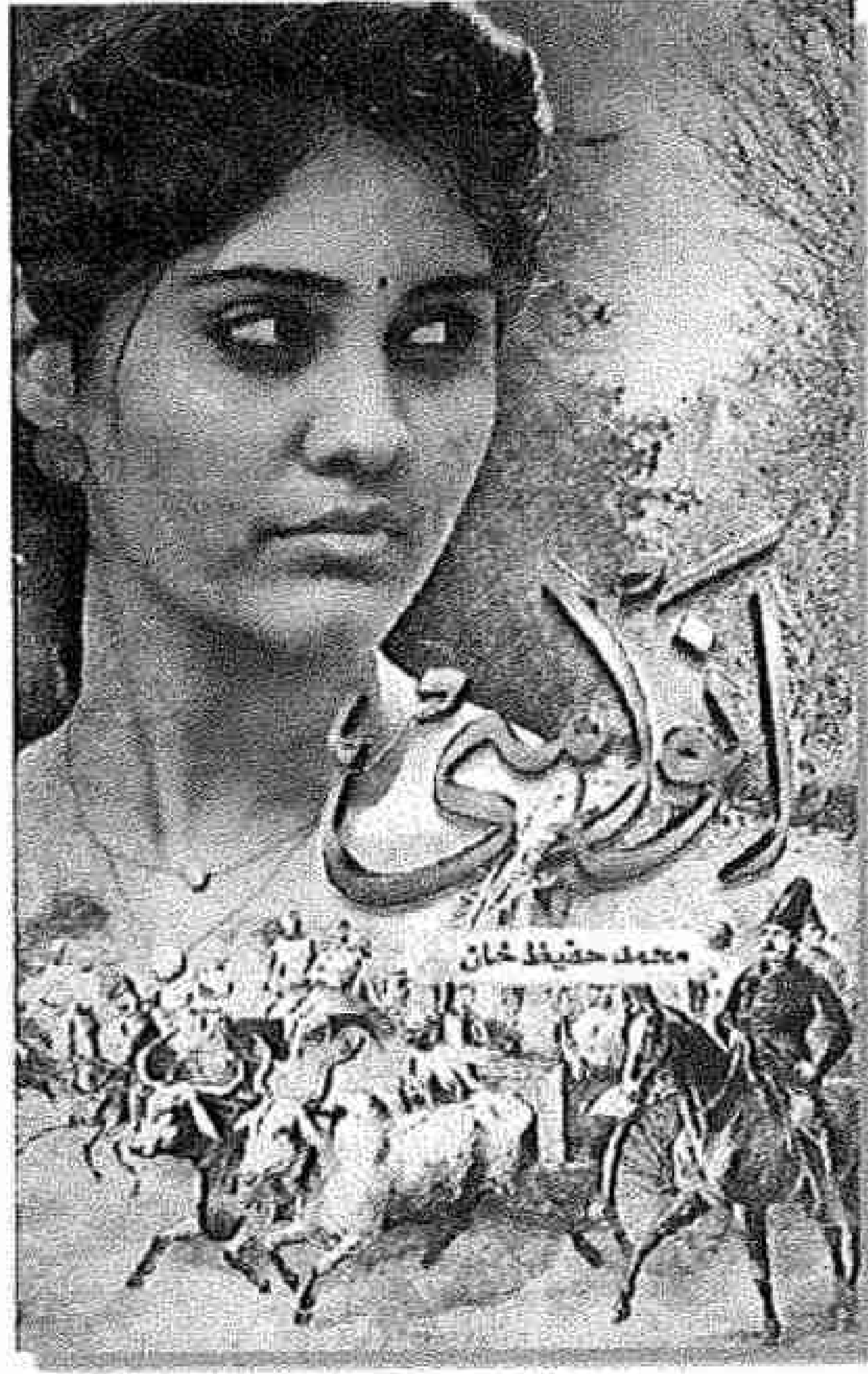
محمد حفیظ خان

- ''انواسی'' محمد حفیظ خان کا ایک تاریخ ساز ناول جس میں خطے کی تاریخ اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو کمال ہنروری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ (خالد فتح محمد)

- محمد حفیظ خان نے ''انواسی'' ایسا شان دار ناول لکھا ہے جو کسی ایک صدی میں قید نہیں آنے والے وقتوں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔ (محمد حامد سراج)

- محمد حفیظ خان کا ناول ''انواسی'' برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی اہم، لیکن نظروں سے اوجھل باب کی روداد ہے۔ ایسے افراد جو ادب کو محض وقت گزاری یا تفریح کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اپنی تاریخ، ماحول، انسانی رویوں اور نفسیات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں یقیناً یہ ناول مایوس نہیں کرے گا۔ کیوں کہ اس میں موجود تقریباً ہر واقعہ یہ گواہی دیتا محسوس ہوتا ہے کہ ہاں! ایسا ہو سکتا ہے، ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ (ڈاکٹر بی بی امینہ)

بُک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان